

# شائع

رضیاع بٹ

PDFBOOKSFREE.PK



شائِر

رَضِيَّہ بیٹ

ماوراء پبلشرز © ۳ بہاولپور روڈ لاہور

## عرضِ ناشر

رضیہ بٹ کا نیا ناول ”مشائخہ“ پیش خدمت ہے۔ اس ناول کا کچھ حصہ اہنامہ ”آئینل“ میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔ اب اس کی اشاعت کے ساتھ ہی نسطوں کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

”مشائخہ“ مشرقیت کی کہانی ہے۔ مشرق اور مغرب میں عورت کی محبت اور وفاداری کے نظریے میں جو تفاوت ہے، رضیہ بٹ نے اس کی عکاسی بڑی باکدستی سے کی ہے۔ یہ ناول جہاں ایک عمدہ ادب پارہ ہے وہیں ان گھرانوں کے لیے باعثِ عبرت بھی ہے جو مغرب کی اندھا دھند تقلید میں اپنی روایات کو راموش کر بیٹھے ہیں۔

ادارۃ

مراد محل اس علاقے کی خوبصورت ترین عمارت تھی۔ ایجنٹوں پر پھیلے بانٹا  
 میں یہ سفید عمارت اک شان و مہکت سے کھڑی دور و نزدیک سے اپنی  
 انفرادیت منواتی تھی۔ بیسیوں کمروں، رہائشیوں، برآمدوں، بالکینوں اور  
 وسیع و عریض ڈائینگ، ڈرائنگ ہالوں والے مراد محل کے حسن میں عبقی  
 طرف ہنسنے والی بیک حزام ندی نے اضافہ کیا تھا۔ پہاڑی علاقے کے اس میدانی  
 قدرتی منظر سے میں رہائشی بچے کا انتخاب بلاشبہ حسن نظر ہی کا کرشمہ تھا۔  
 لیکن

مٹی کی اک لکیر بھی کہہ دے گی داستان  
 چلنے کا شوق ہے تو روا کو سمیٹ لے  
 (خالد شریف)

جب مراد محل کے سامنے اونچائی کی طرف جاتی سرسبز شہر کے کنارے  
 نشین وجود میں آئی۔ تو مراد محل کا حسن ماند پڑ گیا۔ اونچے نیچے پہاڑی علاقے میں  
 یہ نئی عمارت نئی دہلی کی طرح لگتی تھی۔ سُرخ ڈھلانی چھتوں اور شیشے کی پوری  
 پوری دیواروں والی یہ کوٹھی مراد محل کی طرح بیسیوں کمروں پر توبہ شک شعل تھی



نہیں رہا۔ شچو نے چترال میں تھی۔ اس لیے کبھی کبھار آئے تو یہاں قیام کرتے تھے۔ پچھلے سال انہوں نے اچانک ہی یہ جگہ بیچنے کا پروگرام بنالیا۔ عثمان ان دنوں جگہ کی تلاش میں تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ مراد محل کے ارد گرد ہی کوئی جگہ مل جائے۔ وہ مراد محل کے مقابل جگہ بنانا چاہتے تھے۔ ایسی جگہ جو مراد محل سے زیادہ خوبصورت ہو۔

مراد محل چھوڑنے سے پہلے ان کی سوتیلی والدہ عشرت بانو نے جو کچھ کہا تھا یا ان کے والد مراد علی خاں نے جو الفاظ استعمال کیے تھے۔ عثمان کے سینے میں تیر کی طرح اتر گئے تھے۔ ان کی انا ان کے دقار اور عزت نفس کو جس طرح مجروح کر گئے تھے۔ اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ الفاظ کا توڑ عملی طور پر کریں۔ عثمان کی قسمت اچھی تھی۔ کزنلاش کے انہی دنوں میں انہیں اپنی پسند کی جگہ مل گئی۔ منہ مانگے دام دے کر انہوں نے ساری سٹیٹ خرید لی۔ اور پھر دن رات ایک کر کے پرانی کوٹھی کا نیا چولہہ بدلا۔ کئی جگہ سے گرائی۔ کئی جگہ سے بنوائی۔ جدید طور کی عمارت بنانے کے لیے تگ و دو کا لہما ملے طے کرنا پڑا تھا۔

نشین کی ظاہری دکھاوٹ تو خوبصورت تھی ہی۔ لیکن اندرونی سجاوٹ خوابوں کے کسی سنہری دیس کی سی تھی۔ قالین۔ پردے۔ فرنیچر اور نایاب آرٹسٹریچیز عثمان علی خاں کے نفیس ذوق۔ لائقانہ شوق اور فن کارانہ حس کی نماز تھیں۔

وہ بہت سی چیزیں بیرونی ممالک سے لائے تھے۔ صرف مغربی ممالک

صرف آٹھ بیڈروم تھے۔ لیکن ہر کمرہ موقع کی مناسبت سے خوب تھا۔ بڑا۔ خوب نشیمن کی یہ تھی۔ کہ چاروں اطراف عمارت کا فرنٹ دکھائی دیتے تھے۔ ادنیٰ نیچے ٹیلوں کو مہوار کر کے بڑی خوبصورتی سے چمن بنائے گئے تھے۔ ان چمنوں میں علاقائی پھولوں، پودوں کے علاوہ باہر سے لائے ہوئے غیر ملکی پھولوں کی بھی بڑی محنت سے نشوونما کی گئی تھی۔ کئی خوشبودار جھاڑیاں تھیں۔ کئی پھولدار بیلین تھیں۔ بہت سے چھتدار درخت تھے۔

مراد محل کے عقب میں بننے والی ندی نشین کے مغربی حصے سے نکلا کر گزرتی تھی۔ جو کچھ یہاں علاقہ غیر مہوار تھا۔ نشیب دفرانہ تھے۔ اس لیے ندی بھی کئی شوق حیلہ کی طرح اچھلتی کودتی چھینٹاڑاتی شور مچاتی گزرتی تھی۔

ندی کا ایک پلو چھید کر پانی کو کوٹھی کے وسطی سوننگ پول میں ڈالا گیا تھا۔ اس خود ساختہ تالاب کے کنارے شیشے کا بڑا دیدہ زیب کمرہ سن باتھ کے لیے بنایا گیا تھا۔ مچلیں، آرام کر سکیاں اور رنگ برنگے سوننگ کوسٹوم۔ ٹاؤل۔ اور دگ وغیرہ اس کمرے میں ترتیب سے رکھے رہتے تھے۔ نشین جو کچھ کافی ادنیٰ پر واقع تھی۔ اس لیے دور دور سے نظر آتی تھی۔ سبزے میں گھری لال چتوں والی یہ کوٹھی مراد محل پر سبقت لے گئی تھی۔

یہ کوٹھی نواب زادہ عثمان علی خاں کی تھی۔ عثمان۔ مراد علی خاں کے بڑے صاحبزادے تھے۔

اپنے محل وقوع کی وجہ سے یہ جگہ عثمان کو شروع سے ہی بہت پسند تھی۔ یہ جگہ خاں نجیب اللہ خاں کی ملکیت تھی۔ انہوں نے یہاں کوٹھی بنا تو لی تھی۔

شیشے کی تھی۔ جس کے پار پہاڑیوں کے سلسلے اور پہاڑی اور پائنتھے چلے گئے تھے۔ سنہرے اور خود در پھولوں سے لدی پہاڑیاں دور۔ بہت دور۔ جہاں آسمان سے ملتی محسوس ہوتی تھیں۔ نیلی نیلی دکھائی دیتی تھیں۔ اور برف کی جہمی نہیں سفید چمکیلی جھلک نیلا ہٹوں میں مدغم ہوتی دکھائی دیتی رہتی تھیں۔

شیشے کی دیوار کے آگے ریشمی مہین پر دے تھے۔ موٹے وزنی پڑوں کی دوسری تہہ کمرے کی زنگھت سے مناسبت کھاتی تھی۔ اس کمرے میں خوابناک ماحول دن کی روشنی اور رات کی سیاہیوں میں یکساں خوبصورت لگتا تھا۔ بیڈ کے لیے ایک چوترہ سا بنایا گیا تھا۔ شاندار غلیں بیڈ اس پر اک تخت کی طرح رکھا تھا۔ سنہری ڈوریوں میں بندھے مسہری کے پردے سرسرتے ریشم کے تھے۔ صوفے۔ کمریاں اور فوم کی موٹی موٹی نشستیں سبھی بیڈ کی طرح تھیں۔ سرخی اور سنہرے پن کا حسین امتزاج تھا۔ چھت کے سینے میں ٹنگا فانوس۔ دیواروں میں لگی برقی روشنی اور بیڈ کے سرہانے سرخ روشن کمرے کو خوابناک سا تاثر دیتی تھیں۔ پورا فرش کئی اونچ موٹے قالین سے ڈھکا تھا۔ سرخ قالین جب روشنیوں کی زد میں آتا تو یوں لگتا جیسے شعلے جامد ہو گئے ہیں۔

خواب گاہ کی فضا کچھ ایسی بنائی گئی تھی کہ نیند آتی ہو۔ تو بیڈ پر سر رکھتے ہی خوابوں کی وادی میں انسان جا پینچے۔ اور اگر جگنے کا عزم ہو۔ تو ساری رات یوں گزر جائے جیسے پلک جھپکی ہو۔

ہی سے نہیں مشرقی ممالک سے بھی اپنی پسندیدہ چیزیں خرید کر لائے تھے۔ ان کے نشین کی سجادہ میں جہاں مغربی تاثر ملتا تھا۔ وہاں جاپانی نزاکت و نفاست۔ رنگوں اور پھولوں کا انتخاب بھی نظر آتا تھا۔ انڈونیشی لکڑی اور ہاتھی دانت کی بے نظیر اشیاء بھی نظر آتی تھیں۔ کانسے کے خوبصورت مجسمے جنوبی بھارت کی تہذیب کے عکاس بھی دکھائی دیتے تھے۔

عثمان علی خاں کو نایاب چیزیں اکٹھی کرنے کا جنون تھا۔ مرادعلی میں رہ کر انہوں نے خوبصورت اور آراستہ گھر کا خواب دیکھا تھا۔ نشین اس خواب کی کھلی تعبیر تھا۔ ہر کمرہ قابلِ تالاش تھا۔ مہمان خانہ۔ ڈرائنگ ہال۔ ڈائیننگ ہال، خوش ذوقی اور شوق بے پناہ کے منہ بولتے ثبوت تھے۔ بالکنیاں اور برآمدے جس طرح سمائے گئے تھے۔ اور خوبصورت سیلوں کے ساتھ مریں اور کانسے کے ٹب جس طرح ایسا دہ کیے گئے تھے۔ اپنی مثال آپ تھے۔

لائبریری میں آرام دہ نشستوں کا بندوبست تھا۔ کتابیں گوا بھی زیادہ جمع نہ کر سکے تھے۔ پھر بھی ذخیرہ قابلِ تعریف تھا۔ اور تو اور عثمان علی خاں نے تو نوکر گھر بھی جدید سہولتوں سے مزین کر کے اس طریق سے بنائے تھے کہ ان پر چھوٹے چھوٹے نفیس فلیٹوں کا گمان ہوتا تھا۔

نشین کی سب سے خوبصورت سچے عثمان علی خاں کا ذاتی بیڈ روم تھا۔ یہ بیڈ روم ان کی خاص الخاص ہدایات پر تیار کیا گیا تھا۔ اور اسے آراستہ کرنے میں بھی انہوں نے بطور خاص محنت کی تھی۔ اس کی ایک پوری دیوار

خواب گاہ کے برابر زمانہ اور مردانہ ڈرائنگ روم اور ان سے ملحقہ غسل خانے تھے۔ یہ سب بھی خواب گاہ ہی کی طرح خوبصورت اور جدید سامان سے آراستہ تھے۔

خواب گاہ کے شمالی جانب اپنے نوزائیدہ بچے شہریار کے لیے انہوں نے الگ کمرہ بنوایا تھا۔ خوبصورت شہری کی طرح اس کے کمرے کی بھی ہر چیز خوبصورت اور معصوم تھی۔ پانچ چھ ماہ کا شہری عثمان اور شائنے کی دیوانہ محبت اور والہانہ عشق کا بندھن تھا۔

نشین کی سجادہ بناوٹ سال ڈیڑھ سال کے عرصہ میں مکمل ہو پائی تھی۔ عثمان کے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ آج یہاں ہیں تو کل یورپ — لندن سے لوٹے ہیں۔ تو جاپان جا رہے ہیں۔ انڈونیشیا پہنچ رہے ہیں۔

یہ ساری تنگ دود اور محنت وہ ایک شوریدہ سر انسان کی طرح کمر رہے تھے۔ انہیں شائنے کا مان رکھنا تھا۔ انہیں مراد علی اور عشرت بانو کی نظروں میں شائنے کا قدر بڑھانا تھا۔ حسین شائنے ان کی زندگی کا انتخاب تھی۔ ان کے دیوانہ عشق کا مرکز تھی۔

شادی انہوں نے کرایے کے ایک بنگلے میں کی تھی۔ دو بیڑ روم کا گھر ان کی حیثیت کے شایان شان نہ تھا۔ مجبوری کے تحت وہاں رہ رہے تھے۔ اس لیے کام کی رفتار تیز سے تیز کر رہے تھے۔

نشین میں وہ کچھلے ماہ ہی شفٹ ہوئے تھے۔ ہزاروں انگلیوں —

شوق کی فراوانیوں اور عشق کی بے تابوں کو پہلو میں سیٹے یہاں آئے تھے۔ اک شاندار تقریب یہاں شفٹ ہونے کی خوشی میں کی گئی تھی۔ اس دن ان کی خوشیوں کی انتہا تھی۔

اور

شاید

ہر انتہا لوٹ کر ابتدا کی طرف آنے کی عادی ہے۔

خوشیاں غبار کی مانند ہوتی ہیں۔ جس میں گیس زیادہ بھر جائے تو پھٹ جانا یقینی ہوتا ہے۔

اس کے بال سیدھے، چمکدار اور کندھوں تک کٹے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ حسین و دلکش تھا۔ چوڑی چوڑی بنری مائل گرے آنکھیں ہمیشہ ٹوٹے خمار کی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ اس کے ہونٹ سیکی تھے۔ گلابی ہونٹوں پر نرم سی چھوڑ ہمیشہ نظر آتی۔ جو بڑی ہی جذبات انگیز تھی۔ اس کی آواز میں نغموں کی لے تھی۔

اس کے متعلق بلاشبہ کہا جاسکتا تھا کہ اس بت کو قدرت نے بڑی محبت اور بڑی کاوش سے تراشا تھا۔

شینو صوفے پر بے دم سی پڑی رہی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ خوبصورت اور آراستہ لاڈلج میں تھی۔ لیکن احساس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی وجود نہیں۔ آوارہ رُوح ہے جو قبرستانوں کے سناٹوں میں۔ چنتی چلاتی پھر رہی ہے جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ جس کی کوئی منزل نہیں۔ گھر اگر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سر کو ہلکا سا جھکا دیا۔

اپنی خرد طبی گداز اور ڈائمنڈ کی موٹی موٹی انگوٹھیوں سے مرصع انگلیاں بالوں میں پھیرنے لگی۔ اسے وحشت ہو رہی تھی۔ وحشت کا آسیب دونوں سے اس کے اندر پل رہا تھا۔ اور وہ دکھ کی ایسی صلیب سینے میں کاڑھے تھی جس پر اس کی اپنی ہی رُوح ٹنگی تھی۔ اپنا ہی وجود لٹک رہا تھا۔ وہ اک اضطرابی انداز میں صوفے سے اٹھ بیٹھی۔ کلاک پر نگاہ ڈالی۔ غمان ابھی تک نہیں آئے تھے۔

لاڈلج میں لگے الیکٹرک کلاک نے دس کا گجر بڑے مڑیے انداز میں بجایا۔ شانہ کی نگاہیں کلاک کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک گہری جھگڑ سوز سانس لیتے ہوئے اس نے رسالہ میز پر پھینک دیا۔ اور اس کا وجود بے جان مٹی کا ڈھیر ہو کر ختم ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ کا پٹنے لگے۔

لاڈلج باقی گھر کی طرح بڑی نفاست سے آراستہ تھی۔ ساری بقیہاں روشن تھیں۔ نور کا سیلاب تھا جیسے۔ ہر چیز چمک رہی تھی۔ ان سب بے جان چیزوں کی طرح سیپ ایسے بدن والی شانہ بھی چمک رہی تھی۔ زنجین، نفیس لانگ ڈریس سے اس کے گداز اور قالمہ حرکت کر رہی تھیں، جھمک کا خزانہ تھی۔ اس کے پاؤں اور پنڈلیاں جذبات تھیں۔ اس کے کندھے ملائم اور ڈھلانی تھے۔ اس کی گرچیتے کی سی تھی

ان کا آنا یا نہ آنا اس کے لیے برابر ہی تھا۔

پھر بھی

انتظار کی کسک اسے چین نہ لینے دیتی تھی۔ عثمان نے اب اکثر لہ آنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کہاں رہتے تھے۔ کہاں آتے جاتے تھے۔ کچھ علم نہ تھا۔

وہ ان سے پوچھ بھی تو نہ سکتی تھی۔

وہ تو ابتداء انتہاء کے دوسرے بن چکے تھے۔ دوسرے — جن کا آپس میں تعلق تو ہوتا ہے۔ لیکن فاصلے ازل سے ابد تک پچھوتے ہیں۔ اس نے پھر ایک گہری سانس لی۔ بالوں کو چہرے سے پیٹھایا۔ ہڈیوں سے نکل کر برآمدے میں آگئی۔

ننگے شانوں پر بر فانی ہوا کے جھونکے جلن سی پیدا کرتے ہوئے گزرے گئے۔ شانہ تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنی خوابگاہ کی طرف بڑھی۔

شیری کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے قدم رک گئے۔ وہ خوابگاہ میں جانے کی بجائے بچے کے کمرے میں آگئی۔

لیس کی خوبصورت جھالروں والی کاٹ میں آسانی رنگ کے لبتے ہیں اس کا پانچ چھ ماہ کا گول مٹول پایا سا بچہ فرشتوں کی سی معصومیت چہرے پر لیے بے خبر سو رہا تھا۔ نیلا کبیل اس پر پڑا تھا۔ اس کے موٹے موٹے ہاتھ کبیل سے باہر تھے۔ مکہ کا فی گرم تھا۔ بچے کے ماتھے پر ہلکی سی نمی تھی۔ شانہ اپنی اس خوبصورت تخلیق کو دیکھتے ہوئے بے اختیار

جھک گئی۔ اس کے ہونٹ بچے کی پیشانی پر شفقت سے مس ہو گئے۔ کبھی ہی نگیں ساتیں گزر گئیں۔ اور وہ اسی انداز میں جھکی رہی۔

بچہ بے آرام ہوا۔ اس نے سر ہلایا اور مٹھیاں بند کر کے منہ میں ٹھوننا چاہیں۔ اس کوشش میں انگوٹھا منہ میں آگیا۔ وہ بڑے اطمینان سے اسے جوستے ہوئے پھر سو گیا۔ انگوٹھا اس کے ننھے منے پیارے پیارے ہونٹوں میں دباز ہوا۔

شانہ کاٹ سے ہٹ کر کمرے کو دیکھنے لگی۔ بچے کی آیا دیوار کے ساتھ لگے پلنگ پر سو رہی تھی۔ بچے کی ساری چیزیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ دودھ کی بوتلیں صاف ستھری تھیں۔ اور شیشے کے کور کے نیچے رکھی ہوئی تھیں۔

وہ کسی پر اسرار روح کی طرح آہستہ آہستہ چلتی بچے کے کمرے سے نکلی در اپنی خواب گاہ میں آگئی۔

خوابگاہ میں روشنیوں کا سُرخ غبار پھیلا ہوا تھا۔ عثمان کی دل پسند خوشبو لہر میں بچی بسی تھی۔

اپنی تمام تر خوبصورتیوں اور آسائشوں کا بوجھ خواب گاہ شینو کے لیے بکتے ہوئے جنہم سے کم نہ تھی۔ سبھی سجائی پھیر کھٹ کسی قبر کے کھلے ہانے کی طرح خوفناک نظر آ رہی تھی۔ قبروں کے اس جنہم میں اس نے رات گزارنا تھی۔

اس نے حسرت بھری نظریں چاروں طرف ڈالیں۔ پھر اپنے ڈیرنگ

ردم ہیں چلی گئی۔

وہ شبِ خوابی کا دیدہ زیب لباس پہن کر واپس آئی۔ یہ لباس اسے اپنے جسم کو آتشیں زبان سے چاٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ اگر بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس نے تیکھ میں منہ چھپا لیا۔ اور ان گنت آدائیاں اس کے وجود میں تحلیل ہونے لگیں۔

جانے کتنا وقت اور گزر گیا۔

گاڑی کے پورچ میں رکنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ بیڈ میں اٹھ بیٹھی۔

شبِ خوابی کے لباس میں مہین ڈدریاں اس کے کندھوں سے پھیل کر بازوؤں پر آگئی تھیں۔ اور اس کی لیس کی خوبصورت جھالیں بہت نیچے کو جھک آئی تھیں۔

ڈدریاں کندھوں پر لاتے اور جھالیں سیپ ایسے دھکتے بدن پر اوپر کو کھینچتے وہ بیڈ سے نیچے اتری۔ منہل کے سلیمپروں میں پاؤں ڈالے اور پورچ کی سمت کھٹنے والی گھڑکی کا ہٹ کھول کر باہر دیکھنے لگی۔

عثمان گاڑی سے ماہرکل رہے تھے۔

”سلام صاحب۔“ نعمت خاں نے سلوٹ کے انداز میں سلام کرتے

ہوئے ان کے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا۔

سرکی ہلکی سی خبش سے عثمان نے سلام کا جواب دیا۔ انہوں نے

براؤن سوٹ پر لبھا اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ سردی سے ان کا چہرہ خاصہ

سُرخ ہو رہا تھا۔ ان کے بالوں اور حین آنکھوں کی سیاہی اس سُرخ سے مل

کردان کی بھرپور اور پرکشش شخصیت کو اجاگر کر رہی تھی۔ اونچے لائے قد اور متوازن جسم والے عثمان کے چہرے پر گہری اداسی کی چھاپ بڑی واضح تھی۔ ان کی آنکھوں میں کرب تھا۔ لیکن چونکہ اکر کو دیکھتے ہی وہ سُکرائے۔ استاد۔ بڑی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔

”جی صاحب۔ آج آپ بہت دیر سے آیا۔“ نعمت خاں پتو زار زدہ

میں بولا۔

”ہاں کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔“ وہ بولے۔

”روز ہی دیر سے آتا ہے آپ۔“ خوشگم صاحب انتظار میں بیٹھا ہے

وہ بولا۔

”اچھا بھئی اچھا۔“ آئندہ جلد آجایا کریں گے۔“ وہ خاکی موٹے سے

ادھر کوٹ میں بلوس نعمت خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سُکرائے۔

”یہ بریف کیس اس کمرے میں رکھ دو۔“ عثمان نے مہمان خانے کی طرف

اشارہ کیا۔ ان دنوں وہ اسی کمرے میں سوتے تھے۔

نعمت خاں حکم کی بجا آوری کے لیے سر کو قدرے خم کر کے ادھر چلا گیا۔

عثمان اندر آگئے۔

برآمدے خانہ سال مل گیا۔

”کھانا لگاؤں صاحب۔“ اس نے پوچھا۔

”کیا رہنچ چکے ہیں۔“ فضل دین۔ عثمان نے آئیں قدرے ہٹا کر گھڑی دیکھی۔

”بھوک تو مر چکی۔“

انہوں نے لباس تبدیل کیا۔ شبِ خوابی کا لباس پہنا اور خوبصورت گرم۔  
گاؤں پہنتے ہوئے خوابگاہ میں آگئے۔ گاؤں کی ڈوریاں بند کرتے ہوئے شینو  
کی طرف دیکھ بغیر وہ آہستگی سے بولے۔ "میرے دیر سے آنے سے آپ  
ڈسٹرب ہوئی ہیں۔ کل سے میں اپنا ڈرائنگ روم ادھر ہی بنا لوں گا۔"  
شینو نے یہ دھتے ہوئے ٹریل سی آواز میں کہا۔ "میں ڈسٹرب نہیں  
ہوئی۔"

"کھانا بھی کھالیا کریں۔ ان دنوں میرے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔"  
عثمان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے بولے۔  
شینو اک گہری سانس لیتے ہوئے عثمان کی پشت کو دیکھنے لگی۔ وہ اس کی  
طرف کر کے کھڑے تھے۔

اجنبیت کے یہ وارثاں تھے۔ لیکن شینو تو کھل کر ٹپ بھی نہ سکتی تھی۔  
عثمان نے اب طرزِ مخاطب بھی بدل لیا تھا۔ تم کی بجائے آپ کہنے لگے تھے۔  
کتنے اجنبی لگتے تھے اسے یہ طریق۔  
خانساں نے کھانا لگا دیا تھا۔

"آئیے۔ کھانا کھالیں۔" عثمان نے قدم اٹھاتے ہوئے گھیر آواز  
میں کہا۔

شینو بادلِ خواستہ بستر سے نکلی۔ ادنیٰ بارہ اور تھا اور عثمان کے پیچھے پیچھے  
کمرے سے نکل آئی۔

بھوک تو اسے تھی ہی نہیں۔ اس وجہ سے آگئی تھی۔ کہ کہیں عثمان بھی کھانے

"بگیم صاحبہ نے بھی کھانا نہیں کھایا۔" فضل دین بولا۔  
"ادہ۔ اچھا۔ پھر لگاؤ کھانا۔" عثمان نے کہا اور خوابگاہ کی طرف  
بڑھ گئے۔  
شینو کمر کی سے ہٹ کر بیڈ پر آگئی تھی۔ تیکے سے سر لگائے وہ نیم دراز  
تھی۔

عثمان اندر آئے۔ اک نظر شینو پر ڈالی۔ وہ نکاہیں جھکائے خاموش تھی۔  
شینو کا جی چاہا اٹھ کر تیر کی سی تیزی سے عثمان کی طرف جانے اور ان کے  
گلے میں بازو ڈال کر شکوہ کرے۔ "مانی۔ یہ کیا دطیرہ اپنا لیا ہے کیوں دیر سے  
آنے لگے ہو۔"

لیکن اٹھنا اور کچھ کہنا تو درکنار وہ تو آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھ بھی نہ  
سکی۔ اس کی سانس بھی جیسے سینے میں اکس گئی تھی۔

عثمان اس پر ایک نظر ڈال کر آگے بڑھ گئے۔ چند لمے پہلے نعمت خاں  
اور فضل دین کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ  
کھیل رہی تھی۔ جو دکی تیں گھٹ چکی تھی۔ ان کے چہرے پر اذیت کے آثار  
تھے۔ آنکھوں میں کرب کی کیفیت تھی۔

وہ اپنے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

کتنی ہی دیر وہ بڈ حال سے الماری کے پٹ سے ہاتھ لگا لئے کھڑے  
رہے۔ ان کے ہاتھ کی گرفت پٹ پر مضبوط تھی۔ ان کے سینے میں ٹپل مچی تھی۔  
لیکن طوفان کو پٹ پڑنے کی اجازت دینا ان کے وقار کے منافی تھا۔

سے انکار کر دیں۔

کچھ ایسے ہی احساسات عثمان کے بھی تھے۔ اپنے لیے نہیں شینو کے لیے وہ کھانے کے کمرے میں آئے تھے۔

مینز پر دونوں آنے سامنے بیٹھے تھے۔ خانہ ماں لذیذ کھانے پکانے کا ماہر تھا۔ لیکن لذت کا انحصار بھی تو انسان کے جذباتی آثار و چڑھاؤ پر ہوتا ہے۔ سوچ و فکر بھی لذت بڑھانے اور گھٹانے میں اہم کردار کرتے ہیں۔

دونوں نے تھوڑا تھوڑا کھانا اپنی اپنی پلیٹوں میں نکال لیا۔ مستعد ہوا صاف تھری وردی میں کھڑا تھا۔

عثمان بڑے خوشگوار انداز میں اس سے باتیں کر رہے تھے۔ اور شینو بھی چہرے پر بشارت کے آثار لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

عثمان چاہتے تھے شینو کو دونوں کے مابین پھیل جانے و صلح خلا کے متعلق گھر کے کسی نوکر یا ملنے ملائے والے کسی فرد کو پتہ چلے۔

بناوٹ کے نقاب اوڑھنا اور چہروں پر تصنع کے چہرے بجا نا بڑا ہی مشکل تھا۔ لیکن دونوں ایسا کر رہے تھے۔

بڑی بکھری ہوئی دھوپ نکلی تھی۔ کئی دنوں سے مطلع ابراؤں تھا۔ فضا میں ٹھنڈی سی گھٹن تھی۔ لیکن رات ٹھیکے جھکڑ چلتے رہے۔ اور کچھ بوند باندی بھی ہوئی۔ صبح مطلع بالکل صاف ہو گیا۔ آسمان کی نیلاہٹیں صاف و شفاف ہو گئیں۔ فضا میں لمبی گھٹن ختم ہو گئی۔ مٹی دھول سب دھل گئے اور سورج کی سنہری حریت نے بڑا سکھار پیدا کر دیا۔

نچلی ڈھلان کے دامن میں پھیلے خوبصورت لان میں دو تین سفید کرسیاں بچھیں تھیں۔ مینز پر اخبار اور کچھ غیر ملکی میگزین رکھے تھے۔

والنگ چپٹر پر شائے نیم دراز تھی۔ وہ آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔ اس

نے خوبصورت ادنی لباس پہن رکھا تھا۔ اور اس کے چمکدار ریشمی بال کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں زمکین تصاویر و لایمگزین تھا۔ اس سے پڑے ہٹ کر عثمان گھاس پر لیٹے ہوئے شیریں سے کھیل رہے



بچہ خوب تہقے لگا رہا تھا۔

عثمان بھی اس کے ساتھ شور مچا رہے تھے۔

”شیری — شریر — پارے — جانی —“ وہ ساتھ یہ الفاظ بھی کہہ رہے تھے۔

شیری نے کچھ ہی دیر پہلے دودھ پیا تھا۔ اچھالنے سے معدہ کچھ الٹ پلٹ ہوا پہلے اس کے منہ میں رال ٹپکے۔ پھر اس نے دودھ عثمان کی چھاتی پر الٹ دیا۔

”ارے —“ عثمان نے بچے کو جلدی سے گھاس پر لٹاتے ہوئے کہا۔

”شریر کہیں کے — گندہ کرو یا —“

کھلے گریبان سے عثمان کی بالوں بھری چھاتی جھانک رہی تھی۔ منہ میاں کا الٹا ہوا دودھ چھاتی پر پڑا —

شینور سالہ پھینک کر جلدی سے قریب آئی۔ اور اپنا ننھا سادھی وال عثمان کی چھاتی پر پھیرتے ہوئے دودھ صاف کرنا چاہا — وہ گھٹنے کے بل جھکی تھی۔

عثمان کے منگے سینے سے شینو کے ٹنڈے ہاتھ کی انگلیاں چھوئیں۔ تو انہیں یوں لگا جیسے کئی سو والٹ کرنٹ بدن میں سرایت کر گیا ہو۔ بڑی سختی سے انہوں نے شینو کا ہاتھ پرے جھٹکا۔ ان کے پھرے پر بڑی سختی تھی۔

تھے۔ گرم شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ قمیض کی آستینیں کھلی تھیں۔ اور گریبان کچھ سبب بن بھی کھلے تھے۔

شیری بڑا خوش تھا۔ عثمان اسے گدگداتے تو وہ ہنسنے لگتا عثمان بھی ہنسنے لگتے۔

شینور سالے کی طرف کم ہی متوجہ تھی۔ اس کی توساری ہتی ہمہ توجہ بنی ہوئی تھی۔

عثمان بچے سے کھیل رہے تھے۔ منہں رہے تھے۔ مسکرا رہے تھے۔ لیکن شینو ان کی آنکھوں میں جم جانے والے کرب کو دیکھ کر بے چین ہو رہی تھی۔

عثمان نے لیٹے لیٹے بچے کو اچھالا۔ بچہ کھلکھلا کر منہں پٹا۔ بہت پسند آیا۔ عثمان نے دونوں ہاتھوں پر بچے کو اونچا کیے کہا۔

شیری ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔

”پھر کروں — ہوں —“ عثمان بولے۔

”نہیں — انہوں نے بچے سے کہا — یہیں ٹنگے رہو —“

بچہ اچھالا جانے کے لیے زور زور سے ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ اپنی خواہش پوری کر دانے کے لیے وہ بسورنے لگا۔

اس کی ادا اتنی پیاری تھی۔ کہ عثمان نے اس کے کئی بار پیار لیئے۔ اور پھر بار بار وہاں اچھالنے لگے۔

”اُن۔ کتنی ناگوار بساند ہے۔“ سرینچا کرتے ہوئے عثمان نے اپنی چھاتی  
سو گھننا چاہی۔

”نہالیں۔ اُلٹے ہوئے دودھ کی بساند ایسی ہی ہوتی ہے صاحب  
جی۔“ آیا مسکراتے ہوئے شینو کی طرف دیکھنے لگی۔

پھر

بولی۔ ”ماں اور باپ میں یہی تو فرق ہے۔ عثمان ناک منہ چڑھا سہے تھے۔  
”ماں کے قدموں تلے یونہی تو خبت نہیں ہوتی صاحب جی۔“ آیا  
نے بچے کو کندھے سے لگاٹے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”ماں کو بس ہانڈ نہیں  
آتی۔ چاہئے دودھ لٹے یا گند کرے۔“

”ماں جیسی بھی ہو۔ اس کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔“ عثمان نے  
بڑی آزار دہ آواز میں کہا۔

شینو کے کھلبے میں نشتر اتر گئے۔

”اس کے کپڑے بدل دو آیا۔“ سوٹیر پر بھی دودھ پڑا ہے۔“ جانے  
کے لیے شینو نے اپنے سانسوں کے الجھا دیں کہا۔

”اچھا جی۔“ آیا نے بب سے جڑی صاف کرتے ہوئے وہاں سے جانے  
کو قدم اٹھایا۔ اس کے جانے سے پہلے ہی عثمان لمبے لمبے ڈگ بھرتے چہن  
پار کر کے اندر چلے گئے۔

شینو دل گرفتہ سی نظر آرہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چہن کی  
اترائی اتر گئی۔

شینو کا سارا وجود لرز گیا۔

شیری گھاس پر پھینکے جانے پر ناراضگی سے روتے لگا۔ آیا آواز سن  
کر جھاگی آئی۔

بچے کو اس نے ہاتھوں پر اٹھاتے ہوئے عثمان کی طرف دیکھا۔ جو بچے  
کے دودھ سے چھاتی صاف کر رہے تھے۔

”سخت بدتمیز میں۔“ آیا کے ہاتھوں میں شیری کو دیکھ کر عثمان  
مسکرائے۔ ”گندہ کر دیا مجھے۔ نہانا پڑے گا۔“

”ہائے صاحب جی۔“ آیا بچے کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔  
”کیا ہوا۔ اپنا ہی بچہ ہے نا۔“

”اپنا بچہ ہے تو کیا ہوا۔ اتنی بدتمیزی کی اجازت اسے نہیں دینا  
سکتی۔“

عثمان ہنس رہے تھے۔ کپڑے جھاڑتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھے۔

”اپنی امی پر تو چھوٹے صاحب کئی۔“ آیا نے مسکرا کر  
گھٹنے کے بل جھکی جامد ساکت شینو کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

”جی ہاں۔ اچھی بات ہے۔ یہ شرف شیری صاحب اپنی امی ہی کو  
بخشیں۔“ باز آئے ہم۔ کیوں شائے۔“

شائے جو ذہنی دھچکے پر دھچکے کھا رہی تھی۔ چونکی۔ بات سننے بغیر  
ہی ہنس کر آیا اور بچے کو دیکھتے ہوئے سر اثبات میں ہلادیا۔ ”ہاں۔  
بالکل۔ بالکل۔“

اکیلی ہی ہوتی ہوں۔“  
 ”ڈرتی تھی۔ منسرتیوری جلد ہی بے تکلف ہو گئی۔ تہقہہ لگاتے ہوئے  
 بولی۔ ”جانے آپ کو پسند ہوتا کہ نہیں۔“  
 ”ایسی کوئی بات نہیں۔“ شینو نے مسکرا کر کہا۔ ”ضرور آیا کریں۔“  
 منسرتیوری خاصی باتونی تھی۔ کم تو شینو بھی نہ تھی۔ وہ تو اس کی شخصیت  
 ہی ان دنوں اس قدر الجھ چکی تھی۔ کہ بات کرتے چپ ہو جاتی تھی۔  
 اور چپ رہتے رہتے اچانک ہی بولنا شروع کر دیتی تھی۔  
 منسرتیوری کا یوں آجانا کچھ اچھا ہی تھا۔ گپ شپ میں شینو اپنے  
 بھانک خیالوں سے دوزخ لائی تھی۔

ورنہ

وہ تو ندی کے کنارے پڑے پتھر پر بیٹھی سوچ رہی تھی۔ کہ اپنے آپ  
 وان شوریدہ سرموجوں کے حوالے ہی کیوں نہ کر دے۔

سوچوں میں ڈوبی وہ آگے بڑھتی گئی۔ سامنے والی اونچائی عبور کر  
 کے وہ ایک بڑے سے پتھر پر آن بیٹھی۔  
 یہ پتھر اچھلتی کودتی نہستی مسکراتی رواں دواں ندی کے اونچے کنارے  
 پر پڑا تھا۔

منسرتیوری بائیں ہاتھ کی ترائی میں بنے چھوٹے سے نیگلے میں تھی  
 تھی۔ نشین میں تین ہتے پہلے جو تقریب ہوئی تھی۔ وہ بھی ہمسایہ ہوتے  
 ہوئے مدعو تھی۔ شینو کی ہم عمر ہی تھی۔ دوستی کا ہاتھ بڑھانے کو بڑا جی  
 چاہتا تھا۔ لیکن وہ شینو کے بے پناہ حسن اور امارت سے مرعوب تھی۔  
 چاہنے کے باوجود ہمیشہ نشین میں جانا نہیں ہو سکا تھا۔ اور نہ ہی اپنے گھر  
 کو اس قابل محسوس کرتی کہ کیم فشان کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے سکے۔  
 شینو کو پتھر پر بیٹھے دیکھا۔ تو ایک سلیک کی خواہش پر قابو نہ پا  
 اپنے نیچے غیر سوار راستے پر چڑھتے وہ دہاں آ گئی۔

”ہلو۔“ اس نے بے خبر سی بیٹھی شینو کی پشت پر آتے ہوئے کہا۔  
 شینو نے اپنی خوبصورت گردن کو ہلکا سا خم دے کر پیچھے دیکھا۔ نوح  
 سادہ سی عام شکل و صورت لیکن سمارٹ سی لڑکی کو کھڑے دیکھ کر د  
 اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے منسرتیوری کو پہچانا نہیں۔  
 تعارف کا مرحلہ منسرتیوری نے خود ہی طے کیا۔

”بڑا جی چاہتا تھا آپ سے ملنے کو۔“  
 ”شکر یہ۔“ شینو نے ملائمت سے کہا۔ ”آجایا کریں۔ میں بھی اکٹ

یہ کچھ چیزیں لانا ہیں۔ تھوڑی سی فلائیں چاہیے — اور تھوڑے سے پب بھی لیتے آویں۔

”اچھا۔“

”سیفٹی پن بھی چاہئیں۔“

”فہرست دے دینا لے آؤں گی سب کچھ۔“

”اور — اور —“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”جا کر دیکھ لو — کیا کچھ منگوانا ہے — ساری چیزیں لکھ دینا —

یہ نہ ہو دو چیزیں آجائیں۔ اور چار بھول جائیں۔“

”ٹھیک ہے بیگم صاحبہ جی۔ کھردتی ہوں۔“

”شام کو جائیں گے — اطمینان سے دیکھ لو چیزیں — پھر جو کچھ منگوانا ہو لکھ دینا۔“

”شائے۔“

”جی۔“

”شام بازار جانا ہے۔“

”بازار۔“

”ہاں۔“

”اچھا۔“

”کچھ شوپنگ ہو جائے گی۔“

”کوئی خاص چیز تو نہیں لینا مجھے۔“

”کچھ نہ کچھ خرید لینا۔“

”اچھا۔“ شینو نے بغیر عثمان کو دیکھے سر جھکا کر کہا۔

”بیگم صاحبہ۔“ قریب بیٹھی آیا جلدی سے بولی۔ ”پھوٹے صاحب۔“

”ابھی دیکھتی ہوں۔ پھوٹے صاحب سو رہے ہیں۔ میں فارغ ہی

ہوں۔“ آیا اٹھتے ہوئے بولی۔ اس وقت وہ لاڈلے میں شینو کے پاس

بیٹھی تھی۔ صاحبہ کے موزے بن رہی تھی۔ خانوں کا گھٹانا بڑھانا نہیں

ناتھا۔ وہ اس سے پوچھ پوچھ کر بن رہی تھی۔

عثمان بھی لاڈلے ہی میں بیٹھے تھے۔ کچھ فائل کھول رکھے تھے۔ کام

مصرف تھے۔ کبھی کبھی سراٹھا کر شینو کو دیکھ لیتے تھے۔ شینو کو گرم مٹم

تے ہی وہ غلط کر لیتے تھے۔ ایک آدھ بات کر کے اسے حال کی

یادیں لوٹا لاتے تھے۔ یہ بات وہ دانت کر رہے تھے۔ آیا جو وہاں بیٹھی

تھی۔ شینو کی طرح وہ بھی خلاؤں میں کھوٹے رہتے تو دونوں کی بے تعلقی آیا  
کو ضرور کھٹک جاتی۔

بے تعلقی کو تعلق بنانا معمولی کام نہ تھا۔ آگ کی محرابوں تلے سے اپنے  
آپ کو جلائے بغیر گزارا نہیں جاسکتا۔ کرب اور اذیت کے دار نہیں نہ  
کر سہنا آسان نہیں ہوتا۔ عثمان اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے ہی  
شاید بے تحاشہ سگریٹ پی رہے تھے۔  
"آیا۔" شینو نے جلدی سے کہا۔

"جی۔"

"بیٹھو ابھی۔"

"وہ۔ چیزیں۔"

"میں نے کہا ہے ناشام کو جانا ہے۔ تم یہ روزہ پہلے یہیں بیٹھ کر ختم  
کر لو۔"

"میں سمجھ گئی ہوں جی۔ ختم کر لوں گی۔"

"نہیں۔ پھر خراب کر دو گی۔"

آیا حکم کی تعمیل کے لیے بیٹھ گئی عثمان نے فائل پر جھکے جھکے بڑی گہری  
نظر دے کر شائن کو دیکھا۔ وہ بڑے مضطرب تھے۔ اپنے آپ کو جلدی سے  
انہوں نے فائلوں میں الجھالیا۔ اور بے درغلی سے سگریٹ کے کش لینے لگے  
شائن آیا کو روزے کے متعلق بتانے لگی۔ اس کے بیٹھے سے اسے بڑا  
بھرا دل رہا تھا۔ عثمان نے تنہائی میں سامنا کرنے کی تو اب اس کی بہت ہی نہ

رہی تھی۔ تنہائی اتنی بے رحم، اتنی خاموش اور اتنی بے تعلق ہوتی تھی کہ اس  
کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔

نمنا سا روزہ تھا۔ چند منٹوں میں کیا نے ختم کر لیا۔ نیلی اُون کا گولا اور  
سلائیوں لفافے میں رکھ کر اس نے ننھے سے روزے کو پیار سے چوم لیا۔  
اب میں بہت سارے روزے بنا لوں گی۔  
"ٹوپی بنا بھی سیکھ لو۔"

"سیکھونگی۔" بیکار وقت میں بنائی کیا کر دوں گی۔ سردی بھی تو بہت  
ہے۔ اور صاحب بہادر ان دنوں خیر سے ہاتھ پاؤں بھی خوب چلا رہے  
ہیں۔ کبیل میں لپٹے تو بہتے ہی نہیں۔"

شائن نے اس سے اُون اور سلائیوں لے لیں۔ "لاؤ میں ٹوپی بن لیتی ہوں۔"  
"میں بناؤں گی یکم صاحب جی۔ آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔"  
"بنانے دو آیا۔" عثمان کام کرتے کرتے بولے۔ "بیکار بیٹھی ہیں۔  
یہ کام کوئی مشکل تو نہیں۔"

"مشکل تو نہیں صاحب جی۔"

"اپنے بچے ہی کا بنا رہی ہیں نا۔ کوئی احسان تو ہوتا ہی۔" کئی پر۔  
عثمان مسکرا کر بولے۔ انہوں نے اگلے سگریٹ ہی سے نیا سگریٹ سلگایا۔  
"جی یہ بات تو ہے۔ قسمت دے ہاتھ بچوں کی چیزیں بنائیں۔" آیا  
ہنس کر بولی۔ "میری یکم صاحب تو بہت اونچے نصیب والی ہیں۔ اللہ  
نے بیٹے جیسی نعمت سے گود بھری۔"

اڑا اڑا ویران ویران اور بے سکون تھا۔  
- شائے - عثمان نے کہا۔

جی - وہ نظر لا کر بات نہ کر سکی۔

آج شام شاپنگ کے لیے جانا ہے۔ انہوں نے لمبے میں حکم کارنگ  
بہرتے ہوئے کہا۔

وہ چپ رہی۔ ایوگرین گرم میکسی میں اس کا چہرہ بیمار لگ رہا تھا۔  
عثمان نے پھر نظریں فائل پر جمادیں۔ اور بولے "چابکچے تیار رہنا۔"  
وہ اب بھی کچھ نہ بولی۔ تو عثمان گھمبیر لمبے میں گویا ہوئے۔ میرے بہت  
سے ملنے والوں نے استفسار کیا ہے۔ عارف کہہ رہے تھے۔ کہ اب انہوں  
نے ہم دونوں کو کبھی اکٹھے شہر میں نہیں دیکھا۔  
وہ چپ ہو گئے۔

شائے بے طرح مضطرب ہو گئی۔ اس نے جلدی سے قدم اٹھایا۔

عثمان کی نظریں اسکی پشت پر تھیں۔ ان کی آنکھوں میں سرخی پھیل  
رہی تھی۔ شدید جن کا احساس ہو رہا تھا۔ پوٹوں میں جیسے ریت کا کوئی  
ذره پھنس گیا ہو۔

میں نہیں چاہتا۔ وہ ہنسی ہوئی بے جان سی آواز میں بولے۔ کہ کوئی  
بھی ہمارے متعلق اس قسم کی قیاس آرائیاں کر کے کسی نتیجے پر پہنچے۔ کبھی  
کبھی شاپنگ کے لیے شہر جانا ضروری ہے۔  
اچھا۔ وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

ہاں نگہ صاحبہ تو اونچے نصیب والی ہیں۔ عثمان نے فائل پر کچھ  
لکھتے ہوئے گہری سانس لے کر کہا۔ اللہ نے بیٹے جیسی نعمت سے گود  
بھری ہے۔

جی ہاں۔ آیا سکر لے لگی۔ اور شائے نے بے چین ہو کر ہلو بدلا۔  
آیا ادون اور سلائیاں شائے کو لے کر باقی چیزیں اٹھا کر کمرے سے چلی  
گئی۔ شینو کا چہرہ بے رنگ سا نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں الٹی  
پھری سے ذبح ہونے والے جانور پر بیتنے والی تکلیف نظر آنے لگی تھی۔  
آیا کے جانے کے بعد عثمان پورے انہماک سے اپنا کام کرنے لگے۔  
شائے نے کئی دفعہ چور نظروں سے ان کو دیکھا۔ چند منٹ پہلے آیا اور اس  
سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے والے عثمان جیسے کسی پتھر سے تراشا ہوا بت  
تھے۔ جس کے چہرے پر بے سکونی کرب اور اندرونی کشمکش کے آثار جھمکے  
تھے۔

شائے کو کوئی کام نہیں تھا۔ لیکن وہ وہاں بیٹھ نہ سکی۔ سلائیاں قالین پر  
پڑی رہیں۔ اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

عثمان کی نظریں اس کے قدموں پر تھیں۔

شائے نے جانے کے لیے قدم اٹھایا۔ تو نظریں قدموں سے الٹتی الٹتی  
اس کے پورے سراپا کا جائزہ لیتیں چہرے پر آکر رک گئیں۔

چہرہ!  
جو

شائے نے بھی عثمان کے لیے چند مائیاں ایک جبرسی اور دو قمیضیں پسند کیں۔

سارا سامان سیل میں ان کی کار میں رکھنے گیا تو راحیل نے بڑی گرجوشی سے دونوں کو رخصت کرتے ہوئے کہا - "خدا انظر بد سے بچائے آپ کو۔ اتنا شاندار جوڑا پہلے کبھی نہیں دیکھا، خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ دونوں کی پسند بھی ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے۔"

- شکریہ - شینو نے گھٹ جانے والی آواز میں کہا۔

اور عثمان نے ہنستے ہوئے راحیل کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر بلایا - "بڑے کامیاب وکاندار ہو۔"

- کیوں -

"ایسی ایسی چچی چڑھی باتیں نہ کرو۔ تو تمہارے پاس آئے کون۔"

"یہ بات نہیں نوا بنزادہ صاحب - میں نے حقیقت بیان کی ہے۔ بلاشبہ آپ بہت لگی ہیں - جو بھابی جیسی بیوی ملی -"

"اور بھابی لگی ہیں - کہ مجھ جیسا شوہر ملا۔" عثمان نے قہقہہ لگایا۔

"بالکل بالکل - وہ خلوص سے عثمان کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا -

وکان سے نکلتے ہی دونوں پھر اپنی دنیا میں لوٹ آئے - بے رنگ و بے کیف دنیا میں -

ایا کی دی ہوئی فہرست کے مطابق شائے نے بچے کی چیزیں بھی خریدیں اور چند نرم نرم ربڑ کے خوبصورت کھلونے بھی لیے۔

اور عثمان نے صوفے کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور اپنا سچلا ہونڈا کامراداتوں میں دبایا۔

اٹ زندگی کتنی بے کار - کیسی بے معنی اور بے مقصد ہو چکی تھی! اندھ کے لانتناہی سلسلے تھے۔ کوئی منزل رہی تھی - تجوئے منزل - جھٹکا اور صرف جھٹکا ہی نصیب میں رہ گیا تھا۔

شام سو اچار بجے عثمان شائے کو لے کر شہر چلے گئے۔ دونوں گاڑی پر برابر بیٹھے تھے۔ لیکن گھر سے نکلنے کے بعد دونوں نے ایک بات بھی نہ کی تھی۔

مال کی بہترین دکانوں میں دونوں گھومتے پھرے - راحیل سنز امپورٹ چیزوں کا مرکز تھا - راحیل عثمان کو جاننے والوں میں سے تھا - اس نے عثمان اور شائے کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔

عثمان اور شائے نے بھی اس کے سامنے خوب اداکاری کی - راحیل انہیں اپنا سارا اسٹور دکھایا۔

عثمان نے اپنی دلپسند ریفریجریز شینو کے لیے خریدیں - ساڑھیوں کی گولے ضرورت نہ تھی - پھر بھی عثمان نے اس کے لیے فرنیچر شیفون کی اپنی پسند کی ساڑھیاں لیں - انڈین ریشم اور سلک کی مرثی طرز کی ساڑھیاں بھی عثمان کو بہت پسند تھیں - راحیل کے پاس وہی پیس تھے۔ انہوں نے فریجریے

بازار میں گھومتے پھرتے کئی آشنا چیزوں نے ان کو دیکھا۔ دو تین ملنے والوں سے رسمی سی باتیں بھی ہوئیں —  
اتفاق سے عارف بھی ایک دکان میں مل گئے۔ وہ زبردستی دونوں کو ایک شاندار کیفے میں لے گئے۔

بڑی دلچسپ محفل جی — ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ شائے بھی ساتھ دیتی رہی۔ باتوں کے دوران عارف نے بھی عثمان کی خوش بختی پر تبصرہ کیا۔ شینو کے حسن صورت اور حسن سیرت کی داد دی۔

عثمان کو جب بھی کوئی ایسے الفاظ کہتا۔ تو انہیں یوں لگتا جیسے لوہے کا برآمدل میں تیزی سے گھومتا اتر رہا ہے۔ آنکھوں میں ریت کی چھنی محسوس ہونے لگتی۔ چاروں طرف پھیلے اندھیرے منہ چڑاتے۔ روشنی کا کوئی سراہا ملتا محسوس نہ ہوتا۔

لیکن سب کچھ برداشت کر جاتے۔ مسکراتے، ہنستے اور قہقہے لگاتے۔  
سوائے شائے کے کوئی نہ جان پاتا۔ کہ یہ مسکراہٹ کتنی بے جان ہے  
یہ فیسی کتنی مصنوعی ہے۔

اور

یہ قہقہے کتنے کھوکھلے ہیں۔

شینو تڑپ جاتی — لیکن —

کبھی کبھی زہر بھی تریاق کے طور پر پناہ دیتا ہے نا —

۔ ہلو ۔

۔ ہلو ۔

۔ میں شائے بول رہی ہوں۔

۔ شائے باجی ۔

۔ اذ طریقہ — کیا حال ہے۔ ماں کیسی ہیں ڈیڑھی کیسے ہیں۔ اس دن

انہیں زکام ہو رہا تھا۔

۔ آپ کو کیا۔

۔ کیوں۔

۔ آنا جانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ جیسے عثمان بھائی ہی آپ کے سب کچھ ہیں۔

ہم کچھ لگتے ہی نہیں۔

۔ شریہ۔



ہاں۔

کیوں۔

آنا منع ہے۔

نہیں تو۔

پھر ما۔ ابھی آپ کو دعوت خاص دیتی ہیں۔

ظریفہ۔ کیا پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ بڑی سنی آئی ہوئی ہے۔

ہاں یہ ٹھیک کہا آپ نے۔

اچھا بندہ کہ اپنی بک بک اور ماما کو بلا۔

ماما باورچی خانے میں ہیں۔

تو جان نہیں سکتی وہاں۔

کام کر رہی ہیں۔

اور تو بے کار بچہ رہی ہے۔ کالج نہیں گئی آج۔

لبیعت خراب تھی صبح۔

کیوں کیا ہوا تھا۔

پریشانی تھی۔

کیسی؟

شائندہ باجی۔

ہوں۔

وہ۔ وہ زریں خاں ہیں نا۔

تو اور کیا۔ اتنا نہیں ہوتا۔ کہ روز فون ہی کر لیا کریں۔

تم کو نسا روز کرتی ہو۔

بھائی ہم تو ہوئے غریب آدمی۔ دفتر فون کرنے لگیں تو کب کاڑھ ہی ہو

جانے۔ آپ ٹھہریں یکم نوا بزاوہ عثمان علی خاں۔

چل ہٹ۔ زیادہ باتیں نہ بنا۔ ماما کہاں ہیں۔

گھر میں ہی ہیں۔

بلا ذرا انہیں۔

پہلے مجھ سے تو باتیں کر لیں۔

کر لیں۔

ہائے اللہ قسم شائندہ باجی۔ پیٹ میں مردہ ہو رہا ہے۔ ایک بات

کہنا ہے آپ سے۔

کیا بات ہے۔ کوئی خاص خبری ہے۔

ہاں۔

یعنی۔

یعنی۔ یعنی۔

شائندہ کو بہن کے کھکھلا کر تنہا دینے پر الجھن ہوئی۔ جلدی سے بولا

بتائی کیوں نہیں کیا بات ہے۔

آپ جلدی سے آجائیں۔ بتا دیں گے۔

میں آؤں۔

”ہاں - ہاں ہاں“

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

”بے وقوف“

”باجی - وہ - وہ - بس آپ سمجھ بھی جائیں نا“

”اچھا - یہ بات ہے“

”ہاں - آج وہ شام آرہے ہیں۔“

”وہ اکیلے“

”نہیں - ان کی اماں اور آغا جی“

”اب سمجھی - اسی لیے اتنی مست ہوئی ہے۔“

”ماما نے یہی اطلاع آپ کو دینے کے لیے کہا ہے۔“

”مبارک ہو“

”بھئی بات تو بن جائے پہلے“

”وہ آرہے ہیں تو بن ہی گئی۔“

”آپ ابھی آجائیں۔“

”ہوں۔“

”ہوں کیا - خوشی نہیں ہوئی آپ کو۔“

”کیوں نہیں ظریفہ - تمہاری خوشیاں میری خوشیاں ہیں۔“

”تو پھر یہ آواز کیوں اتنی روئی بنالی“

”خدا کرے جو اس خوشی کے موقع پر میں روئی آواز بنالوں۔“

”پھر کب آرہی ہیں۔“

”ان کے آنے سے پہلے ہی پنج جاؤں گی - فکر نہ کر - سچی بہت خوشی ہوئی ہے۔“

شائندہ اپنے جذبات کا اظہار بڑھ چڑھ کر کرتی رہی - زیریں خاں اس کے ننھیالی دور پار کے عزیزوں میں سے تھے - ظریفہ کے لیے ان کی آنکھوں میں پرستاری کے جذبات شائندہ نے اکثر دیکھے تھے - ظریفہ بھی سن میں انکی مورتی بنائے تھی - لیکن کچھ گھر بلیو تنازعے تھے - جن کی وجہ سے دریں خاں دل کی بات زبان پر نہ لاسکتے تھے - ان کے چچا اپنی بیٹی نوخیزہ کا رشتہ دینے کے خواہش مند تھے - شاید اب یہ بات ختم ہوگئی تھی - یا زیریں خاں نے ہی اپنی بات منوالی تھی - خوشی کی بات تھی -

دو چار ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد شائندہ نے ماما کو بلانے کے لیے کہا -

”ماما آئیں - بڑی محبت اور پیار سے احوال پرسی کی - انہوں نے بھی شائندہ کی لالعلقی کا گلہ کیا - شائندہ نے بھی اپنی غلطی تسلیم کر لی - ماں کی تسلی و تشنی ہنس ہنس کر کی

زیریں خاں کے متعلق بھی ماما سے بات ہوئی - ماما کو تو یہ رشتہ ویسے بھی پسند تھا - کہ زیریں خاں اپنے عزیزوں میں سے تھے -

آج وہ لوگ باقاعدہ رشتہ لینے آرہے تھے - ماما نے پوری تفصیل اسے بتائی -

”تم اور عثمان بھی آجانا۔“  
 ”اچھا ماما۔ میں تو آجاؤں گی۔ عثمان شاید نہ آسکیں۔“  
 ”کیوں۔“

”ان دنوں بہت مصروف ہیں۔“  
 ”خیر ہماری طرف سے کہہ دینا۔ رات کو آسکتے ہیں۔“  
 ”دیکھو گی۔“

پھر اس نے اپنے چھوٹے بھائیوں اور ڈیڈی کے متعلق ماما سے پوچھ کر فون بند کر کے وہ کتنی ہی دیر فون پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی۔  
 عثمان بالکنی میں بیٹھے تھے۔ ابھی ابھی ان کے دوست اٹھ کر گئے تھے۔ ان دوستوں کے ساتھ وہ کافی دیر کپ شپ لگاتے رہے۔  
 تاش کی کئی بانیاں بھی کھیلی تھیں۔ شائے بھی ان کے ساتھ گھنٹہ بھر رہی تھی۔

عثمان کو طریقہ کے رشتے کی بات کہنے کی تو خاص ضرورت نہ تھی ہاں ماما کے گھر جانے کے لیے ان سے پوچھنا ضروری تھا۔  
 جب سے وہ اس خوبصورت سے مغوس گھر میں آئی تھی۔ زندگی خطرناک موڑ لے چکی تھی۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ اپنے آپ کا ہوش نہ رہا تھا۔ کسی کی کیا خبر لیتی۔

ماما نے جب اسے اپنی خوشیوں میں گم ہو کر ہاں باپ بہن بھائیوں کیسر فراموش کر دینے کا مشورہ کر رکھا تھا۔ تو ماما کی آواز میں خوشیوں

کھٹک سے اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔  
 وہ فون پر ہاتھ رکھے سوچوں میں گم تھی۔ کہ عثمان خود ہی گیلے ہو ہیں آگئے۔

”فون تھا؟“

”ہاں۔“

”آپ کا۔“

”ماما کا۔“

”خیریت؟“

”ماما نے آج بلایا ہے۔“

عثمان چپ ہے۔

”طریقہ کے لیے رشتہ آیا ہے۔ ماما نے مجھے اور آپ کو بلایا ہے۔“

عثمان کسی خدشے کو محسوس کر کے چپ ہو گئے تھے۔

شائے چند لمبے اسی انداز میں کھڑی رہی۔ پھر آہستگی سے بولی۔ میں جا سکتی ہوں۔؟“

عثمان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

یہ قہقہہ کسی طور نہیں تھا۔

یوں لگتا تھا۔ چیخ اپنے قدرتی عمل میں ساختہ رکاوٹ آجانے سے

بکھر گئی ہو۔

شائے کو ان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

لسلے میں مجھ سے پوچھنے کی بھی زحمت نہ کیا کریں۔۔۔  
 وہ چند ساتھیوں کے چہرے آہستگی سے بولے۔ آپ اپنی مختار آپ ہیں  
 میری صرف ایک ہی استدعا ہے۔۔۔ اور وہ آپ جانتی ہیں۔۔۔ میری  
 اس استدعا۔۔۔ کا بھرم نہ ٹوٹے۔۔۔

وہ

پھر پہلے سے بھی زیادہ گھٹی ہوئی آواز میں بولے۔ آپ ماما کے  
 ہاں ضرور جائیے۔۔۔ لیکن محتاط رہیے گا۔ ماں کی نگاہوں کو دھوکہ  
 دینا۔۔۔ شاید آپ کے لیے بھی مشکل ہوگا۔ لیکن۔۔۔ آپ کو۔۔۔ آپ کو  
 ایسا کرنا ہوگا۔ کہ ناٹھے گا۔۔۔ شائے۔۔۔ میں نے جس دن بھی محسوس  
 کر لیا۔ کہ لوگوں کی نگاہیں ہمارے موجودہ تعلقات کو بھانپ گئی ہیں۔  
 یقین کر لیں۔ کہ وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔۔۔ زندہ تو میں اب  
 بھی نہیں ہوں۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔

وہ کل کل کر ٹوٹ ٹوٹ کر بول رہے تھے۔  
 شائے کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ نہ چیخ سکتی تھی۔ نہ  
 رپ سکتی تھی۔ چپ چاپ آنسو بہائے جا رہی تھی۔  
 عثمان ٹوٹے بکھرتے پھر بولے۔۔۔ مراد عمل یہاں سے تھوڑے سے  
 صلے پر ہے۔ اتنے تھوڑے صلے پر کہ ہوا کے جھونکے بھی ہمارے لیے  
 خبر دہاں پہنچا سکتے ہیں۔

اور۔۔۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ بعض اوقات آپ بہت۔۔۔ جذباتی

وہ دروازے کے قریب کھڑے تھے۔ دونوں ہاتھ لپٹ پیچھے  
 پکڑ رکھے تھے۔ شوخ رنگ کی قمیض کے ساتھ چیک کوٹ اور  
 تپلون پہنے ہوئے تھے۔ کتنے شاندار لگ رہے تھے۔ کتنے  
 متین۔۔۔ کتنے سنجیدہ۔۔۔ شیون کا دل انہیں جی بھر کر دیکھنے کو ٹپاٹھا  
 لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔

۔۔۔ شائے۔۔۔ وہ چند لمحوں بعد بولے۔

۔۔۔ جی۔۔۔ وہ اپنے ناخن دیکھتے ہوئے بولی۔

۔۔۔ آپ ماما کے گھر جب چاہیں جاسکتی ہیں۔۔۔ وہ گھبرایاؤں میں بولے  
 شائے نے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اور پھر مجرمانہ انداز میں سر جھکا  
 لیا۔

۔۔۔ میں نے آپ کا کوئی حق سلب نہیں کیا۔ شائے آپ جب اور جانا  
 چاہیں جاسکتی ہیں۔۔۔

۔۔۔ مانی۔۔۔ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ عثمان مضطرب ہو  
 جلدی سے اپنے قدموں پر گھوم پر لپٹ شائے کی طرف کرتے ہوئے  
 بولے۔۔۔ بہتر ہوگا۔ آپ مجھے میرے نام سے پکارا کریں۔۔۔  
 فرط غم سے شائے نے اپنی انگلی دانتوں میں دباکر پھٹنے والی چم  
 کو روک لیا۔ اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ آئی۔

چند لمحوں بعد بولے۔ آپ جب بھی جانا چاہتی ہیں چلی جائیں۔ آئندہ  
 پھر عثمان بولے۔ آپ جب بھی جانا چاہتی ہیں چلی جائیں۔ آئندہ

ہو جاتی ہیں۔ اس طرح۔ میری استدعا۔ کا بھرم ٹوٹ بھی سکتا ہے۔  
 — مراد فعل کے کسی ایک فرد کو بھی معلوم ہو گیا۔ تو۔ تو۔  
 شائے زار زار رو رہی تھی عثمان جانتے تھے۔ لیکن یہ سب باتیں  
 کہنا بہت ضروری تھا۔ ادھوری بات چھوڑ کر وہ چند لمحے چپ  
 رہے۔ پھر آنکھیں بند کر کے سر قدر سے پیچھے لے جاتے ہوئے بولے  
 — آپ مجھے شاید خود غرض سمجھتی ہوں۔ لیکن شائے — میں آپ کو  
 — اس غدا ب — میں سے جتنی جلدی ممکن ہو سکا نکالنے کی کوشش  
 کروں گا۔

شائے بچکیوں سے رونے لگی۔

عثمان کا سانس جیسے ٹوٹ رہا تھا۔ سینے میں درد ہو رہا تھا۔ گلے  
 پھندہ سا پڑ رہا تھا۔ بے آواز سی سسکیاں سینے میں دم توڑ رہی تھیں  
 — آپ ماما کے ہاں چلی جائیں۔ وہ قدر سے منہ بھل کر بدلے کو  
 کروں گا رات کو میں بھی پیچ جاؤں۔ آپ ڈرائیور کے ساتھ چلی جا  
 شیریں اور آیا کو بھی لے جائیں۔ شاید ماما دو چار دن آپ کو روکنا چاہے  
 عثمان تیزی سے — بے لے دگ بھرتے برآمدے سے ہوا  
 لائبریری میں چلے گئے۔

جب سے کراچی سے نصیر کا فون آیا تھا۔ عثمان پریشان نظر آرہے  
 تھے۔ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ کہ کیا کریں۔ کوئی بہانہ بنالیں۔ یا کچھ اور  
 کریں۔ بہانہ بنانا موزوں نہیں تھا۔ نہ ہی ان کی مہمان نواز طبیعت انہیں ایسا  
 کرنے دیتی۔ پریشانی ہی تھی کہ کیا کریں۔

نصیر علی خاں ان کی سوتیلی امی عشرت بانو کے رشتہ کے پیچھے تھے۔ عثمان  
 کے اس ناطے سے تو نہیں۔ ہاں بھگڑی دوست تھے۔ یو کے میں تین سال  
 دونوں نے اکٹھے تعلیمی مارچ طے کرنے گزارے تھے۔ بہت پیارے بہت  
 نفیس طبع انسان تھے۔ ہر وقت ہنسنا ہنسانا ان کا عام مشغلہ تھا۔ پچھلے سال شادی  
 ہوئی تھی۔ اور اب اک سرور زندگی گزار رہے تھے۔

نصیر نے فون پر اطلاع دی تھی کہ وہ چند دن عثمان کے ساتھ گزارنا چاہتے

ہیں۔ ان کی بیوی نے یہ پروگرام بنایا ہے۔

پروگرام صرف ان دو میاں بیوی تک ہی محدود نہیں تھا۔ بلکہ ان کے تین اور مشترکہ دوست مع اپنی بیگمات آرہے تھے۔ نصیر نے کہا تھا کہ دو کراچی کی شینی زندگی سے اکٹا گئے ہیں۔ چند دن دوست مل کر عثمان کے گوشہ سکون و عافیت میں ہلڑ بازی کرنا چاہتے ہیں۔

عثمان جیسے دوست نواز شخص کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کا مقام اور کیا ہو سکتا تھا۔ چند دن چھوڑ وہ لوگ مہینوں بھی ان کے پاس رہتے۔ تو ان کو گراں نہ گذرتا۔ دوستوں کی صحبت تو ان کی کمزوری تھی۔

لیکن

پریشانی تو اپنے حالات کی تھی۔ اتنے گھاگ قسم کے بے تکلف دوستوں سے کچھ چھپا نا شکل ہو گیا تو کیا ہوگا۔ آٹھ دس دن کے قیام میں کسی وقت بھی چہروں سے بناوٹ کے نقاب کھسک گئے۔ تو کیا بنے گا۔ نصیر کی عادت سے وہ بخوبی واقف تھے۔ وہ تو ادھار رکھنے کے عادی ہی نہ تھے۔ جو بات ہوتی منہ پر مار دیتے تھے۔

پھر۔

اصلی خطرہ تو نصیر ہی کی طرف سے تھا۔ وہ عشرت بانو کے عزیز تھے۔ انہوں نے کچھ دیکھا، سنایا محسوس کیا۔ تو بات عشرت بانو تک بھی جا پہنچے گی۔ اور یہ بات ان کی خود داری، ان کی انا اور عزت نفس کے لیے ایسا زہر ہوگی۔ جو لمبے لمبے کی موت طاری کرتا ہے۔

اپنے گھر کی جوشا ناز تقریب عثمان نے کی تھی۔ اس میں مراد محل کے مہمانوں کو بھی دعوت دی تھی۔ اباحضور تو خیر طبعی رضا مند ہو گئے تھے۔ عشرت بانو ان کی دونوں بیٹیوں سائبرہ اور فاخرہ کو مدعو کرنے کے لیے عثمان کو بہت نیچے تک جھکانا بھی پڑا تھا۔ لیکن وہ ان لوگوں کو مدعو کر کے رہے تھے۔ اپنی بیوی۔ اپنے گھر اور اپنے حلقہ اجاب سے متعارف کرنا کے انہوں نے عشرت بانو اور اباحضور کی ساری باتوں کا عملی جواب دیا تھا۔

لیکن اب معاملہ اور تھا۔ ان کی خوشیوں پر ٹوٹ ٹوٹ پڑنے والی برقی کاکسی کو علم نہ تھا۔ سارے دکھ وہ اپنی جان پر پھیل رہے تھے۔ شائد بھی ان کے بھرم کے اعتماد کو نبھائے جا رہی تھی۔ اب ڈر تھا۔ کہ نصیر یہاں ہے تو بھانپ جائیں گے۔ عشرت بانو بھی آگاہ ہو گئیں تو کیا ہوگا۔؟؟؟

پریشانی سے زیادہ عثمان کے ذہن میں خوف پیدا ہو رہا تھا۔ جوں جوں ان کے آنے کے دن قریب آرہے تھے۔ یہ خوف بڑھ رہا تھا۔ شائد ان کی پریشانی دنوں سے محسوس کر رہی تھی۔ اسے دھڑکا سا لگا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا۔ جیسے کسی ناظم پر پٹھی ہے۔ جو وقت آنے پر پھٹ جائے گا۔ اور اس کی ساری سہی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گی۔ وہ مانی کی پریشانی سے بجز اس کے اور کیا سمجھ سکتی تھی۔ کہ اس ایسے سے کوئی تیسرا فرد بھی آگاہ ہو چکا ہے۔ جو ان دونوں کے درمیان کسی مقدس لڑکی کی طرح

جغم بے چکا تھا۔

اس نے کئی دفعہ عثمان سے پوچھنا چاہا — لیکن جرات نہ کر سکی۔ سب کے سامنے راز کی بات پوچھی نہ جاسکتی تھی۔

اور تنہائی میں دونوں کی زبانوں پر تالے پڑ جاتے تھے۔ اجنبیت کی آہنی دیوار درمیان میں آجاتی تھی جسے پار کرنا شائے کے بس میں نہ ہوتا تھا۔

شائے سوچ سوچ کر بھی پریشانی کی وجہ نہ جان پائی — خود ہی دلائل دیتی اور پھر خود ہی انہیں کاٹ دیتی۔

تیسرے فرد کے علم میں آنے کی بات کو بھی اس کی سوچوں نے رد کر دیا۔ اگر ایسا ہو گیا ہوتا — تو یقیناً ٹائم بم بھٹ چکا ہوتا — تو

پھر

سوچوں کے الجھاؤ سلیف میں نہ آتے تھے۔

اس رات وہ اپنی خوابگاہ میں جانے سے پہلے شیریں کے کمرے پر کافی دیر بیٹھی رہی۔ شیریں کو کھلاتی رہی اور جب وہ سو گیا۔ تو اسے گود پر لیے اس کے پیارے پیارے سیب ایسے گالوں پر پیار کرتی رہی — اس کے بالوں کو چومتی رہی۔ اس کی سیاہ عثمان سے مشابہت رکھنے والی خوبصورت آنکھوں پر مونٹ پھرتی رہی —

آیا نے شیریں کے بے آرام ہونے کے خیال سے بچے کو کاٹ میں ڈال دیا۔ تو وہ کمرے سے نکل آئی۔

مہمان خانے کے جن کمرے میں ان دنوں عثمان سوتے تھے۔ وہ دائیں ہاتھ پہلے گھماؤ پر تھا۔ بیدیاں روشن تھیں۔ شیشے کی دیوار کے سامنے بھاری پردے تھے ہوئے تھے۔ پرلی کھڑکی کا پردہ بھی گر لایا ہوا تھا۔

شائے کی لمحے حسرت بھری نظروں سے اس کمرے کو دیکھتی رہی۔ جو ان دنوں عثمان کی خواب گاہ کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ اسے یہ کمرہ موٹی موٹی آہنی سلاخوں والا قید خانہ معلوم ہو رہا تھا۔

قید خانہ

جس میں

عثمان ناکردہ گناہوں کی سزا پا رہے تھے۔

بے خیالی ہی میں وہ چلتے چلتے اس کمرے کے پاس پہنچ گئی۔ اس کی خوابگاہ کو بھی اس طرف سے راستہ جاتا تھا۔ لمبا بزمہ ہی تو درمیان میں تھا — اس کے قدم ہولے ہولے اٹھ رہے تھے۔ سفید لمبے اور گھیر دار ریشمی لباس میں وہ کوئی پراسرار سی روح لگ رہی تھی۔ اس نے کندھوں پر اک سبک سا ستول ڈال رکھا تھا۔

شیشے کی دیوار سے آگے سے وہ تیزی سے گزری۔ لیکن ڈھلانی چھت والے بزمہ سے میں کھٹنے والی کھڑکی کے قریب اس کے قدموں کی رفتار

ہو گئی۔ برابر ہی دروازہ تھا۔ جو آدھا کھلا تھا۔

اس کے اور عثمان کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ اک بار تو اس کے جہی میں آئی کہ آنکھیں بند کر کے آگ کے اس دریا کو پھاندا جائے۔ عثمان کے قریب پہنچ جائے۔ اور ان کی دونوں کی پریشانی کے متعلق بنے نکلنے سے پوچھے۔

وہ چند لمبے شش در پنج کے عالم میں دروازے کے قریب کھڑی رہی۔ عثمان اندر ہی تھے۔

فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔

شائے نے سنا۔ وہ کہہ رہے تھے۔۔۔ ہو گئی سب سے بات۔ ہاں ہاں۔۔۔ بھی تکلف کی کوئی بات ہی نہیں۔۔۔۔۔ تم لوگوں کے آنے سے مجھے اور شائے کو دلی خوشی ہو گئی۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ تم اس سے ملو گے۔۔۔۔۔ تو جان جاؤ گے بے شک۔۔۔۔۔ بے شک۔۔۔۔۔ اس کی اچھائی تم آؤ گے تو خود ہی دیکھ لو گے۔ وہ کیلے بور ہوتی رہتی تھی۔ بہت خوش ہے تم سب لوگوں کے آنے کی خبر ہے۔ ہوں۔ ہوں۔ ادا کے۔۔۔۔۔ ٹھیک۔۔۔۔۔ پانچ بجے بروز بدھ۔۔۔۔۔ ادا کے پہنچ جائیں گے تمہیں لینے۔۔۔۔۔ فلائیٹ کا دیے میں پھر تپ کر لوں گا۔۔۔۔۔ بس ٹھیک۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔۔۔ شائے نے ادا کھلے پٹ سے دیکھا۔ عثمان پلنگ پر لیٹے فون کر رہے تھے۔ فون واپس رکھتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھے۔ اتنے مضطرب تھے کہ

شائے کا دل کٹ گیا۔ انہوں نے بیڈ کی پی پر بیٹھے بیٹھے کہنیاں گھنوں تک اٹھا کر ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔۔۔۔۔ یقیناً وہ بہت پریشان تھے۔

اور

پریشانی کی وجہ کچھ لوگوں کی آمد تھی۔

شینو سوچتے ہوئے ہوئے قدم اٹھاتی لمبا بزمہ عبور کرنے لگی۔ خواب گاہ میں آتے ہی اس نے کندھوں سے سٹول اتار کر کرسی پر بھینک دیا۔۔۔۔۔ ساری تیاں روشن کر دیں۔۔۔۔۔ اور ایک طرف رکھا ہوا ریڈیو گرام آن کر دیا۔۔۔۔۔ کوئی انگریزی دھن بجنے لگی۔ دھن بڑی سوگوار تھی۔ البم کراس نے بند کر دی۔۔۔۔۔ پھر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

لباس تبدیل کر کے اس نے سفید نائیٹی پہنی۔۔۔۔۔ بالوں میں برش کیا۔ اور خواب گاہ میں آ گئی۔

وہ بیڈ تک پہنچے پہنچے نہ پائی تھی۔ کہ عثمان اندر آ گئے۔

پلنگ کے دوسری طرف کھڑے کھڑے شائے نے ان کی طرف دیکھا۔ نیلے دھاری دار گاؤن میں وہ سامنے ہی کھڑے تھے۔ آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے بڑے نمایاں تھے۔ اور بال کچھ بے ترتیب سے تھے۔ سگریٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔

وہ کچھ جھکے

پھر



بولے  
شائے — میرے کچھ مہان آرہے ہیں۔  
جی۔

نصیر میرے بڑے بے تکلف دوست ہیں۔ ان کی بیگم بھی ساتھ  
ہوں گے۔ نصیر عزت آتی کے عزیزوں میں سے ہیں۔  
عثمان نے جیلے کے آخری حصے پر خاص زور دے کر کہا۔  
شینو حیران حیران کھڑی رہی۔

نصیر کے علاوہ تین اور دوست بھی مع اپنی بیگمات کے آرہے ہیں۔  
اچھا۔

عثمان نے آہستہ آہستہ نگاہیں اٹھا کر شینو کو دیکھا۔ پھر بڑے ٹھہرے  
ہوئے لہجے میں بولے۔ یہ لوگ سات آٹھ دن یہاں قیام کریں گے۔  
شینو نے عثمان کی نگاہوں سے ایک لمحہ کو نگاہیں ملائیں۔ پھر سر جھکا۔  
ہوئے بولی: شاید آپ اسی لیے۔ اتنے پریشان ہیں۔  
ہاں۔ وہ تیزی سے کہتے ہوئے رخ موڑ کر کھڑے ہو گئے۔  
آپ۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

میں بہت پریشان ہوں۔ یہ سب۔ سب میرے بے تکلف دوست  
میں سے ہیں۔ اور۔ اور۔ سات آٹھ دن قیام۔  
انہوں نے سر جھکا تے ہوئے سگریٹ پوڑی انگلیوں سے اپنے ماتھے کو  
دبا یا۔

میں سمجھتی ہوں۔ مریلی سی آواز میں شائے نے کہا۔  
عثمان نے ایک دم گردن گھما کر اسے دیکھا۔

وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے آہنگی سے بولی۔ میں آپ کی پریشانی  
کم کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔  
عثمان نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔  
کیا یقین کر لوں۔

کبھی کبھی موجوں میں بہا رہی لینا پڑتا ہے۔  
طوفانوں میں کنارے بھی ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔

شائے نے جھکا ہوا سر اثبات میں ہلایا۔

شکریہ۔ عثمان نے کہا اور تیزی سے خواب گاہ سے چلے گئے۔

شائے کو خواب گاہ کی ساری روشن تہیوں کے باوجود یوں لگا جیسے  
ایکا ایکی ظلمتوں کی بلخار ہو گئی ہو۔ چاروں اور دبیز اندھیرے پھیل گئے  
ہوں۔ اور تاریکی اتنی شدید ہو۔ کہ اسے اپنے وجود کا بھی سراغ نہ  
مل سکتا ہو۔

دکھوں کا تجربہ کرنے اور اپنی محرومیوں کو جانپننے کا بہت کم وقت ملتا تھا۔ عثمان اس کی مصروفیتوں کا برابر جائزہ لے رہے تھے۔ اور جتنا اسے کام میں مستعدی سے منہمک دیکھتے اپنی بزنس کا احساس زیادہ ہی جاگنے لگتا۔ وہ کچھ اور دکھی ہو جاتے۔

بدھ کی صبح شائے ہر طرف سے مطن ہو چکی تھی۔ شام پانچ بجے مہمانوں کی آمد تھی۔ اس نے ساری تیاریوں کے متعلق عثمان کو بھی بتانا تھا۔ کہیں کوئی کمی رہ گئی ہو۔ تو وہ پورا کر سکتے تھے۔

گیارہ بج رہے تھے۔ نہادھو کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ بال ڈرائیو سے سکھائے۔ انہیں بل دے کر جوڑے کی صورت میں باندھا۔ سادہ سی فیروزی ساڑھی پر کالا پل اور پہنا اور ہاتھ میں فہرست لیے باہر آگئی۔ عثمان فضل دین سے کچھ کہہ رہے تھے۔

بگم صاحبہ نے سب کچھ بتا دیا ہے نوابزادہ صاحب۔ آپ بالکل مطن رہیں۔

کیا بتا دیا ہے۔ عثمان بولے تو شیوہ دو قدم اٹھا کر ان کے برابر آکر بولی۔

سارا کام ہو گیا ہے۔ آپ ایک نظر کرے دیکھنا پسند کریں گے۔ چلیے۔ عثمان نے قدم اٹھایا۔

دونوں ساتھ ساتھ چلتے لان عبور کر کے مہمانوں کی خواہنگاہوں کی طرف آگئے۔ جامو۔ حاکم۔ رحمت اور یوسف چاروں ملزم

شائے دوسرے دن ہی مہمانوں کے لیے خواہنگاہیں ٹھیک کر دوانے میں مصروف ہو گئی۔ چار جوڑے آرہے تھے۔ چاروں کے لیے کمرے اس نے آمنے سامنے والے ٹھیک کر دوائے۔ ضرورت کی ہر چیز دیاں رکھی۔ کمرے ایرکٹڈ لائنڈ تھے۔ پھر بھی سردی کے پیش نظر وہاں کے ساز و سامان اور دوسری چیزوں میں رد و بدل کیا۔ ہر کمرے کے لیے ایک ایک نوکر کی ڈیوٹی لگائی۔

پھر اس نے سات دن کے سارے پروگرام ترتیب دیئے۔ یہ پروگرام ترتیب دینے میں اس نے تفریح کا بطور خاص خیال رکھا۔ دو دن کپکنوں کے لیے مخصوص کیئے۔ تین دن شہر کے اونچے ہوٹلوں میں دینے کا اہتمام کیا۔ کلب میں موسیقی کی فضل جمانے کا بھی پروگرام ترتیب کیا۔

مصروفیت نے اس پر کچھ اچھا ہی اثر ڈالا تھا۔ اپنے متعلق سوچنے اپنے

شاید اس قدر مہارت اور سلیقے پر وہ شائے کو بازوؤں میں بھر کر اتنا پیار کرتے اتنا پیار کرتے کہ وہ چیخ اٹھتی۔

”بہت اچھا ہے“ عثمان ٹوٹ رہے تھے۔ انہوں نے کاغذ شائے کی طرف بڑھادیا۔

”گانے کے لیے آپ کے دعوت دینا پسند کریں گے“ شائے نے بھی بکھی آواز میں کہا۔

”جو آپ کو پسند ہو۔ بالائیں۔“ عثمان نے دوسرا سگریٹ ملگاتے ہوئے کہا۔

”اور کچھ۔؟“ شائے نے کاغذ کا سر امر دڑتے ہوئے پوچھا۔

”جو مناسب سمجھیں کر لیں۔“ عثمان کسی میں قدرے دراز ہوتے ہوئے بے تعلقی سے بولے۔ ”سب ٹھیک ہے۔“

”ہوں۔“ شائے سوئمگ پول کے کنارے کھلتے ٹوکروں کے پلوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

چند لمبے بالکل خاموش رہی۔ پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”پلین پانچ بجے آتا ہے؟“

”ہاں۔ شاید!۔“ فون کر کے پتہ کر لیں۔“ عثمان دکھے جا رہے تھے۔

شائے نے جانے کے لیے قدم اٹھائے۔ وہ پوری طرح مڑ بھی نہ اٹی تھی۔ کہ عثمان آہنگی سے بولے۔ ”خدا یا۔ یہ دلی خیریت سے گزر جائیں۔“

بیرون برآمدے میں کھڑے تھے۔ صاحب اور بیگم صاحبہ کو دیکھا تو مادرِ سہو گئے۔

شائے نے چاروں کمرے اور ان پر چاروں ملازموں کی ڈیوٹی کا عثمان کو بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“ شائے نے آہنگی سے پوچھا۔

”ہیں۔ بالکل۔“ عثمان جانے کن سوچوں میں تھے چونک گئے۔ شائے نے چند لمبے رک کر ملازموں کو چھوٹی چھوٹی ہدایات دیں۔

عثمان اس کا انتظار کیے بغیر دھیرے دھیرے چلتے سامنے والی بالکنی کی طرف بڑھ گئے۔ بالکنی میں کرسیاں بھی تھیں۔ اور تازہ دم دھوپ سفید بالکنی کو چمکارتی تھی۔ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ سگریٹ ملگایا اور کش پکش لینے لگے۔

شائے بھی ادھر ہی آگئی۔ ابھی دوسرے پردہ گر امول کے متعلق بھی عثمان کو بتانا تھا۔

دائیں ہاتھ پڑی کرسی پر وہ بیٹھ گئی۔ ہاتھ میں پکڑا کاغذ اس نے ساتھ رکھی میز پر رکھ دیا۔

”ہوں۔ سب ٹھیک ہے۔“ عثمان سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال رہے تھے۔

”یہ پردہ گرام۔“ شائے نے کاغذ ان کی طرف بڑھادیا۔

عثمان کی نظریں سطور پر رہیں گے۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو

شانہ تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔

شام ساڑھے چار شانہ تیار ہو کر کمرے سے باہر آئی۔ اس نے بڑا اہتمام سے تیاری کی تھی۔ خوبصورت سلک کی لال بارڈروں والی نیوی بلو ساڑھی پارسی طرز سے باندھی تھی۔ بالوں کا جوڑا بھی ساڑھی سائل کی مناسبت سے بنایا تھا۔ بناؤنگھاڑنے اس کے حسن کو تاننا بنادیا تھا۔ اتنا تاننا کہ نظریں ہلکی جاتی تھیں۔

آیائے تو دیکھ کر نظر اتارنے کا کہا۔ جمعدارنی نے تو جھبک کر اس کے قدموں کی خاک بھی اٹھالی۔ آگ میں ڈالوں گی۔ نظر نہ لگے گی۔

”بے وقوف۔ شانہ منہس پڑی۔

”چلنا نہیں۔“ عثمان گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ کوٹ کی آہٹا کر گھڑی دیکھ کر بولے۔

”صاحب جی کی بھی نظر اتاروں گی۔ چھپا جمعدارنی نہ کہے۔

”مار کھائے گی۔ شانہ نے منہس کر کہا۔ وہ یقیناً کہتے ان با

”میں۔“

”نہ رکھیں۔ میں تو اتاروں گی۔“

”کیا بات ہے۔“ عثمان ان کے قریب آگئے۔

”صاحب جی آپ دونوں کی نظر اتارنی ہے۔ ماشاء اللہ لاکھوڑا ایک جوڑی ہے۔“ آیائے عثمان اور شانہ کو دیکھ کر کہا۔ اور چھپ جھک کر عثمان کے قدموں کی خاک اٹھالی۔

”پگلی۔ شانہ نے کہا۔ بس کام ٹھیک ٹھیک کرنا۔ مہمان شکایت نہ کریں۔ کوئی۔“

”بے فکر رہیے جی۔“ میں آتماں چا چا اور اینڈرو۔ چار بندے ہیں ٹھیک کیوں نہ ہوگا۔“ یہ نظر اتارنے والی بات تو الگ ہوئی نا۔

”چل جا۔“ شانہ نے مسکرا کر کہا۔ اور پھر گاڑی کی طرف جانے لگی۔ عثمان بھی ساتھ ساتھ آئے۔ دوسری طرف کا دروازہ شانہ کے لیے کھول کر اپنا دروازہ بند کر لیا۔

”دوسری گاڑی بھجوا دی؟“ شانہ نے پوچھا۔

”ہاں راشد جا چکا ہے۔“ عثمان گاڑی کی چابی گھاتے ہوئے بولے۔

جمعدارنی اور آیائی باتیں ان کے ذہن میں بھل چا رہی تھیں۔ کیا ابھی نظر لگنا باقی تھی؟

اپنی سوچوں کو انہوں نے اپنے تک ہی محدود رکھا۔ اور خاموشی سے گاڑی چلانے لگے۔

ہوائی اڈے تک دونوں نے ایک بات نہیں کی۔ شانہ شاید مصروفیت کے دنوں میں معاملے کی سنگینی کو کچھ کچھ فراموش کر چکی تھی۔ لیکن گاڑی میں عثمان کے پہلو میں چپ چاپ بیٹھے اسے احساس ہو رہا تھا۔ کہ درمیان میں شرک آنے والی چٹانیں پوری طرح جھمکے بنا بھی ہیں۔ اس تلخ احساس کے باوجود اس نے اپنا موڈ خوشگوار رکھنے کی پوری کوشش کی۔

اتنے دوستوں کا کافی دیر کے بعد ملنا بھی خوب تھا۔ اتنے تپاک اتنے

زور و شور اور ایسی ہلڑ بازی سے ملے کہ ارد گرد کھڑے اور آنے جانے والوں کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔

نصیر کی دھان پان سی بیگم فاربیہ بڑی سمارٹ تھی۔ قوی ہیکل انوار کی ہر اس کے برابر ہی کا جوڑ تھی۔ اونچے قد کی بھاری بھر کم عورت نے ڈائینگ کر کر کے اپنا ناس مار لیا تھا۔ لیکن ڈائینگ سے جتنا وزن کم کرتی تھی بے تحاشا سننے سے آنا ہی چڑھ جاتا تھا۔ دونوں میاں بیوی خوار باش تھے۔ آصف نور تو با توئی تھے۔ بیگم البتہ خاموش طبع تھیں۔ بڑے بڑے مذاق پر بھی دھیرے سے مسکاتے کی عادی تھیں۔ نوخو بصورت تو نہ تھیں ہاں سمارٹ بہت تھیں۔

بختیار اور ان کی بیوی شیماد دونوں ہی خوش خلق تھے۔ بختیار خود بھی نوا خوبصورت تھے۔ شیماد ان کی زنجیت رکھتی تھیں۔ لیکن بے حد پرکشش تھیں انہیں ننھے ننھے قہقہے بکھیرنے کی اتنی عادت تھی۔ کہ بعض اوقات سنجیدہ بات پر بھی قہقہہ لگادیتیں۔ چاہے بعد میں معذرت ہی کیوں نہ کرنا پڑتی۔ دوستوں کا ملنا ملنا ختم ہوا۔ تو بیویوں کے تعارف کی طرف دھیان

دیا۔

نصیر نے فاربیہ کا تعارف شائے سے کر دانا چاہا۔ تو شائے ہنس کر دوا "شکریہ۔ زنجیت ہی کریں۔ ہمارا سب کا تعارف ہو چکا۔ ہاں آپ لوگ ابھی تک میرے لیے انجان ہیں۔"

شائے کی بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔

نصیر نے چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے سر کو خم کیا۔ بندے کو نصیر کہتے ہیں۔ رشتے میں آپ کا دیور جیہہ قسم کی کوئی چیز ہوگی۔ آپ کی شادی خانہ آبادی میں شریک نہ ہو سکا تھا۔ کہ مردود نے بلایا ہی نہ تھا۔ نصیر نے عثمان کے پہلو میں مٹکا کھبوا دیا۔

"شائے۔ یہ ان دنوں امریکہ میں تھے۔ عثمان نے نوک جھونک کے لیے فاربیہ کی طرف دیکھا اور بولے۔ بھابی معذرت کے ساتھ۔ یہ جناب ان دنوں امریکی تیلیاں پچڑتے پھر رہے تھے۔"

"ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ انوار نے نصیر کے کندھے پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔ کوشش ہم کرتے رہے۔ ہاتھ یہ صاحب مار گئے۔ نصیر نے عثمان کی طرف اٹکی سے اشارہ کیا۔

"میں کیسے؟" عثمان بولے۔

"ایسے کہ۔ نصیر شوخ نظروں سے شائے کو دیکھ کر بولے۔ بھابی جیسی نایاب شے لے اڑے۔"

"نایاب تو بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ بختیار نے تحمین بھری نظروں سے شائے کو دیکھا۔

عثمان نے اب چوری نگاہ شائے پر ڈالی تھی۔ اسے ہنستے دیکھ کر وہ بہ مطمئن ہو کر منہی مذاق میں شریک ہو گئے۔

شائے کے حسن و جمال کی تعریف مرد و مرد عورتیں بھی کر رہی تھیں۔

"انشاء اللہ۔ صورت کے ساتھ سیرت بھی اتنی ہی خوبصورت ہے۔"

آصف نے کہا۔  
- اکھاری کی بھی حد ہو گئی۔ نصیر نہیں کر بولے۔  
- کیوں جی۔ شیمانے پوچھا  
- بھی اتنی تعریفیں نہ کرو۔ نصیر نے ہاتھ اٹھا کر جیسے سب کو منع کیا۔

- کیوں۔ تقریباً سبھی بولے۔  
- میں جانتا ہوں تم تعریفیں کیوں کر رہے ہو۔ نصیر نے کہا۔  
- کیوں۔ پھر مشترکہ سا سوال تھا۔  
- چالوسی۔ تم ان کے گھر ہونے آئے ہونا۔ نصیر نے  
- سب نے شور مچا دیا۔ چالوسی کی کیا ضرورت ہے۔ مہمان آئے  
- ہیں۔ مہمان بن کر ٹھاٹھ سے رہیں گے۔ شائستہ کی تعریف تو اس لیے کر  
- رہے ہیں۔ کہ ہیں ہی تعریف کے قابل۔

- منہی مذاق ہوتا رہا۔ شائستہ نے واقعی سب کو اپنے ساحرانہ حسن سے  
- بہت متاثر کیا تھا۔ عثمان بھی خوبصورت شوخ رنگ کا لباس پہنے تھے۔  
- دونوں مفرد سے نظر آ رہے تھے۔  
- منفرد اور متنازع۔  
- یہ قافلہ دو گاڑیوں میں بشکل سمایا۔ سب کے ساتھ سامان بھی تھا اس  
- لیے ایک ٹیکسی لی گئی۔  
- چلو دوسری گاڑی تم ڈرائیو کرو۔ عثمان نے نصیر سے کہا۔

- کیوں بھئی۔ آتے ہی بیکار یعنی شروع کر دی۔ وہ سیٹ پر بیٹھے ہوئے  
- بولے۔  
- تو کیا تم واقعی صرف مہمان بننا چاہ رہے ہو۔ عثمان نے مسکراتے  
- ہوئے کہا۔  
- لاؤ میں ڈرائیو کر لیتا ہوں۔ آصف نے کہا۔  
- نہیں جی۔ یہی لے جائیں گے۔ عثمان بولے۔ ڈرائیو ٹیکسی میں سامان  
- لے جا رہا ہے۔  
- ایک شرط پر ڈرائیو کروں گا۔ نصیر نے شوخ نظروں سے عثمان کو دیکھا۔  
- کیا۔ عثمان بولے۔  
- تمہاری بیوی میرے ساتھ بیٹھے گی۔ وہ شوخ ہوئے جا رہے تھے۔  
- سب ان کے گرد کھڑے نہیں رہے تھے۔  
- منظور؟۔ نصیر نے پوچھا۔  
- کیوں شرماتے ہو یا ر۔ انوار بولے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ کہ۔  
- کہ۔ کیا؟۔ نصیر نے ان کی طرف مڑ کر پوچھا۔  
- پہلے عورتیں ننگور خدا کی قدرت۔ آصف نے ترنم سے کہا۔  
- سب کا مشترکہ قہقہہ پیمیزی کی حد تک فلک شکاف تھا۔  
- بھئی۔ باقی آئندہ۔ اب گھر چلو۔ بختیار بولے۔  
- لوگ ہمیں پاگل سمجھ رہے ہیں۔ صنم نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔  
- کوئی شک ہے کیا۔ فارہ بولی۔

میں فاریہ بھابی کو لے اڑوں۔ عثمان نے بھی شوخی سے کہا۔  
 وہ اڑے۔ نصیر قہقہہ لگا کر بولے۔ ایک نہیں دس فاریہ لے جاؤ  
 ان کے بدلے۔

فاریہ نے اک گھورتی ہوئی نگاہ نصیر پر ڈالی۔ جوان پر پنیے سے پہلے  
 سب کی نظروں میں آگئی۔ طوفان بدتمیزی اک بار پھر مچا۔ خوب قہقہے پڑے۔  
 ہنسا مسکراتا قافلہ پندرہ سولہ میل کا راستہ قہقہے بھیرتا گھر پہنچ گیا۔  
 رات دو بجے تک مغل جی۔ عورتیں تو تھکاوٹ محسوس کر رہی تھیں۔ مرد  
 ہشاش بشاش تھے۔ کتنی باتیں کیں۔ کتنے قہقہے بکھرے۔ کتنے قصے سنائے۔  
 کتنی لطیفہ گوئی کی۔ کچھ حساب ہی نہ تھا۔

دوستوں کا بس چلتا تو شاید رات یونہی بیٹھے بیٹھے گزار دیتے۔ عورتیں  
 اب بور ہو رہی تھیں۔ نہ تو کوئی باراف نگہ بھی تھی۔ فاریہ بھی تھکی تھکی نظر آرہی تھی۔  
 ڈرائنگ ہال سے نکلنے سے پہلے سب نے اپنے اپنے گرم شال اور کوٹ  
 اٹھالیے۔ باہر بلا کی سردی تھی۔

نازک سی فاریہ تو کاپٹنے لگی۔ نصیر نے لپک کر اسے اٹھایا اور بازوؤں  
 میں بھر کر اپنے کمرے کی طرف لے گئے۔ سب خوب ہنستے۔ بختیار نے بھی  
 شیماء کے گرد بازو لے جا کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

ہنستے مسکراتے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے سب اپنی اپنی خوابگاہوں  
 کی طرف جارہے تھے۔

عثمان بھی شائے کے ساتھ ساتھ چلتے خوابگاہ میں داخل ہوئے۔ شائے

”چلیے بھائی۔ شائے نے کہا۔  
 ”بے شک بھائی کہہ لیں۔ لیکن ٹھیں گی آپ میرے ساتھ۔ نصیر  
 ہنستے ہوئے کہا۔

”کیوں بھابی سے پٹنا ہے۔ شائے نے بھی شوخی سے کہا۔  
 بختیار اور انوار نے قہقہہ لگایا۔ انوار بولا۔ ”یہ ٹھیک کہا بھابی آپ  
 بے چارے سارا راستہ پٹتے آئے ہیں۔  
 ”دو جھڑ ہیں تو واقعی خطرناک تھیں۔ آصف ہنسا۔

”یہ بات ہے۔ عثمان نے کہا۔  
 ”ان کی باتوں پر نہ جاؤ۔ میں کتنا خوش مزاج ہوں تم تو جانتے ہو۔  
 نصیر نے کہا۔

”تو گویا بھابی کو بد مزاج بتا رہے ہو۔ بختیار نے چھیڑا۔ لڑائی سے تو  
 انکار نہیں کر سکتے۔

”اجتی کہیں کے۔ اسے تم لڑائی کہتے ہو۔ نصیر نے بختیار کا کان مروڑا  
 ”نہیں جی یہ تو محبت کے چونچلے تھے۔ نمبولی۔

”چلو چلو سب اب۔ نصیر نے ان کی آنکھیں سنائی کرتے ہوئے کہا۔ آئیے  
 میرے دوست کی جان جاناں۔

نصیر نے شائے سے شوخی سے کہا۔  
 ”ان کے بغیر تم واقعی ٹٹنے کے نہیں۔ عثمان بولے۔  
 ”بالکل نہیں۔ وہ ہنستے۔

کا دل اس انقلاب پر متحتم سا گیا

لیکن

خوشی لمحاتی تھی عثمان ایک دروازے سے داخل ہوئے اور دوسرے  
سے برآمدے میں نکل گئے۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ برآمدہ  
کی تہی بچھا دی تھی

انہوں نے تو خدا حافظ بھی نہیں کہا تھا۔

شائے تھکے تھکے قدموں سے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ اس کی آنکھوں  
میں کڑواہٹ گھلنے لگی۔

مہمان گھوم پھر کر عثمان کا گھر دیکھ رہے تھے۔ ہر چیز خوبصورت اور  
نفیس تھی۔ فارسیہ کو تو گھر کا محل وقوع اتنا پسند آیا تھا کہ تعریفیں کرتے  
تھکتی تھی۔ بار بار شائے اور عثمان کو ان کے ذوقِ نظر کی داد دے رہی  
تھی۔

مہمان گھر دیکھتے دیکھتے خوابگاہ میں بھی آگئے۔ سب کا مشترکہ فیصلہ  
تھا کہ یہ خوابگاہ پوری کوٹھی کو اگر حرم کہا جائے تو دل کی حیثیت رکھتی ہے۔  
عثمان یہ آپنی طرزِ فکر ہے یا بھابی کی۔ آصف نے خوابگاہ کی آرائش دیکھتے  
ہوئے پوچھا۔

”آپ کی غالباً۔“ بختیار نے شائے کی طرف دیکھا۔

”دونوں کی ہوگی۔“ نموبولی۔

”بہر حال بہت خوبصورت ہے۔“ خوابگاہ خوابوں کی دنیا لگتی ہے۔ فارسیہ



رکھے ریڈیو گرام کی طرف گھوم گئے۔ در نہ ساری کوشش اسی لمحے اکارت گئی تھی۔

گیارہ بارہ بجے کے قریب جب سیب ترانی والے خوبصورت چمن میں بیٹھے کوئی بسکٹ اور ڈرائی فروٹ سے شغل کر رہے تھے۔ اس وقت بھی تعریفی و توصیفی جملے ان کی زبان پر تھے۔

شائے نے اس وقت خوبصورت پہاڑی لباس پہن رکھا تھا۔ یہ لباس بھی عثمان نے اپنی پسند سے بنوایا تھا۔ کھلے گھیردار فراک چوڑی کالی گنگھریوں والی چادر اور تنگ موری کی کھلی گھیردار شلوار پہنے وہ مہانوں کی آؤ بھگت کر رہی تھی۔ چاندی کے زیور پہنے تھے۔ گول گول بالے کانوں میں جھول رہے تھے۔ سینے پر موٹا چاندی کا زنجیروں والا ہار لٹک رہا تھا۔ ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے تھے۔ پاؤں کی انگلیوں میں بھی چاندی کے چھلے تھے۔ پٹھانی چپل پاؤں میں تھی۔

بھابی۔ نصیر نے بنظر تحسین اسے دیکھا۔

جی۔

بہنڈا سیدھے سادے کپڑے پہنا کریں۔ آپ تو ہماری سیم کو مہلکس میں مبتلا کر دیں گی۔

بالکل بالکل۔ فاریہ ہنسی۔ کل پیٹ اور جرسی میں آپ بالکل امریکن لگ رہی تھیں۔ آج پٹھانی لگ رہی ہیں۔

اور اس شب جب منزل موسیقی جی تھی۔ فرشی غارے میں آپ یوپی

نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

کیسی پرسکون ہے۔ منم جیسے خوابوں میں ڈوب رہی تھی۔ عثمان نے بے چینی سے شائے کو دیکھا۔ اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

عثمان جتنا ان لوگوں کو خواہ گاہ سے باہر لانے کے حربے استعمال کر رہے تھے وہ لوگ اتنا ہی اندر رہنے پر مجبور تھے۔

بڑی خوش نصیب ہیں آپ شائے بھابی۔ نصیر نے داد کے طور پر پوری سنجیدگی سے کہا۔ عثمان ایک بہترین انسان ہیں۔ پیارے غلصہ اور بے انتہا خوبیوں کے مالک۔

شائے کے حلق میں کوئی شے پھنس رہی تھی۔ مسکرا کر اس نے سر ہلایا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فاریہ بولی۔ عثمان بھی تو قسمت کے دھنی! جو شائے جیسی بیوی ملی۔ ہمہ صفت و موصوف۔

حوروں کی سی خوبصورت معصوم اور پاکیزہ۔ بختیار نے سنجیدگی سے کہا۔

شائے کی آنکھیں فرط کرب سے جیسے پھٹ جانے کو تھیں۔ کچھ بھی عثمان کی بھی تھی۔ انہوں نے بالکل بالکل اتنے زور سے کہا کہ شائے چونکا کر انہیں دیکھنے لگی۔

وہ نارمل بالکل نہیں لگ رہے تھے۔ وہ تو سب اپنی اپنی باتوں میں اتنے لگن تھے جو کسی نے کچھ محسوس نہ کیا۔ اور عثمان بھی جلدی سے کونے پر

کیوں نہیں چھوڑا۔ عثمان ہنس کر بولے۔ اچھی اور فاریہ بھابی کی رانی بھی تو موضوع بن سکتی ہے۔  
سب نے ملا جلا قہقہہ لگایا۔ عثمان نے بڑی خوبصورتی سے موضوع موڑ دیا تھا۔ اب زیر بحث نصیر اور فاریہ تھے۔ جو دن میں ایک دو دفعہ ضرور الجھ پڑتے تھے۔

باقاعدہ لڑائی بھی دو تین دفعہ ہو چکی تھی۔ ایک دن تو فاریہ اتنی سنجیدہ ہو گئی تھی کہ اس نے واپس چلے جانے کا فیصلہ کر کے اپنا بوریہ بستر گول کر لیا تھا۔

نصیر خوب قابو میں آئے ہوئے تھے۔ فاریہ کو موقع ملا تھا۔ خوب دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔ چاروں خواتین اس کی لشت پناہی جو کر رہی تھیں۔

مذاق مذاق ہی میں معاملہ سنجیدہ ہو گیا۔ فاریہ غصے میں آگئی۔ نصیر سے ردھو کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ شائندہ، ہنواور صنم کے کینچ کینچ کر بٹھانے کے باوجود وہ نہیں بیٹھی۔

سنجیدہ ہنس کر دوسرے سو رہے تھے۔ نصیر کی حالت قابل رحم تھی۔ فاریہ اندر چلی گئی۔ تو نصیر نے خوشخوار نظروں سے عثمان کو گھورا اور پھر اٹھ کر بہتے ہوئے ان کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا۔ بہت ذلیل ہو۔ سارا قصور تہا رہا ہے۔ اب جاؤ مناؤ اسے جا کر۔  
عثمان گردن چھڑاتے ہوئے ہنس رہے تھے۔ بختیار آصف اور

کے کسی نوابی خاندان سے تعلق معلوم ہوتا تھا۔ نمونے کہا۔  
اور بارڈر لڑھالی سلک کی ساڑھی میں مگس کا روپ دھارا تھا۔ منہ نے کہا۔

کمال تو یہ ہے۔ نصیر داد دیتے ہوئے بولے۔ جیسا لباس پہنتی ہیں اپنے میں صفات بھی ایسی ہی پیدا کر لیتی ہیں۔  
ہاں بالکل۔ بختیار نے کہا۔

دیکھ لیں آج۔ بوجھ بھی بالکل بچتونوں سا لگ رہا ہے۔ نصیر مسکرائے۔ شائندہ جبراً مسکرا رہی تھی۔ نصیر کی بات پر بولی۔ میری ماما افغانی شراذ ہیں۔ آپ نے پہلے نوٹ نہیں کیا ہوگا۔ میرا الجھ ہے ہی ایسا۔

ہم تو سمجھے اداکاری کر رہی ہیں۔ صنم نے ہنس کر کہا۔  
شائندہ نے عثمان کی طرف دیکھا۔ جو بظاہر بے نیاز سے بیٹھے ماٹے کو ہوا میں اچھال رہے تھے۔

تعریفی باتیں جب طویل کینچ گئیں اور عثمان کے لیے ان لوگوں کی لاعلمی میں لگائے جانے والے چہرے کے برداشت سے باہر ہونے لگے تو وہ ہنس کر بولے۔ بھئی آپ لوگوں نے ہمیں ہی کیوں موضوع بنالیا ہے۔ کسی اور کی بھی بات کریں۔

کسی اور کو موضوع بننے کے قابل تم دونوں نے چھوڑا ہی نہیں۔ نصیر نے کہا۔

”کیوں؟“ عثمان نے پوچھا۔  
 ”ادھر بھی مہمان کو کھانے کو ہے۔“ بختیار نے نواہر آصف کی طرف دیکھ کر کہا۔  
 ”ہم اتنے بے وقوف کیا نہیں جناب کہ سب کے سامنے لڑنے لگیں۔“  
 ”نہو نے جلدی سے کہا۔  
 ”لڑنا ضرور ہے۔“ انوار بولا۔ ”عقل مند ہیں۔ اندر جا کر آصف کی پٹائی کریں گی۔“  
 ”یار میں تو چلا۔“ نصیر نے اپنے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی سے پٹو ڈال لیں تو اچھا ہے۔“  
 ”جاؤ جاؤ۔“ سب نے کہا اور جب نصیر جانے لگے تو تالیاں پیٹ پیٹ کر سب نے ادٹے ادٹے۔ کے نعرے لگائے۔  
 ”نصیر نے گھر دن موڑ کر نہیں دیکھا۔ ہاں دروازہ بند کیا تو سب کو منہ چڑھا کر ہاتھ دھو لیا۔“  
 ”ہنتے ہنتے سب نصیر اور فاریہ کی باتیں کرنے لگے۔“

انوار بھی تہقے لگا رہے تھے۔ عورتیں بھی مسکرا رہی تھیں۔  
 ”اب ان مخترمہ کو سنبھالے گا کون۔“ نصیر نے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا۔  
 ”تم۔“ عثمان بولے۔  
 ”جاؤ بچے ناک رگڑو۔ پاؤں پڑو۔ ہاتھ جوڑو۔“ آصف نے کہا۔  
 ”اس مردود نے بات کا رخ ہماری طرف پھیر کر معاملہ اس حد تک پہنچا ہی دیا ہے۔“ نصیر کھا جانے والی نظروں سے عثمان کو دیکھنے کی ادا کا کرنے لگے۔  
 ”سب ہنس ہنس کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔  
 ”فی الحال تم جاؤ۔“ عثمان نے نصیر سے کہا۔ ”ضرورت پڑی تو مدد کے لیے ہمیں بلا لینا۔“  
 ”ہاں فاریہ بھابی کے تیور خطرناک ہی تھے۔“ انوار بولا۔  
 ”یار اتنی سی تو بھابی ہے آصف نے کہا۔ ”ڈرتے آنا ہو۔“  
 ”تم نہیں ڈرتے کیا؟“ نصیر نے تنک کر کہا۔  
 ”ماکل نہیں۔“ آصف سینہ تان کر بولے۔ ”کیوں نہ ہو۔“  
 ”ڈرنے کے لیے ہم جو ہیں۔ آپ کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔“  
 ”کم گونہوں نے بڑے طنز سے کہا۔  
 ”لو۔“ بختیار ہنتے ہنتے لوٹ پوٹ ہو گیا۔

خوبصورت سپاٹ تو ہونگے وہاں بھی۔ سنجیدہ بولے۔  
 "حسن ہی حسن ہے وہاں۔ عثمان نے کہا۔ سبزہ ہی سبزہ ہے۔ تیز رفتار  
 بریلا دریا۔ جا بجا لکڑی کے خستہ حال جھولتے پل۔ بڑی خوبصورت جگہیں  
 ہیں سب۔"

"بس پھر ٹھیک ہے۔ یہ لوگ اپنی پلنک منائیں۔ ہم پھلی کا شکار کھیلیں گے۔  
 نصیر نے دونوں ہاتھ بند کرتے ہوئے فیصلہ دے دیا۔

شانہ نے تیاری شروع کر دی۔ صبح یہاں سے نکل جاتا تھا۔ اور رات  
 واپس تھی۔ پورے دن کے لیے اس نے کھانے پینے کا سامان تیار کر دیا۔ کئی  
 قم کا گوشت روست کیا۔ مرغ سلم بنائے۔ پھلی خرائی کروائی۔ پھل، چائے  
 کے لوازمات اور سوکھا میدہ وافر مقدار میں رکھا۔

پلاسٹک کے کپے پھلے پکے برتن کاغذ کے رنگین نپکن اور باریک نائیلون  
 کے پھولدار دسترخوانوں سب کچھ اس نے بڑی حفاظت سے پیک کر دیا۔  
 قایلین اور دو چار چادروں کے علاوہ اس نے احتیاطاً کچھ کبل بھی ساتھ  
 رکھے۔ ان علاقوں میں موسم بے یقینی ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے واپسی پر ٹھنڈ نہ  
 کیلوں کا سامان یعنی تاش، لٹو اور کیرم بھی رکھ لیے گئے۔

سارا سامان لے جانے کے لیے جیب منگوائی گئی۔ پھر سارا سامان  
 اس میں رات ہی کو لے دیا گیا۔ رنگین ٹینٹ بھی ساتھ رکھ لیا گیا۔ سلینڈر اور  
 گیس کے چولہے چائے وغیرہ کے لیے ساتھ لے جاتا تھا۔ وہ بھی وہیں  
 رکھ لیے گئے۔

شانہ نے تفریح کے پروگرام میں پلنک کے لیے دو دن مخصوص کیے  
 تھے۔ ترائی کے علاقوں میں دو ایک سچے بڑے خوبصورت پلنک سپوٹ تھے  
 لیکن پلنک کی بجائے شکار کا پروگرام نصیر نے تجویز کیا۔ ترائی کے میلوں اور  
 علاقے میں دریائے سوات کی ایک شاخ میں ان دنوں ٹراؤٹ مچھلی بکثرت  
 ملتی تھی۔ نصیر سے اختیار۔ انوار اور آصف بھی متفق تھے۔ عورتوں میں جنم کو  
 پھلی کے شکار میں شوہر محترم کا ساتھ دینے کا شوق تھا۔ بریلے پانی میں بڑے  
 والی بڑی مافقہ دار اور میدانی علاقوں میں نایاب ہوتی ہے۔

نمونے بھی بادل خواستہ حامی بھری۔ فاریر نے مزاحمت کی اور شیانے بڑے  
 اس کا ساتھ دیا۔

"تم شکار کھیلیں گے۔ آپ لوگ وہیں پلنک منالیں۔ نصیر نے تجویز  
 کی۔ یہ ٹھیک ہے۔ انوار نے کہا۔

عثمان نے بے جان سا قہقہہ لگایا۔

لیکن ایک بات ہے۔ جتنی جلدی لڑائی ہوتی ہے اتنی ہی جلدی صلح

بھی ہو جاتی ہے۔ فاریہ دل کی بہت اچھی ہیں۔

ہوں۔ عثمان کی آنکھوں میں ریت سی چھنے لگی۔ انہوں نے کھڑکی سے

باہر دیکھا۔ کچھ لوگ دوسری گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ فاریہ، شائندہ اور صنم

باہر ہی کھڑی تھیں۔ تینوں نے اس گاڑی میں بیٹھنا تھا۔ شائندہ بچے کو پیار

کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اسے شام تک کے لیے ہدایات بھی دے رہی تھی۔

عثمان کو شیریں کو دیکھا۔ دل پیار کو مچلا۔

شیریں ادھر آؤ بیٹے۔ انہوں نے کہا۔

شائندہ بچے کو لے کر ان کی طرف آگئی۔ شیریں کو عثمان کی طرف بڑھا دیا۔

خود اپنا بیگ لینے چلی گئی۔

آپ لوگ تو آج بیٹے۔ عثمان نے شیریں کا کال اپنے کال سے لگاتے

ہوئے باہر کھڑی خواتین سے کہا۔

دونوں اگر کچھ سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ عثمان بچے کو گدگداتے ہوئے پیار

کرتے ملے۔

بہت پیارا بچہ ہے۔ نصیر نے کہا۔

ہم کم پیارے ہیں۔ عثمان بولے۔

زیادہ ماں پہی لگتا ہے۔ نصیر نے شوخی سے چھیڑا۔

کیا بات ہے۔ عثمان نے ہنس کر نصیر سے کہا۔ لٹو ہو گئے ہو شائندہ پر۔

شکار کے لیے ضروری چیزیں عثمان نے اکٹھی کیں۔ ڈوریاں جاں وغیرہ  
ان کے شکار خانہ میں رکھے ہوئے تھے۔

جیب کو مہمانوں کی روانگی سے دو گھنٹے قبل رواں کرنا تھا۔ تاکہ مطلوبہ

جگہ پر ساری چیزیں پہنچا دی جائیں۔ مہمانوں کے پینے سے پہلے وہاں ہر چیز

سیلتے سے لگائی جانی ضروری تھی۔

نودس بجے سو کر اٹھنے والے صبح سویرے ہی بیدار کر دیئے گئے۔

سات بجے تک سب ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔

آدھ

ساڑھے سات سب موٹے اونٹنی لباسوں میں ملبوس گاڑیوں میں بیٹھ

چکے تھے۔ دو گاڑیاں تھیں۔ دس آدمی آسانی بیٹھ گئے۔

اگلی گاڑی میں عثمان شرننگ پر بیٹھے۔ ان کے ساتھ نصیر آ بیٹھے۔

آج میرے ساتھ۔ عثمان نے ہنس کر کہا۔

فاریہ شائندہ کے ساتھ بیٹھنا چاہتی ہیں۔ نصیر نے کہا۔

کیوں؟ پھر کوئی گھر بڑ ہو گئی۔ عثمان ہنسے۔

ادخل کو مانو۔ نصیر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ تیرے کتنی مشکلوں سے

کل منایا تھا۔

کچھ زیادہ ہی لڑتے ہو تم دونوں۔ عثمان نے کہا۔

بس ساسی میں لطف آتا ہے۔ یقین مانو ایک دو دن لڑائی نہ ہو تو

ہم دونوں بور ہونے لگتے ہیں۔

رکھا تھا۔

پچاس سچیں میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ پندرہ میل پہاڑی علاقہ تھا۔ تنگ سی سڑک تھی جو بارشوں کی وجہ سے خستہ حال تھی۔ بہت محتاط ہو کر گاڑی چلانا پڑتی تھی۔ کیونکہ کئی جگہ سے سڑک دریا کی سطح سے بالکل عمودی چڑھانی پر تھی۔ ایک طرف دیو ہیکل اوپر ہی اوپر سرسبز پہاڑ اٹھتے چلے گئے تھے اور دوسری طرف نیچے کہیں کہیں بہت نیچے دریا بہہ رہا تھا جو ادنیٰ سے نیچے کی طرف کہیں کہیں آبشار کی صورت گزرتا تھا۔ کہیں شوریدہ سرگت اور کہیں کٹ اڑتا۔ غراتا انتہائی ٹھوس اور برق رفتار دکھائی دیتا تھا۔

ڈرائیو کرنے والے بہت محتاط تھے۔ باقی سب تفریح کے موڈ میں تھے۔ منم نے ٹیپ پر خوبصورت گانے آن کر دیئے تھے۔ اور سچلی گاڑی میں الوار آصف اور بختیار قذافی کا رہے تھے۔ شیما اور نوتالیاں بجا بجا کر ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ کہیں کہیں جہاں کوئی خطرناک موڑ آ جاتا تو قذافی رک جاتی اور نوشیا خوف سے دہل جاتی۔

قدرتی حسن یہاں بکھرا پڑا تھا۔ سبز پانی اور ادنیٰ سرسبز اور میاں پہاڑ تھے۔ فضا میں سحر کن مہک تھی۔ اور خوبصورت جوڑوں کا خوبصورت قافلہ تھا۔

مقوڑی دیر بعد سب اس خوبصورت میدان میں تھے جو تین طرف سے پہاڑوں کو گھرا تھا۔ اور چوتھی طرف دریا بہہ رہا تھا۔ ملازموں نے ایک طرف رنگدار سینٹ بھی لگا دیا تھا۔ قالین بچھا کر

”یار بڑے لگی ہو۔“ نصیر نے سنجیدگی سے کہا۔ خدا انظر بد سے بچائے۔ شائے صرف ماؤ اور خوبصورت ہی نہیں، سلیقہ شعرا گھر بلو سی لڑکی بھی ہے خوش قسمت ہو۔ بہت خوش قسمت۔“

عثمان نے اپنی توجہ شیریں کی طرف مبذول کر لی۔ زور زور سے اس کے گال پر پیار کیا۔ شیریں نے منہ بنایا۔ وہ رو دینے کو تھا۔

”بڑے نازک مزاج ہو صاحبزادے۔“ عثمان نے اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے کہا۔

شائے ٹیگ لے کر آگئی تھی۔ ٹیپ اور کیسٹس کا بیگ بھی پچھے ہوئے تھی۔ آیا نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے چیزیں لے لیں اور گاڑی کی کچل سیٹ کے پیچھے رکھ دیں۔ شائے بیٹھ چکی تو عثمان نے بچے کا پیار لے کر اسے آیا کے حوالے کر دیا

”ٹھنڈکانی ہے آج۔ دھیان رکھنا اس کا۔ کمرے ہی میں رکھنا۔“ شائے نے عثمان کے گاڑی چلاتے چلاتے آیا کو ہدایت کی۔

دوسری گاڑی الوار چلا ہے تھے۔ ان کے ساتھ بختیار تھے پیچھے نمو۔ آصف اور شیما بیٹھے تھے۔

قافلہ چل پڑا۔ سب نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ شائے نے آج سردی اور سہولت کی خاطر گرم میروں شلوار قمیص کے ساتھ کالی سوٹر اور کالی گرم شال لے لی تھی۔ عثمان نے بھی نیوی بلو گرم شلوار گزرتے کے ساتھ گرم واسکٹ پہنی تھی اور سفید نرم کٹیریں دو شالہ ایک کندھے پر ڈال

”جی صاحب۔“  
”کتنے ہیں۔“

”تین تو ادھر ہیں۔ باقی اور بھی بستر اور چار پائیاں پر لے گاؤں سے لا سکتے ہیں۔“

”خیر۔ ضرورت نہیں۔ اگر ہمارے کسی مہمان نے دوپہر آرام کرنا چاہا تو اوپر آجائیں گے۔“

”شکر یہ بیگم صاحب۔“

”ہاں کمرے صاف ہیں نا۔“

”بس جی صاف ہی ہیں۔ میں ابھی جھاڑو لگا کر پھر صاف کرتا ہوں۔“  
”اچھا۔“

شانہ ٹھکرمہانوں کی طرف آگئی۔ چوکیدار کا مقصد وہ سمجھ گئی تھی۔ غریب آدمی کو کچھ ایسے لینے کی توقع تھی۔

چائے کے بعد سب لوگ ادھر ادھر پھیل گئے۔ کوئی دریا کی طرف چلایا کوئی پہاڑوں کی طرف۔

عثمان نے مچھلی کے شکار کے لیے لائی ہوئی چیزیں یوسف کو دے کر مطلوبہ جگہ پر پہنچانے کا کہا۔ سارے لوگ شکار کے لیے کچھ دیر بعد وہاں پہنچنے والے تھے۔ ان کا کھانا بھی وہیں پہنچا تھا۔

نمونہ فاریہ اور شیا شانہ کے ساتھ ادھر ادھر گھومنے نکل گئیں۔ کبھی وہ چلنے لگتیں۔ کبھی بڑے بڑے پتھروں پر بیٹھ جاتیں۔ زمانے بھر کی باتیں کر

کھانے پینے کی چیزیں جو گر کر رکھی ہوئی تھیں۔ چو لہا کچھ فاصلے پر ایک چٹا کی اوٹ میں رکھتا تھا۔

مہانوں کے پینے سے پہلے انہوں نے چائے کا پانی کھولنے کے بعد رکھ دیا تھا۔ اور مہمان ابھی گاڑیوں سے نکل کر قالین پر بیٹھے ناگھیں سید کر رہے تھے کہ وہ گرم گرم چائے بنا کر لے آئے۔

یہ چائے اس وقت سب کے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ سب چائے تین تین پیالیاں پی کر تازہ دم ہو گئے۔

جہاں اس قافلے نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ اس سے ایک فرلانگ اوپر لیا ہاؤس کی ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت تھی۔ مہمانوں کو دیکھ کر ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار ادھر آگیا۔

شانہ کھانے کے ڈبے دیکھ رہی تھی۔ حاکو اور یوسف ڈبے لالا کر قریب رکھ رہے تھے۔ فضل دین گرم کرنے والی چیزیں ایک طرف رکھ رہا تھا۔

چوکیدار نے شانہ کو سلام کیا۔ شانہ نے جواب دیتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”بیگم صاحب۔ وہ ریسٹ ہاؤس ہے۔ آپ لوگ رات ادھر ٹھہریں گے۔“  
”نہیں۔ شام ہم واپس چلے جائیں گے۔“

”دوپہر کو آرام کرنا ہو۔ تو تشریف لے آئیں۔“

”بید وغیرہ ہیں۔“

لیکن

اچانک پہاڑوں کے عقب سے سیاہ بادل جھومتے جھامتے چلے آئے۔ ایک دم مطلع ابراؤد ہو گیا۔ اور تیز ہوائیں چنگھاڑنے لگیں۔ لوگوں نے جلدی جلدی سامان باندھ کر جیپ میں لا دیا۔ اور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

عثمان نے متفکرانہ آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل کوئی دم میں برسنے کو تھے۔

”بڑے خوفناک بادل ہیں۔ آصف نے آسمان کی طرف دیکھا۔

”بادل تو کیا خوفناک ہوں گے۔ عثمان نے کہا۔ بارش ہونے لگی۔

تو واپس کیسے جائیں گے۔

”کیوں۔“ بنجیہار بولا۔

”راستہ بہت خراب ہے۔ پھسلن اتنی ہو جاتی ہے۔ کہ گاڑی چلانا

ممکن نہیں ہوتا۔ عثمان نے کہا۔

”جلدی کرو۔ ابھی کیوں نہ نکل جائیں۔“ نصیر نے کہا۔

عثمان خاصے متفکر تھے۔ ایسے علاقوں میں بارش جس طرح اچانک آتی تھی انہیں علم تھا۔ سفر کسی طور ٹھیک نہیں تھا۔

پھر بھی

سب کے کہنے پر وہ واپسی کے لیے آمادہ ہو گئے۔

لیکن

رہی تھیں۔ جنم کے مردوں کے ساتھ شکار میں شرکت کرنے پر شیوا فاریر بہت باتیں بنا رہی تھیں۔ شاید انہیں یہ بات پسند نہ آئی تھی۔ نموا شانہ مسکا مسکا کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔ شوق کا کوئی مول نہیں نہ ہی حد و حساب ہے۔ دونوں اس بات کی قابل تھیں۔ اعتراض کرنے کی بھی کیا تھی۔ سب تفریح کے لیے تو آئے تھے۔ جیسے جس کا جی چاہا کر لی۔

دوپہر کا کھانا سب دریا کے کنارے ہی اٹھا کر لے گئے۔ مچھلی ابھی کوئی ہاتھ نہ آئی تھی۔ ڈوریاں دریا میں ڈالے سب گپ شپ لگاتے رہے تھے۔

دریا کے کنارے ٹھنڈ خاصا بڑھ گئی تھی۔ میدانی علاقوں میں تو سردی نہ آ رہی تھی۔ لیکن یہاں موسم بہت ٹھنڈا تھا۔ عثمان کا گھر بھی کافی اوپر واقع تھا۔ وہاں سردی خاصی تھی۔ یہ جگہ تو اس جگہ سے کوئی سو فٹ اوپر چائی پر تھی۔

کھانے کے بعد نوکر چاکر برتن سیٹنے لگے۔ اور مہمان اپنی اپنی بیویوں کے دروں میں ہاتھ ڈالے اور دھڑکھڑکے۔ کوئی نظروں سے اوجھل ہو گا۔ کوئی سنبوسے میں روپوش ہو گیا۔

نمو اور آصف اوپر رسیٹ ہاؤس میں چلے گئے۔ شائستہ میدان

اکیلی رہ گئی۔ عثمان گاڑی میں جا کر لیٹ گئے تھے۔

تین بجے چائے کے بعد روانگی کا پروگرام تھا۔



ایلا ہوا تھا۔ چھتوں پر پانی پڑنے سے خوب شور مچ رہا تھا۔ اور رلیٹ ہاؤس کے چاروں طرف جیسے ندیاں بہنے لگی تھیں۔

چوکیدار نے تینوں کمروں میں موٹی موٹی لکڑیاں آتش دانوں میں جلا دیں۔ شائے نے کبل جیپ سے منگوا لیے۔ سردی اپنا رنگ کھانے لگی تھی۔ موٹے موٹے کوٹوں کے اوپر شالیں اور کبل لپٹ لیے گئے۔ نازک سی فاریہ تو پھر بھی کانپ رہی تھی۔ شائے نے قالین آگ کے قریب بگدے دی۔

دوپہر کا بچا ہوا کھانا اور چائے کافی کا سامان کام آگیا۔ ملازموں نے جلدی جلدی چائے بنائی۔ سب نے بڑی رغبت سے پی۔ رات تک بارش نہیں رکی۔

رات سب کو یہاں ہی گزارنا تھی۔

سفر اور سارے دن کے سرگشت سے سب ہی تھک گئے تھے۔ ہوک تو کسی کو خاص تھی نہیں۔ اور یہ کوئی بڑا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ کھانا کافی تھا۔ سوال تو رات سونے کا تھا۔ یہی تین کمرے تھے جن میں شب گزاری کا بندوبست کرنا تھا۔

رلیٹ ہاؤس میں صرف تین بیڈ تھے۔ پرانے پرانے بھاری بھر کم صوفے بھی سونے کیے جاسکتے تھے۔ لیکن سونے کا مسئلہ دس آدمیوں کا نہیں، پانچ جوڑوں کا تھا۔

آتش دان میں لکڑیاں دھڑا دھڑل رہی تھیں۔ کھڑکیاں دروازے

ابھی گاڑیاں کچے راستے سے سڑک تک بھی نہ آئی تھیں۔ کہ بارش کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے۔

عثمان نے گاڑی روک لی۔ بجتیار بھی رک گئے۔ بارش ایکایک تیز ہو گئی۔

اب؟ نصیر فکر مندی سے بولے۔

رلیٹ ہاؤس میں چلے۔ شائے نے کہا۔

جانا ہی پڑے گا۔ عثمان نے گاڑی موڑی۔ بجتیار نے بھی تعلید کی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں گاڑیاں رلیٹ ہاؤس کے پورچ میں تھیں جیپ بھی پیچھے پیچھے آگئی۔

چوکیدار بھاگا آیا۔

بارش اس کے لیے بارانِ رحمت تھی۔ اتنے معزز اور بڑے لوگوں کی آمد خوش بختی کی دلیل تھی۔

اس نے کمرے کھول دیئے۔ پرانے پرانے بے قلعی کمرہ میں فرسودہ سا فرنیچر تھا۔ لیکن اس وقت یہ پناہ گاہ بڑی نعمت تھی۔ سب لوگ گاڑیوں سے نکل کر اندر بھی نہ آیا۔ تھے کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ خدا کا شکر ہے۔ عثمان بولے۔ کہیں یہ خوفناک بارش راستے میں

آلتی۔ تو بس گئے تھے سب۔

چلو بھئی لغزج کرنے آئے ہیں نا۔ پہاڑی بارش کا بھی لطف لے لیں۔ نصیر کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے بولے۔ پانی چادر کی طرح

دیا تو باعث تسخیر گئی بات — یا تم لوگ جو چاہو کہو۔ ہم تو تفریح کے لیے آئے ہیں۔ الگ سونے کا سوال ہی نہیں۔ کیوں فارے۔  
 فارے نے گھور کر نصیر کو دیکھا۔ سب پھر کھلکھلا کر منہں پڑے۔  
 "ٹھیک ہے یعنی ٹھیک ہے۔ انوار نے اپنی بیگم کو گھسیٹ کر اپنے قریب کر لیا۔

— پھر ہم بھی اپنی شیا کو ناراض کیوں کریں۔ بختیار نے اپنی بیوی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔  
 "ہائے اللہ۔ نو مسکرائی۔ یہ لوگ رات گزارنے کا مسئلہ حل نہیں ہونے دیں گے۔ شانہ آپ میزبان ہیں جس طرح مناسب ہو بند و بست کریں۔ ایک رات بیویوں کے بغیر بھی گزاری جاسکتی ہے۔"

— نہیں۔ نہیں۔ کبھی نہیں۔ بختیار نصیر آصف اور انوار نے زور زور سے احتجاج کیا۔ شور و غل، قہقہے اور باتیں آپس میں گھل مل کر فضا کو کافی دیر تک مرتعش کرتے رہے۔

— سونے کی تاک ہی کیا ہے۔ رات جاگ کر بھی گزاری جاسکتی ہے۔ عثمان کافی دیر تک چپ رہنے کے بعد بولے۔

— ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے نصیر نے کہا۔ لیکن پروگرام کیا ہوگا۔  
 "توالیاں گاتے ہیں۔ بختیار نے کہا۔

اور انوار نے فوراً کان پر ہاتھ رکھ کر ہا ہا۔ ہا۔ کرنا شروع کر دیا سب ہنسنے لگے۔

بند رہتے۔ کمرہ خاصہ معتدل ہو رہا تھا۔ قالین پر کوئی لیٹا تھا، کوئی بیٹھ تھا۔ کچھ لوگ صوفوں میں دھنسے تھے۔ رات گزارنے کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ہر کوئی اپنی اپنی تجاویز پیش کر رہا تھا۔

— ہم عورتیں قالین پر سو جاتی ہیں۔ مرد بچوں اور دو صوفوں پر سو جائیں۔ شانہ نے منہم کے پاس گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے صلاح دی۔  
 "جی نہیں۔ فارے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ بولی۔ یہ تو سیوا آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہم نہیں سو سکتے زمین پر۔"

پتی سیوا کا لفظ شانہ کو چھو گیا۔  
 عثمان کے لبوں پر زہر خند تھا۔  
 "تو چلو ان سب کو زمین پر سلا دیتے ہیں۔ ہم بچوں اور صوفوں پر ٹیک جائیں گے۔" نمونے کہا۔

— نہیں صاحب۔ نصیر نے احتجاجاً ہاتھ اٹھاتے ہوئے نعرہ مارنے کے انداز میں کہا۔ "مابعد دولت اپنی بیگم کے بغیر نہیں سو سکتے۔"  
 نصیر کی بات پر فارے شرما گئی۔ سب نے زور زور سے ہنسنے شروع کر دیا تھا۔

— ہنسنے کی کیا بات ہے۔ نصیر نے کہنی کے بل کر وٹ لیتے ہوئے کہا۔  
 گھر میں آپ سب اکٹھے نہیں سوتے۔؟ کس کے پاس ڈبل بیڈ نہیں ہے۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ آصف نے کچھ کہنا چاہا۔

— خاک ٹھیک ہے۔ ڈبل بیڈ پہ سونا معیوب نہیں اور جو میں نے ک

تو توبہ بند کرو۔ اتنے سریلے سروں میں تو الی گائی تو سب کا کبارا  
کردو گے۔ عثمان نے کہا۔

”چلے تاش کیلتے ہیں۔ آصف نے تجویز پیش کی۔

خدا کے واسطے۔ فاریہ نے اپنے نازک نازک ہاتھ باندھتے ہوئے کہا:  
ہیں تو چھی دیں۔ تھک گئے ہیں۔ آپ لوگ تو جانے کس شے کے بنے ہو  
ہیں۔“

”کیوں نصیر۔ کیا ارادے ہیں۔ آصف نے پوچھا۔

”جو مرضی ہماری نصف بہتر کی۔ نصیر نے تھپار ڈال دیئے۔ سب  
پھر ہنس پڑے۔ اور کافی دیر طوفان ہنسی مچا رہا۔

رات ایک بجے تک سب ہنسی مذاق میں مشغول ہے۔ لیکن پھر تھکاوٹ  
اور نیند نے سب کو لیٹنے پر مجبور کر دیا۔

”جو فیصلہ مابعد ولت کریں۔ اس پر بلاچوں چراں عمل کیا جائے۔ نصیر بولا۔  
فرمائیے۔ سب نے کہا۔

نصیر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ”انوار اور صنم آپ اٹھیے اور ایک بیڈ  
والے کمرے میں تمام بستر کے باوجود سو جائیے۔“

”آصف اور نموت۔ نصیر نے دوسرے جوڑے کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ آپ  
برابر والے کمرے کے ایک بیڈ پر۔ اور بختیار اور شیا آپ دوسرے بیڈ  
پر تشریف لے جائیے۔“

دونوں جوڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انوار اور صنم پہلے ہی کھسک گئے

اور ہم۔ عثمان نے گہرا کر نصیر کو دیکھا۔

”ہم اس کمرے میں قالین کے اوپر۔ آتش دان کے اس طرف ہیں  
فاریہ۔ اس طرف تم اور شائے۔“

شائے کی زنگت ماند پڑ گئی۔ کچھ ہی حال عثمان کا ہوا۔

”چلو بھی اپنی خیر ہے۔ نصیر نے عثمان کو چپ دیکھ کر کہا۔ رات کی رات  
ہے۔ قالین پر ہی بسر ہو جائے گی۔“

”لیکن۔ عثمان کچھ نہ کہہ سکے۔

”بھی زیادہ ہی پائیلٹی کی ضرورت ہے تو۔ نصیر نے شوخی سے  
عثمان کو دیکھا۔ تو آڈیہ صوفے اٹھا کر درمیان میں کر لیتے ہیں۔ جیسے

آصف اور بختیار الماری دونوں ہلنگوں کے درمیان کریں گے۔

عثمان تو جیسے جاکھن کے غدا ب میں گرفتار ہو گئے۔ نہ چلے رفتن  
نہ پائے ماندن والی بات تھی۔ کشمکش میں انہوں نے سگریٹ سلگا  
لیا۔ پھر صوفے پر بیٹھ گئے۔

شائے بے جان بت کی طرح آتش دان کے قریب شال لپیٹے بیٹھی  
تھی۔

”آپ کس فکر میں ہیں بھابی۔ نصیر نے ہنس کر کہا۔ اٹھیے جگر نادر۔  
سونا چاہیئے اب۔ بہت تھک گئی ہیں آپ۔ شیری کی وجہ سے  
پریشان شاید۔“

شائے محزونہ سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

نصیر نے صوفے گھسیٹ گھسیٹ کر لائن لگا دی۔ خاصی پارٹیشن بنادی انہوں نے۔

پھر ایک کبل اور رسیٹ ہاؤس کا گدا ان کی طرف پھینک کر اپنا بستر بنایا۔ کبل کے ساتھ انہوں نے دوشالہ اور فاریہ کی شال جوڑ لی۔ شائے کسی آٹومینک مشین کی طرح بستر بنانے لگی۔ اس کا چہرہ بالکل بے رنگ تھا۔ اور آنکھوں میں اذیت کے آثار بڑے واضح تھے۔ بستر بنا کر اس نے عثمان کی طرف دیکھا۔ جو صوفے پر بیٹھے تھے۔ گھٹنوں پر کنپیاں رکھی تھیں۔ اور دونوں ہاتھوں میں سرخام رکھا تھا۔ گھسیٹ ان کی انگلیوں میں جل جل کر دھواں چھوڑ رہا تھا۔

نصیر لیٹ چکے تھے۔ دو چار باتیں عثمان اور شائے کو فحاشی کر رہے تھیں۔ پھر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر نصیر کے گہرے گہرے سانس خراٹوں میں بدل گئے۔

لیٹ جائیے۔ شائے نے انتہائی نحیف آواز پر عثمان سے کہا۔ عثمان نے سراٹھایا۔ شائے کی طرف دیکھ بھری لیکن سخت نظروں سے دیکھا۔ اٹھتے ہوئے بولے۔ آپ سو جائیے۔

شائے بستر کے سرے پر گھٹنوں پر بازو رکھے بیٹھی رہی۔ عثمان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے آئے اور دروازہ آہستگی سے کھول کرے سے باہر نکل گئے۔

صبح بڑی سہانی تھی۔ آسمان نکھر گیا تھا۔ اور پہاڑوں پر پھیلا سبزہ ہاش سے دھل کر تازہ دم ہو گیا تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ رات بھر کی بے آرامی کے بعد اس کی ہلکی ہلکی تمارت دکتے اعضا کو سکون دے رہی تھی۔ چوکیدار گاؤں سے آٹا، انڈے، مکھن اور دودھ وغیرہ لے آیا تھا۔ کچھ چیزیں کل کی کچی ہوئی تھیں۔ ڈھنگ کا ناشتہ تو نہیں تھا۔ پھر بھی سب نے خوب لطف لیا۔

رات جیسے جیسے گزر گئی تھی۔ فاریہ کو نہ کام نے آیا۔ نصیر بھی در و بکر کی شکایت کر رہے تھے۔ انوار کو چھیلیں آرہی تھیں۔ عثمان بھی ٹھنڈا کھا گئے تھے۔ سر میں درد اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔

ناشتے کے بعد جب دھوپ خاصی تیز ہو گئی۔ تو سارا قافلہ گاڑیوں میں سما چکا تھا۔

کل سب نے خوب ہی انجوائے کیا تھا۔ رات سنا رہے تھے گزاردی تھی۔

نصیر چپ بیٹھنے کے عادی کہاں تھے۔ پچھلی نشست پر بیٹھی خواتین سے باتیں کرنے لگے۔

”اپنی اپنی پسند تائیں۔ میں وہی کیسٹ لگاؤں گا۔“ انہوں نے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا۔

”جو چل رہے ہیں خوب ہیں۔“ صنم بولی۔

”ماحول اتنا خوبصورت ہے کہ ہر گانا بیچ رہا ہے۔“ فاریہ بولی۔

آپ بھابی۔ نصیر نے شائے سے کہا۔

”سب ٹھیک ہے۔“ وہ بے خیالی کے عالم میں بولی۔

”یہ دونوں بہت ایگزاسٹ ہو چکے ہیں۔“ نصیر نے عثمان اور شائے کی طرف دیکھ کر شوخی سے کہا۔

”یہ بات نہیں۔“ شائے نے گہرا کر جلدی سے کہا۔ ”دراصل۔“ میں شیری کے لیے پریشان ہوں۔ بیچارے کو کل سے چھوڑا ہوا ہے۔“

”گہرا کیوں گئی ہیں ہم نے بھی تو سات دن سے اپنے بچوں کو چھوڑا ہوا ہے۔“ فاریہ بولیں۔ پھر تینوں اپنے اپنے بچوں کی باتیں کرنے لگیں۔

نصیر مختلف کیسٹس اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ پھر ایک کیسٹ منتخب کر کے انہوں نے ٹیپ میں لگا کر ان کر دیا۔ ایک خوبصورت گانا تھا۔ لیکن صرف ایک ہی مصرعہ۔

”میں نے قسمت کی لکیر دل سے چرا ہے تجھے۔ بار بار سنائی دے رہا تھا۔“

”کیا۔“ نصیر نے کہا۔

”نا کافی بہتر اور غضب کی ٹھنڈ۔“ وہ ٹوکسہ ہے جو کلڑی کافی تھی۔ آتش دان میں کافی دیر تک جلتی رہی تھی۔

اب سبھی تازہ دم ہو چکے تھے۔

کل کی طرح آج بھی سب نے اپنی نشستیں منبھالیں عثمان کو پہلی گاڑی اور انہوں نے کرنا تھی۔ ان کے ساتھ نصیر بیٹھے تھے۔

سفر بڑے مختار طریق سے شروع ہوا۔ شرک پر گڑھے آج کل سے زیادہ بن چکے تھے۔ کئی جگہ سے تو بہرہ گیری تھی۔ اور کہیں کہیں عمودی پہاڑوں سے بڑے بڑے پتھر لڑھک آئے تھے جس سے شرک بند تو نہیں ہوئی تھی۔ تاہم راستہ زیادہ ہی دشوار گزار ہو گیا تھا۔

کئی جگہ سب کو پیدل چلنا پڑا۔ اور گاڑیاں انتہائی نازک اور خطرناک جگہوں سے عثمان اور نصیر نے آہستگی سے نکالیں۔

اب شرک ہوا ہو گئی تھی۔ پہاڑوں کا مودی بن بھی قدر سے گھٹ تھا۔ اور دریا سے شرک بھی زیادہ بلندی پر نہ تھی۔ دونوں گاڑیوں میں ٹیپ آن ہو گئے تھے۔ باتوں اور تہمت کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

عثمان گاڑی چلا رہے تھے۔ طبیعت خراب تھی۔ سر بھاری تھا۔ وہ کام کے آثار تھے۔ وہ بہت کم باتیں کر رہے تھے۔ نصیر نے ان کی طبیعت خراب دیکھی۔ تو چپ ہو گیا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی شائے بھی چپ تھی۔ فاریہ صنم گرد پیش کے حسن سے مغلوط ہو رہی تھیں۔ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔ اور اس خوبصورت تفریح پر تبصرہ بھی۔

ہاں - ہاں - عثمان کے سینے میں گھٹن سی ہو رہی تھی۔  
 - لگتا ہے رات ٹھنڈ دل پر اثر کر گئی - فاریہ بولی۔

۔ زکام ہو رہا ہے - صغم بولی - بخار تو نہیں محسوس ہو رہا عثمان بھائی۔  
 - فی الحال تو نہیں - لیکن آثار ہیں - آواز میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے  
 کی کوشش کرتے ہوئے عثمان بولے۔

۔ اللہ نہ کرے کہیں بیمار نہ پڑ جائیں - فاریہ بولی،  
 - فرق کیا پڑے گا - عثمان نے کہا۔

۔ نہ بھی - ہم اپنے آپ کو مجرم سمجھیں گے - وہ مسکرائی۔  
 - کیوں - عثمان نے کہا۔

۔ ہماری وجہ سے ہی آپ کو یہاں آنا پڑا - نہ ہم آتے نہ پکنک کا پر وگرام  
 بتا - وہ مسکرا رہی تھی۔  
 عثمان مسکرا دیئے۔

نصیر نے دیکھا یہ مسکراہٹ زخمی تھی۔

عثمان کو مجبور کر کے نصیر نے ڈرائیونگ کی - باقی سارا راستہ تقریباً خاموشی  
 ہی میں کٹ گیا۔

آج نشین میں مہانوں کی آخری رات تھی۔ کھانے کے بعد نشست کا  
 دل خوش کن پروگرام تھا۔

سب ڈرائیونگ روم میں آ بیٹھے۔ شائد سب کو قہوے کی نفیس اور  
 بسک پیالیوں میں خوشبودار قہوہ پیش کر رہی تھی۔ گپ شپ لگ رہی تھی۔

شائد کے چہرے کا رنگ متغیر ہو چکا تھا۔ اس نے سیٹ کی بلیک پیر  
 رکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

عثمان اپنے آپ میں گم تھے۔ نصیر کے یہ کیا - کہنے پر متوجہ نہ ہوئے۔  
 گانے کے لول کا نول میں اترے تو جیسے گھٹلا ہوا سیمہ کانوں میں اند  
 گیا۔

۔ خراب تو نہیں کیٹ - نصیر نے کہا۔ وہ کچھ سمجھ بھی نہ پائے۔ کہ عثمان نا  
 جھپٹ کر شپ بند کر دیا۔ ٹین دبا کر کیٹ باہر نکالا۔ اللہ جل کی سرعت -  
 کیٹ کھڑکی سے باہر دریا کی طرف اُچھال دیا۔

نصیر کچھ نہ سمجھے۔ غور سے عثمان کی طرف دیکھا۔ جو خاصے بے چین ہو گئے  
 تھے۔

کیا بات ہے دوست - نصیر نے حیرانگی سے ان کی طرف دیکھا۔

۔ کچھ نہیں - عثمان نے سختی سے آنکھیں میچ کر کھولیں۔

۔ کیٹ باہر کیوں پھینک دیا - نصیر نے پوچھا۔

۔ کوئی اور بات کہ نصیر - میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے شائد  
 نے کہا۔

شائد ٹوٹ چھوٹ رہی تھی۔

نصیر نے ایک مزدیدہ سی نگاہ اس پر ڈالی۔ پھر عثمان کو دیکھا۔ چند

چپ رہا۔ پھر بولا - گاڑی میں ڈرائیو کرتا ہوں۔ تمہاری طبیعت واقعی

خراب ہو رہی ہے۔

۷۲۰۰۰

نصیر اور عثمان ان میں نہیں تھے۔ سب ان کا انتظار کر رہے تھے۔

عثمان ڈرائینگ روم کی طرف آرہے تھے۔ کہ نصیر ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئے۔ صبح سے وہ شش در پنج میں تھے۔ آج عثمان کے کیٹ پیکنے کے واقعے کی روشنی میں انہوں نے اپنے سات دن کے قیام میں شائدہ اور عثمان کے رویے کو دیکھا تو یہ الجھن واضح طور پر محسوس ہوئی۔ کہ دونوں خوش باشی کے باوجود کچھ کٹے کٹے ہیں۔ اک مخلص اور سچے دوست کی حیثیت سے انہیں الجھن ہو رہی تھی۔ وہ عثمان سے اس بارے میں پوچھنا چاہتے تھے۔

کیوں۔ عثمان نے زکام سے سرخ ہوئی آنکھوں اور ناک کو رومال سے

پونچتے ہوئے پوچھا

۔ بیٹھو۔

۔ کوئی خاص بات۔

۔ نہیں۔ یونہی

۔ تو چلو ڈرائینگ روم میں سب بیٹھیں۔

۔ کچھ وقت تمہارے ساتھ تنہا گزارنے کو بھی جی چاہ رہا ہے۔

۔ یہ کیا سمائی دماغ شریفین میں۔

۔ بس دل چاہتا ہے۔ تم بیٹھو تو سہی۔

عثمان ایک گدے دار کرسی پر بیٹھ گئے۔ زکام واقعی شدت اختیار کر رہا تھا۔ کبھی چھینک آجاتی۔ کبھی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔

نصیر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ نشین میں اپنا قیام انہوں نے زندگی کی سب سے خوبصورت یادگار قرار دیا۔ نشین کی انہوں نے بے حد تعریف کی۔

۔ بہت پسند ہے تمہیں میرا گھر۔ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔

۔ ہاں۔ اس کا نام نشین کی بجائے گوشہ عافیت ہونا چاہیے تھا۔

وہ بولے۔ سکون ہی سکون ہے ہر سو۔

نصیر نے جان بوجھ کر یہ بات کہی تھی۔ وہ عثمان کا رد عمل دیکھ کر بات بڑھانا چاہتے تھے۔ عثمان مضطرب تو ہوئے لیکن نصیر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بولے۔

یہ گرم لینا چاہو گے۔

کیا؟ نصیر نے حیرانگی سے انہیں دیکھا۔ وہ مذاق کے موڈ میں قطعاً نہیں تھے۔

۔ میں یہ گرم لینا چاہتا ہوں۔ وہ اطمینان سے بولے

۔ کیوں؟ نصیر حیران سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

عثمان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ چند لمحوں کے کمرے میں ٹہلتے رہے۔ پھر

سگریٹ سلگایا۔ نصیر کو پیش کیا۔ خود بھی کش لیتے ہوئے پھر صوفے پر بیٹھ گئے۔

۔ کیا بات ہے مانی۔ نصیر ان کے قریب آ بیٹھے۔

۔ بات کوئی خاص نہیں۔ عثمان نے لاپرواہی کا انداز اختیار کرنے کی کوشش

کی۔

۔ پھر بھی۔

”میں باہر جا رہا ہوں۔“

”کہاں۔“

”شاید کیلغورینا۔“

”کیوں۔“

”وہیں ٹھیل ہونے کے لیے۔ اس کی کسی خوبصورت اضافی بستی میں۔“

”لیکن کیوں۔ اتنے شوق سے تم نے یہ گھر بنوایا۔“

”غلطی کی۔“

”کچھ بتاؤ گے نہیں۔“

عثمان خود بخود افشا ہوئے جا رہے تھے۔ جونہی یہ احساس ہوا۔ سنبھل

گئے۔ نصیر کو کوئی بات اس لیے بتانا نہیں چاہیے تھی۔ کہ وہ عشرت بانو کے

عزیز تھے۔ ویسے بھی وہ اپنا دکھ تو سوائے اپنے آپ کے کسی کو بتا ہی نہ سکتے

تھے۔ اس دکھ کی کوئی گڑھی کوئی بستی بھی کسی تک پہنچنے سے پہلے وہ مر جانے کو

ترجیح دے رہے تھے۔

نصیر نے کرید کرید کر پوچھا۔ تو انہوں نے بات بنالی۔ مراد محل کے قریب

رہنا۔ ایسی پرسکون زندگی میں بلبل مچائے رکھنے والی بات تھی۔ وہ انہوں نے

کٹ کر انہوں کے قریب اتنی بیگانگی سے رہ کر زندگی کی خوشیوں سے لطف

اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ گو مراد محل میں آنا جانا ہو گیا تھا۔ پھر بھی بیگانگی اپنی

جگہ تھی۔

ساری باتیں سننے کے بعد نصیر بولے۔ ”یکٹی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔“

”ان لوگوں سے گھل مل کر اجنبیت کو ختم کر سکتے ہو۔“

”یہ ممکن کر سکتے ہو۔“

”کیوں۔“

”وہ لوگ شائد کو قبول نہیں کرتے۔ اور شائد کی دل آزاری مجھے کبھی  
گوارہ نہ ہوگی۔“

نصیر نے حیرانگی سے عثمان کو دیکھا۔ پھر بولا۔ ”میں نے تو ایسی کوئی بات  
محسوس نہیں کی۔ عشرت آئی اور مراد محل تو شائد کی بے حد تعریفیں کرتے

ہیں۔“

عثمان چونکے۔ بہانہ کار گرہ نہیں تھا۔

”بلکہ۔ مراد محل تو اس روز کہہ رہے تھے۔“

”کیا۔“

”تمہاری برتھ ڈے منا رہے ہیں۔ اور اس دن کا تحفہ تمہارا سارا شیر ذوہ

تحفہ واپس لوٹا رہے ہیں۔ اور یہ سب اس لیے کہ شائد کو انہوں نے

تمہارا بہترین انتخاب قرار دیا ہے۔“

عثمان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔ بچی کے

دو پاؤں میں آکر جیسے آنا فانا پس گئے۔

”کوئی اور بات ہے۔ نصیر نے کہا تو عثمان کی جیسے سانس الجھ گئی۔ کھانسی

نے لاج رکھ لی۔ ورنہ راز راز نہ رہتا۔“

”تم اور شائد ناراض ہو۔ نصیر نے لاعلمی میں فشر زخم میں اتار دیا۔ عثمان



مجھے اعتراف ہے کہ تصور میرا ہی ہے۔ وہ مسکرا کر بولے۔ منانا بھی مجھے ہی پڑے گا۔ شائد اس معاملے میں بڑی خمدی ہیں۔ آسانی سے مانیں گی توڑا ہی۔

نصیر اطمینان سے مسکرائے۔ ان کی آنکھیں کسی شوخ شوخ سے چمک رہی تھیں۔ دونوں باتیں کرتے باہر آ گئے۔

نشین کی فروخت کے لیے عثمان بنجیدہ تھے۔ نصیر نے اس سلسلہ میں باتیں پور ہی تھیں۔ باہر جا کر آباد ہونے کا ان کا ارادہ قطعی اور یقینی تھا۔ دونوں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

کہاں غائب تھے۔ بنجیدار نے آتے ہی سوال کیا۔

”دکھ سکھ کی باتیں کر رہے تھے۔ نصیر مسکرائے۔

”چوری چوری“ کسی نے کہا۔

”آپ کو بھی بتاتے ہیں۔“ نصیر صوفے پر پھل گئے۔

نصیر۔ عثمان نے آنکھوں کے اشارے سے منع کیا۔ نصیر کھلکھلا کر ہنس پڑے اور ہاتھ پکڑ کر عثمان کو بھی قریب ہی بٹھالیا۔ اب وہ شائد کی درخواست پر مسکرا رہے تھے۔ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

پہلے قبوہ پلائیے۔ نصیر کندھے اچکاتے ہوئے مسکرائے۔

شائد دو پیالوں میں قبوہ بھر چکی تھی۔

وہ پیالیاں لیے ان کی طرف آئی۔ نصیر کو پیالی پیش کی اور دوسری عثمان کی طرف بڑھائی۔

کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ دماغ گھوم رہا تھا۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر ہٹا لیا۔

معاملے کی سنگینی سے نصیر قطعاً واقف نہ تھے۔ اپنی لے میں بولتے گئے۔ انہوں نے ہفتے بھر کے قیام میں یہ بات محسوس کی۔ کہ شائد اور عثمان کے درمیان کوئی نہ کوئی ناخوشگوار ہی ہے۔ یہ بات انہوں نے آج صبح کیسٹ کے پھینکنے کے واقعے کی روشنی میں کہی تھی۔

عثمان سنبھل گئے۔ نصیر سے جان چھڑانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ لے آئے۔ اور بولے۔ میری اور شائد کی لڑائی ہوئی ہے۔

”مان لیا نا“

”ہاں۔ جس دن تم لوگوں نے اتنا طول دے دیا۔“

”بھئی تم لوگوں نے ایسے دھماچو کڑی مچائی۔ کہ موقع ہی نہ ملا۔“

”میں اور فار یہ بہت لڑتے ہیں۔ لیکن یہ لڑائی چند گھنٹوں سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔“

”کل تم لوگ جاؤ گے تو ہماری بھی صلح ہو جائے گی۔“

عثمان نصیر کو جھانسا دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اب وہ بہت سنبھل سنبھل کر مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔

”لڑائی کس بات پر ہوئی۔“ نصیر نے پوچھا

”بھئی اب اتنی تفصیلات میں نہ جاؤ۔ لڑنے کو بہاروں باتیں ہوتی ہیں۔“

”ہاں“

”خوب انجوائے کیا ہے۔“

”بالکل بالکل۔ یاد رکھ رہیں گے یہ دن۔“

”خاص کر پکنک۔“

”واقعی۔“

”لیکن“ نصیر نے کہا۔ سب تجسس سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ عثمان

بھی مسکرا رہے تھے وہ مطمئن تھے کہ نصیر کو انہوں نے بہلا وہ دے لیا تھا۔

”ابن شائد ان کی باتوں سے پریشان تھی۔“

”بغیر چند سیکنڈ خاموش رہے سب کو الجھن مہونے لگی۔“

”کبھی بھی اب کچھ۔“

”آپ لوگوں نے کوئی خاص چیز دیکھی ان دنوں۔ کچھ محسوس کیا۔“

”یعنی۔۔“

”یعنی عثمان اور شائد کے متعلق آپ نے کچھ نوٹ کیا؟“ نصیر نے کہا

”شائد کارنگ فٹ ہو گیا۔ اس کا وجود اندر ہی اندر لرز گیا۔“

عثمان نے گھور کر نصیر کو دیکھا۔ باقی سب بھی حیران حیران ایک دوسرے

رد دیکھنے لگے۔ جرت نو مسکرا نے لگی۔

”جی ہاں میں نے محسوس کیا؟“ وہ بولی۔

”کیا؟“

”کہ شائد بھابی اور عثمان بھائی روٹے ہوئے ہیں۔“ وہ دھیمی سی مسکرا،

”بھابی عثمان کو قہوہ دیتے ہوئے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں۔“ نصیر

نے کہا۔

اور

پیالی شائد کے ہاتھوں سے واقعی چھوٹ گئی۔ وہ پیار لگی اور کرب

کی محرابوں تلے گزرتے ہوئے عثمان کو تک رہی تھی۔ عثمان کی نگاہ بیگانہ

تھی۔ جو شائد سمجھی تھی وہ بات نہیں تھی۔

قہوہ گرم تھا۔ چند قطرے شائد کے پاؤں پر بھی پڑے۔ نصیر معذرت

خواہ ہوا۔ منم نے اپنا رد مال شائد کے پاؤں پر پھیر کر گرم قطرے جذب کر لے

شائد شکر یہ کہتے ہوئے مڑی۔ دوسری پیالی بناٹی اور نموسے استدعا

کی کہ وہ عثمان کو قہوہ پکڑا دیں۔

نصیر نہیں دیئے۔

عثمان نے شکر یہ کہ ساتھ پیالی نموسے لے لی۔

قہوہ ختم کر کے نصیر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”نوائین و حضرات۔“ انہوں نے کسی سیاسی لیڈر کی طرح خطاب کرنے کا

انذار اپنایا۔

سب مسکراتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”آج یہاں ہمارے قیام کی آٹھویں اور آخری رات ہے۔“ نصیر نے کہا۔

”بالکل بالکل۔“ سب بولے۔

”آپ لوگ آٹھ دن یہاں رہے ہیں۔“

”حاضرین“ نصیر نے مزاحیہ انداز میں کہا۔  
”فرمائیے۔“

”یہ بات خلوص کے منافی ہے اور اچھی بھی نہیں گتی۔ کہ ہم اپنے مشفق اور بہران میزبانوں کو روٹھا چھوڑ کر جائیں۔“  
”بالکل۔ بالکل۔“ سب نے تائیدیں سجائیں۔ ”ابھی صلح کروادینی چاہیے۔“  
”ضرور۔“ نصیر نے کہا۔

”نصیر۔“ عثمان نے قدرے حکمانہ انداز میں جل کر کہا: ”شکر یہ تمہاری ضرورت نہیں۔ یہاں سے سدھارو گے تو صلح کر لیں گے۔“  
”گویا آپ مان گئے۔“ سنجیدہ لہجے میں انوار کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”کہ روٹھے ہوئے ہیں۔“

”شانہ نے تڑپتی نگاہیں عثمان پر ڈالیں۔ وہ مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے بتیار کی بات کا جواب دے رہے تھے۔

نصیر نے عثمان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھایا۔  
”نو آپ شانہ کو ادھر لائیں۔“ نصیر نے کہا۔

عثمان عجیب شش و پنج کے عالم میں تھے۔ اس وقت سخت رویہ اختیار کرتے۔ تو معاملہ سنگینی کی طرف جاہل ممکن تھا۔ لیکن نصیر جس طرح صلح کرانے کے موڑ میں تھے۔ وہ بھی گوارہ نہ تھا۔

لیکن

باقی سب لوگ تو ہلاکلا کے موڑ میں تھے۔ سب اٹھ کر ان کے گرد گھیرا

سے بولی۔

باقی سب حیران ہو ہو کر عثمان اور شانہ کو دیکھنے لگے۔ شانہ کے توڑ کے باوجود پسینے چھوٹ گئے۔ جسم سے جیسے ساری توانائی کسی نے کھینچ کر سی میں مڑھال ہو کر گر گئی۔  
عثمان کو نصیر رخصت تو کیا۔ لیکن دوست کے علاوہ وہاں بھی تھا چہ ہو گئے۔

”میں نے یہ بات شانہ سے پرسوں پوچھی بھی تھی۔“ نموبولی۔ ”ان کو آنکھیں بے حد اس تھیں۔ میں نے ٹولا۔ تو کہنے لگیں۔ بتادوں شانہ کیا کہا تھا۔“ شانہ نے تو کوئی جواب نہ دیا۔ اور وہ شوخ نظروں سے نہ کوٹکتے ہوئے بولی۔ ”میری آنکھوں میں اُو اسی قدر تھی ہے۔ یہی تو حسن ہے اسی پر تو عثمان مفتوں ہوئے تھے۔ یہ جواب تھا محترمہ کا۔“

سب مسکرا مسکرا کر شانہ اور عثمان کو تنک رہے تھے۔ عثمان خفت محسوس کر رہے تھے۔ نمو کی بات نے انہیں خاصہ بے چین کر دیا تھا۔

”تو گویا۔ ثابت ہو گیا کہ دونوں ناراض ہیں۔“ نصیر نے کہا۔

”آپ دونوں کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں۔“ آصف ہنسے۔

”بہن تو کچھ محسوس نہیں ہوا۔“ شیما بولی۔

”یہ بات تصدیق شدہ ہے شیما بھابی۔“ نصیر نے کہا۔

”اچھا۔“ وہ حیران تھی۔ لیکن اب عثمان کے تیور اور شانہ کا انداز

کر شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی تھی۔

”ہاں۔ ہاں۔۔ سب بولے۔  
 ”چلو مانی۔ اٹھاؤ بھائی کو اور لے جاؤ خوابگاہ میں۔۔ یہ سزا ہے۔  
 مناؤ انہیں جا کر۔ نصیر نے کہا۔

اور

عثمان جو وہاں کھڑے آگ کی بھٹی میں جلے جا رہے تھے۔ جان چڑانے  
 کو غنیمت جانا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں پر شائے کو اٹھایا۔  
 سب نے پر زور قہقہے لگائے۔ وہ ڈرائینگ روم سے نکلے۔ سب  
 پیچھے پیچھے آئے۔ خوابگاہ تک ان لوگوں نے بہتے شور مچاتے ان کا تعاقب  
 کیا۔

”بس۔ خوش ہیں آپ۔ شائے کو ہاتھوں پر اٹھائے خوابگاہ کے دروازے  
 میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے پلٹ کر کہا۔ شائے ریسک رہی تھی۔  
 سب نے ہاتھ ہلا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔  
 عثمان اندر داخل ہوئے

اور

وہ سب اپنی اپنی خوابگاہوں کی طرف چل دیئے۔  
 اندر آکر عثمان نے شائے کو میڈر پر ڈال دیا۔ وہ بالکل بے دم ہو گئی تھی۔  
 عثمان نے ایک لمحہ بھی وہاں رکنہ گوارہ نہ کیا۔ شائے کی طرف دیکھے  
 بغیر وہ دوسرے دروازے کی طرف پلے۔  
 ”مانی۔۔ شائے بے اختیار ہو کر چیخ اٹھی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی

بنا کر کھڑے ہو گئے۔ نموشائے کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے لے آئے  
 کسی ذہنی کیفیت سے عثمان کے سروا کوئی واقعہ نہ تھا۔  
 سب نے شور مچا کر تالیاں پیٹیں۔  
 نصیر نے عثمان کا ہاتھ پکڑ کر شائے کی طرف بڑھایا۔

اور

نمونے شائے کا ہاتھ عثمان کے ہاتھ میں دے دیا۔  
 ”مبارک مبارک۔ نصیر نے ہاتھ سرے اوپر لے جا کر تالی بجائی۔  
 ”یوں نہیں صاحب۔ ابراہ نے چھیڑا۔  
 ”آصف نے عثمان کو ہلکا سا ٹھوکا دے کر شائے کی طرف دھکیلا اور  
 نے شائے کو عثمان کی طرف ہلکا سا دھکا دیا۔  
 ”یوں نہیں۔ صنم نے تو شائے کو پکڑ کر عثمان کے سینے پر دے مارا۔  
 سب بہتے بہتے جیسے باؤ لے ہو گئے عثمان کو مجبوراً شائے کو تھامنا پڑا۔  
 آگ جیسے انہوں نے سینے سے لگالی۔  
 شائے کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ عثمان کے سینے سے  
 کر بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

سب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے عثمان اب سکھ بھی نہ سکتے  
 شائے کے آنسوؤں نے مذاق کو سنجیدگی میں بدل دیا۔  
 چلو بھی چھوڑو۔ نصیر نے ہنس کر معاملے کو خوشگوار رکھنے کا  
 زیادتی عثمان کی ہے۔ اب سزا انہیں ملنا چاہیئے۔

وہ بقیہ رات اندر نہیں آئے۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر سوتے جاگتے وقت گزار دیا۔ شائندہ دم سادھے پڑی رہی۔ پیچ سکی نہ رو سکی۔ ہاں نیند اس کی جلتی آنکھوں سے دور ہی رہی۔ صبح ہونے کو تھی۔ جب اس کی آنکھ لگی۔

صبح نصیر کے بیدار ہونے سے پہلے عثمان کمرے میں آگئے۔ بستر کے آخری سرے پر جہاں شائندہ بیٹھی تھی۔ وہیں سگریٹ سٹک کر سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تکیاں اور اذیت کے واضح آثار تھے۔

عثمان نے دوسرے سرے پر رکھا کبل اٹھایا۔ کئی لمے شائندہ کو دیکھتے رہے پھر اس کی سے کبل اس پر ڈال دیا۔

نصیر کے اٹھنے تلک انہوں نے بیٹا ر سگریٹ پھونک ڈالے۔ وہ بڑے وحشیانہ طریق سے سگریٹ پی رہے تھے۔

تھی۔

عثمان نے رُکے بغیر اس کی طرف دیکھا۔

ان کی نظریں کسی طور ہمدر داند نہ تھیں۔

وہ جلدی سے دروازے سے باہر برآمدے میں نکل آئے۔ شائندہ کے میں منہ چھپا کر بے اختیار ہو ہو کر رونے لگی۔

کر

اب

رونا ہی اس کا مقدر تھا

احساس تکلیف وہ تھا۔ شائہ شیریں سے دل ہلار ہی تھی۔ اسے گود میں بیٹھی تھی۔ رات جانے کتنی دیر تک زدتی رہی تھی۔ آنکھیں سرخ و متورم تھیں۔ عثمان نے بھی رات، بیٹے کانٹوں پر گنہاری تھی۔ شائہ کے جسم کے لمس نے جلاڈالا تھا۔ ویسے بھی زکام سے طبیعت بوجھل تھی۔ کچھ حرارت بھی محسوس کر رہے تھے۔ دھوپ کی زد میں بیٹھے تھے چہرہ خاصا سرخ ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے مراد مل سے ان کا پرانا نوکر رفیق آیا تھا۔ اور انہیں اباحضور کا پیغام دے گیا تھا۔

جہاں تک عثمان اندازہ کر پائے تھے۔ بلا وہ برآمدہ کے سلسلہ میں تھا۔ جس کے متعلق نصیر نے بتایا تھا۔ موقع تو لاکھ خوشیوں کا تھا۔ لیکن خوشیاں تو ٹھہر منوع تھیں ان کے لیے۔ اس موقع پر دل لچر اور بھج گیا تھا۔

ہم خوشیوں کے پیچھے پارے مارے پھرتے ہیں۔ انہیں پچھلے چھو لینے۔ پالنے کی آرزو میں مڑ کے جیتے ہیں۔ یہ ہاتھ نہیں آتیں۔ ترسائے سا کر دانتی ہیں قریب آ کر دوسرے جانتی ہیں۔

لیکن

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے۔ کہ خوشیاں ہمارے تعاقب میں ماری ماری پھرتی ہیں۔ اور ہم انہیں پکڑائی نہیں دیتے۔ ان کے ہاتھ نہیں آتے۔ عثمان کی بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔

محبت، پوری جوش میں آگئی تھی۔ موج بن کر انہیں سیراب کر دینے کو تھی۔ لیکن وہ — وہ تو سوکھا ساحل تھے۔ اتنا سوکھا۔ کہ یہ موج کسی طور سیراب

- اباحضور نے آج شام بلا بھیجا ہے۔

- آپ کو۔

- آپ کو بھی۔

- پھر۔

- میں پانچ بجے آ جاؤں گا۔ تیار رہیے گا۔

- اچھا۔

- لباس اچھا سا پہنیے گا اور چہرے کے تاثرات —

شائہ نے اک اذیت زدہ نگاہ عثمان پر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا۔ کھلے کے بعد دونوں لاؤنج میں آ بیٹھے تھے۔ بہانوں کے چلے جانے سے گھر ایک دم سونا ہو گیا تھا۔ بلا گلا شور شرابا۔ ہنسیاں قہقہے سب ختم ہو چکے تھے۔ ماحول پر دبی آلتا دینے والی یکسانیت طاری ہو گئی تھی۔ جسے ریڈیو گرام پر چلنے والے ملکی اور غیر ملکی خوبصورت نغمے بھی نہ توڑ سکے تھے۔ سناٹوں کا

گول مثل سیب ایسے گالوں والا شیریں بے انتہا پیارا لگ رہا تھا۔ عثمان نے اسے آیا سے لے لیا۔ اور باز دوں میں بھر کر بے تحاشا پیار کرنے لگے۔  
مراد محل نشین سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ بہت بڑی پہلنی طرز کی عمارت کو جدید طریقے سے آراستہ کیا گیا۔ بیسیوں کمرے تھے۔ ہر کمرہ بیش قیمت قالینوں ریشمی پردوں اور نفیس فرنیچر سے آراستہ تھا۔ وسیع و عریض ڈرائیونگ ہال تو عمارت کے دل کی حیثیت رکھتا تھا۔  
مراد محل بہت بڑے میدانی قطعے میں واقع تھا۔ ایک دوسروں پر پھیلے باغات تھے جتنی حصے سے چھو کرندی گزرتی تھی۔ بسک رفتار مندی میں چھوٹی چھوٹی سڑکیں کشتیاں اہل خانہ کی سیر و تفریح کے لیے تیرتی تھیں۔

عثمان نے جب اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ تو مراد محل میں بھونچال آگیا تھا۔ اس کے در و دیوار عثمان پر تنگ ہو گئے تھے۔ عشرت بالوں نے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اور ابابھی انہیں کے ایما پر اناگر جے بر سے تھے۔ کہ عثمان کو یہ گھر چھوڑ دینا پڑا تھا۔

لیکن نشین بن جانے پر جو تقریب عثمان نے کی تھی۔ اس میں ان سب لوگوں نے شرکت کی تھی۔ عثمان نے بڑی مشکلوں سے حالات کو سلجھایا تھا۔ یہ لوگ نہ آتے تو نشین بننے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

بہر حال صلح ہو گئی تھی۔ اس تقریب کے بعد بھی عثمان اور شائندہ دو تین دفعہ مراد محل گئے تھے۔ اور ایک دفعہ عشرت بانو اپنی بیٹیوں کے ہمراہ یہاں بھی آئی تھیں۔

شائندہ کے حسن و جمال اور شائستہ اخلاق سے سب ہی مغرب ہوئے تھے۔

کمرنے کی اہل نہ تھی۔ منیجر، ویران اور خشک ساحل۔  
- شیریں کو بھی ساتھ لے جانا ہے۔ عثمان نے کمرے کی پشت پر گردن ڈالا دی۔

اچھا۔ وہ بے دلی کے بولی۔  
- کوئی بہت اہم فیصلہ کیا ہے اب حضور نے۔ عثمان شیشے کی دیوار کے بازو پر ہوئے چن میں خرااں خرااں پھرتے ہنسوں کے جوڑے کو حسرت سے دیکھتے ہوئے بولے۔ شائندہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ شیریں کے پیاز کی گالوں پر جھک کر اس ہونٹ رکھ دیئے۔

کچھ دیر عثمان وہیں بیٹھے رہے۔ پھر اٹھ کر بائیں کی طرف چلے گئے۔ شائندہ نے چاہا کہ انہیں کھلی فضا میں جانے سے روک لے۔ آج ہوائیں خاصی ٹھنڈی تھیں۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

ان کے جانے کے بعد اس نے ریڈیو گرام بند کر دیا اور شیریں کو بازو پر بٹھائے آیا کے پاس چلی گئی۔ اس کی نیپی تبدیل کرنے والی تھی۔  
شام پانچ بجے شائندہ تیار بیٹھی تھی۔ اس نے مور کے پردوں کی بھاری پڑ کی ساڑھی پہنی تھی۔ جوڑا انگوٹھ اس کی گردن کی خوبصورتی اور بڑبڑا رہا تھا بالوں کا شانل خوبصورت تھا۔ اور نفاست سے کیے گئے میک اپ نے اس کے حسن میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ عثمان باہر ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے اک نگاہ پر ڈالی۔ اور گہرا کر جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ قدم قدم پر آدھاناش تو زندگی کس قدر دشوار ہو جاتی ہے۔

آیا شیریں کو لے کر آگئی۔ اسے آیا نے ہلکے زرد رنگ کا ادنی سوٹ پہنا

لائے انہیں۔ مراد علی خاں نے کہا  
عثمان اٹھ گئے۔ چند لمحوں بعد وہ شیریں کو لیے اندر آ گئے۔ فاخرہ اور سائرہ  
جی ساتھ تھیں۔

مراد علی خاں نے بچے کو گود میں لے کر خوب پیار کیا۔  
چاہت کا جس قدر اظہار ہو رہا تھا۔ عثمان اتنے ہی بے چین اور اداس ہوئے  
جارے تھے۔ شائستہ بھی دم بخود تھیں۔ لیکن دونوں کو اپنی اپنی جگہ پورا پورا احساس  
حقا۔ دل کی کیفیات عیاں نہ ہونے دے رہے تھے۔  
چائے بڑی پرتکلف تھی۔

”یہ کباب میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں۔ سائرہ نے کہا۔ صرف اس  
لیے کپڑا ہی سی بھابی آرہی ہیں۔“

”اور یہ چاٹ میں نے تیار کی ہے شائستہ بھابی“ فاخرہ بولی۔ خدا قسم کبھی  
بدر چرخانے کا منہ نہیں دیکھا صرف ایک ہی خاطر یہ کام کیا ہے۔  
”شکر یہ۔ شائستہ محبت کی مار کھا رہی تھی۔“

”صرف بھابی کے لیے۔ عثمان نے شائستہ کے چہرے پر سو گوار سائے دیکھے  
تو معاف کو خوش گوار تاثر دینے کے لیے سائرہ اور فاخرہ سے کہا۔ ہم کچھ نہ ہوئے  
آپ کے۔“

”بھابی تو بھابی ہیں نا۔ سائرہ نے بازو شائستہ کی گردن میں ڈال کر پیادے  
کہا۔  
”بھابی لا جواب ہیں۔“ فاخرہ بولی۔

”ماشاء اللہ ماشاء اللہ“ عشرت بانو نے دُش شائستہ کی طرف بڑھاتے ہوئے  
کہا۔

اور یہ شاید اسی کا نتیجہ تھا۔ جو آج مراد علی خاں نے بیٹے اور بہو کو بطور خاص گھ  
بلایا تھا۔

شائستہ عثمان کے ساتھ دو تین دفعہ پہلے بھی آئی تھی۔ لیکن آج اس کا آنا  
جس طرح کیا گیا۔ وہ خود بھی حیران رہ گئی۔

گاڑی سے باہر آتے ہی عشرت بانو جو پورچ میں سر پائانتظار کھڑی تھی  
تپاک سے آگے بڑھیں اور شائستہ کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ عثمان کا  
بھی کتنی دیر لپٹائے پیار کرتی رہیں۔

سائرہ اور فاخرہ تو شیریں کو چھپٹ لے گئیں۔ دونوں ہنسیں بچے کو اٹھ  
کے لیے لڑ رہی تھیں۔

مراد علی خاں ڈرائیگ روم میں تھے عشرت بانو شائستہ کو لیے ڈرائیگ  
روم کی طرف آئیں۔ عثمان ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ وہ بے حد افسردہ ہو رہے  
تھے۔ کاش ان کی زندگی اتنے بڑے آلیے سے دوچار نہ ہوئی ہوتی۔  
شائستہ نے مراد علی خاں کو حسب سابق قدرے حجب کر ہاتھ پیشانی تک  
لے جاتے ہوئے سلام کیا۔

”جیتی رہو۔“ مراد علی خاں نے اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھ کر  
عثمان نے بھی پدری محبت کے جوشیلے انداز میں معاف کیا۔

”بیٹھو بیٹی۔“ مراد علی خاں نے غمخیز صوٹ پر بیٹھتے ہوئے شائستہ کو قریب  
بٹھالیا۔ عثمان سامنے والی گدے دار کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے دائیں ہاتھ  
عشرت بانو تھیں۔ احوال پرسی کی سبکی اور تکلف زدہ باتیں ہونے لگیں۔

”شہر یار کہاں ہیں۔“ مراد علی خاں نے پوچھا۔ ”انہیں نہیں لائے۔“  
سائرہ کے پاس ہیں۔ عشرت بانو بولیں۔ ”دونوں ہنسیں چھپٹ پڑیں ان پر۔“



مراد علی خاں خوش دلی سے مسکرا رہے تھے۔  
چائے کے بعد مراد علی خاں اور عشرت بانو شائندہ اور عثمان کو لے کر اپنی ذاتی نشست گاہ میں آگئے۔  
عشرت بانو شائندہ کے پاس بیٹھیں۔ عثمان مراد علی خاں کے قریب صوفے پر بیٹھ گئے۔  
عشرت بانو شائندہ سے باتیں کرنے لگیں۔ اس کے والدین اور بھائی بہنوں کا پوچھنے لگیں۔ شائندہ بڑے سلیمہ انداز میں ابھی باتوں کا جواب دینے لگی۔

ظریفہ کے متعلق عشرت بانو نے خاص طور پر پوچھا۔  
"ان کی شادی کرنے کا ارادہ نہیں ابھی۔"  
عشرت بانو کا شوق و تجسس مخفی نہ تھا۔ شائندہ مسکرا کر بولی۔ "ان کی منگنی شاید اگلے ہفتے ہو جائے۔"  
"اوہو۔۔۔" عشرت بانو کو بیسے افسوس ہوا۔  
"کیوں جی۔" مراد علی خاں پوری دلچسپی سے دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔  
"یوں ہی۔" عشرت بانو بولیں۔  
"نہیں تو۔" آپ کے ارادے شاید کچھ اور تھے۔ وہ مسکرائے۔  
"تھے تو۔" عشرت بانو مسکرائیں۔ "لیکن اب تو دیر ہو چکی۔"  
شائندہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"وہ بھی اپنی شائندہ ہی کی طرح خوبصورت اور شائستہ ہیں۔" عشرت بانو نے کہا۔ "انہیں اس کے لیے مانگنے کا خیال تھا۔ شائندہ نے تو حسنِ اخلاق سے ہمیں جیت لیا ہے۔ وہ بھی ان کی بہن ہیں۔"

وہ خود ہی ہنس پڑیں۔ عثمان کچھ مضطرب ہوئے اور شائندہ ان کا اضطراب دیکھ کر افسردہ ہو گئی۔ مراد علی خاں مسکرانے لگے۔ "خیال اچھا تھا۔ وہ بوجے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔"  
پھر مراد علی خاں سگار کے کش لیتے ہوئے عثمان کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ عثمان سنبھل کر بیٹھ گئے۔ عشرت بانو اور شائندہ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔  
"بیٹے۔ وہ بولے۔  
"جی۔  
"آپ کی ساگرہ آرہی ہے۔"  
"جی۔"

"ہم نے پچھلے سال بھی آپ کی ساگرہ منائی تھی۔ گو آپ شامل نہیں تھے۔"  
"ہیں۔ میں نادم ہوں ابا حضور۔"

وہ فراخ دلی سے مسکرائے۔ شائندہ کی طرف دیکھا اور بولے۔ "ہیں آپ کا انتخاب بہت پسند ہے عثمان بیٹے۔ ہم نے شائندہ بیٹی کو کسی لحاظ سے بھی اپنے خاندان کی کچیوں سے کمتر نہیں پایا۔ حسن صورت اور حسن سیرت میں وہ لاشانی ہیں۔ آپ مبارک کے مستحق ہیں۔"

عثمان کی بے چینی دید کے قابل تھی۔ شائندہ کا سر جھک گیا تھا۔  
مراد علی خاں کچھ دیر بیٹی باتوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ عثمان اگر اپنی ضد میں اپنی حدود سے تجاوز نہ کر جاتے۔ ہمیں خود سری سے اشتعال نہ دلاتے۔  
تو شاید ہم شادی کا فریضہ اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے۔"  
عثمان نزاعت سے پانی پانی ہوئے جا رہے تھے۔ اور شائندہ کا رنگ فق ہو رہا تھا۔

عشرت بانو مسکرا کر بولیں۔ چلیے جو سوچکا۔ سو سوچکا۔ اب تو آپ نے بیٹے کو معاف کر دیا ہے۔  
 "معاف تو اسی دن کر دیا تھا۔ جس دن ان کی دعوت ہم نشین چلے گئے تھے۔  
 مراد علی خاں بولے۔

عثمان کچھ نہیں بولے۔

"کرتے بھی کیا شائندہ بیٹے۔" مراد علی خاں بولے۔ عثمان ہمارے ایک ہی بیٹے ہیں۔ معاف تو ہم انہیں اسی وقت کر دیتے۔ اگر شادی کے بعد یہ آپ کو لے کر مراد علی آجاتے۔ بہر حال ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے بیٹے نے جو آن اور وقار وراثت میں پایا ہے۔ اس کی پوری طرح حفاظت کی۔  
 "ذرا نوازی ہے اما حضور۔ عثمان خفت سے مسکرائے۔ ان کے چہرے پر اضطراب کے سائے بڑے گہرے تھے۔

"ہم تو شادی میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ اور ڈیڑھ سال تک ہم نے اپنی بہو بیکم کی صورت بھی نہ دیکھی۔ لیکن خیر۔ دیکھا تو اطمینان پایا۔ عثمان بیٹے اب ہم تمہاری سالگرہ اس شان سے منانا چاہتے ہیں۔ کہ شادی میں شامل ہونے کا ملال جاتا رہے گا۔"

عثمان نے مضطربانہ شائندہ کو دیکھا۔ شائندہ جیسے کند چھری تلے آئی ہوئی تھی۔ اس میں اب اور برداشت کرنے کی ہمت نہ رہی تھی۔

جوں جوں وہ شائندہ کی تعریفیں کر رہے تھے۔ شائندہ کی اذیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور کرب کی کیفیت ترپ رہی تھی۔ عثمان بے چاہی تھے۔ ڈر رہے تھے کہ بھرم کا نازک شیشہ کہیں کرچی کرچی نہ ہو جائے۔ وہ اپنے خوف سے اس قدر مخالف تھے۔ کہ مراد علی خاں تو دیر باپ بیٹے

عشرت بانو کے اس ایک ایک پلٹے کے متعلق بھی کچھ نہ پوچھ سکے۔ انہوں نے خود ہی بتا دیا۔ کہ فوقیہ کی منگنی بہت اچھی جگہ پر ہو گئی ہے۔ عثمان سے انہیں رنجش تھی تو فوقیہ کی وجہ سے۔ اب وہ ان کی طرف سے مطمئن ہو چکی تھی۔  
 اور شائندہ بھی ان کے معیار سے کہیں بلند تھی۔ اس لیے خواہ مخواہ کٹ جانے کی تک ہی کیا تھی۔ نئے دور کے نئے تقاضوں کے مطابق انہوں نے اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا۔

باتیں ہوتی رہیں عثمان کبھی کبھی کوئی جملہ کہہ دیتے۔ شائندہ چپ تھی۔ عشرت بانو اور مراد علی خاں ان کی خاموشی کو خود دوسری کی ندامت سمجھ رہے تھے۔  
 مراد علی خاں اٹھے۔ دیوار گیر سیف کی طرف گئے۔ اسے کھولا اور ایک

نمٹیں ڈبیر نکال لائے۔

عثمان کا دل جیسے پھٹ کر سینے سے باہر آنے کو تھا۔ شائندہ کچھ نہیں سمجھی۔ مراد علی خاں نے ڈبیر کھولی۔ اور صدیوں پرانی ایک موٹی سی خوبصورت انگوٹھی نکال کر خند لکھے دیکھتے رہے۔ پھر شائندہ کے قریب آئے۔ صوفے پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے۔

"یہ ہماری خاندانی امانت ہے۔ جو نسل در نسل بڑی بہو کے حصے میں آئی ہے۔ اس کی تاریخ تین صدیوں تک ہمارے شجرے کے ساتھ چل رہی ہے۔ شائندہ بیٹے یہ امانت آج سے ڈیڑھ سال پہلے آپ کی شادی کے موقع پر لے چکے تھے۔ لیکن خیر۔ اپنا ہاتھ لائیے۔"

عشرت بانو بھی شائندہ کے دائیں جانب آ بیٹھیں۔ انہوں نے شائندہ کا نرم دگداز لیکن برت کی طرح ٹھنڈا ہاتھ مراد علی خاں کی طرف بڑھا دیا۔  
 شائندہ کا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔

اور

جب ان باتوں سے آجگینے اور بھی چور چور ہونے لگے۔ تو آنسوؤں میں سیلابی کیفیت دہ چند ہو گئی۔ بچکیوں اور سسکیوں کے درمیان شائد رونے لگی۔

”عثمان۔ آپ ہی چپ کر لیئے انہیں۔ عشرت بانو نے ہار کر کہا۔  
عثمان خود بھی بے حال ہوئے جارہے تھے۔ شائد کا اس طرح بے اختیار ہو کر رونا اس جان لیوہ لیے کی نشاندہی بھی کر سکتا تھا۔ بچھے زندہ موت کی طرح وہ سینے سے لگائے ہوئے تھے۔

مراد علی خاں نے عثمان اور شائد کو تنہائی کا موقعہ دینے کے لیے عشرت بانو کو اشارہ کیا۔

”کوئی بات نہیں۔ ابھی سنبھل جائیں گی۔ دل بھر کر آنا ہی تھا۔ مراد علی خاں کہتے ہوئے نشست گاہ سے باہر نکل گئے۔  
عشرت بانو بھی دلاسا دیتے ہوئے باس چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی پرسکون سی نشست گاہ آگ کی جلتی بھیٹی بن گئی عثمان شائد کے قریب آئے۔ اس کا کندھا سختی سے جھنجھوڑتے ہوئے بولے۔  
ابھی کوئی سزا دینا باقی ہے۔ آپ کے یہ آنسو ہمارے تعلقات کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں۔“

شائد کا دامن صبر تو اس طرح چاک ہو چکا تھا۔ کہ رفوگری ممکن ہی نہ تھی۔ عثمان جس بے قراری سے کمرے میں پہلے رہے۔ وہ اسی بے قراری سے روتی رہی۔

عثمان نے سہل کی طرح صوفے پر پیلو بدلا۔ ان کی آنکھیں شدت کرب سے جیسے پھٹ جانے کو تھیں۔ دل شائد کے ہاتھ سے بھی زیادہ کانپ رہا تھا۔

بڑی دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ مراد علی خاں نے انجشتری شائد کے ہاتھ میں ڈال دی۔

”مبارک ہو۔ عشرت بانو نے شائد کا ہاتھ ہونٹوں سے لگایا۔ مراد علی خاں نے شائد کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اور

شائد

جو

تضادات کی چکی میں بری طرح پس رہی تھی۔ سنبھل نہ سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے

اور

پھر ان آنسوؤں نے کسی بند توڑے ہوئے سیلابی سیلے کی صورت اختیار کر لی۔

عثمان بھی اتنے دلگیر تھے۔ کہ مجسم آنسو نظر آ رہے تھے۔  
عشرت بانو اور مراد علی خاں شائد کو پیار کرنے لگے۔ آپ کا تو کوئی قصہ نہیں تھا بیٹے۔ اور پھر پچھلی باتیں یاد کرنے کی بھی فوضورت نہیں۔ ہم نے پوری نیتی خلوص اور فراخ دلی سے آپ دونوں کو قبول کر لیا ہے۔ ہم آپ کو پوری عزت اور آپ کا مقام دے رہے ہیں۔ آپ اس گھرانے کی عزت و ناموس ہیں۔ پورا خاندان آپ کا احترام کرے گا۔“

جو صاحب کی فرمائش پر دو تین بار قہوہ بنا کر پیش کر چکا تھا۔  
عثمان کی طبیعت خاصی غراب تھی۔ زکام سمجھا ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ آج  
تو صارت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

سارا دن عثمان پوری متعدی سے دفتری کام پٹاتے رہے تھے۔ ان کے  
سیکرٹری اور جنرل منیجر نے کئی بار آرام کرنے کو کہا بھی تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو  
زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے حسب کتاب بھی چیک  
کیا اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل بھی تیار کیا۔

شام وہ اپنے دو ایک دوستوں سے ملنے بھی گئے تھے۔ مل کر گھر جانے  
کی بجائے دفتر آ گئے تھے۔ اور جب سب تک دفتری ہیں تھے۔  
گھر تو آتش کدہ تھا۔

جلاؤ الاقامت بخت نے۔

جل تو یہاں بھی ہے تھے۔ سکون تو ان کی زندگی سے چھن چکا تھا۔ بے  
مقصد اند بے معنی زندگی گزارنے سے زیادہ گھسیٹ ہے تھے۔ زکوٹی  
آزاد تھی۔ دھتجو۔ منزل تھی۔ نشان منزل۔ راہیں اندھیروں میں ڈوب چکی  
تھیں۔ اور ان اندھیروں کے لاتنا ہی سمندر میں وہ بے سہارا کشتی کی طرح ادھر  
سے ادھر ڈالتے پھر رہے تھے۔ ان کا وجود اندھیروں ہی کا ایک حصہ بن چکا  
تھا۔ روشنیوں کا سراغ پانے کی خواہش ہی نہ رہی تھی۔ کبھی کبھی توانہیں یوں  
محسوس ہوتا۔ کہ وہ نہیں ہیں۔ اپنے ہونے کا احساس کرنے کے لیے انہیں  
شعوری طور پر اپنا آپ محسوس کرنا پڑتا تھا۔

دفتر میں بیٹھے وہ انہیں اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ جوان کی چمکا چوند  
روشنیوں بھری زندگی کو اک آن ایک لمحے میں ہٹ کر گئے تھے۔ دکھ اور اذیت

رات کے کنارہ بچ رہے تھے۔

آج موسم طوفانی تھا۔ صبح ہی سے شوریدہ سرسواؤں کے جھکڑ  
چل رہے تھے۔ کالے اور سرمئی بادل جھومتے جھامتے سینے چرخ پر پھر رہے تھے  
سارا دن سورج سے بادلوں کی آنکھ مچولی مہوتی رہی تھی۔ سورج کے آغوش مغرب  
پناہ لیتے ہی بادلوں سے یلغار کر دی۔ گھٹ جوڑ ہوا۔ ادا نا نا گھٹائیں شرق یا غرب  
چیل گئیں۔ بوزہ باز می شروع ہو گئی۔ جس نے موسم کو کٹار بنا دیا۔  
جوں جوں رات ڈھلتی گئی۔ بارش تیز ہوتی گئی۔ ہوائیں تند و تیز ہو گئیں۔ نسلا  
میں خون بخند کر دینے والی سردی کی لہرائی ہوئی تھی۔

عثمان اپنے دفتر کے ریٹائرنگ روم میں ایک صوفے پر نیم دراز تھے۔ تہوے  
کی خالی پیالی میز پر رکھی تھی۔ اور سگریٹوں کے بے شمار جلے اور ادھ جلتے سگریٹے  
ایش ٹرے کے اندر ادھ بانہر بکھرے پڑے تھے۔  
دفتر کا سارا عملہ چھٹی ہوتے ہی واپس جا چکا تھا۔ اب یہاں صرف چوکیدار تھا۔

پر لوٹ رہا تھا۔

وہ اک اتہائی پچیدہ موٹر پر آن کھڑے ہوئے تھے۔ اک خوفناک سپانی سے دوچار تھے۔ جدھر نظر دوڑاتے سپانی کا خوفناک اثر دما پھن پھیلنے نظر آتا۔ ملوے چوبیس دن گزر چکے تھے۔ اب وہ تھک گئے تھے۔ ہار گئے تھے۔ ٹوٹ گئے تھے۔ والدین سے صلح ہو چکی تھی۔ یہ صلح خوشیوں کی پیغامبر نہ تھی۔ اب تو ان کی تسویش اور بڑھ گئی تھی۔ پردہ داری کی اہمیت اور ضرورت زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ ادنیٰ بات ان کے اعصاب پر سوار تھی۔

وہ کوئی راہ نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نین اندھیروں کی لینڈ تھی۔ راہ کہاں سجائی دیتی تھی۔ جدھر لپکتے سیاحیوں سے بھرا جاتا۔ گیارہ کا گھنٹہ سب آتوہ گھوٹ پھینک کر اٹھ بیٹھے۔ انگلیوں سے بالوں کو سلجھا حلق منک ہو رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ سر میں شدید درد تھا۔ جسم سنگ رہا تھا۔ اپنی نبض پر انگلیاں رکھ کر انہوں نے حرارت کا اندازہ لگایا۔ کافی بخار محسوس ہو رہا تھا۔

انہوں نے چوکیدار کو آواز دی۔ ”جمعہ خان“

”جی حضور۔ وہ لپک کر آیا۔

”باہر موم کا کیا حال ہے۔“

”خوب پانی پڑ رہا ہے جناب۔“

”رک نہیں بارش۔“

”سر دیوں کی بارش ہے جناب۔ چارچہ درن سے پہلے کیا ختم ہوگی۔“

”اچھا۔ چلیں پھر۔“

”آپ بارش رکنے کا انتظار کر رہے تھے مالک؟“

کا ابدی لمحہ ان کی زندگی میں کتنی سفاکی سے در آیا تھا۔ کاش اس لمحے نے وقت کو کوکھ سے جنم ہی نہ لیا ہوتا۔ عثمان سوچوں میں ڈوبے تھے۔

لیکن

کوئی سوچ بھی مکمل نہ تھی۔ یوں جیسے سوچنے کو کچھ رہ ہی نہ گیا تھا۔ انہیں کیا کرنا چاہیئے؟ کیسے کرنا چاہیئے۔ کیونکر کرنا چاہیئے۔ کچھ سمجھ نہ پاتے تھے۔ لیکن انہیں کچھ نہ کچھ کرنا ضرور تھا۔ تضادات کے درمیان پتے پتے وہ عاجز آ گئے تھے۔ تصنع اور بناوٹ کے چہرے پر سجاتے سجاتے وہ تھک گئے تھے۔ انہیں ہی محسوس ہوتا تھا کہ کسی آن وہ پھٹ کر بکھر جائیں گے۔ اور وہ راز وہ المیہ وہ خوفناک حقیقت جسے انا اور دُعا کی خاطر وہ بشکل چھپائے پھر رہے ہیں چار سو پھیل جائے گی۔

اس پھٹ جانے کے عمل سے پیشتر ہی وہ کوئی راہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اندھے اندھیرے چار دن اور پھیلے تھے۔ کچھ سمجھا ہی نہ دیتا تھا۔ کر کیا کریں نشین کو چھوڑ دینے کا انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن اس سے آگے کچھ تہ نہ چلتا تھا۔ کر عملی قدم کہاں رکھیں۔

وہ دلجمعی سے اپنے خیالات کا تجزیہ بھی تو نہ کر سکتے تھے۔ نفرت و محبت شاید ایک ہی جذبے کے دو نام ہیں۔ عثمان کے لیے کم از کم ان دونوں یہ ایک ہی جذبے کے دو نام تھے۔ وہ شانہ سے جس قدر ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ اسی قدر شدت سے نفرت بھی۔ خالی نفرت کر رہے ہوتے۔ تو دکھ اور اذیت کے جن سانحوں سے دوچار ہو رہے تھے وہ تو نہ ہوتے۔ یہ تو محبت ہی تھی جو نفرت کے واروں کے باوجود تڑپ رہی تھی۔ یہ عشق ہی تھا جو انکار

ہاں - ہاں -

وہ صاحب کی سادہ لوحی پر سادگی ہی سے مسکرا دیا۔ سردیوں کے موسم پر دو چار فقرے تبصرے کے طور پر بول دیئے۔

غوان گرم گرم کمرے سے ایک دم باہر آئے تو کپکا دینے والی سردی جسم میں سرائت کر گئی۔ کوٹ کے کالر اٹھا کر انہوں نے ادبچے کر لیے۔ اور ہاتھ اور کوٹ کی جیبوں میں ڈالے جوہ خان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

گاڑی کا میٹر آن کر کے انہوں نے گاڑی چلا دی۔ لیکن ٹھنڈا اپنا اثر دکھا گئی تھی۔ انہیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد لرزہ سا لگ رہا تھا۔

گھر پہنچنے تک ان کی طبیعت بہت ہی خراب ہو چکی تھی۔ ملازم ان کے انتظار میں کبل کی لکھل مارے گیراج کے اندر بیٹھا تھا۔ اور خواب گاہ کی بتیاں بھی روشن تھیں۔

انہوں نے جالی دار پردوں کے پیچھے شانہ کو ٹپتے بھی دیکھا۔

اک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اپنے گرم وجود کو کوٹ میں لپٹے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ فضل دین کھانے کے لیے ابھی تک باورچی خانے میں بیٹھا تھا۔ کریم اور یوسف بھی صاحب کے انتظار میں اس کے پاس بیٹھے کپ شپ لگا رہے تھے۔

فضل دین جلدی سے چامنے بنا لاڈ۔ مجھے سخت سردی لگ رہی ہے۔ وہ لباس تبدیل کرنے کے لیے غسل خانے سے ملحقہ چھوٹے سے ڈرائنگ روم کی طرف چلے گئے۔

کمرہ خاصہ گرم تھا پھر بھی عثمان ٹھنڈ محسوس کر رہے تھے۔ بستر میں گھستے ہی

انہوں نے دو کبل اور پردا لے لیے۔ سرگرمی سے کس کس باندھا۔ بخار کچھ تیز ہی ہو رہا تھا۔ وہ بڑی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ فضل دین چائے لے آیا عثمان نے دو تین گولیاں چائے کے ساتھ مکمل لیں۔ فضل دین نے دوسرا بیٹر بھی جلادیا۔ یوسف اور کریم بھی کمرے میں آگئے۔ پندرہ بیس منٹ بعد عثمان قدرے پرسکون ہو گئے۔ سردی اور لرزہ ختم ہو گیا تھا۔ بخار تیز تھا۔ فضل دین نے تھرمائیٹر ان کی طرف بڑھا دیا۔

رہنے دو۔

دیکھ تو لیں صاحب۔ ضرورت ہو تو ڈاکٹر ناصر کو فون کر دوں۔

نہیں۔ بس اب ٹھیک ہوں۔ تم لوگ جاؤ۔

حکم ہو تو میں یہیں سو جاؤں۔

نہیں فضل دین پریشان نہ ہو۔ اب میں کچھ بہتر ہوں۔ جاؤ تم لوگ۔

تینوں خلا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل آئے۔ فضل دین نے چائے تھرماس میں ڈال کر میز پر رکھ دی۔ پانی کا جگ اور گلاس بھی قریب ہی رکھ دیا۔ وہ آخر کمرے سے باہر آیا۔

اس نے بیگم صاحبہ کو برا کمرے میں دیکھا۔ بیگم صاحبہ۔ صاحبہ کو بخار ہو گیا ہے۔ اس نے شانہ سے کہا۔

اچھا؟ شانہ نے صرف اسی قدر بات کی۔ وہ خامی ابھی ہوئی تھی۔ عثمان کو اس نے ادھر آتے دیکھا تھا۔ پھر نوکروں کو آتے جاتے بھی دیکھا تو پریشانی بڑھ گئی۔ ان کی طبیعت کئی دنوں سے خراب تھی۔ آج سردی بھی کافی تھی۔ بخار ہونا ہی تھا۔

فضل دین چند لمحے کھڑا رہا۔ صاحب کی حالت سے اسے آگاہ کیا۔  
- تم جاؤ۔ شانہ نے اسے کہا۔ اور خود بڑی خود اعتمادی سے قدم اٹھاتی،  
عثمان کے کمرے کی طرف آگئی۔

لیکن دروازے تک پہنچتے پہنچتے خود اعتمادی ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ چکی تھی۔  
اسے اندر جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ دونوں ہاتھ آپس میں الجھائے وہ دروازے  
پر کھڑی رہی۔ پانی زوروں کا پڑ رہا تھا۔ ہوائیں کچھ اور تند ہو گئی تھیں۔ بارانی جھکڑ  
تھا۔ فضا میں خاصہ شور مچا ہوا تھا۔ چتوڑوں پر پڑنے والا پانی پر نالوں کی صورت  
بہر رہا تھا۔ شانہ نے گرم فرار میں رکھا تھا۔ ادنیٰ ہزار ٹوپی بھی سر پہ تھی۔ پاؤں  
میں گرم غل بوٹ تھے۔ پھر بھی کپکپاہٹ موس ہو رہی تھی۔ عثمان کے کمرے  
کے باہر کمرے نہ تھا۔ اندر جانے کی جرات نہ ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ  
آہستہ قدم اٹھاتے واپس مڑی۔

لیکن  
عثمان کو بخار تھا۔

وہ انہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ چھوٹا چاہتی تھی۔ احوال پرسی کرنا چاہتی تھی۔  
اپنے قدموں پر وہ لوٹ آئی۔

لیکن  
اندر جانے کی  
واپس مڑی  
اور

پھر  
لوٹ آئی۔

یوں کئی دفعہ ہوا۔

اور آخر جانے وہ کونسا نور دار اور بہادر لمحہ تھا۔ کہ وہ دروازہ کھول کر  
اندر آگئی۔

عثمان آنکھیں بند کیے بیڈ پر پڑے تھے۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ہاتھ پر  
رومال بندھا تھا۔ کبیل سینے پر تھا۔ اور دونوں ہاتھ اس کے اوپر رکھے تھے۔  
شانہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ کئی لمحے بیڈ کی پائنٹی کی طرف کھڑی ایک  
دھمکتی رہی۔ دکھ کی تیز دھار اس کے سینے میں تر رہی تھی۔ اتنی قربت اور  
اتنے فاصلے، شانہ کے سینے میں بجلیاں ٹوٹنے لگیں۔ اس کا جی چاہا کہ چیخ بن کر کچھ  
جائے۔

عثمان تیز بخار کی وجہ سے بے چین تھے۔ اسی بے چینی میں کرڈٹ بدلی۔  
اپنے قدموں کی طرف ہٹاؤ کی۔ توشانہ نظر آئی۔

انہوں نے سرخ انکار اور بخار سے جلتی آنکھوں کو کئی بار جھپکایا۔ منہ سے کچھ  
نہیں بولے۔

- طبیعت کیسی ہے۔ فریل اور کا پتی آواز میں شانہ نے پوچھا۔  
- شکریہ۔ کاٹ دار طنز آواز میں عثمان بولے۔

- بخار بہت تیز ہے۔ بے جان مجھے کی طرح کھڑی شانہ نے سر جھکاتے ہوئے  
آہستگی سے کہا۔

- ہاں۔ وہ بولے۔ پھر کرڈٹ بدل کر چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے  
کہا۔ بہتر ہوگا۔ آپ فوراً یہاں سے چلی جائیں۔ میری تنہائی میں آنے کی ضرورت  
نہیں۔

شانہ دل موس کر رہ گئی۔ طنز کا زہر رگ دپے میں اتر گیا۔ لیکن بے بسی سے

مرث عثمان کو تکنے کے اور وہ کیا کر سکتی تھی۔

وہ کمر موڑے پڑے تھے۔ یقیناً بہت بے چین ہو رہے تھے۔ سر کو بار بار ادھر ادھر کیجے پر پرخ رہے تھے۔

آپ کو۔۔۔ شائے نے ڈھیٹ بن کر اتہگی سے کہنا چاہا۔

”اوہ شائے۔ خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میں۔ میں آپ کو ایک لمحہ کے

لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میری فکر مت کریں۔ بہت سخت جان ہوں۔

مر نہیں جاؤں گا۔۔۔ عثمان نے تلخ دند لہجے میں کہتے ہوئے تیکے میں چھپالیا۔

آنسو ٹوٹی تبیع کے دانوں کی طرح شائے کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر لڑھکنے

لگے۔ اس نے پچھلے ہونٹ کے سرے کو سختی سے دانتوں تلے دبایا۔ اس کا سینہ

فرما کر ب سے پھٹ جانے کو تھا۔

لیکن کبھی کیا سکتی تھی۔

مجھوں کی طرح سر جھکاٹے روتی روتی کمرے سے نکل آئی۔

پچھلے چھوٹے سے لان میں لوہے کی سفید کرسیاں پڑی تھیں۔ درمیان میں انہی کے سائیل کی چھوٹے سے شیشے والی گول میز تھی۔ جس پر کچھ رسائل اخبار اور اون سلائیڈاں بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ اون کا ایک گول لائٹ حک کر نیچے گھاس پر گر گیا تھا۔

آج بڑی تر دنازہ و جھوپ تھی۔ کئی دنوں کے بعد مطلع صاف ہوا تھا۔ ہفتہ

بھر لوہا باندھی زور و شور کی بارش اور بارانی جھکڑوں نے موسم کو جبر پڑ رکھا تھا۔

اب آسمان نیلگوں تھا۔ اور سورج بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ طلائی

اجالے پھیلے تھے۔ ہر چیز پر بکھار تھا۔ دھلی دھلائی فضا خوشگوار تھی۔ درخت

اور پھول تازگی لینے ہوئے تھے۔

میں روڈ پر چھوٹے چھوٹے۔ ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ کنال کے بنگلوں کی

قطاریں تھیں۔ کچھ بنگلے نئے تھے۔ کچھ پرانے۔ دو ایک تو خاصی پرانی چوڑی چوڑی

دیواروں اور اونچے اونچے خرابی دروں والی کوٹھیاں بھی تھیں۔



تہقہ لگا کر سب کو وطن کر رہی تھی۔ لیکن جانے کیوں ماما کا دل ہول کھائے جا رہا تھا۔  
تقریب کے فوراً ہی بعد وہ عثمان کے ساتھ واپس چلی گئی تھی۔ ماما معرفت کی وجہ سے اس سے کچھ پوچھ بھی نہ سکی تھی۔

دوسرے دن ماما نے خاص طور پر فون کیا تھا۔ لیکن شائزہ نے اتنے خوش گوار موڈ میں باتیں کی تھیں۔ کہ انہیں اپنے دل میں اٹھتے دوسروں کو کپل دینا پڑا تھا۔ شائزہ کی اداسی کو اپنا دامن سمجھا تھا۔ وہ وطن ہو گئی تھیں۔  
لیکن

کل رات عثمان کی سالگرہ تھی۔ مراد محل میں ماما کرنل صاحب نظریہ اور بچے بھی مدعو تھے۔ سالگرہ کی تقریب کسی بڑی سے بڑی شادی کے جشن کی طرح تھی۔ مراد علی خاں نے بیٹے کی شادی ہی کے سارے چاؤ پورے کیے تھے۔ شائزہ کو انہوں نے باقاعدہ طور پر اپنی بہو قبول کیا تھا۔ اس کے جیسے کے بیش قیمت زیورات اسے دیئے تھے۔ دوسرے زمین شائزہ کے نام کر دی تھی۔ یہ زمین سلامی کے طور پر اسے دی تھی۔

پورے خاندان نے شائزہ کے بے مثل حسن کو سراہا تھا۔ خوشی کا اظہار کیا تھا۔ عزت دی تھی۔ محبت پنچھاؤں کی تھی۔ شائزہ کسی مہارانی کی طرح سب میں منفرد اور ممتاز دکھائی دے رہی تھی۔ بلاشبہ لوگ اس کی تقدیر پر رشک کر رہے تھے۔ ٹولیوں کی صورت میں۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے۔ جو فوں پر سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے مہمانوں کی زبان پر شائزہ ہی کا ذکر تھا۔  
ماما کو بیٹی کی اس عزت افزائی اور تعریف و توصیف پر چھوٹے نہیں سہانا چاہیے تھا۔ خوش ہو جی رہی تھیں۔ لیکن یوں لگتا تھا۔ خوشیوں کی گردنیں

شائزہ کے ڈیڑی ریٹائرڈ کرنل سردار علی کو ریگج بہت پسند تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے دوبارہ روم کا چھوٹا سا بنگلہ بنانا یا خرید لیا تھا۔ ارد گرد بھی اچھے لوگ رہتے تھے۔ پڑھے لکھے مہذب اور شائستہ لوگوں کے درمیان رہنا انہیں مرغوب تھا۔

شائزہ کی ماما بے حد حسین عورت تھی۔ افغانی نژاد تھی۔ رکھ رکھاؤ میں بھی افغانی جھلک تھی۔ جو اسے دوسروں سے منفرد اور الگ ٹھک کر رکھتی تھی۔ بڑی خوش خلق۔ با مذاق اور با ذوق عورت تھی۔ محبت کی شادی کا میاابی سے پوری طرح ہلکار ہوئی تھی۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ شائزہ کے بعد نظریہ کی تکھی بھی کر دی تھی۔ زریں خان ان کے اپنے میکے کے عزیزوں میں سے تھا۔ نظریہ اور وہ دونوں کو پسند کرتے تھے۔ اس لیے دونوں کو باقاعدہ ازدواجی بندھن میں بچرنے کے لیے اہتمام کروایا گیا تھا۔ پہلے ہفتے ان کی تکھی کی تقریب ہوئی تھی۔ کرنل صاحب دونوں بچیوں کے فریضے سے یوں بروقت فارغ ہو جانے پر بڑے سرور اور وطن تھے۔  
ماما بھی خوش تھی۔

لیکن  
چند دنوں سے وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھیں۔ شائزہ کو دیکھ کر وہ جانے کیوں پریشان ہو جاتی تھیں۔

شائزہ تکھی کی تقریب میں شامل ہوئی تھی۔ اس نے بہت قیمتی لباس پہنا تھا۔ بڑے انمول زیورات سے لدی تھی۔ لیکن ماما کو یوں لگتا تھا جیسے وہ خوش نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں اداسی کی غماز تھیں۔ اس کے چہرے پر ناشتہ آورہ تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہنسی مصنوعی تھی۔ وہ بے جان اور کھوکھلے

دری اٹھ گئے۔ ظریفہ نے ہی سب کے لیے ناشتہ بنایا۔ اور سب کے ناشتے  
 کے بعد غنا ہو کر اس نے ماما کو جگایا۔

ماما تو رات سے جاگ رہی تھیں۔ فکر اور دوسو سے نیند کے دشمن تھے۔  
 ظریفہ نے موسم کے پیش نظر پچھلے لان میں کرسیاں ڈلوادی۔ تھوڑی دیر  
 پڑی کے ساتھ وہ لان میں بیٹھی۔ رات کی تقریب کی باتیں کرتی رہی تھیں۔  
 ایساں اور اون لیے بیٹھی تھی۔ ڈیڑی اخبار دیکھتے رہے تھے۔

پھر وہ بازار جانے کے لیے اٹھ گئے تھے۔ انہیں کسی ضروری کام سے  
 اٹھا۔ ان کے جاتے ہی ظریفہ اور ان سلاٹیاں وہیں چھوڑا کر گئی تھی۔

ماما باہر بڑی خوبصورت دھوپ ہے۔ اس نے کہا۔ آئیے باہر  
 کر بیٹھیں۔

”اچھا“

”کیوں ماما“

”کچھ نہیں۔“

”بڑی سست نظر آ رہی ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔“

”ٹھیک ہوں۔“

”رات تک گئیں نا۔“

”اے! شاید یہی بات ہے۔“

”شک کریں آج مجھے چھٹی تھی۔ ورنہ آپ کو صبح اٹھنا پڑتا۔ سب کو میں  
 ناشتہ کر دیا ہے آج ماما۔“

”اچھی بچی ہو۔“

آپ کو بھی دیکھیں بستر ہی ناشتہ دیا ہے۔

کسی تکبجے میں آئی ہوئی ہیں۔ شائے آج بھی منگنی کی تقریب کی طرح تفتن اور  
 بناوٹ کے لبادے میں اپنا آپ چھپائے پھر رہی تھی۔ اس کی ہنسی بے  
 رنگ تھی۔ اس کے قہقہے بے جان تھے۔ اس کی سلاٹیاں دھواں دیتے دیتے  
 کی طرح تھیں۔ اس کی آنکھوں میں افسردگی کے سائے لہا رہے تھے۔  
 اس کے وجود میں کھوئے کھوئے رہنے کی کیفیت تھی۔ وہ چونک چونک  
 کربات کرتی تھی۔ وہ چپ چپ ہو جاتی تو یہ چپ لہو لہان نظر آتی۔  
 بے شک یہ سب باتیں لوگوں سے مخفی تھیں۔ کوئی کریم میں نہیں تھا۔  
 کسی کو تجسس نہیں تھا۔

لیکن

ماما کی نظر میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ ان کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔  
 وہ ڈر رہی تھیں۔ شائے کی خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگ گئی ہو۔ اتنے چرچے  
 بھی اچھے نہیں ہوتے۔ ہرزبان پہ چڑھ جانا بڑی منگنی کی علامت بھی ہو سکتا  
 ہے۔

ماما کی پریشانی تو اور بھی بڑھ گئی۔ جب انہوں نے محسوس کیا۔ کہ عثمان  
 بھی چہرے پر نقاب بجائے پھر رہے ہیں۔ وہ کسی طور خوش نہیں۔ ٹوٹے  
 ٹوٹے بکھرے بکھرے ہیں۔ اور ہدقت اپنے وجود کی ہر چیاں سیٹھے لوگوں  
 میں گھوم رہے ہیں۔

رات تو وقت تقاضا کرتی تھی۔ ماما شائے سے کچھ پوچھ نہ سکیں۔ لیکن رات  
 بھر پریشان ہی رہیں۔ دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا رہا۔ سوچیں تخریبی انداز  
 اختیار کر گئیں۔ ہر پہلو دیکھا۔ ہر نقطے کو سوچا۔ منفی انداز ہی اپنا سکیں۔  
 صبح وہ دن چڑھے تک بستر ہی میں رہیں۔ کمرنل صاحب حسب عادت

لیٹے لیٹے ظریف نے ماما کو دیکھا۔ ماما جب لمبی ناخن چباتے ہوئے خود فراموشی  
 عالم میں تھیں۔ انہیں ضرور کوئی مذکورہ مسئلہ درپیش ہوتا تھا۔  
 ہوا ماما۔ ظریف نے اٹھتے ہوئے کہا۔  
 ماما نے شاید سنا ہی نہیں۔

ظریف مسکاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی سرخ فلیپر نیل شرٹ اور نیلی لال جرسی  
 وہ بڑی سمارٹ لک رہی تھی۔ دھوپ میں لیٹنے سے سرخ و سپید رنگت اور  
 اٹھی تھی۔ بنہری بالوں میں بڑی چمک تھی۔ اس نے بالوں کو قابو میں رکھنے  
 لیے چوڑا لال رنگ کا ہینڈ گرڈ لکھا تھا۔  
 وہ کپڑے جھاڑ کر گردن کو ہلکا سا جھکا دے کر بال پیچھے شاتے ہوئے ماما  
 بت پر آگئی۔

ماما۔ اس نے ماں کے گلے میں ہانپیں ڈال دیں۔  
 ماما نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پیار کر لیا۔

کیا بات ہے ماما۔ ظریف نے بھی ماں کے گال پر عقیدت سے بوسہ دیا۔  
 ماما کچھ نہیں بولیں۔

ظریف ان کے سامنے آکر گھاس پر دوڑا نو ہوتے ہوئے ان کے گھٹنوں پر  
 آگئی۔ آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں۔ حالانکہ آج تو آپ کو بہت خوش  
 پائینے۔ رات آپچی بیٹی کے آنے میں کتنا زبردست قسم کا ٹکسٹ تھا۔  
 ہوں۔

ماما شانہ باجی بہت لگی ہیں۔

وہ خود ہی ہنس پڑی۔ ہاں سے لاڈ کرتے ہوئے بولی۔ ویسے میں بھی بڑی لگی  
 ماما۔ زیریں بہت اچھے انسان ہیں۔ عثمان کی طرح ان کے پاس بے شمار دولت

تھیں۔  
 اب اٹھیے بھی۔ باہر بڑا ہی نکھر ہوا دن نکلا ہے۔

تم چلو میں آتی ہوں۔  
 ظریف مسکاکر ماں کو دیکھتے ہوئے کمرے سے نکلی۔ برابر والے کمرے  
 گئی۔ ٹیپ اٹھایا اور ان میں آگئی۔  
 اس نے اپنی پسند کا کیسٹ لگا کر ٹیپ آن کر دیا۔ اور گھاس پر لوندی  
 کر گیت سننے لگی۔ اس کی سیامی جلی اس کے پاس آگئی۔ ظریف اس سے کہنے  
 ہوئے نفوس کی دنیا میں کھو گئی۔

ان دنوں وہ بے حد خوش تھی۔ جوانی ہذا ت خود نشہ ہے۔ زیریں  
 مل جانے سے تو یہ نشہ دو آتشہ ہو گیا تھا۔ بڑی مستانی ہو گئی تھی۔ ہنسے  
 کے موڈ میں تو ہمیشہ ہی رہتی تھی۔ اب تو ہنسی خود بخود چھوٹی پٹتی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد ماما بھی باہر آگئیں۔ ان کا چہرہ کچھ اترا ہوا تھا۔ خوبصورت اور  
 آنکھوں کے گرد حلقے تو بے حد ہی تھے۔ لیکن اب بڑے نمایاں لگ رہے تھے۔  
 اپنی عمر سے کئی سال چھوٹی نظر آیا کرتی تھیں۔ اکثر لوگ اسے شانہ کی بڑی بہن  
 لیکن آج جیسے وہ ایک ہی جست میں عمر کے کئی طویل سال چھلانگ گئی تھیں  
 وہ کرسی گھسیٹ کر اس پر ابٹھیں۔ سورج کی سمت کمری۔ پہلے گلابی رنگ  
 چنڈاں کا جسم لپٹے ہوئے تھا۔ تراشیدہ بال سنوارنے کی بجائے انہوں نے چھوٹا  
 کس کر بانڈ رکھے تھے۔ حسب عادت آج انہوں نے صبح صبح میک اپ بھی  
 تھا۔

ماما نے انہیں اٹھایا۔ لیکن جلدی ہی واپس رکھ دیا۔ اپنی آنکھوں کے  
 چہاتے ہوئے وہ سوچوں میں گم ہو گئیں۔

لڑائیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ازدواجی زندگی ان کے بغیر تکمیل ہی نہیں پاتی۔  
 - تو پھر شائے کے لیے فکر نہ کیوں ہیں۔ آپ نہیں چاہتیں کہ ان کی ازدواجی زندگی  
 جتنی تکمیل پائے۔ وہ کھکھلا کر ہنس دی۔

ماما بھی مسکرا دیں۔ ظریف نے تھوڑی دیر میں ماما کو موڈ ٹھیک کر لیا۔ شائے نے  
 خود ہی اسے بتایا تھا۔ کہ ان دونوں کی لڑائی ہو جاتی ہے۔ کوئی سنگین بات ہوتی تو  
 وہ اس طرح تھوڑا ہی بتاتی۔

"وہ تو کہہ رہی تھی۔ کہ جب تیری شادی ہوئی مجھے بھی پتہ چل جائے گا۔" وہ  
 ہنس دی۔ پھر خراخرا انداز میں بولی۔ نہ بابا۔ مجھے تو لڑائی سے بڑا ڈر لگتا ہے۔  
 ماما کہیں وہ آپ کا رشتہ دار قسم کا لڑکا ہو تو کیا بنے گا۔

"وہ بہت اچھا ہے۔ طبع الطبع انسان ہے۔  
 - اور عثمان تندہ خود بھی کیا؟"

"نہیں۔"

"بس پھر فکر کی کیا بات؟" ماما آپ بیکانے مسائل اپنے ذہن پر مسلط نہ کیا کریں۔  
 وہ دونوں ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ایک چھانسنے والی بھی نکل گئی۔  
 "کولسی۔"

"یہی سسرال والوں کی اس رات دیکھا نہیں تھا۔ وہ لوگ شائے باجی کے لیے کیا  
 کچھ کر رہے تھے۔ وہ فخر و عشرت بانو صاحبہ جو اس شادی کی مخالفت میں پیش پیش  
 تھیں۔ کبھی جاری تھیں۔"

ظریف نے باتوں کا رخ مثبت سمت موڑ دیا۔ ماما کو اس نے یقین دلایا۔ کہ  
 شائے بہت خوش بخت ہے۔ اور اگر وہ کچھ پریشان ہے بھی تو آپس کی چھوٹی موٹی  
 انتہائی بے ضرر قسم کی لڑائی سے۔

تو نہیں، لیکن میں بہت خوش ہوں ماما۔  
 "خدا تمہیں خوش رکھے۔ ماما نے اپنے ہاتھ اس کے سونے کی تاروں  
 بالوں میں الجھاتے ہوئے دکھ بھری آواز میں کہا۔  
 "ماما۔ ظریف نے مسکرا کر ماما کو دیکھا۔

"ہوں۔" وہ جیسے چونک گئیں۔ اب تو ظریف سے ذرا ہلکا۔ سیدم  
 بیٹھتے ہوئے ماں سے اس پریشانی کا سبب پوچھنے لگی۔

ماما پہلے تو مالتی رہیں۔ پھر اپنے دل میں پیدا ہونے والے دوسروں کا  
 ظریف پر کبھی دیا۔

ظریف کھکھلا کر ہنس پڑی۔ "اوہ ماما۔"  
 - نہیں ظریف۔ شائے بہت اداس رہتی ہے۔ کوئی بات ضرور ہے۔  
 - تو اس کو نصیحت کیا کریں۔ کہ عثمان۔ سسرال کی نہ کیا کرے۔

"لڑائی۔"

"ہاں ماما۔ ظریف نہیں کہہ بولی۔ دونوں میں اکثر لڑائی ہو جاتی ہے  
 - کیوں؟"

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ مجھے کیا پتہ۔ میاں  
 بیوی۔ یہ ان کی اپنی پرالہم ہے۔ آپ خواہ مخواہ ہی فکر نہ ہو رہی ہیں۔  
 ماما چپ رہیں۔

ظریف نے ان کا گھٹنا پکڑ کر آہستگی سے ہلاتے ہوئے کہا۔ ماما آپ  
 میں پڑ گئیں۔ وہ جیسا بیوی ہیں۔ لڑتے بھی ہیں۔ سن بھی جانتے ہیں۔  
 کے ساتھ اب بھی غصے ہو جاتی ہیں۔

وہ ہنس دی۔ ماما نے پچھلی کی سی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

ماما طمن تو ہو گئیں۔  
پھر بھی پھانس سی جو چہرہ رہی تھی محسوس ہوتی رہی۔

---

۔ کون ہے۔  
۔ بیگم صاحبہ۔ وہ ترائی والے بگلے میں جو بیگم صاحبہ میں آئی ہیں۔  
۔ مسرتیوری۔  
۔ جی ہاں۔  
۔ انہیں نشست گاہ میں بٹھاؤ۔  
۔ جی بہت اچھا۔  
۔ میں آتی ہوں۔  
۔ اچھا جی۔

رحمت خاں مسرتیوری کی اطلاع دینے آیا۔ شائے لاؤنچ میں تھی۔ ماما کا فون  
بھی ابھی آیا تھا۔ وہ اس کے بارہ میں کچھ پریشان تھیں۔ شائے نے بڑی ہمت  
سے انہیں یقین دلایا تھا۔ کہ وہ اپنے گھر میں خوش و غرم زندگی گزار رہی ہے۔ کبھی

میں برش پھرا اور چاق و چوبند نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے نشست گاہ کی طرف بڑھ گئی۔

آج دن پھر دھندلا دھندلا تھا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ لیکن فضا میں صبح والی ٹھنڈک تھی۔ موسم کافی بدل چکا تھا۔ پچھلے دنوں کی بارش اور جھکڑوں نے تو سرمائی موسم کو جو بن بٹھ دیا تھا۔

نشست گاہ معتدل تھی۔ بیٹیر آن تھا۔ منتر تیری نے اپنا گرم کوٹ اتار کر صوفے کی لپٹ پر ڈال دیا تھا۔

شانہ نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مزاج کیا۔

وہ بھی محبت سے ملی۔

میں نخل تو نہیں ہوئی۔ وہ مسکرا کر بولی۔

”جی نہیں۔ میں بیکار ہی بیٹھی بور ہو رہی تھی۔ آپ نے اچھا کیا آگئیں۔“

”میں تو تنہا رہ ہی نہیں سکتی منتر عثمان۔“ وہ منہ ہی۔ ”آج بچے بھی تہواری ساتھ لے گئے۔“

”کہاں۔“

”داوی اماں نے بلا بھیجا تھا۔“

”آپ کے سسرال نہیں ہیں۔“

”تہواری کے آفس سے قریب ہی ہے ان کا گھر۔ اسی لیے تو ساتھ لے گئے دونوں کو۔“

”اور آپ تنہا بور ہونے کو گھر پر رہ گئیں۔“

”نہیں جی۔ میں بور ہونا جانتی ہی نہیں۔ کام و نام ختم کیا اور آپ کے پاس آچھا کیا ہے۔“

کبھی لڑائی ہو جاتی ہے جس سے موڈ و چاروں کے لیے بگڑ جاتا ہے۔  
اما کو نظر فیہ نے بھی یہی بتایا تھا۔ شانہ کے اس اقرار سے انہیں تسلی ہو گئی۔  
لیکن ماں ہونے کے ناطے سے شانہ کو خاصی ڈانٹ بھی پلائی۔ شوہر اور بھتیجی  
علی خاں جیسے شوہر سے لڑنے جھگڑنے پر شانہ کو خوب کوسا۔ پیار سے نصیحتیں بھی  
کہیں اور زندگی کو منہ ہی خوشی گزارنے کے آزمودہ گمہ بھی بتائے۔

شانہ فون بند کرنے کے بعد وہیں کمرے میں مذہاں سی پڑی تھی۔ آنکھیں  
میں نمی تیر رہی تھی۔ کھل کر رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ ماں کی نظروں سے واقعی  
کچھ نہیں چھپایا جاسکتا۔ یہ نظریں آپا رہ جاتی ہیں۔ ذہنوں میں ریگنے والے  
خیالات کو سنو بی جان لیتی ہیں۔ چہروں پر نقابوں کے چھپائے تانہات کو پڑھ  
لیتی ہیں۔

وقت طو پر شانہ نے اما کو ملہن کر دیا تھا۔ لیکن پریشانی یہ تھی کہ مستطاب  
کیونچر دھوکے میں رکھا جاسکے گا۔ روز بروز تو چھوٹی مولی لڑائی کے بہانے  
نہ چل سکیں گے۔

وہ کھوٹی کھوٹی بیٹھی تھی کہ منتر تیری کے آنے کی اطلاع ملی۔ منتر تیری  
کبھی کبھی آجاتی تھی۔ ایک دفعہ شانہ بھی اس کے ہاں گئی تھی۔ اچھی عورت تھی  
ہاتوئی اور سنسن مکھ۔ جتنی دیر وہ اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ شانہ اپنے آپ  
بھول سا جاتی۔ کبھی کبھی تو شانہ کو اس کی مسرور اور شاد ماں زندگی پر رشک  
آتا۔ قابل رشک زندگی تو اس کی اپنی بھی تھی۔ لیکن جو ہو چکا تھا۔ اس کو لوٹا  
کی وہ اہل کہاں تھی۔

ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ اپنے کمرے میں آئی۔ چہرہ آ  
میں دیکھا۔ کھٹایا ہوا نظر آیا۔ اس نے جلدی جلدی ہلکا میک اپ کیا۔

نے خر بار کیسے ہوں :-

”ہوں“ شائے کے چہرے پر بے انتہا کرب تھا۔

”دیسے آپ نے اتنی شاندار کج نوا بھی اور اب بیچنے کی بھی ٹھان لی۔ دکھ نہیں ہوتا آپ کو“ منتریموری نے کہا۔

شائے کے ذہن میں تو صرف شاہیں شائیں ہو رہا تھا۔ جیسے بہت زور کی آدھی چل رہی ہو۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ نشین“ بیچی جا رہی ہے۔ اور کینوں کے کہیں باہر جانے کے ارادے ہیں؟

”معاذ کریں منتریموری مجھے اس قسم کی پرنزل باتیں تو نہ کرنا چاہیے تھیں۔ ہو سکتا ہے۔ یہ قدم آپ لوگوں نے کسی بہتری کے لیے اٹھایا ہو۔ لیکن یقین کریں آپ کے جانے کا مجھے سب سے زیادہ افسوس ہو گا۔“

شائے کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ دکھ اور اذیت کے واضح آثار تھے۔ اس کی رنجت پیچھے ٹپٹپٹ تھی۔ کئی لمحے تو وہ بے جان بت کی طرح کرسی میں پڑی رہی۔ منتریموری باتیں کیے گئے۔ وہ نشین کی خوبصورتی کے تھیدے پڑھ رہی تھی۔ شائے کے من میں ہلچل مچی تھی۔

کچھ دیر بعد شائے نے اپنے آپ کو منبھالا۔ کرسی میں پہلو بدلا۔ تازہ کافی پیالی میں انڈلی۔ اور حواس بجا کرتے ہوئے منتریموری سے کہا۔ ”آپ سے کس نے کہا سب کچھ“

منتریموری ہتھکڑی لگا کر بولی۔ ”آپ نے سب باتیں صیغہ راز میں رکھی تھیں نا۔“

”ہاں“ شائے نے یونہی کہہ دیا۔

”مان لیں ہمیں۔ آپ کا راز لے اڑے ہم۔“

دونوں کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ شائے نے فضل دین سے کافی بنانے کو کہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد فضل دین ٹرائی میں کچھ بسکٹ کافی اور ڈرائے ڈروٹ لے آگیا۔ شائے نے پیٹ منتریموری کو دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”مکھن نہ کیجیے۔ آپ خود ہی ایں۔“

”لایے میں کافی بناتی ہوں۔ منتریموری نے پیٹ تیری منیر پر رکھتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں۔ آپ میری مہمان ہیں۔ میں بناتی ہوں۔“

”تکلف برطوت۔ ادھر کریں ٹرائی“

منتریموری نے ٹرائی اپنے آگے کر لی اور کافی کی نازک بسکٹ اور نفیس پیالی میں کافی بنانے لگی۔

”ہمارا آپس میں کوئی زیادہ آنا جانا تو نہیں۔ منتریموری پیالی شائے کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرائی۔ لیکن یقین مانیں آپ کی مہمانیگی ہمارے لیے بڑی

مرت کا باعث تھی۔“

”تھی کیوں؟“ شائے نے منتریموری سے کہا۔

”آپ جا جو رہی ہیں۔ تھی ہی کہنا چاہیے نا۔ منتریموری نے پیالی لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

اور شائے کا پیالی والا ہاتھ کانپ گیا۔ اس نے فوراً پیالی منیر پر رکھ دیا اس نے پلکیں چھپکا چھپکا کر منتریموری کو دیکھا۔ منتریموری نے کیا کہہ دیا تھا

شائے کہاں جا رہی تھی؟ وہ ایک دم پوچھ ہی نہ سکا۔

منتریموری نے پیالی والی پیٹ میں رکھتے ہوئے بسکٹ اٹھا لیا۔

واقعہ منتریموری نے اپنے لوگوں کے چلے جانے کا بھی افسوس ہو گا۔ اللہ جانے

عثمان نے نشین جس شوق جس محبت اور جس والہانہ پن سے سال سوا سال کی محنت سے بنوائی اور سجائی تھی۔ شانہ کی نگاہوں میں وہ شب و روز گھوم گئے۔

اب

وہ

یہ جگہ بیچ رہے تھے۔ چھوڑ رہے تھے۔

کتنی اذیت وہ تھی یہ بات۔ لیکن۔

لاکھوں اذیتوں کی ایک اذیت تو یہ تھی۔ کہ شانہ کے علم میں یہ بات تھی ہی نہیں۔ وہ۔ اپنے طور پر ہی سب کچھ کر رہے تھے۔

اپنے طور پر

اکیلے۔ تنہا۔

منتر پوری تو کچھ دیر اور بیٹھ کر اپنے گھر چلی گئی۔ شانہ کی ذہنی کوفت میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ مضمل بے چین اور مجروح مجروح نشست گاہ سے اٹھ

آئی۔

عثمان اب روزانہ رات گئے گھر آتے تھے۔ ناشتہ دونوں ساتھ کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ چلے جاتے اور رات کا دل جب پوری طرح ڈوب جاتا تو واپس آتے۔

دوپہر شانہ نے کھانا نہیں کھایا۔ حلق میں تو جیسے کانٹے چھب رہے تھے۔ دل ڈوب رہا تھا۔ ٹائم بم پھٹنے کا وقت جیسے قریب آ رہا تھا۔

شام اس نے فضل دین اور رحمت خان کو طلب کیا۔ اور منتر پوری سے ملی ہوئی معلومات کے حوالے سے دونوں سے بات کی۔

کیا۔

آپ کو کس نے بتایا۔

کیا؟

یہی کہ کوٹھی بھی جارہی ہے اور ہم باہر جا رہے ہیں۔

بس چل گیا تپہ۔

کیا آپ بتانا پسند نہیں کریں گی۔

نہیں بھئی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ویسے۔ وہ کچھ کہتے ہوئے رک

گئی۔

ہوں۔ شانہ سنجیدہ تھی۔

مجھے علم نہیں تھا منتر عثمان۔ کہ یہ راز کی بات ہے۔ معاف کیجئے گا۔ تپہ

ہوتا تو میں ہرگز بات نہ کرتی۔

خیر کوئی ایسی راز کی بھی بات نہیں۔ پھر بھی میں جاننا ضرور چاہوں گی۔ کہ

آپ کو کیسے تپہ چلا۔

دو تین دن ہوئے آپ کے ملازم رحمت خان اور فضل دین ہمارے خانا

سے یہ باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سن لیں۔ یقین مانیں۔ دل تو اسی وقت

چاہا کہ آپ کے پاس آکر پوچھوں پھر سوچا۔ آپ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں بہتر

ہی کے لیے کر رہے ہوں گے۔

شانہ چپ ہو گئی۔ اس کے سن میں تلاطم ہا تھا۔ گھر کے نوکر و

علم میں یہ بات یقیناً عثمان ہی کی وجہ سے آئی ہوگی۔ تو گویا عثمان کشمیں بیچے

ہیں؟ اور باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

شانہ کے سینے میں ہوک سی اٹھی۔



پہلے تو دونوں شائندہ کے باز پرس کے انداز سے ہم گئے۔ پھر فضل دین نے ہمت سے بات کی۔ اس نے عثمان کو نصیر صاحب سے فون پر باتیں کرتے سنا تھا۔

مجھے فضل دین ہی نے بتایا تھا۔ رحمت خان بولا۔

صاحب بڑے سنجیدہ تھے۔ نصیر صاحب سے کہہ رہے تھے۔ کہ چند دن تک وہ امریکی چلے جائیں گے۔

شائندہ نے دونوں کی باتیں بڑے صبر و تحمل سے سُنیں۔ وہ دونوں یقیناً جھوٹا نہیں کہہ رہے تھے شائندہ کو اعتراف تھا۔ پھر بھی اس نے دونوں کو ڈانٹ دیا۔ گھر کی باتیں یوں دوسروں تک پہنچا کر تے ہیں فضل دین۔ اور رحمت، خان ہیں بھی خدا نے کوئی عقل نہیں دی۔ منتر تیری کے ملازم سے یہ سارے باتیں کرنے کی کیا تک تھی۔

شائندہ نے دل کی بھڑاس ان دونوں پر گرج برس کر نکالی۔ دونوں سر جھکا چپ چاپ کھڑے رہے۔ جب شائندہ بول بول کر تنک گئی۔ تو فضل دین نے آہستگی سے کہا۔ ہم نے منتر تیری کے ملازم سے نہیں کہا تھا بجیم صاحب۔ بلکہ اس نے خود ہی ہم سے پوچھا تھا۔ اس نے یہ خبر باہر سے سنی تھی۔ صاحب اپنے سیکرٹری سے بھی تو اس سلسلے میں بات کرتے رہے ہیں۔ وہ تو۔ وہ تو بہت جلدیاباں ہے جانا چاہ رہے ہیں۔

شائندہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں کو چلے جانے کا کہہ کر خواجہ میں آگئی۔ بیڑ پر افسر بیٹھ گئی۔ اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ داغ گھوم رہا تھا۔ یہ خبر تو متنبہ ہو ہی گئی تھی۔ کہ عثمان یہ گھر چھوڑ کر باہر جا رہے ہیں۔

لیکن

اس کے بارے میں انہوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔؟؟

وہ کہاں رہے گی؟

شیری کا کیا ہوگا؟

معاملے حد تکین ہو گیا تھا۔ دو ٹوک فیصلے کا مرحلہ آ گیا تھا۔ وہ بیڑ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں پر سر کو گرالیا۔ اور سوچوں میں ڈوب گئی۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے گی۔

نوکر چاکر بھی اپنے تھے۔

عثمان دواڑھائی برس کے تھے۔ کہ ان کی امی دوسرے بچے کی ولادت کی متحمل نہ ہو سکیں۔ دو تین ہفتے بیمار رہ کر چل بسیں۔ بچہ بھی فوت ہو گیا۔ عثمان کی پرورش اور نگہداشت دادی اماں کی نگرانی میں انا کی گود میں ہونے لگی۔ بہت چھوٹی عمر میں زسری میں داخل کر دیا۔

عشرت بانو سے مراد علی خاں کی شادی پہلی بیوی کے فوت ہونے کے کوئی دو سال بعد ہوئی۔ عشرت مرحومہ کی بہن ہی نکلتی تھیں۔ یہ رشتہ کرنے میں مراد علی خاں ان کی والدہ اور دوسرے رشتہ داروں نے یہی مصلحت دیکھی تھی۔ کہ عثمان کے لیے عشرت بانو کے دل میں ضرور ہمدردانہ جذبات ہوں گے۔ وہ ماں کا پیار بچے کو دے سکیں گی۔ لیکن بہت جلد مراد علی خاں نے محسوس کر لیا۔ کہ قدرتی جذبوں کا رنگ اپنا ہی ہوتا ہے۔ ظاہر داری کی کوشش میں ان کی شکل منہ بھی ہو سکتی ہے وہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ بچے کے دل و دماغ پر محبتوں کی نمائش سے کوئی غلط اثر پڑے

جب تک دادی اماں زندہ رہیں عثمان ان کی زیر نگرانی پلے بڑھتے رہے جب وہ فوت ہو گئیں تو عثمان کو تعلیمی سلسلوں کے لیے ہوٹل بھیج دیا گیا۔

مراد علی خاں نے حتی الامکان عثمان کو محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ عشرت بانو بھی شوہر کی خوشنودی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عثمان سے اچھا سلوک کرتی رہیں یوں بھی وہ چھٹیوں ہی میں گھر آتے تھے۔ سال میں دو تین بار تھوڑے تھوڑے دنوں کے لیے۔ اس لیے کسان سے سوتیلے پن کی پر خاش رکھنے کا سوال ہی نہ تھا۔ عثمان اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر چلے گئے۔ تو پھر مینوں کا چکر سالوں میں گھٹنے لگا دوسرے تیسرے سال ہی آنا ہو سکتا تھا۔

دو پونے دو سال پہلے ہی کی تو بات تھی۔

عثمان اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد یورپ اور امریکہ کی سیر کر کے واپس وطن آئے۔ مراد علی میں زندگی کی پرجوش سی لہر دوڑ گئی۔ مراد علی خاں تو بیٹے کی دلچسپی پر مسرور و مطمئن تھے ہی۔ عشرت بانو بھی بے انتہا خوش تھیں۔ خوب صورت اور خوب سیرت نوجوان عثمان تنہا واپس آئے تھے۔ خاندان کے دوسرے کئی نواب زادوں کی طرح غیر ملکی بیویاں ساتھ لاکر خاندانی روایات کو توڑنے کی انہوں نے حماقت نہیں کی تھی۔ اپنی بھتیجی فقیہہ کو ہونا کہ مراد علی لانے کی دلی خواہش پورا کرنے کا سامان نظر آ گیا تھا۔

سائرہ اور فاخرہ بھی عثمان کی آمد پر پھولی نہ سہا رہی تھیں۔ ہنس کھ۔ روشن خیال اور ہر بات میں طرف داری کرنے والا بھائی بوجھ آ گیا تھا۔

عثمان خود بھی کچھ کم خوش نہیں تھے۔ برسوں کیلے رہ رہ کر وہ تنگ آچکے تھے۔ گھر کی زندگی مدتوں بعد نصیب ہوئی تھی۔ ماں باپ نہیں دوست رشتہ دار

عثمان خوشدلی سے مسکرا دیتے۔

سائرہ اور فاخرہ کو بھی عثمان کی شادی کا بڑا چاڑ تھا۔ دونوں بہنیں اکثر عثمان سے اس موضوع پر باتیں کرتیں۔ اس کی پسند پوچھتیں۔ اپنی پسند بتلاتیں۔ سائرہ کو ماڈرن قسم کی بھابی لانے کا شوق تھا۔ نئی تہذیب کی دلدلہ۔ جو سوسائٹی میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہو۔ جس کے فیشن کے چرچے ہر زبان پر ہوں۔ جس کے انداز و اطوار اپنانے کی لوگ فخریہ کوشش کریں۔ جو لوگوں کے رشک کی آنکھیں امکی ہوئی ہو۔

فاخرہ کی پسند سائرہ کی ضد تھی۔ اسے خالص مشرقی تہذیب یافتہ لڑکی پسند تھی۔ جھکی جھکی آنکھوں والی بات بات پر کانوں تک سرخ ہو جانے والی اور معمولی معمولی بات پر سہم جانے والی بھابی پسند تھی۔ جس کی حیا کے چرچے لوگوں کی زبان پر ہوں۔ جو پرانے اور مردک لباس پہنتی ہو۔ اور انہیں جدت طبع سے یارنگ نہ بنتی ہو۔ جسے دیکھ کر لوگ دیکھتے ہی دیکھتے رہ جائیں۔

مراد علی خاں عثمان کی شادی کے فرض سے بکدوش ہونا چاہتے تھے انہوں نے عشرت بانو سے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ عثمان کی شادی کا بندوبست کریں۔ مراد علی کی خواہش نے شادی کے چرچوں کو اور زیادہ زوردار کر دیا۔

اس دن سائرہ فاخرہ عثمان اور عشرت بانو بارہ دری میں بیٹھے تھے۔ کرم کیلا جا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ پانچ چھ بازیاں ہو چکیں تو عشرت بانو نے کمری پیچھے گھسیٹ لی۔ بس؟ عثمان نے پوچھا۔

ہوں۔ وہ گوٹ پھینکے ہوئے بولیں۔ بہت کھیل لیا۔

ہاں بھائی جان بدمعاش ہو گئے ہیں۔ کوئی اور پردہ گرام نہ اتارے میں سائرہ بولی۔

مراد علی خاں اور عشرت بانو کا خیال تھا۔ کہ وہ کیا رنیر کے ہو رہیں گے۔ اور اگر وہ بال مستقل نہ بھی رہے تو ضرور کسی لڑکی سے شادی بچالیں گے۔ لیکن عثمان خلافت توقع تہا ہی والیں لوٹ آئے۔

عشرت بانو جان بوجھ کر انہیں چھڑتیں۔ آپ نے خاندانی ریت کیسے ٹوڑ دی۔ اب تک تو جتنے لڑکے باہر گئے۔ اکیلے نہیں آئے۔ میں وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ عثمان بھی شرم ہو جائے۔ آپ لوگوں سے اجازت لے جائے تو لے آؤں گا۔

اور یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ مراد علی میں کسی فرنگ کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

مثلاً۔

مثلاً چین، جاپانی، عربی۔ اور۔

اور۔ اور بس۔

وہ کھلکا کہ نہیں پڑتیں۔ پھر بڑے لاڈ سے کہتیں۔ اپنے بیٹے کے لیے ہم ایسی لڑکی لائیں گے جو بے مثال ہوگی۔

کس لحاظ سے۔

ہر لحاظ سے۔

ٹھیک ہے۔ منظور ہے۔ لیکن ایک شرط ضرور ہے۔

وہ کیا؟

اسے یہاں لانے سے پہلے آپ میرا عندیہ ضرور لیں گی۔ سر تھو پنے کے میں قائل نہیں ہوں امی حضور۔ چاہے آپ کی بے مثال جنت کی حور ہی کیوں نہ ہو۔ یاد کریں گے بیٹے جی۔

- شادی کا پروگرام بنائیں اب تو عشرت بانو نے بی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔  
 - پہلے دلہن کو تو ڈھونڈ لیں۔ فاخرہ بولی۔  
 - ہے میری نظر میں۔ سائرہ نے کہا۔  
 - کون !  
 - بس۔

- کوئی بی مولوا نی ہوگی۔ گھیر وار غرار سے والی لمبی چوڑی چادر میں لپی ،  
 کہنیوں تک چین چین کرتی چوڑیاں پہنے۔ ناک میں موٹا سا لونگ کانوں میں  
 چوڑے بالے۔ گلے میں دوہرے تہرے ہار۔  
 سائرہ فاخرہ کو چرانے کے لیے ہنس ہنس کر خالص مشرقی تہذیب کی دلدادہ  
 کا جلیب بگاڑ بگاڑ کر بیان کرنے لگی۔

عثمان مسکراتے گئے۔ عشرت بانو بھی ہنسنے لگیں۔ فاخرہ کو سائرہ کی باتوں  
 پر طیش آگیا۔ جل کر بولی۔ جی نہیں کوئی بم اٹھا لائیے۔ جو گنجی کو تری ہو ایم  
 مادر پدر آزاد جو فیشن کے نام پر عربیائی کا اشتہار ہو۔ اور جو ناک بھول چڑھا  
 کہ آپ پر ہی چھوں چھوں کرتی پھرے۔

- جی معاف فرمائیں۔ ماڈرن بد تمیزی کو نہیں کہتے۔

- ہر پھر کر دونوں ایک ہی شے کے نام ہیں۔

- خوب۔ یہ ہے عقل جناب کی۔

- بالکل ٹھیک کہا ہے میں نے۔

دونوں بہنیں نوک جھونک پاتر آئیں۔ تو عثمان کھکھلا کر ہنس پڑے  
 دونوں کے درمیان اپنے بازو دھپلا تے ہوئے بولے۔ لڑائی نہیں ہوگی۔  
 - بیوقوف ہیں دونوں۔ عشرت بانو نے مسکرا کر بیٹیوں کی طرف دیکھا۔

اپنی اپنی پسند بتائے جاتی ہیں۔ جنہوں نے شادی کرنا ہے ان سے پوچھا۔  
 - ہاں بھئی۔ عثمان مسکرا کر بولے۔ واقعی پسند تو میری دیکھنا ہے آپ کو۔  
 - بتائیں آپ ہی۔ سائرہ خفگی سے بولی  
 - بتاؤں فاخرہ۔ عثمان نے بہن سے پوچھا  
 - بتادیں۔ فاخرہ خفت سے مسکرائی۔  
 - آپ دونوں عثمان بولے۔

- ہیں چھوڑیں آپ بتائیں کیسی لڑکی پسند ہے آپ کو۔ فاخرہ نے کہا۔  
 - بتادوں؟

- ہاں ہاں۔ بتا بھی دیں۔

- سچی سچی۔

- بالکل سچی سچی۔

- واقعی؟

- ہائے اللہ بتا بھی چکیں اب۔

عثمان کچھ دیر بہنوں کو ستاتے رہے۔ عشرت بانو قدرے ہٹ کر بیٹھیں

چھڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔

- بالکل بھی نہ بتا۔ بیٹے۔ فاخرہ نے اکتا کر کہا۔ ہمارا کیا جائے گا۔ آپ کے

پے ہی کوئی غلط قسم کی لڑکی پسند جائے گی۔

- نہ نہ۔ عثمان بولے ایسا ظلم نہیں ہوگا۔

- پھر بتائیں۔

- ہوں۔

”اچھا جی۔ عثمان نے سنجیدہ چہرہ بناتے ہوئے کہا۔ میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہوں گا۔ اسے کم از کم چھنٹ لبا ہونا چاہیئے۔“  
 ”ہائے اللہ چھنٹ۔“ فاخرہ نے آنکھیں پھلا کر کہا۔  
 ”اتنی لمبی۔؟“ سائرہ نے منہ بنایا۔  
 ”عشرت بانو نے بھی حیران ہو کر عثمان کو دیکھا۔ عثمان سنجیدہ بنے بیٹھے ہے۔“  
 ”اور وزن۔“ وہ بولے  
 ”دونوں نہیں آنکھ پوری کی پوری کھولے عثمان کا منہ نہ لگیں۔  
 ”کم از کم دو من۔“ عثمان نے کہا۔  
 ”دو من کی دھو بن چاہیئے۔“ سائرہ اور فاخرہ کے کچھ کہنے سے پہلے عشرت بانو ہنس کر بولیں۔  
 ”جو جی چاہیئے کہہ لیں۔ رنگ کالا ہو۔ ہونٹ جامنی۔ بال سنہری آنکھیں کالی۔ دانت پیلے۔“ عثمان جلدی جلدی بولے جارہے تھے۔  
 ”سر پینٹ۔“ سائرہ نے عثمان کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔  
 ”اور آپ نے پہلے ہی بتا دیا۔“ عثمان نے ہنس کر کہا۔ عشرت بانو سائرہ اور فاخرہ کھکھلا کر ہنس پڑیں۔  
 ”کچھ دیر ہنس مذاق ہوتا رہا۔  
 ”یہ تو مذاق تھا۔ آپ سچ سچ بتا دیں بھائی جان۔“ سائرہ بولی۔ میری لپٹ کی بھابی لائیں گے۔“

”یا میری۔“ فاخرہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔  
 ”دونوں کی نہیں۔“ عشرت بانو ہنس کر بولیں۔  
 ”واقعی عثمان نے کہا۔“ آپ دونوں تو اتنا پسند ہیں۔“

اور  
 پھر  
 اپنی اسی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے فوضیہ کو مراد عمل بلانے کا ارادہ کر لیا۔

عثمان کئی دفعہ سنجیدگی سے بھی عشرت بانو سے کہہ چکے تھے کہ وہ شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھنا ضرور چاہیں گے۔ سر تقو نے والی بات غلط تھی۔ اسی لیے عشرت بانو نے فوضیہ کو اپنے ہاں مدعو کرنے کا ارادہ کر لیا۔

فوضیہ اپنے والدین کے ساتھ کراچی میں تھی۔ کبھی کبھی مراد عمل چند دنوں کے لیے آیا کرتی تھی۔ اب بھی وہ کچھ دنوں کے لیے بلانی جاسکتی تھی۔ حین و جیل ٹائٹ اور غرض مزاج فوضیہ عثمان کے لیے کھلا چیلنج بن سکتی تھی۔  
 شام اترنے لگی تھی۔ سب بارہ وری سے اٹھے اور اندر چلے گئے۔

اسی رات عشرت بانو نے کراچی کال کی۔ فوقیہ کو چند دنوں کے لیے اپنے  
ہاں بلایا۔ بھائی بھادج نے بات تو نہ بتائی۔ لیکن دل ہی میں خوش بہت تھیں۔  
صبح انہوں نے ناشتہ کرتے ہوئے فوقیہ کے آنے کی یوں سنائی جیسے دُہ  
اتفاقہ ہی آرہی ہو۔

سائرہ اور فاخرہ اپنی ہم عمر کن کے آنے کی خبر پر بہت ہی خوش نظر آئیں۔  
"ہفتہ کو شام پانچ بجے کی فلائیٹ سے پہنچ رہی ہے" عشرت بانو نے سرری  
انداز سے کہا۔

"خوب مزہ آئے گا" فاخرہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔  
"سیر و تفریح کی بہت شوقین ہے فوقیہ" سائرہ بولی "ہم بھی لور ہو رہے  
تھے۔"

"ہمارے ہوتے ہوئے بھی" عثمان نے بہن کے سر پر پیار سے چپٹ لگائی۔  
عشرت بانو نے دیکھا۔ عثمان بھی خوش نظر آ رہے تھے۔

عشرت بانو نے سائرہ اور فاخرہ کے کمروں کے پہلو والا کمرہ فوقیہ کے لیے  
درست کر دیا۔ یہ بیدروم خاصہ کشادہ تھا۔ مراد محل کے دوسرے کمروں کی طرح  
یہ بھی نفاست سے آراستہ تھا۔ ضرورت کی ہر چیز بیاں رکھوا دی گئی تھی۔ فوقیہ کی  
خاطر کر کے بھادج بڑھانے کے لیے عشرت بانو نے پتھر کے قدیمی گدان دونوں  
کونوں میں رکھوا دیئے تھے۔ سائرہ نے ان میں لمبی لمبی ٹہنیوں پر آرائشی پھول پیاں  
اس طرح بھادج تھیں۔ کہ کمرے میں ٹہرے ہونے کے باوجود جاذب نظر آتے تھے  
اور کمرے میں داخل ہوتے ہی توجہ ان کی طرف مبذول ہو جاتی تھی۔

بیڈ کے پاس کافی کا عورت کا خوبصورت مجسمہ جو سائڈ ٹیبل بھی تھا۔  
عشرت بانو نے رکھوا دیا تھا۔ بیڈ کی زیریں اس مجسمے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ رات  
کے وقت تو یہ مجسمہ بہت ہی خوبصورت لگتا تھا۔ کالے مجسمے سے روشنی کی کرنیں  
پھوٹی بڑی آرائش لگتی تھیں

عشرت بانو بڑے انہماک سے فوقیہ کے استقبال کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ مراد  
ٹائی ناں بھی بچہ نہ تھے۔ عشرت بانو کے ارادے بھانپ گئے تھے۔ عشرت بانو کو اتنا

”بس پھر ٹھیک ہے۔“

”عثمان سے آپ نے ذکر کیا؟“

”کس بات کا۔“

”یہی کہ آپ فوقیہ کو ان کے لیے مانگنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔“

”نی الحال تو نہیں کیا۔“

”بہتر ہو تا کہ دیتیں۔“

”جی نہیں۔“

”کیوں۔“

”فوقیہ کل آرہی ہیں۔ عثمان ان سے مل لیں۔ پھر عندیہ معلوم کر لوں گی۔“

”عثمان کی پسند کا معاملہ ہے؟“

”ہاں۔“

”فوقیہ ایسی کچی کے ساتھ ناپسند کا لفظ چپاں نہیں ہو سکتا۔“

”پھر بھی۔“

”آپ کی مرضی۔“

”عثمان شادی ہماری پسند کی کریں گے۔ پھر بھی وہ لڑکی سر تھوپے جانے کے قابل

نہیں ہیں۔ اور میں سمجھتی ہوں۔ یہ ان کی سعادت مندی ہے۔ ورنہ ان کے ہم عمر لڑکے اپنی اپنی پسند کی شادیاں کر رہے ہیں۔“

”نور۔ فوقیہ۔ عاطف اور شبیر علی تو باہر سے بیویاں لے آئے۔ ہم تو اللہ

تعالیٰ کے سکے گذار میں۔ عثمان برسوں باہر رہ کر بھی اپنی روایات کو نہیں بھولے۔“

”وہ بھی باہر ہی شادی کر لیتے تو ہم کیا کر سکتے تھے۔“

”عثمان کے خیالات بے حد سچے ہوئے ہیں۔“

”مصرف دیکھا۔ تو اس رات پوچھ ہی لیا۔“ فوقیہ پہلے بھی آیا کرتی تھیں۔ اس کوئی خاص بات ہے نیگم۔“

”اگر میں کہہ دوں ہاں۔ تو پھر۔“ عشرت بانو بھی دل کی بات مراد علی خاں سے کہنا چاہتی تھیں۔ موقع بن گیا۔ ان کے استفسار نے بات گوش گزار کر کے کی خواہش پوری کر دی۔

”وہ آج کافی دیر سے اپنی خوابگاہ میں آئی تھیں۔ مراد علی خاں کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔“

”عشرت بانو بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئیں۔ مراد علی خاں نے فوقیہ کی بات کی تو وہ بھی بڑی بولتی نکا ہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے مسکرا دیں۔“

”کیا بات ہے۔“

”آپ کو جان جانا چاہیے۔“

”ہم جان تو گئے ہیں۔ لیکن۔“

”فوقیہ بڑی پیاری کچی ہے۔“

”مجھے علم ہے۔ صورت سیرت۔ ہر لحاظ سے بیشال ہیں۔“

”اپنا ہی خون ہے۔“

”بالکل۔“

”میرا جی چاہتا ہے عثمان کے لیے انہیں انگ لوں۔“

”مراد علی خاں نے مسکراتے ہوئے بیڈ میں قدرے اونچے ہو کر شانوں تلے

دھر کرتے ہوئے عشرت بانو کو دیکھا۔“

”پسند ہے آپ کو۔ عشرت نے پوچھا۔“

”نیک خیال ہے۔“

کر دانا ہے۔

”تو گویا معاملہ عوصلا افزا ہے۔“

”ہے تو ہسی۔“ باقی جو خدا کو منظور ہوا۔“

”ہم بڑے مطمئن ہیں۔ یہ رشتہ ضرور ہو نا چاہیے۔ خاندانی کشیدگیاں دور ہو جائیں گی۔“

”انشاء اللہ۔“

عشرت بانو اور مراد علی خان اس رات کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اگر عثمان فقیہ کے بارے میں خوشگوار رد و عمل کا اظہار کر دیں گے۔ تو شادی جلد ہی کر دینے کا پروگرام بننے لگا۔ پھر عثمان کے ہمدرد بار کی بھی باتیں ہوئیں۔ وہ ان دنوں فیکٹری بنوارہے تھے۔ روایتی نوابزادوں کی طرح بے شمار زمینوں، باغات کی آمدنی پر عیش اڑانے اور سیکار میٹھ کر دنیا جہاں کی آسائشیں حاصل کرنے کے وہ قائل نہ تھے۔ شاید برسوں پہلے ملک میں رہنے سے جہاں نظریہ زندگی یہاں سے بالکل ہی مختلف تھا وہ خود کمانے کے عادی ہو گئے تھے۔ باپ کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے کار باک گیس فیکٹری بنوانے کا ارادہ ترک نہ کیا تھا۔ مراد علی خان کو مالی امداد دینا ہی پڑی تھی۔

”عثمان سے پوچھ کر ہی شادی کا طے کیا جائے گا۔“ مراد علی خان خوش ہو کر بولے۔ اپنی من مانی کرنے کے عادی ہیں۔ فیکٹری میں لگے ہوئے ہیں ان دنوں۔ شاید وہ شادی فیکٹری کو چاکر کرنے کے بعد ہی کرنا چاہیں۔

”ابھی یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ فیکٹری کا تو ابھی بہت سا کام باقی ہے۔ پہلے عثمان اپنی پسند کا انتخاب تو کر لیں۔“

”میرا خیال ہے۔ فیکٹری کے لیے اب انہیں زیادہ سرمایہ فراہم کر ہی دینا چاہیے۔“

”فوقیہ ان کی بہترین رفیق ہو گئی۔“

”خدا کرے۔ ہمارے لیے بھی اچھا ہو گا۔ ہم سب ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہو جائیں گے۔“

”ہاں عثمان کی والدہ مرحومہ کی وجہ سے جو ذہنی اختلاف خاندان میں پیدا ہوئے تھے یوں دور ہو سکتے ہیں۔“

”بالکل۔ میری سبھی عثمان کی دلہن بن کر عثمان کے کٹ جانے والے نہال سے پھر سے رابطہ پیدا کر سکتی ہے۔“

”ہاں۔ یہ ہماری دلی خواہش ہے۔“

”خدا کرے۔ یہ بندھن بندھ جائے۔“

”ضرور بندھ جائے گا۔“

مجھے بھی لگتا ہے۔ عثمان فقیہ کے منتظر لگتے ہیں۔

”واقعی؟“

”ہاں محسوس ہوتا ہے۔ کل ساڑھ اور فاخرو کے ساتھ فقیہ کے کمرے کی ترتیب خود ٹھیک کر دار ہے تھے اپنی پسند کی چیزیں وہاں رکھوائیں۔ گلدانوں میں پھول بھی بہنوں سے مل کر بجائے۔“

مراد علی خان بستر میں اٹھ بیٹھے۔ عشرت بانو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تجسس سے بولے۔ ”پنج۔“

”جی ہاں۔“ عشرت بانو کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

مراد علی خان سر کو آہستہ آہستہ جنبش دیتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

”تینوں بہن بھائی پروگرام بھی بنا رہے ہیں۔ تفریح کے لیے کہاں جانا ہے۔“

”پکچر کوئی دیکھنی ہیں۔ کن کن دستوں سے فقیہ کو تماشہ



عثمان دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ مسکرا کر بولے۔ آپ لوگوں کو اتنی افزائش کیوں یثری ہے۔ آپکی کزن ہی آرہی ہیں۔ آپ تو جیسے الپکشن کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

فوقیہ لباس کے معاملے میں بڑی نفاست پسند ہیں۔ ساڑہ نے مسکرا کر کہا۔  
"دیکھیں گے۔ تعریفیں تو بہت سن رہے ہیں۔" عثمان اپنا سر دھرتے ہوئے  
چھپاتے ہوئے بولے۔ "وہ پہاڑ اور چوہے والی کہاوت ہی کہیں صبح نہ ہو جائے۔"  
"ہائے نہیں بھائی جان۔" فاخرہ طرفداری کرتے ہوئے بولی۔ "فوقیہ سے  
آپ ملیں گے تو جانیں گے۔"

"آپکی طرح مرعوب نہیں ہوں گا۔" عثمان نے چھیڑا۔

"اور جو ہو گئے تو۔" ساڑہ نے شوخی سے کہا۔

"تو۔ تو۔" عثمان شوخ نظروں سے بہن کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"کہنے نا۔" ساڑہ بولی۔

"تو۔ تو۔" فاخرہ بولی۔ "تو تو ہی کہتے رہ جائیں گے۔"

دونوں کھکھلا کر ہنس پڑیں۔ عثمان بھی مسکرانے لگے۔

"بھائی جان۔" ساڑہ نے کہا

"ہوں۔"

"آپ نے فوقیہ کو بالکل ہی نہیں دیکھا ہوا۔"

عثمان نے دماغ پر زور دیتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر بولے۔ "بچپن میں  
شاید کبھی دیکھا ہو۔"

"اب دیکھیں گے تو یاد کریں گے۔" فاخرہ شوخی سے بولی۔

"جس تو مورہا ہو گا؟" ساڑہ نے چھیڑا۔

"کیوں نہیں۔" جب بنا ہی ہے ہیں۔ تو مکمل کر ہی لینے دیں۔" خاندان کے  
دوسرے امیر زادوں کے ہم خیال نہیں ہیں وہ۔"

"جاپان سے کچھ مشینری منگوانا چاہتے ہیں۔"

ہاں مجھے بھی بتایا تھا۔ کہ رہے تھے۔ ابا حضور نے سرمایہ نہ لگایا۔ تو میں اپنی  
امی والی زمین فروخت کر دوں گا۔"

مراد علی خان خوش دلی سے ہنس دیئے۔ "بہت تیز ہیں صاحبزادے۔"  
ان کی والدہ مرحومہ کا کافی پیسہ باہر کے بنکوں میں ہے۔ اور وہ جانتے بھی  
ہیں۔ کہ سب کچھ انہیں کا ہے۔"

"ہیں۔"

وہ ہنس کر بولے۔ "چکلے ہیں۔ بھلا ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ کس کا ہے۔؟"  
انہیں کا تو ہے۔"

عشرت بانو نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

سہتہ کا دن سب کے لیے مصروفیت کا تھا۔ شام پانچ بجے کی فلائٹ سے  
فوقیہ آرہی تھی۔ دھیکن صبح ہی سے ہل چکی تھی۔ ساڑہ اور فاخرہ تو لباس ہی کا انتخاب  
کر پار ہی تھیں۔

"میں ساڑھی پہن لوں۔"

"شلوار قمیض ٹھیک ہے۔"

"نیلہ اور ٹیونک اچھا رہے گا۔"

دونوں بہنیں ایک دوسرے سے لباس کے سلسلہ میں مشورہ لے رہی تھیں۔

عثمان امی کے سامنے کچھ خفیف سے ہو گئے۔ سائرہ نے جیسے ان کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔ لیکن ہاتھ آنے والے تو وہ بھی نہ تھے۔ جلدی سے بولے۔  
 "مناں کیجئے گا آپ غلط سمجھیں۔ مجھے اپنے ایک دوست سے ملنے جانا ہے۔"  
 "اور ایئر پورٹ پر نہیں جانا۔" عشرت بانو جلدی سے بولیں۔  
 "میں پانچ بجے تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔" وہ بولے۔  
 "ابھی جانا ضروری ہے؟"

"جی ہاں۔"

"بھول نہیں جانا۔"

"تو یہ تو بڑا بھول سکتے ہیں؟" امی حضور آپ بھی کتنی سادہ ہیں۔

سائرہ آنکھوں کو شرارت سے پچاتے ہوئے بولی۔

"سائرہ آپ میرے ہاتھوں پٹ جایش گی۔" عثمان نے اس کی لمبی چوٹی ہاتھ میں پکڑ کر استہکی سے جھکاکا دیتے ہوئے کہا۔

عشرت بانو کی خوشی دید کے قابل تھی۔ بہن بھائی کی چھیڑ چھاڑ فوجیہ کی اہمیت کی ضامن تھی۔

عثمان اجازت لے کر چلے گئے۔ مال بیٹی سرگوشیوں میں بڑی پیاری پیاری باتیں کرتی رہیں۔

"خواہ مخواہ۔" عثمان نے کندھے اچکاتے ہوئے شوخی سے کہا۔ اتنی اہم شخصیت نہیں ہیں وہ۔"

"ہیں تو۔" فخرہ نے ہنس کر سائرہ کو دیکھا۔ کیوں سائرہ۔"

دونوں شوخی سے بھائی کو چھیڑنے لگیں۔ عثمان بھی کچھ نہ تھے۔ فوجیہ کا جس انداز سے ان دنوں سے گھر میں ذکر ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے۔ تجسس ہی ہو رہا تھا۔ شوق اور کریم بھی تھی۔ فوجیہ کا سراپا بہت حد تک ان کے اعصاب پر مسلط ہو چکا تھا۔ وہ اس سے بٹنے کے لیے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر چکے تھے۔ پسند کی آنکھیں اگر اس کا پکیرا لگا گیا۔ تو وہ شادی کے لیے تیار بھی تھے۔

اس دن عثمان بڑے اہتمام سے تیار ہوئے۔ موسم کی مناسبت سے خوبصورت پھولوں والی شرٹ اور اسی کے ہمرنگ تپلون پہنی۔ اپنی پسند کی پرفیوم بھی استعمال کی۔ کتنی ہی دیر ڈرائنگ روم میں آئینے کے سامنے اپنے وجہ پیکر کا جائزہ لے رہے۔ ان کی نگاہ ہٹ مترنم تھی۔ آنکھوں میں شوخی سی سی تھی۔ آنکھوں میں جھلک جھانک کر اپنے آپ سے چمپ رہے تھے۔ اور اپنے آپ کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تیار ہو کر انہوں نے اپنا سیاہ چشمہ اٹھایا اور رومال سے صاف کرتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔ عشرت بانو اور سائرہ برآمدے میں کھڑی تھیں۔

"بڑی جلدی ہے بھائی جان ابھی تو ساڑھے تین ہی ہوئے ہیں۔" سائرہ

شوخی سے کہا۔ "پلین پانچ بجے آتا ہے۔ ہم ساڑھے چار یہاں سے نکلیں گے"

آپ ابھی سے۔"

عشرت بانو مسکرا دیں۔

”جاؤ۔ ماما کہہ رہی تھاری۔“

”آپکے لیے چائے لینے گئی ہیں۔“

”شائے مجھے پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کو بلا ہی لاؤ۔ ہاتھ دیکھ میرے کس قدر ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔“

”ہاں ڈیڈی۔ پیٹنے آرہے ہیں۔ میں۔ ابھی جاتی ہوں۔“

شائے باپ کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھی تھی۔ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ماما۔“ اس نے وہیں کھڑے کھڑے زور سے پکارا۔

”آگئی۔“ ماما دوسرے لمحے ہاتھ میں چائے کی پیالی لیے اندر داخل ہوئیں۔

وہ خاصی پریشان نظر آرہی تھیں۔ ان کی سرخ و سپید رنگت ماند پڑ گئی تھی۔

”ماما۔ میں ڈاکٹر ناصر کو بلانے جا رہی ہوں۔“

”تم کیسے جاؤ گی۔“

”کسی طرح چلی ہی جاؤں گی۔ ماما ڈیڈی بہت ڈاؤن ہو رہے ہیں۔ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔“

”جاؤ پھر۔ میرا خیال ہے بلڈ پریشر بہت لو ہو رہا ہے۔ میں دوائی کھلاتی ہوں۔ تم جاؤ۔“

”جی کو ساتھ لے جاتی ہوں۔“

”ظریفہ کو لے جاؤ۔“

”نہیں ماما۔ جی ٹھیک ہے۔ ظریفہ کو آپ کے پاس رہنا چاہیے۔ شائے نے نیز پر سے کچھ پیسے اٹھاتے ہوئے کہا۔“

”ماما چائے کی پیالی لیے بیڈ کی طرف آگئیں۔ دوائی ان کے ہاتھ میں تھی۔ اور

”ڈیڈی۔“

”ہوں۔“

”کیسی ہے طبیعت اب۔“

”اچھی نہیں۔“

”دل ٹھیک ہوا۔“

”سنگ کمر رہا ہے۔“

”ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔“

”ہاں۔“

”میں چلی جاؤں۔ فون بل ہی نہیں رہا۔“

”جاؤ گی کیسے۔“

”جی کو ساتھ لے جاتی ہوں۔ کوئی رکشا سیکھی مل ہی جائے گا۔“

ہوئے آج رہے تھے۔ جی کا ہاتھ پکڑ کر اس نے یہ شرک عبور کی۔ اور تنواری  
شرک پر آگئی۔ یہ شرک بھی کافی کشادہ تھی۔ فبتا پر سکون تھی۔ یہاں کبھی کبھی  
لیجی رک شامل جاتا تھا۔ نہ بھی ملتا تو یہ صدر تک پہنچنے کا شارٹ کٹ تھا۔  
شانہ ڈیڑی کی وجہ سے بڑی پریشان تھی۔ جی بچہ تھا۔ بیماری کی نوعیت  
کا اسے علم نہ تھا۔ اسی لیے بے سکی باتیں کر رہا تھا۔  
تم تو چپ ہو جاؤ جی۔ وہ جھنجھلا کر بولی۔  
میرے چپ ہونے سے سیکسی تھوڑا ہی مل جائے گی۔ جی بولا۔  
تمہیں پتہ نہیں ہے کہ ڈیڑی بہت بیمار ہیں۔  
پتہ ہے۔  
پھر باتیں نہیں کرو۔ دعا کرو جلدی سے سواری مل جائے۔  
اچھا جی۔

شانہ شرک کے کنارے رک گئی۔ جی بھی اس کے ساتھ رک گیا۔ سپر  
اور سی تھی۔ بہار کا موسم اختتام پذیر تھا۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ مطلع بالکل صاف  
تھا۔ شرک کے کنارے ایسا درختوں پر بہار کے خاتے سے کچھ اجڑنے  
کی کیفیت تھی۔  
لیجی رک شامل جاتا تھا۔ نہ بھی ملتا تو یہ صدر تک پہنچنے کا شارٹ کٹ تھا۔  
شانہ ڈیڑی کی وجہ سے بڑی پریشان تھی۔ جی بچہ تھا۔ بیماری کی نوعیت  
کا اسے علم نہ تھا۔ اسی لیے بے سکی باتیں کر رہا تھا۔  
تم تو چپ ہو جاؤ جی۔ وہ جھنجھلا کر بولی۔  
میرے چپ ہونے سے سیکسی تھوڑا ہی مل جائے گی۔ جی بولا۔  
تمہیں پتہ نہیں ہے کہ ڈیڑی بہت بیمار ہیں۔  
پتہ ہے۔  
پھر باتیں نہیں کرو۔ دعا کرو جلدی سے سواری مل جائے۔  
اچھا جی۔

زیاہ دیر انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈیڑی بہت ڈاؤن ہو رہے تھے۔  
ڈاکٹر بھی تپہ نہیں ملتا ہے یا نہیں۔  
آپ رک کیوں گئیں۔ تیز تیز چلیں۔ صدر اب زیاہ دور بھی نہیں۔  
کم از کم وکیل ہے۔ مجھ سے تو پریشانی کے عالم میں چلا بھی نہیں جا رہا۔

شانہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔  
جی پچھلے لان میں تھا۔ برآمدے میں کھڑے کھڑے شانہ نے جی کو پکارا۔  
آیا جی۔ دس سالہ جی دہی سے بولا۔  
جلدی آؤ۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ شانہ پریشان تھی۔  
کیوں۔  
ڈیڑی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔  
آیا۔

وہ بھاگ کر آگیا۔ شانہ نے کہا۔ ڈاکٹر ناصر کے پاس جانا ہے۔  
پیدل جائیں گی۔ وہ شانہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔  
بیوقوف۔ کوئی رکشا سیکسی لے لیتے ہیں۔ شانہ برآمدے سے باہر آتے  
ہوئے بولی۔  
آجی آپ ڈرائیونگ سیکھ لیتیں تو اچھا تھا۔ جی نے ڈیڑی کی گاڑی  
کھڑی دیکھ کر کہا۔

ہاں۔ ایسے موقع پر ڈرائیونگ سیکھی ہو تو کام ہی آتی ہے۔ وہ بولی۔  
دونوں باتیں کرتے ہوئے شرک پر آگئے۔  
شانہ نے رک کرائیں بائیں دیکھا۔ دور دور تک کسی رکشے سیکسی کا  
نشان نہ تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ شرک عبور کی۔ اور مین روڈ  
پر آگئی۔ چند لمبے شرک کے کنارے رک کر کسی سواری کا انتظار کیا۔ لیکن یہاں  
سواری ملنا ممکن نہ تھی۔ بسیں، موٹریں، لاریاں، رکشے اور سیکیاں خراٹے ہوتے

روک دی۔

عثمان نے دس گیارہ خوبصورت سہارٹ لڑکے کے ساتھ نوجوان حواس باختہ سی لڑکی کو کھڑے دیکھا۔

سفید شلوار چمک قمیض جس کی آستینیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور چھوٹے سے کندھوں پر پڑے دوپٹے میں لپٹا وجود عثمان نے یوں دیکھا۔ جیسے کوئی ماورائی مخلوق ہو۔ سبزے مائل گرے رنگ کی چوڑی چوڑی آنکھیں جن میں اداسی اور پریشانی وحشت میں گھل مل گئی تھی۔ سرخ دسپید بے داغ چہرہ ان چھوٹی کلیوں کی سی تازگی لیے پیاز سی ہونٹ کندھوں تک کٹے ریشمی بال۔ سیب ایسی چمکی رنگت۔ نگے بازوں کا حسن۔ قاتلانہ حد تک حین جسم۔ عثمان اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ انہوں نے سیاہ چشمہ آنکھوں سے یوں الگ کیا۔ جیسے جو کچھ دیکھا ہو۔ وہ بے یقینی کی علامت ہو۔ چند لمحے تو انہیں یوں لگا۔ جیسے ان کی آنکھوں اور اس حین وجود کے سودنیا میں اور کچھ رہا ہی نہ ہو۔

بے خود

بے مدد ہو کر وہ اسے بچتے گئے۔

شانہ بری طرح گھبرا گئی۔ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے جی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر سرفی میں بلا دیا۔

”باجی کہیں بھی اب۔“ جمی بولا۔ ”ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا۔“

”نہیں جمی۔“ نہیں۔ ”وہ بدحواس سی ہو گئی۔“ ہمیں نہیں جانا۔“

”کیوں۔“ جمی حیران تھا۔

شانہ کچھ نہ کہہ سکی۔ کسی نوجوان کے ساتھ گاڑی میں جانے کو وہ تیار نہ تھی۔ گاڑی روکنے کی وجہ سے اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

”پھر۔“

”کسی سے لفٹ لے لیتے ہیں۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“

”یہی کر سکتے ہیں۔ ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔“

”بس اب جو بھی گاڑی آئی روک لیں گے۔“

”ہاں یہی سوچا ہے میں نے۔“

جی اور شانہ لفٹ لینے کے لیے سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ دو ایک گاڑیوں کو انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ رکی نہیں۔ شاید گاڑی والوں نے ان کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ ایک موٹر لڈی ہوئی تھی۔ ڈرائیور ہاتھ سے نفی میں اشارہ کر کے گذر گیا۔

شانہ پریشانی سے پریشان تر ہو گئی۔

”باجی وہ گاڑی آرہی ہے۔ اسے تو ضرور روک لیں گے۔ جی نے کہا۔“

شانہ ادھر دیکھتے ہوئے تیزی سے چند قدم آگے بڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور

گاڑی کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کر دیا۔

وہ گھبراہٹ اور پریشانی میں ہاتھ ہلاتے گئی۔

بہی سفید گاڑی چند گز آگے جا کر ہلکی سی چرچاہٹ سے سڑک کے ایک

ہو کر رکا گئی۔

جی اس طرف لپکا۔

گاڑی کی کھڑکی سے سر نکال کر عثمان نے پیچھے دیکھا۔ جمی تیزی سے اس طرف

آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ شانہ بھی قدم اٹھاتے چلی آرہی تھی۔

عثمان نے آہستہ سے گاڑی ریورس کی۔ اور ان دونوں کے قریب آکر گاڑی

- وقت ضائع نہ کیجئے۔ اگر آپ نے جانا ہے تو آئیے۔ سواری کے اشتکار میں آپ وقت ہی ضائع کریں گی۔ عثمان بولے۔  
شانہ اب بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔

- محترمہ۔ مجھ پر اعتماد کیجئے۔ شریف آدمی ہوں۔ آپ کے کاموں کو خوش ہوگی۔ اگر آپ نہیں چاہتیں تو اپنے گھر کا پتہ بتا دیں۔ میں ڈاکٹر کو لے کر آ جاتا ہوں۔  
شانہ نے ہر اس ہر اس نظروں سے عثمان کو دیکھا۔ وہ دل تمام کر رہ گئے۔  
عثمان کبھی بھی پہلی نظریں محبت کے قائل نہ ہوئے تھے۔

لیکن

یہاں تو پہلی نظر میں لٹ پٹ جانے کا ساماں ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا۔  
جیسے برسوں منزل کی تلاش میں ٹھک رہے تھے۔ کہ اچانک اپنے آپ کو منزل پہ  
کھڑے پایا ہو۔ قدم جیسے زمین میں گر گئے تھے۔ گنگا میں شانہ کے پیکر  
میں ایسی آشکی تھیں۔ کہ جدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔  
شانہ باجی۔ جی نے بہن کا ہاتھ ہلایا۔

- شانہ۔ عثمان کے ہونٹوں پر یہ خوبصورت نام تھرک گیا۔ انہوں نے  
شانہ کے سراپا پر اک گہری نگاہ ڈالی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر عثمان اپنے  
قدوں پر مڑے۔

- تشریف لائیے۔ عثمان نے دوسری طرف جا کر گاڑی کا اگلا دروازہ کھولتے  
ہوئے۔ یوں کہا۔ جیسے یہ ان کا حق ہو۔ اور اجنبی حسن نے اس حق کو بخوشی تسلیم  
کر لیا ہو۔

جانے جی نے شانہ کو کہینچا۔ یا شانہ خود ہی گاڑی کی طرف اگئی۔ پس وہ  
پیش اور تذبذب کے مرحلے گزر چکے تھے۔ شانہ کے ذہن میں اب صرف اور

- آپ نے۔ عثمان گاڑی سے باہر آتے ہوئے بولے۔  
- جی نہیں۔ شانہ نے اک نظر اس شاندار انسان کو دیکھا۔ وجہ بدلتا اور  
انتہائی خوبصورت فوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

- ہمارے ڈیڑی سخت بیمار ہیں سر۔ جی نے شانہ کی سے کہا۔ کوئی رشتہ کی  
مل ہی نہیں رہا۔ ڈاکٹر کو لینے جانا ہے۔  
- ابھی مل جائے گا جی۔ شانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔  
عثمان نے شانہ کی طرف دیکھا۔ آپ نے گاڑی رد کی تھی؟

- جی۔ جی میں سکی سمجھی تھی۔ شانہ نے بھلاتے ہوئے کہا۔  
- سفید کچیاں بھی چلنے لگی ہیں۔ عثمان زریب مسکرائے۔ شانہ اور گھبراہٹ۔  
- تشریف لائیے۔ عثمان شانہ کا تذبذب دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولے  
- میں آپ کو صدمہ ڈراؤں گا۔ شاید آپ اپنے ڈیڑی کی وجہ سے پریشان  
ہیں۔

- جی ہاں۔ جی بولا۔ ڈاکٹر کے پاس جلدی پہنچا ہے نہیں۔

- تو پھر آئیے نا۔ عثمان نے جی سے کہا۔

جی نے قدم اٹھایا۔ شانہ نے اسے کندھے سے پکڑ لیا۔

- آپ کو اس وقت یہاں کوئی سواری نہ ملے گی۔ عثمان نے شانہ سے کہا۔ اگر آپ  
کے ڈیڑی واقعی بیمار ہیں۔ تو دیر نہ کیجئے۔

- وہ بہت بیمار ہیں۔ جی بولا۔ بیڈ میں ہیں سر۔

شانہ تذبذب کے عالم میں تھی۔ جانے جو آدمی کے ساتھ جانے سے  
خائف تھی۔ یا اس جوان آدمی کی ساحرانہ شخصیت سے۔ وہ دھڑکی ہرئی کی طرف  
نظر آ رہی تھی۔ جی کو پیچھے کیپٹنے لگی۔

صرف ڈیڑی کے لیے ڈاکٹر لانے کا خیال تھا۔  
عثمان کے ساتھ جی اور جی کے ساتھ شائے بیٹھ گئی۔  
کیا تکلیف ہے آپ کے ڈیڑی کو۔ عثمان نے گاڑی چلاتے ہوئے  
پوچھا۔

پتہ نہیں۔ جی نے سادگی سے کہا۔۔۔ ویسے بیڑی میں۔۔۔  
کس ڈاکٹر کا علاج ہے۔ عثمان نے پھر پوچھا۔  
ڈاکٹر ناصر ہیں نا۔ مدر میں۔ ان کو لینے جا رہی ہیں شائے باجی۔ جی بولا۔  
ڈاکٹر ناصر۔ جن کا کلینک فاضل چوک کے پاس ہے۔ عثمان نے قد سے  
آگے ہو کر شائے سے پوچھا۔

جی۔ شائے نے سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ دھیرے سے جی کہا۔

ان کے زیر علاج ہیں آپ کے ڈیڑی۔ عثمان نے پوچھا۔

جی وہ ڈیڑی کے معالج میں۔۔۔ وہ بولی۔

کیا تکلیف ہے انہیں۔۔۔

دل کی تکلیف اور بلڈ پریشر ہے۔

عثمان نے محسوس کیا شائے کے وجود کی طرح اس کی آواز بھی بے حد شائستہ  
اور سُرلی ہے۔

وکیل کا راستہ چند منٹوں میں کٹ گیا۔ جی اپنے طور پر عثمان سے باتیں کرتا  
رہا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے بہت کچھ عثمان کو بتا دیا۔ خاصہ ہوشمند اور  
ہوشیار لڑکا تھا وہ۔

کلینک کے سامنے عثمان نے گاڑی روک دی اور باہر آکر انہوں نے  
شائے کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ شائے باہر نکلی۔ جی بھی باہر آگیا۔

شکریہ۔ شائے نے احسان منظر نظروں سے عثمان کو دیکھا۔

میں انتظار کرتا ہوں۔ آپ ڈاکٹر صاحب کو بلا لائیے۔ میں آپ کو گھر سپنا دوں  
گا۔ عثمان نے بارگاہ حسن میں جیسے یہ منت التجا کی۔

شائے نے عثمان کی طرف دیکھا۔ ان کی خوبصورت آنکھوں میں کوئی آلودگی  
نہ تھی۔ خاموش سی التجا تھی۔ جسے رو کر دینا شاید شائے کے بس میں بھی نہ تھا۔  
وہ انکار یا اقرار کیے بغیر کلینک کے اندر چلی گئی۔ جی بھی اس کے ساتھ گیا۔

کوئی پانچ منٹ جی ڈاکٹر صاحب کا بیگ اٹھائے باہر آگیا۔ اس کے پیچھے  
پیچھے شائے بھی آگئی۔

معاف کیجئے گا۔ آپ کو یونہی تکلیف دے رہے ہیں ہم لوگ۔ اس نے عثمان سے  
کہا۔ ڈاکٹر صاحب آرہے ہیں۔ آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔

عثمان نے بیگ اندر سیٹ پر رکھتے ہوئے شائے کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہے  
ہوں۔ تمہارا انتظار تو میں قرفوں صدیوں سے کر رہا ہوں۔ اب تو انتظار کی  
اذیت ختم ہوئی ہے۔ جو وہ ٹوٹا ہے۔ زندگی نے عنوان پایا ہے۔ جستجو ٹھکانے لگی  
سچائی کا سر اٹھ بلا ہے۔ میں تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ تمہارے لیے جھک رہا تھا۔  
تمہیں پانے کے لیے تمہیں حاصل کرنے کے لیے۔ تم۔ تم جو میری خواہشوں  
آرزوؤں اور مناؤں کا نوپ تھیں۔ تم۔ تم جو میری کائنات ہو۔ میرا آقا صاف ہو۔

میری سوچ ہو میری فکر ہو۔ میری زندگی میری محبت میرا عشق۔ میرا اپنا آپ ہو۔  
مگر ڈاکٹر ناصر کے باہر آجانے سے عثمان کا ذہنی سفر رک گیا۔ ڈاکٹر عثمان کو  
دیکھتے ہی پلک کر آیا اور۔ ہلو عثمان۔ آپ کیسے؟ کہتے ہوئے تپاک سے مصافحہ  
کیا۔

عثمان نے مسکرا کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ شائے نے ایک نظر عثمان کو

دیکھا۔ ڈاکٹر ناصر اس سے کافی بے تکلف تھا۔

سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔

”کرنل سردار علی آپ کے عزیز ہیں۔؟“ ناصر نے عثمان سے پوچھا۔

”کون؟“ عثمان بولے۔

”ان کے ڈیڈی۔ ڈاکٹر نے حمی کی طرف اشارہ کیا۔

”شاید۔ عثمان مسکرا کر بولے۔ انہوں نے اک دُزدیدہ سی نگاہ شائے پڑالی۔

وہ خامی سرخ ہو رہی تھی۔

”شاید؟“ ناصر نے حیرانگی سے کہا۔

”انسان ہونے کے ناطے ہم سب ایک دوسرے کے عزیز ہی ہیں ڈاکٹر صاحب۔

عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔

”معاف کرنا عثمان۔ آپ بچے طبقے کے لوگوں کی یہ سوچ نہیں ہے۔“ ناصر

نے قدرے مسکرا کر کہا۔

”میں طبقوں کا قائل نہیں ہوں۔ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔

”ایسی بات ہے تو مجھے خوشی ہوئی ہے۔“ ناصر بولے۔

دونوں باتیں کرتے رہے۔ شائے ان باتوں سے جو کچھ اخذ کر پائی بی تھا۔

کہ عثمان کا تعلق کسی بہت اونچے اور نوابی قسم کے خاندان سے ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم

یافتہ ہیں۔ باہر سے تھوڑی دیر ہی ہوئی لوٹے ہیں۔ روشن خیال ہیں۔ اور اپنے

خاندان کی روایات سے ہٹ کر سوچتے ہیں۔

”شائے باجی“

”ہوں۔“

”یہ کون ہے۔“

”پتہ نہیں۔“

”سچ؟“

”نہیں تو کیا جھوٹ۔“

”میں سمجھی تھی۔ آپ کے کسی دوست کے بھائی جان ہیں۔“

”نہیں۔“

”شائے باجی۔“

”ہوں۔“

”کسی اجنبی سے لفظ لیتے ہوئے آپ کو ڈر نہیں لگا۔“

”موقع ہی ایسا تھا اور کیا کرتی۔“



"ہاں" شائندہ نے جواب دیا۔ "ڈاکٹر ناصر کا ان سے پہلے ہی تعارف تھا۔"  
 "جیسی۔ ڈیڈی اور ماما سے بھی انہوں نے ان کا پورا پورا تعارف کر دیا۔  
 وہ سب تو خوب بنے نکلت ہو کر باتیں کر رہے تھے۔"

"ماما کی عادت ہی ایسی ہے۔"

"خوش دلی انہیں ورثے میں ملی ہے۔"

"بعض اوقات ماما اپنی خوش دلی دوسروں پر زبردستی بھی ٹھونس دیتی ہیں۔"  
 شائندہ منہس کر بولی۔ "ہو سکتا ہے اس بے چارے کو کوئی کام ہو۔ لیکن ماما انہیں  
 پڑے اتنی دیر بیٹھی رہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب بھی تو بیٹھے رہے۔" ظریف بولی شائندہ ڈیڈی کی باتیں کہنے  
 لگی۔

"شکر ہے ڈیڈی اب بہتر ہیں۔ وہ بولی۔"

"ڈاکٹر نے تو ہسپتال ایڈمٹ ہونے کا کہا ہے۔" ظریف نے کہا۔

"چیک اپ کے لیے۔ اچھا ہے پوری طرح تسلی ہو جائے گی۔"

"کل داخل ہوں گے۔"

"نشاید۔ ماما سے پوچھا نہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی باتوں سے

اندازہ لگایا ہے۔ ڈیڈی کے لیے پانی لے کر گئی تھی۔ تو ہسپتال کی باتیں ہو

رہی تھیں۔"

"کالنج سے چھٹیاں کرنا پڑیں گی۔"

"وہ تو کرنا پڑیں گی ضرور۔"

"دونوں بہنیں باتیں کر رہی تھیں۔ ظریف نے کباب بنانے کے بعد چوہا

چلایا۔ اور فرمائنگ بین اوپر رکھ دیا۔"

"غلط کام کیا آپ نے۔"

"کوئی ایسا غلط بھی نہیں۔"

"جی۔ اتفاقاً ہی وہ شریف آدمی نکلے جو گھر پہنچا دیا۔"

"ضرورت سے زیادہ ہی شریف معلوم ہوتے ہیں۔ جواب ڈاکٹر کو واپس

پہنچانے بھی گئے ہیں۔"

"ویسے بہت بڑا رسک آپ نے لیا۔ آپ کی جگہ میں ہوتی کبھی اتنی بڑی غلطی

نہ کرتی۔"

"بیوقوف کہیں کی سنتی نہیں ہو۔ کہ کش مشکل وقت میں لفٹ لینا پڑی مجھے

تو ڈیڈی کی پریشانی تھی۔ ڈاکٹر کے آکر دیکھ لینے سے ہی تسلی ہوئی ہے نا۔ ورنہ

پہلے تو سب پریشان ہی ہو گئے تھے نا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر کا بلانا ضروری تھا۔"

"بس آگیا ڈاکٹر۔ اس نے ڈیڈی کو دیکھ لیا۔ اور ہم سب کو تسلی ہو گئی۔ قصہ

ختم۔"

"شائندہ اور ظریف باورچی خانے میں آنے سے سامنے کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔"

"ظریف نے آج شامی کباب بنائے تھے۔ خوب مصالحے دار کباب تھے۔ چٹ پٹی

چیزیں بنانے کا اسے بہت شوق تھا۔ ڈیڈی کی طبیعت اچانک زیادہ بگڑ جانے

کی وجہ سے یونہی دھڑے رہ گئے تھے۔ اب ڈاکٹر انہیں دیکھ کر تسلی و تسخنی دے

گیا تھا۔ وہ بھی اب نسبتاً بہتر محسوس کر رہے تھے۔ اس لیے ظریف پھر کبابوں کو

بنانے اور تلنے کے لیے باورچی خانے میں آگئی تھی۔ شائندہ بھی اس کے ساتھ اتر

آگئی تھی۔"

"ویسے شائندہ باجی۔ یہ صاحب ہیں کوئی بھاری بھر کم شخصیت۔" ظریف بولی۔"

شانہ ہنس پڑی۔ ظریف بھی مسکرانے لگی۔

دونوں شادی کے متعلق ہنسی مذاق کرنے لگیں۔ شانہ کے لیے دو ایک رشتے آرہے تھے۔ ایک کیپٹن نسیم تھے۔ دوسرے سول کے کوئی افسر۔ ظریف اسے چھڑ رہی تھی۔ تنخواہوں کے لحاظ سے دونوں بیرے خانہ ماں کے تحمل نہ ہو سکتے تھے۔

چھڑ چھڑا سہو رہی تھی۔ کرماما باورچی خانے میں آگئیں۔ اپنے تراشیدہ بالوں کو جوڑے کی صورت سیٹے ہوئے دلکش نقش و نگار اور متناسب جسم والی ماما بولیں۔ "اسلم کہاں ہے۔"

"پتہ نہیں۔ ہم تو سمجھے تھے آپ نے اسے کسی کام سے بھیجا ہے۔" شانہ بولی۔  
"میں نے کہاں بھیجا تھا۔ باہر ہی کہیں ہوگا۔ آواز دینا اسے شانہ۔" باورچی خانے کی پھللی کھڑکی کے قریب کھڑی شانہ سے ماما نے کہا۔  
"اما خاصی عجلت میں تھیں۔ شانہ کو اسلم کو آواز دینے کا کہہ کر وہ ظریف کی طرف متوجہ ہو گئیں۔" کباب تو ہونگے۔"

"جی ماما بنا رہی ہوں۔"  
"اسلم سے کوئی بسکٹ یا کیک منگوالو۔ شانہ تم چاٹ بھی بنا لو۔ ڈرائے فرڈ بھی ہے۔ سمو سے بھی منگوالو۔"  
"کیوں۔"

"چانے کے لیے۔"  
"کوئی یہاں ہے۔"

"ہاں۔"

"کون ہے اما۔" شانہ نے اسلم کو بلانے کے بعد پوچھا۔

"پہلا کباب میں چکھوں گی۔" شانہ نے کہا۔ "نمک مرچ کا اندازہ تو ہو۔"  
"جی نہیں۔ میں کباب بناؤں اور مصالحہ ٹھیک نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"  
کباب چائے کے ساتھ پیش کر دی گئی۔ اس سے پہلے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں۔"

"یہ بات ہے۔"  
"ہاں۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ تیار ہونے سے پہلے ہی چکھ چکھ کر میری بناؤ ہوئی چیز ختم کر دی جائے۔"  
شانہ مسکرانے لگی۔ ظریف بولی۔ "بہتر ہوگا آپ دوسرا چولہا کھول کر چائے کا پانی رکھ دیں۔ اور ٹرے میں برتن بجا دیں۔"

"اسلم کدھر گیا۔"  
"ماما نے کہیں بھیجا ہوگا۔"  
"آجائے۔ تو برتن لگا دے گا اور چائے بھی بنالے گا۔"  
"آپ سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں۔"  
"کیوں۔"

"بس میری مرضی۔"  
"شانہ باجی۔ آپ بہت کام چور ہیں۔"  
"کیا ہوا۔"

"کل کلاں شادی ہو گئی۔ تو پھر کیا کریں گی۔" آپ کو باورچی خانے کا کوئی کام بھی تو نہیں آتا۔"  
"شادی کر کے کسی نے باورچن ہی بنانا ہے۔ تو اس شادی کو سو سلام۔"

میں ان کی مدد کی تھی۔ شائے کو شاید شام تک بھی سواری نہ ملتی۔ عثمان نے لفٹ دی۔ ڈاکٹر کو لانے۔ اب ڈاکٹر کو چھوڑنے بھی گئے تھے۔ اور اس کی تجویز کردہ دوائیاں بھی لایے تھے۔

عثمان صاحب تو چلے گئے۔ ظریف نے کہا۔

ڈاکٹر صاحب کو چھوڑنے گئے ہیں۔ مسخ بھی لیتے بھی گئے ہیں۔ دوائیاں لے آئیں گے۔ ماما نے کہا۔

”واہ ماما۔ آپ نے تو جیسے انہیں نوکر ہی سمجھ لیا۔ ظریف بولی۔ رضا انکل کے ڈرائیور کو بلا کر دوائی منگو الیتیں۔“

”بھئی میں نے بہتر کہا۔ کہ دوائی منگوا لوں گی۔ وہ مہر تھے۔ کہ دالپی پر لیتے آئیں گے۔ ماما بولیں۔“

”اور آپ نے جھٹ سے چائے کی دعوت دے دی۔ شائے نے مسک کر کہا۔“

”بیوقوف۔“ ماما نے پیار سے ڈانٹا۔ ”اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔“

دونوں بہنیں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔

ماما نے شائے سے کہا۔ ”تم الماری سے برتن نکال لاؤ۔“

”نئے والا سیٹ ماما۔ شائے نے شوخی سے کہا۔“ نوابزادہ صاحب کے لیے نیا سیٹ ہی نکالوں نا۔“

”ہاں۔“ ماما نے جلدی سے کہا۔ ”نئے پنک بھی ساتھ رکھنا۔ ٹرائی وغیرہ خوب صاف تھری ہو۔“

ماما چائے پیش کرنے کے متعلق جلدی جلدی ہدایات دے کر باورچی خانے سے باہر نکل گئیں۔ ان کے جاتے ہی ظریف نے سر ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ماما بھی خوب ہیں۔“

عثمان صاحب چائے ہمارے ساتھ پیئیں گے۔ ماما بولیں۔

عثمان صاحب؟ شائے نے کہا اور ظریف بھی خیران سی ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔ وہی جنہوں نے شائے باجی کو لفٹ دی تھی۔

ماما تاخیر سے مسکرائیں۔ پتہ ہے وہ کون ہے۔

کون۔ دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

نوابزادہ عثمان علی خان ہیں۔ ماما نے بڑے فخر سے نام لیا۔ ”مراد علی خاں کے

بیٹے مراد علی والے۔ میری دوست منر شواری کے سگے بھانجے ہیں۔ ان کا نام قوسن رکھا تھا آج مل بھی لیا۔“

مراد علی اس علاقے کے لیے غیر قوسن نام نہیں تھا۔ مراد علی خاں کے خاندان۔ ان کی امارت اور رکھ رکھاؤ کے چرچے عام تھے۔ مراد علی میں اکثر تقریبات ہوتی رہتی تھیں۔ اور ان کے تذکرے مقبول لوگوں کی زبان پر تھے۔ یوں یہ انجانے لوگ عام لوگوں کے لیے اجنبی نہ تھے۔ منر شواری کے حوالے سے ماما ان کے متعلق کافی معلومات رکھتی تھیں۔

شائے اور ظریف نے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس خاندان کی دو ایک لڑکیاں کالج میں بھی پڑھتی تھیں۔ مراد علی میں ہونے والی تقریبات کا حال ان لڑکیوں کا زبانی اکثر معلوم ہوتا رہتا تھا۔

ماما نوابزادہ عثمان علی خاں نے اپنے گھر اتفاقاً ہی آج جانے پر بے حد سرور و نظم آ رہی تھیں۔ شاید یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ جوان کے حصے میں اچانک ہی آگیا تھا۔ ماما طبعاً مہمان نواز بھی تھیں۔ خوش مزاج اور خوش آمدید کہنے میں ہمیشہ ہی پیش پیش رہنے والی تھیں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نوابزادہ صاحب ان کے ہاں آئیں۔ اور وہ انہیں چائے بھی نہ پلائیں۔ ویسے احسان مند بھی تھیں۔ عثمان نے مشکل وقت

ہاں۔

میں چائے تیار کرتی ہوں۔ پلیز آپ جا کر ڈرائیونگ روم دیکھ لیں۔  
کیوں۔

صاف تھلا ہے کہ نہیں۔

صبح صفائی ہوئی تھی۔

دھول مٹی پڑی جاتی ہے۔ ایک دفعہ جھاڑ پونچھ کر دیں۔

تو بھی ماما کی طرح امپرس ہو گئی۔

بعض لوگوں سے ہونا ہی پڑتا ہے۔

راہ جاتے لوگوں سے۔

بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔ خیر آپ جائیں۔

شائے اچھا کہہ کر باورچی خانے سے نکل گئی۔ چند لمحوں بعد وہ ڈرائیونگ روم

میں تھی۔ ڈرائیونگ روم صاف تھرا تھا۔ پھر بھی وہ ہر چیز جھاٹن سے پونچھنے لگی۔

ڈرائیونگ روم درمیانہ سا کمرہ تھا۔ متوسط درجے کی نمائندگی کر رہا تھا۔ ایک

مورنہ دو کرسیاں اور دو گدے دار چوکیاں پڑی تھیں۔ درمیان میں چوکدار آف

وائٹ قالین تھا۔ اور اسی کے ہم رنگ موٹے کھدر کے پردے تھے۔ دو ایک

یئریاں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ کونے میں مٹی کا بڑا سا گلدان تھا۔ اور دوسرے

کونے میں تینوں سی میز پر چھوٹی چھوٹی آرائشی چیزیں رکھی تھیں۔

صفائی کر کے شائے کمرے سے نکلنے ہی والی تھی۔ کہ گاڑی کی آواز آئی۔ کھڑکی

کا پردہ ذرا ہٹا کر اس نے دیکھا۔ عثمان برآمدے کے سامنے گاڑی روک رہے تھے۔

آواز سن کر ماما بھی برآمدے میں نکل آئیں۔ عثمان گاڑی سے باہر نکلے۔ ان کے ہاتھ میں

ڈرائیونگ کالٹاف تھا۔

فوراً امپرس ہو جاتی ہیں۔ شائے بولی۔

بھئی وہ تو عام عام لوگوں سے امپرس ہو جاتی ہیں۔ یہ تو ماشاء اللہ نواب قسم

کی شے ہیں۔ دونوں نے ہلکا سا ہنسنہ لگایا۔

پھر دونوں اپنے اپنے کام میں لگ گئیں۔ اسلم کو چائے کے لوازمات لانے

کے لیے بھیج کر شائے نے برتن نکالے اور انہیں صاف ستھرے جھاڑن سے پونچھ

لگی۔

ماما نے چائے کی دعوت دی اور جناب نے فوراً قبول کر لی۔ "ظریفہ نہی"۔ لٹو

تو نہیں ہو گئے۔ کہیں۔

تجھ پر ہونے ہوں گے۔ شائے نے اس کی شوخ نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے

کہا۔ "بار بار ڈیڈی کے کمرے میں جا رہی تھی نا۔"

اوں ہوں۔ میری طرف تو مخترم نے دیکھا ہی نہیں۔

جی ہاں۔ بالکل نہیں دیکھا ہوگا۔

سچ شائے باجی۔ آپ ہی ان کے ساتھ گئی اور آئی ہیں۔

اس ہے کیا ہوتا ہے۔

شاید کچھ سوچ گیا ہو۔

جو اس نہیں کر۔

ہائے شائے باجی۔ ایکدم اتنا شاندار آدمی ہے۔

ہے تو میں کیا کروں۔

میرا بس چلے تو میں ضرور کچھ کر دوں۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شائے بھی کھلا

لگی۔

شائے باجی۔

لغافہ انہوں نے بڑی تنظیم سے ماما کی طرف بڑھا دیا۔  
- شکریہ - ماما بولیں۔

- ڈاکٹر صاحب نے کرنل صاحب کو ہسپتال داخل کروانے کی بہت تاکید کی ہے۔ عثمان بولے۔

- کل سی ایم ایچ جائیں گے۔ ماما نے جواب دیا۔

- اب کیسے ہیں کرنل صاحب۔ وہ بولے۔

- سو گئے ہیں۔ ماما نے جواب دیا۔

- اچھا۔ اجازت ہے اب۔ وہ قدرے توقف کے بعد سر قدرے خم کرتے ہوئے بولے۔

- نہیں۔ ماما حسب عادت تنہا بیٹھیں۔

عثمان نے ماما کی طرف دیکھا۔

- چائے پی کر جائیے گا۔

- جی بہت بہت شکریہ۔ انہوں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ مجھے ایئر پورٹ پہنچانے

- پہنچ جائیے گا۔ چائے ضرور پینا پڑے گی آپ کو۔ ماما نے مسکاکر کہا۔

عثمان کچھ لمبے دہلیز کر رہے تھے۔ کہ ماما نے ڈرائیونگ روم کا دروازہ کھول دیا۔

آئیے۔

شائے کھڑکی کے قریب ہی کھڑی تھی۔ کہ ماما اور ان کے پیچھے عثمان اندر آگئے۔

- تشریف رکھیے۔ ماما نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے عثمان سے کہا۔

عثمان کی نظریں شائے پر پڑیں۔ اور ایک بار پھر شائے کے کسی آفاقی مخلوق ہونے

کا انہیں احساس ہوا۔ شائے نظروں کی زد میں آکر کچھ جھینپ سی گئی۔

ماما نے پھر عثمان سے بیٹھے کو کہا۔

- آپ بھی تشریف رکھیے۔ عثمان نے شائے سے کہا۔

- آپ میری بیٹی ہیں۔ ان کا نام شائے سے اور یہ بی لے فائل میں ہیں۔ ماما نے بڑی بے تکلفی سے شائے کا تدارف عثمان سے کر لیا۔

- میں ان کا ممنون احسان ہوں۔ عثمان درمیانی صوفے پر ٹکنت سے بیٹھتے ہوئے درمے سے مسکرائے۔

- کیوں۔ ماما خوشدلی سے مسکرائیں

عثمان نے پھر اک بھر پور نظر کھڑکی کے قریب کھڑی اس آفاقی مخلوق پر ڈالی اور سکرارتے ہوئے بولے۔ ان کی مہربانی سے آپ جیسی شفیق ہستی سے ملاقات ہو گئی۔

ماما ہنس دی۔ پھر بخیرہ ہوتے ہوئے بولیں۔ ممنون احسان تو ہم لوگ آپ کے ہیں۔ آپ نے ہمارے لیے اتنی تکلیف گوارہ کی۔ آپ شائے کو فلفل نہ دیتے تو جانے کب تک وہ سواری کے لیے پریشان رہتیں۔

- واقعی ماما۔ شائے نے بھی اظہار ممنونیت کے طور پر عثمان کی طرف دیکھا۔ ہم آپ کے بہت شکریہ گزار رہیں۔

عثمان کے کانوں میں جیسے فردوسی نغمے اتر گئے۔

- بیٹھیے نا۔ انہوں نے شائے سے کہا۔ جواب تک کہ سی کی پشت پکڑے کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔

- بائیں بیٹھے۔ ماما نے بھی کہا۔

شائے اسی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جس کی پشت پکڑے کھڑکی تھی۔ ماما عثمان سے

باتیں کرنے لگیں۔ اپنے چاروں بچوں کے متعلق وہ سب کچھ تفصیلاً عثمان کو بتا رہی

رہی تھی۔ ماما کی باتوں میں موعوب ہو جانے کا عکس نمایاں تھا۔ شائے کو یہ بات کچھ

اچھی نہ لگ رہی تھی۔

.. شائے ..

جی ماما ..

بیٹے ذرا چائے جلدی سے لاؤ۔ ہمارے معزز مہمان کو ایئر پورٹ جانا ہے۔  
عثمان ہنس کر بولے۔ مہمان آپ نہیں کہہ سکتیں۔ بن بلائے۔  
ادہ ماما مسکراتے ہوئے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ چلیے شخص سہی۔  
شرمندہ نہ کیجیے۔ میں نے کوئی اتنی بڑی بات نہیں کی محترمہ۔ معمولی سا کام  
ہے۔ مجھے خوشی اور فخر ہے۔ کہ اس طرح میں آپ لوگوں سے متعارف ہو گیا۔  
.. شکریہ .. ماما بولیں۔

اور شائے کی نگاہیں شکریے کے طور پر اٹھ کر جھک گئیں۔  
وہ اٹھ کر چلی گئی۔ پانچ سات منٹ بعد وہ اور ظریفہ دونوں آگئیں۔ اہم  
چائے کی ٹرالی لے آیا۔ ماما نے ظریفہ کا تعارف بھی عثمان سے کر لیا۔  
شائے نے ٹرالی اپنے سامنے کر لی۔ ظریفہ ماں اور عثمان کو پلٹتیں دے کر کھانا  
پینے کی چیزیں پیش کرنے لگی۔ وہ خاصی باتونی تھی۔ ماما کی طرح بہت جلد بے تک  
ہو جایا کرتی تھی۔ آج بڑی سنبھل سنبھل کر اور قحطاً طریق سے باتیں کر رہی تھی۔  
اس نے شائے سے بہت زیادہ باتیں کیں۔  
عثمان شائے سے اس کے کالج۔ سیکسٹس اور ہو میز کا پوچھنے لگے۔ شائے نے  
شائے کی سے جواب دیئے۔ چھ بجے کے قریب عثمان نے اٹھتے ہوئے جانے  
کی اجازت چاہی۔

شائے ظریفہ اور ماما بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

.. بہت بہت شکریہ نواں زادہ صاحب .. ماما نے کہا۔

.. آپ مجھے صرف عثمان کہیں۔ تو مجھے خوشی ہوگی۔ عثمان انکساری سے

ماما مسکرا دیں۔

.. اگر آپ اجازت دیں تو میں کل کرنل صاحب کی خیریت دریافت کرنے  
آ جاؤں۔ عثمان نے قدرے توقف کے بعد بتیجی سے لہجے میں کہا۔  
.. ضرور ضرور۔ ماما جیسے کوئی اعزاز پا گئیں۔۔۔ ضرور آئیے گا۔  
.. شکریہ .. انہوں نے کہا۔ اور جانے کے لیے قدم اٹھایا۔  
ظریفہ اور شائے کمرے ہی میں کھڑی رہیں۔ عثمان ماما کے ساتھ شائے پر پاک  
بھر پور اور بولتی ہوئی نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل گئے۔

بظاہر لاپرواہ سی نظر آتی تھی لیکن اپنے حسن کے حدود اربع سے پوری طرح واقف تھی۔

”فتح محمد“ عشرت بانو نے ملازم کو پکارا۔ وہ قریب آیا تو بولیں۔ ”گاڑی میں سے سوٹ کیس نکال کر اوپر فوقیہ کے کمرے میں لے جاؤ۔“

”بہتر حضور“ وہ آگے بڑھا۔ ڈرائیور نے ڈگنی کھول کر سوٹ کیس نکال کر اس کے حوالے کیا۔

عشرت بانو ٹکیوں کو لے کر اندر آ گئیں۔

بڑے کمرے میں مراد علی خان مہمان کے منتظر تھے۔ فوقیہ نے بڑی تعظیم سے سر خم کرتے ہوئے انہیں سلام کیا۔ مراد علی خان نے اسے اپنے قریب بٹھا کر پیار کیا۔ پھر اس کے والدین کا پوچھنے لگے۔

”عثمان خدا جانے کہاں چلے گئے“ عشرت بانو نے مراد علی خان سے کہا۔

”کیوں؟“ ساتھ نہیں تھے آپ کے“ مراد بولے۔

”نہیں۔ وہ تو کوئی ساڑھ تین ہی چلے گئے تھے۔ کسی دوست سے ملنا تھا۔“

”بس پھر دوست ہی بچڑ بیٹھے ہوں گے۔“

”مجھے تو کہا تھا۔ کہ وقت پر ایئر پورٹ پہنچ جائیں گے۔“

”ممکن ہے کوئی اور کام پڑ گیا ہو۔“

”کوئی کام بھی اس کام سے ضروری نہ تھا۔“

مراد علی خان مسکرا دیئے۔ ساڑھ اور فاخرہ نے بھی ایک دوسری کو دیکھا۔

فوقیہ کے لب بھی مسکرا رہے تھے۔

عثمان کا انتظار کافی دیر کیا گیا۔ وہ نہیں پہنچے تو چائے ان کے بغیر ہی پی پٹی گئی۔

گاڑی پورچ میں رکی۔ عشرت بانو ساڑھ فاخرہ اور فوقیہ باہر نکلیں۔

بانو کو پہچاننے کی نگاہیں تھیں۔ باہر نکلتے ہی برآمدے میں کھڑے فتح محمد سے پوچھا۔

”عثمان آگئے ہیں۔“ وہ قریب آتے ہوئے مودبانہ بولا۔

”جی نہیں۔ وہ قریب آتے ہوئے مودبانہ بولا۔“

”کہاں گئے بھائی جان“ ساڑھ بولی۔

”اللہ جانے۔“ عشرت بانو نے کہا۔ ”ایئر پورٹ بھی نہیں پہنچے۔“

”کرے۔“

”وعدے کے تو بڑے پابند ہیں بھائی جان“ فاخرہ نے کہا۔

فوقیہ خاموش کھڑی ان دیکھے بھائی جان کے متعلق باتیں سن رہی تھی۔

اٹھارہ انیس سالہ فوقیہ حسین کی لڑکی تھی۔ جدید طرز کے لباس نے اس کو خاصہ اجاگر کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بولتی تھیں۔ اس کے ہونٹ مسکراتے تھے۔

اس کا سر پادوسروں پر حاوی اور تسلط کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

عثمان نے پیار سے عشرت بانو کی ٹھوڑی کو چھوا۔ وہ مسکرائیں۔ وہ عثمان کے ذوق اور خوشی کو محسوس کر رہی تھیں۔

عشرت بانو وہیں کھڑی رہیں اور عثمان لمبے لمبے ڈگ بھرتے برآمدے کے آخری موڑ پر کشادہ زینے کی طرف چل دیئے۔ چند لمحوں بعد وہ اوپر تھے لمبی راہداری سے ہوتے ہوئے وہ اس بالکنی کی طرف آئے۔ جس کے دائیں فوقیہ کے کمرے تھے۔ گھوم کر وہ آئے۔ پہلے کمرے میں خاموشی تھی۔ ہاں دوسرے کمرے میں سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ بلا جھجک عثمان نے الٹی انگلی سے دروازہ بکایا۔

۔ کون؟ یہ سارہ تھی۔

۔ اندر آ سکتا ہوں۔ عثمان نے پوچھا۔

۔ اوہ بھائی جان۔ آئیے آئیے۔ فاخرہ جوش مسرت میں دروازے پر آگئی۔ فوقیہ اور بھائی جان کو ملائے کی اسے گن تھی۔

۔ ہمارے بھائی جان۔ فاخرہ نے عثمان کا ہاتھ ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ فوقیہ کی طرف دیکھ کر نعرے کے انداز میں کہا۔

۔ اور ہماری۔ سارہ مسکراتے ہوئے جان بوجھ کر رک گئی۔ تدریس توقف کے بعد بولیں۔ فوقیہ۔

عثمان نے فوقیہ کو دیکھا۔

فوقیہ نے عثمان کے سر پر ہاتھ ڈالی۔

عثمان کی نگاہیں سیر نہ ہو گئی ہوتیں۔ تو شاید فوقیہ ان کے جذبات میں پل پل پناہ دیتی۔ لیکن وہ تو جیل پاچے تھے۔ بھرپور تھے۔ چٹک رہے تھے۔ عثمان انہوں کو دیکھ کر مسکرائے۔ پھر بولے۔ فوقیہ۔ میں معذرت خواہ ہوں۔

چائے کے بعد سارہ اور فاخرہ فوقیہ کو لے کر ادیس کا کمرہ دکھانے چلی گئیں۔ مراد علی خان لاہوری میں جا بیٹھے اور عشرت بانو اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ برآمدے ہی میں تھیں کہ عثمان کی آواز آئی۔ وہ شاید کسی ملازم سے باتیں کر رہے تھے۔ عشرت بانو گھوم کر بیرونی طرف آگئیں۔ عثمان ادھر ہی آرہے تھے۔ عشرت بانو کو دیکھ کر مسکرا دیئے۔ مسکرا تو ان کا انگ انگ رہا تھا۔

۔ کہاں رہ گئے تھے عثمان۔ عشرت بانو نے پوچھا۔

۔ امی حضور۔ جس دوست سے ملنے گیا تھا نا۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔

ڈاکٹر کو لانے لیجانے میں وقت کل گیا۔

۔ مجھے تو خاصہ پریشان کیا آپ نے۔

۔ معذرت خواہ ہوں۔ ہاں تو آگئیں فوقیہ۔

۔ ہاں۔

۔ بخیریت پہنچ گئی ہیں نا۔

۔ بالکل۔

۔ کہاں ہیں۔

۔ اوپر گئی ہیں سارہ اور فاخرہ کے ساتھ۔

۔ میں اوپر جا سکتا ہوں۔

۔ کیوں نہیں۔ لوگے نہیں اس سے۔

۔ اس لیے تو اجازت چاہی ہے۔

۔ شریہ۔ اجازت کی کیا ضرورت ہے۔

۔ شکریہ۔



اس کی تعلیم سے متعلق سوال کیے۔ وہ بھی بی اے فائنل میں تھی۔ عثمان اپنی مسکراہٹ روک نہ سکے۔ یہ اتفاق ہی تھا۔  
 - آپ کا قیام کتنے دن ہوگا۔ عثمان نے پوچھا۔  
 - کتنے دن ہونا چاہیئے۔ فوقیہ کی بولتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں نے سوال کیا۔

- یہ تو آپ کی مرضی اور حالات پر منحصر ہے۔ ہم تو مہمان نوازی کے اصول کے تحت آپ کو زیادہ سے زیادہ روکنے کی کوشش کریں گے۔  
 - لیکن میں رک نہ سکوں گی۔ فوقیہ بولی۔  
 - کیوں۔ سائرہ نے پوچھا۔

- کالج سے زیادہ دن غیر حاضر نہیں رہ سکتی۔ ایک ہفتے کی رخصت بھی میڈیکل سرٹیفکیٹ پر ملتی ہے۔

- تو گویا آپ بیمار ہیں۔ سائرہ ہنس پڑی۔ سب نے اس کی ہنسی میں شگت کی۔  
 - کچھ دیر سب بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ فاخرہ اور سائرہ فوقیہ کے ایک ہفتے کے قیام کی مطابقت سے سیر و تفریح کے پروگرام بنانے لگیں۔ دن تھوڑے تھے۔ مصروفیات زیادہ۔ ان کی باتوں میں عثمان بھی دلچسپی لے رہے تھے۔  
 - کل دوپہر کا کھانا کھاتے ہی نکل پڑیں گے۔ فاخرہ بولی۔

- کہاں۔ سائرہ نے پوچھا۔  
 - پہلے جائیں گے آنٹی صبو جی کے ہاں وہاں سے شوارہ کو لیں گے۔ بازار جائیں گے کچھ شاپنگ کریں گے۔ چائے سہلن میں ہوگی۔ شام بچہ دیکھیں گے اور رات۔

- بس بس۔۔۔ فوقیہ ہنسی۔ ایک ہی دن میں سب کچھ ختم کر ڈالو گی۔

آپ کے استقبال کے لیے انٹرپوٹ نہ اسکا۔ ایک دوست بیمار ہو گئے تھے۔  
 - کوئی بات نہیں۔ ہم کو نسا وہیں رہ گئے۔ پہنچ ہی گئے ہیں نا۔ کیوں فوقیہ سائرہ نے شوخی سے کہا۔  
 - بالکل۔ فوقیہ نے جواب دیا۔

- ویسے بھائی جان آپ رہ کہاں گئے تھے۔ پلین کے آنے کا ٹائم تو آپ کو پتہ ہی تھا۔ فاخرہ شوخی سے بولی۔

- میں پہلے تباچکا ہوں۔ عثمان نے کہا۔  
 - معذرت کر کے ابھی سکتے تھے۔ فاخرہ نے گلہ کیا۔  
 - کچھ اخلاقی تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ عثمان سمجھانے کے انداز میں بولے۔

- جن پر اصول قربان کیے جاسکتے ہیں۔ وہ ہنس پڑی۔  
 - اصول کیا سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔ عثمان نے چمکتی نگاہوں سے ناظر کو دیکھا۔ فاخرہ کچھ کہنے کو تھی۔ کہ سائرہ بولی۔ آپ لوگوں کو آداب محفل کا بھی خیال ہے۔

- کیوں۔ فاخرہ نے پوچھا عثمان نے بھی اسے دیکھا۔  
 - مہمان مہربان رہی ہیں اور جناب بحث میں الجھ رہے ہیں۔ سائرہ مسکرائی۔  
 - باتیں تو آپ کو فوقیہ سے کرنا چاہئیں۔

- واقعی۔ عثمان مسکرا کر فوقیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہنس کر بولے۔ فوقیہ ہم بہن بھائی ذرا بد مزہ قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ ہماری غلطیوں کو تباہیوں اور بے سرو پا باتوں کا برا نہ مانیں گے۔

- ایسی کوئی بات نہیں۔ فوقیہ نے انکساری سے کہا۔  
 - عثمان اب فوقیہ سے براہ راست باتیں کرنے لگے۔ اس کے اہل خانہ کو بوجھا

عثمان خوب چپک رہے تھے۔ ہشاش بشاش تھے۔ بات بات پر ہنسی پھوٹ رہی تھی۔  
یہ سب باتیں عشرت بانو کے پلان کی کامیابی کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ وہ خوشی سے پھولی نہ سمار ہی تھیں۔

- نہیں بڑی دوائی ہے میرے پروگرام ہیں۔ فاخرہ ہنسی۔  
.. کل صرت آٹلی صبحی کے ہاں جائیں گے۔ اور شوارہ کو ساتھ لے کر چائے  
کہیں باہر نہیں گئے۔ ٹھیک ہے نابھائی جان۔ ساڑھ نے کہا۔  
.. بھئی جو بھی پروگرام بنانا ہے بنائیں۔ میں چار بجے کے بعد اس میں شرکت  
سے معذور ہوں۔  
.. کیوں؟ .. دونوں نے پوچھا۔ فوقیہ کی نظریں بھی استفہامیہ تھیں۔  
.. چار بجے مجھے اپنے دوست کی عیادت کو جانا ہے۔ عثمان نے مسکولہجے میں کہا۔  
.. کیا ہوا۔ ہم بھی ساتھ چلے جائیں گے۔ احوال پرسی کہیں گے اور مرندرت بھی  
کر دیں گے۔ کم از کم زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔ فاخرہ نے کہا۔  
عثمان نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔  
.. یہ کیا بات ہوئی۔ فاخرہ روٹھنے کے موڈ میں تھی۔  
.. بھئی کہہ جو دیا ہے۔ کر مجھے دوست کی عیادت کو جانا ہے۔  
.. لوٹیں گے کب۔  
.. کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے جلدی آجاؤں اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ شام  
ہو جائے۔ رات اترا آئے۔  
.. دن کل آئے۔ فاخرہ نے عثمان کی بات پوری کرنے کی نقل اتاری۔  
.. سب کھٹکھٹا کر منس دیئے۔  
رات کھانے کی میز پر بھی خوب گپ شپ رہی۔ مراد علی خان جب تک بیٹھے  
تھے۔ سب محتاط ہو کر باتیں کر رہے تھے۔ ان کے اٹھ کر جاتے ہی بے تکلفی کے  
ماحول میں باتیں ہونے لگیں۔  
عشرت بانو بھی شریک گفتگو تھیں۔



”ہوسٹل۔“

”ایڈمٹ ہو گئے۔“

”جی۔“

”کب۔“

”رات۔“

”رات؟“

”ہاں ان کی طبیعت پھر گرنے لگی تھی۔ بہتر یہ سمجھا کہ انہیں ہوسٹل لے جائیں پورے چیک اپ کے لیے۔“

”اوہو۔ بڑی تکلیف ہوئی ہوگی ہوسٹل رات کے وقت جانے کی۔“

”ساتھ والے اکل رضا آگئے تھے۔ ماما کے کزن بھی پہنچ گئے تھے۔“

”سی ایم ایچ میں ہیں۔“

”جی۔“

”کس طرف۔“

”فیملی وارڈ کے ساتھ ادپر جو کمرے ہیں۔“

”کس نمبر میں۔“

”سات میں ہیں۔“

”عثمان نے آستین تدرے ادچی کر کے گھڑی دیکھی۔ ابھی ٹننے کا وقت تھا۔“

”ان کے پاس کون ہے۔“

”ماما اور ظریفہ صبح سے گئی ہوئی ہیں۔“

”آپ جائیں گی۔“

”ماما اور ظریفہ آجائیں تو پھر میں جاؤں گی۔ وہ کچھ دیر تک آنے ہی والی ہیں۔“

اور بے تکلف نگاہ ڈالی۔ مکرراتے ہوئے کاٹری سے باہر نکلے۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے انہوں نے سیٹ پر سے پھول اٹھا لیے۔

”شائے انہیں دیکھ کر گھبرا سی گئی۔“

”عثمان برآمدے میں آگئے۔ فان قمیض ڈارک براؤن پتلون اور کوٹی میں ملبوس

وہ بڑے باوقار اور وجہ نگ رہے تھے۔“

”تدرے سر جھکاتے ہوئے انہوں نے شائے کو تعظیم دی۔“

”آپ۔ آپ ڈیڑی کو دیکھنے آئے ہیں۔ شائے بوکھلائی سی انہیں سمجھ گئی۔“

”کہہ سکتی ہیں۔ عثمان شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر مسکرائے۔“

”نظروں کی زبان بڑی سادہ بڑی سہل بڑی آسان اور بڑی عام فہم ہوتی ہے۔“

”الفاظ کو غلط سمجھا جاسکتا ہے۔ انہیں غلط معنی دینے جاسکتے ہیں۔ ان کے چچرا

میں الجھا جاسکتا ہے۔ لیکن اپنا مفہوم باترہ دیکھا دیتی ہیں۔“

”شائے نظروں کی زبان سمجھتے ہی سُرخ ہو گئی۔“

”عثمان کے جذبات شوق نے اس محبوب ادا کا ہر عکس جذب کر لیا۔“

”چند لمبے دونوں یونی کھڑے رہے۔ شائے نگاہ اٹھا کر عثمان کی طرف

کی جرات نہ کر سکی۔ اور عثمان کی نگاہیں اس بُت کافر کا جذبات ابھیر عکس محفوظ کر

رہیں۔“

”مجھے اندر جانے کی اجازت ہے۔ لمحوں کے پرسکون توقف کے بعد عثمان

دھیرے سے مسکرائے۔“

”کیسی ہے اب کرنل صاحب کی طبیعت۔“

”وہ اندر نہیں ہیں۔“ شائے بے ملاحظہ سا جملہ کہہ گئی۔“

”تک۔۔۔“

تک وہ اپنے آپ سے لڑ رہی تھی عثمان کی شخصیت سے لڑ رہی تھی۔ انہوں نے کوہونے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نوابزادے قسم کے آدمی سے مرعوب نہیں ہونا چاہتی تھی۔ بلقائی فرق اور مالی حیثیت کو درمیان میں رکھ کر عثمان کی ذات کو اپنے اوپر وارد ہونے سے بچا رہی تھی۔

لیکن

سیلاب کے سامنے کمزور و کمزور بند بھلا کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ اٹھتے طوفان کبھی یوں بھی روکے جاسکتے ہیں۔

عثمان نے بڑے مہذب طریقے سے گلاب کا پھول پیش کیا تھا۔ لیکن یہ گلابی مہکتا ہوا شاداب پھول جن جذبول کی علامت تھا وہ آپوں آپ اس تک پہنچ گئے تھے۔ اب بھلا وہ ہار نہ ماتی یا شکست قبول نہ کرتی اور کرتی بھی کیا۔؟

عثمان سیدھے ہوٹل گئے۔ کمرہ ڈھونڈنے میں انہیں دیر نہ لگی۔ وہ اندر جا رہے تھے اور ڈاکٹر جعفر کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ کرنل جعفر عثمان کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ مراد فیملی سے ان کی دور کی رشتہ داری تھی۔ اور مراد علی خان سے گہرے مراسم بھی تھے۔ دونوں دروازے پر کھڑے تپاک سے ایک دوسرے کی احوال پرسی کرتے رہے۔

اما عثمان کو دیکھ کر دروازے پر آگئیں۔ عثمان نے انہیں سعادت مندی سے سلام کیا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے آدمی ہیں۔ کرنل صاحب کی دیکھ بھال اچھی طرح سے کریں گے۔ عثمان نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑے پکڑے ماما سے کہا۔

آپ کی سفارش کی ضرورت نہیں صاحبزادے۔ ڈاکٹر سہوں اپنے فرض کو

عثمان نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پھولوں کو دیکھا۔ پھر بولے۔ میں انہیں دیکھنے جا رہا ہوں۔

شائستہ نے صرف انہیں دیکھا۔

عثمان چپ رہے۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے پھولوں کو تک رہے تھے۔ کسی لمحے گزر گئے۔ پھر عثمان نے گلاب کا ایک خوبصورت کھیتا ہوا پھول گلہ سے نکالا۔ ہاتھ میں پکڑے اس پھول کو وہ بڑی محبت سے دیکھتے رہے۔ پھر بڑی جرات کر کے پھول شائستہ کی طرف بڑھایا۔ شائستہ تذبذب اور جھجک سے کچھ کہہ نہ سکی۔ ہاں اس نے عثمان کا پیش کیا ہوا پھول پکڑ لیا۔

پھول شائستہ کے خوبصورت ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔

شکستہ۔ عثمان تادم اٹھاتے ہوئے بولے۔

وہ اپنی گاڑی کی طرف آگئے۔

کوئی پیغام ہو تو ہو ہوٹل بنیادوں کا۔ عثمان سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ شائستہ نے سر ہلکے سے نفی کے انداز میں ہلادیا۔ پھول اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ پھول لرزتا تھا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ لرزش صاف طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ عثمان کے لبوں پر بڑی دلنشین مسکراہٹ تھی۔

جانے سے پہلے ان کا جی چاہا شائستہ سے کہیں۔ آپ پھولوں کی زبان جانتی ہیں۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولے۔ گاڑی چلاتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور تیزی سے گلیٹ سے باہر لے گئے۔

شائستہ پھول ہاتھ میں پکڑے کسی ترشیدہ بت کی طرح وہیں کھڑی رہی۔ مرزا ہو جانے۔ ہار مان لینے۔ شکست خوردہ ہونے اور لپسا ہو جانے کے احساس دور جا رہی تھی۔ عثمان کی شخصیت سے مسخو تو وہ کل ہی ہو گئی تھی۔ لیکن کل سے اس

پچانتا ہوں۔ جعفر سکر اتے ہونے بولے۔ ویسے کرنل صاحب خدا خواستہ کچھ  
 سجدہ قسم کے بیمار بھی نہیں ہیں۔ بلڈ پریشر کنٹرول ہو جائے تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔  
 کچھ دن تو لگیں گے۔ ماما بولیں۔  
 یہی ہفتہ عشرہ۔ جعفر بولے۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی فوجی  
 لوگوں کے دل اور حوصلے مضبوط ہوتے ہیں۔  
 سب سکرانے لگے۔ جعفر چلے گئے۔ ماما عثمان کو لے کر اندر آ گئیں۔ وہ جعفر  
 اور عثمان کی جان پچان کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔  
 کرنل صاحب بستر میں دراز تھے۔ ظریف ان کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ عثمان کو  
 دیکھتے ہی ظریف نے مؤذبانہ سلام کیا۔  
 عثمان خندہ پیشانی سے جواب دیتے ہوئے کرنل صاحب کی طرف بڑھے بھانہ  
 کرتے ہوئے انہوں نے پھول ان کے سر پرانے کے قریب رکھی چھوٹی سی آہنی  
 الماری پر رکھ دیئے۔  
 شکریہ۔ کرنل صاحب نے پھولوں کو چھوا۔  
 ظریف نے عثمان کو کرسی پر پیش کی۔ خود پلنگ کے سر پرانے کھڑی ہو گئی۔ ماما پلنگ  
 پر آ بیٹھیں۔ احوال پرسی ہوئی۔  
 کرنل صاحب اس وقت بستر تھے خوش مزاج اور خوش گفتار تھے۔ عثمان  
 سے خوش دلی سے باتیں کرنے لگے۔ موسم ملکی حالات اور بین الاقوامی سیاست  
 پر دونوں نے یہ حاصل گفت گو کی۔ ظریف تو بوری ہو رہی۔ ماما دلپسی سے دونوں  
 کی باتیں سنتی رہیں۔ کرنل صاحب اور عثمان بہت اچھے دوست بن چکے تھے  
 دلپسی پر عثمان ماما اور ظریف کو ساتھ لائے۔ ماما نے دو لکاب بارسکیسی پر پٹ  
 جانے کا کہا۔ تو عثمان بولے۔ مجھے اجنبی سمجھتے ہوئے آپ ایسا کہہ رہی ہیں۔

حالانکہ میں نے آپ سب سے مل کر اپنائیت کا احساس پایا ہے۔  
 شکریہ۔ ماما بولیں۔ اب انکار کی گنجائش نہ تھی۔  
 راستے میں ماما اور عثمان باتیں کرتے رہے۔ عثمان کی باتوں سے اعتراف ہو  
 رہا تھا۔ کہ وہ اس خاندان کے بہت قریب آ گئے ہیں۔ ماما بھلا کسی کی دل شکنی  
 کر سکتی تھیں۔ ان کے جذبات کا وہ دل سے احترام کر رہی تھیں۔ ظریف بھی ان  
 کی باتوں سے بڑی مرعوب ہو رہی تھی۔ عثمان اسے بڑے اچھے لگ رہے تھے۔  
 اسے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے عثمان سے دو دن کی ملاقات نہیں برسوں  
 کی جان پچان ہے۔  
 عثمان کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی۔ شائدہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔  
 وہ چھوٹے سے لان میں بیٹھی کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔  
 گاڑی سے ماما ظریف اور عثمان باہر نکلے۔  
 شائدہ ادھر آ گئی۔  
 اس کے بالوں میں عثمان کا پیش کیا ہوا پھول مسکر رہا تھا۔  
 وہ ماما اور ظریف سے ڈیڑی کا حال پوچھنے لگی۔  
 عثمان کی نظریں اس کے بالوں میں چپکے پھول پر تھیں۔ خوشی اور طمانیت کا  
 برپا احساس ان پر چھا گیا۔  
 ماما اور ظریف برآمدے کی طرف بڑھیں عثمان گاڑی کے پاس ہی کھڑے تھے  
 شائدہ قریب سے گزری تو اس کے بالوں کو دیکھتے ہوئے آہنگی سے بولے:  
 بہت بہت شکریہ۔  
 شائدہ اُنک حجاب سا محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔  
 عثمان نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ماما آواز پر پلٹیں۔ آئیے کچھ دیر بیٹھیے

تو سہی۔ پھر کبھی سہی۔ عثمان گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولے۔  
 "پھر کب؟" ماما خوش دلی سے بولیں۔  
 "جب آپ اجازت دیں گی۔ عثمان بھی مکر لے۔ ماما اور ظریفہ مسکرانے لگیں۔ شانہ دم بخود رہی۔  
 پھر وہ سب کو خفا حافظ کہتے ہوئے گاڑی نکال لے گئے۔

"عثمان۔"

"جی۔"

"ادھر آئیے ذرا۔"

"فرمائیے۔"

"یہاں بیٹھیے۔"

"جی کیئے۔"

"کہتی ہوں۔ ذرا آپ تشریف تو رکھیں۔"

عشرت بانو نے برابر والی کرسی عثمان کی طرفٹ کر دی۔ وہ چمن میں بیٹھی تھیں۔  
 سائرہ فاخرہ اور فوقیہ بھی وہیں تھیں۔ آج موسم بے حد خوبصورت تھا۔ کہیں سے  
 اڑتے اڑتے بادل آگئے تھے۔ ہوائیں بھی ٹھنڈی اور بک خرام تھیں۔ پچھلے  
 راتوں اچانک رات بدل گئی تھی۔ دوپہر کو تو خاصی گرمی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن بادلوں

”ان کی باتوں میں نہ آئیے امی“  
 ”غلط تو نہیں کہہ رہیں۔ فوقیہ آپ کی مہمان ہیں۔“  
 ”جی میں جانتا ہوں۔ انہیں شاید مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ کیوں فوقیہ۔“  
 عثمان نے براہ راست فوقیہ سے پوچھا۔ وہ مسکرا دی۔  
 ”جی اب وہ آپ سے تھوڑا ہی کہیں گی۔ سائرہ بولی۔“  
 ”انہیں شکایت ہونی تو چاہیے۔“ عثمان بولے۔  
 ”آپ شام ہمارے ساتھ کیوں نہیں گزارتے۔“ فاخرہ نے کہا۔  
 ”سارا دن تو آپ لوگوں کے ساتھ گزارتا ہوں۔ عثمان نے جواب دیا پھر عشرت بانو سے مخاطب ہو کر بولے۔  
 ”دیکھئے امی۔ صبح میں ان سب کو داک کے لیے لے جاتا ہوں۔“  
 ”پیدل چلا کر تنیاس کر دیتے ہیں۔“ سائرہ نے کہا۔ باقی سب مسکرائے لگیں۔  
 ”بڈیشن کھیلتا ہوں۔ فوقیہ کرم بہت اچھا کھیلتی ہیں مجھے کرم پسند نہیں پھر بھی ان کی خاطر کھیلتا ہوں۔ کل رات پچھر پر لے گیا تھا۔ تاش کی بازیاں تمہی ہیں۔ اور۔“  
 ”سب ٹھیک ہے۔ لیکن چار بجے جناب کو باہر جانا ضروری ہوتا ہے۔“ فاخرہ بولی۔  
 ”ہمارے پردہ گرام آپ کی وجہ سے الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں۔“  
 ”میں اپنے دوست کی عیادت کے لیے جاتا ہوں۔ ہوسٹل جانے کا یہی وقت ہوتا ہے۔ بس مجبوری ہے۔“ شاپنگ کے لیے آپ کو اسی وقت ہی جانا ہے۔“  
 ”ہاں۔“

”تو پھر ڈرائیور کے ساتھ چلی جائیے۔“

”یوں کیوں نہیں کرتے۔ کہ یہیں بازار ڈراپ کر دیں۔ اور آپ احوال پرسی کر کے پھر میں لے لیں۔ ہماری شاپنگ ہو جائے گی۔ آپ عیادت کو موٹا میں گئے۔“  
 ”اوں ہوں۔ میں اس طرح اپنے آپ کو پابند نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی تینوں کو

اور سہواؤں کے گٹھ جوڑ نے موسم کو معتدل بنا دیا تھا۔ اس وقت بھی فضا بڑی خوش گوار تھی۔ صبح چمن آراستہ تھا۔ پھول اور پتیاں لہرا رہی تھیں۔ گھاس بنر اور بکھری ہوئی تھی۔ پرانے درختوں پر بھی موسم کے اثرات سے نیا روپ آیا ہوا تھا۔

سب پر کی چائے سب نے یہیں پی تھی۔ عثمان چائے کے بعد اٹھ گئے تھے خواتین وہیں بیٹھی رہی تھیں۔  
 سائرہ فاخرہ فوقیہ کے ساتھ آج شاپنگ کے لیے جانا چاہتی تھیں۔  
 عثمان سے انہوں نے ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ وہ ٹال گئے تھے۔ اب فاخرہ نے اسی سے شکایت کر دی تھی۔

عثمان تیار ہو کر باہر جا رہے تھے۔ کہ عشرت بانو نے انہیں بلالیا۔  
 ”بیٹھو بیٹی۔“ عثمان کو کھڑے دیکھ کر عشرت بانو بولیں۔  
 وہ بیٹھ گئے۔ سائرہ نے شوخی سے ان کو دیکھا۔ وہ سمجھ گئے۔ کہ ان کی شکایت کی گئی ہے۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ۔“ عشرت بانو نے پوچھا۔  
 ”یہ لوگ شاپنگ کے لیے جانا چاہتی ہیں نا۔“ عثمان نے سوال درگزر کر ہوئے پوچھا۔

”اور آپ جان چھڑانا چاہتے ہیں۔“ فاخرہ بولی۔  
 ”انہیں آپ سے شکایت ہے عثمان۔“ عشرت بانو نے کہا۔  
 ”چار دن ہو گئے فوقیہ کو آئے۔ ایک شام بھی یہ صاحب ہیں باہر لے نہیں گئے۔“ فاخرہ نے شاکی لہجے میں کہا۔ عثمان مسکرائے گئے۔  
 ”کیوں عثمان؟“



ٹرنٹ مل رہی تھی۔ کرنل جعفر کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے زمیں بھی ان کے معاملے میں چاک و چوبند تھیں۔ بڑی ہولیتیں انہیں مل رہی تھیں۔ کرنل صاحب عثمان ہی کے مرحوم احسان تھے۔ جعفر کی ذاتی دلچسپی انہی کی وجہ سے تھی۔

عثمان ہسپتال میں دس پندرہ منٹ ٹھہرے۔ پچھلے تین دن سے انہوں نے شائع کو نہیں دیکھا تھا۔ وہاں نظریہ ہی ملتی تھی۔ یا تو شائع آئی نہیں ہوتی تھی۔ یا اگر چلی گئی ہوتی۔ عثمان بے چینی تو محسوس کرتے۔ لیکن یہ مانتے ہوئے بھی کر شائع گھر پر آکیلے مل سکتی ہے۔ انہوں نے وہاں جانے کا سوچا بھی نہیں تھا۔

کرنل صاحب اور ماما سے وہ خوب مل گئے تھے۔ اپنے خاندان کے متعلق انہیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ اور ان کے خاندان کی بہت سی باتیں ان کے علم میں آ گئیں تھیں۔ کرنل صاحب اور ماما کی محبت کی شادی کے متعلق بھی انہیں پتہ چلا تھا۔ یہ بات ان کے لیے وجہ تسکین تھی۔

آج عثمان دراجلدی ہی واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ویسے بھی کرنل صاحب اور ماما کے کافی ملنے والے احوال پر ہی کو آگئے تھے۔ مگر بھر گیا تھا۔ ماننے سب سے ان کا تعارف تو کر دیا تھا۔ لیکن انہوں نے زیادہ دیر رکنا مناسب دیکھا۔ پانچ بجے راکیوں کو شاپنگ کے لیے لے جانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ سب کو خواہ مخواہ کر دہ باہر آئے۔ نظریہ بھی کسی کام سے باہر آ گئی۔ عثمان نے اسے دیکھا۔ مسکرائے اور بولے۔ لگتا ہے آپ کو اپنے ڈیڑھی سے بہت محبت ہے۔

کیوں۔ نظریہ بولی۔ ڈیڑھی سے سب ہی کو محبت ہے۔

یا پھر آپ زیادہ اچھی تیمارداری کرتی ہیں۔ وہ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

اکیلے بازار میں چھوڑ سکتا ہوں۔  
ٹھیک کہہ رہے ہیں عثمان۔ عشرت بانو نے کہا۔ اب تم لوگ انہیں شاپنگ پابند تو نہ کرو۔

عثمان خوش ہو گئے۔ فخرہ کا منہ چڑھایا۔  
امی آپ بھی ان کی طرف اشارہ ہو گئیں۔ فخرہ چڑکھ کر بولی۔  
ٹھیک ہے فخرہ۔ فوقیہ نے کہا۔ شاپنگ کے لیے جانا کچھ ایسا ضروری

ہیں۔  
لیکن شام کو کہیں نہ کہیں جانا ضروری ہے۔ وہ اب بھی چڑی ہوئی تھی۔  
اچھا بھئی۔ عثمان اٹھتے ہوئے بولے۔ میں پانچ سوا پانچ تک آ جاؤں گا۔  
آپ سب تیار رہیے گا۔

آج آپ کی شام باہر گزارنے کی حسرت پوری کر ہی دیں گے۔  
زندہ باد۔ فخرہ ایک دم خوش ہو گئی۔  
منوا کے دم لیا ہے۔ سائرو بولی۔

بہت ضدی ہو گئی ہیں۔ عشرت بانو نے کہا۔  
اپنے بھائی جان ہی سے لڑ کر کرتی ہوں نا۔ فخرہ اتر کر عثمان کو دیکھنے لگی۔  
عثمان نے اس کے سر پر ہلکی ہلکی تھپکی دی۔

اور  
پانچ سوا پانچ تک تیار رہنے کی تاکید کرتے ہوئے چمن عبور کر کے گاڑی کی طرف آ گئے۔

وہ ہر دریا قاعدگی سے کرنل صاحب کی احوال پر ہی کو سی ایم ایچ جا رہے تھے۔ کرنل صاحب کے میڈیکل ٹسٹ ہو رہے تھے۔ اور رپورٹوں کے مطابق

کافی بے تکلف تھے۔ کوئی جھجک تھی نہ تکلف۔

انہوں نے فوقیہ کے لیے خوبصورت تحائف خریدے۔ ان کی پسند بہت اونچی تھی۔ فوقیہ کو سب چیزیں بے حد پسند آئیں۔

رات کا کھانا بھی سب نے چائیز میں کھایا۔

کوک پلانے اور پان کھلانے کے بعد عثمان کوئی دس بجے کے قریب ان سب کو لے کر واپس آئے۔ فوقیہ ان کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی۔

عشرت بانو بڑے میں کھڑی کسی ملازم سے باتیں کر رہی تھیں۔ فوقیہ اور عثمان کو ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھا۔ تو خوشی کی لہری دوڑتی رگ و پے میں محسوس

کی۔ ملازم سے ہٹ کر وہ ان کی طرف آئیں۔

لڑکیاں اپنی اپنی اٹھا کر گاڑی سے باہر نکل آئیں۔ عثمان بھی باہر نکلے۔

بس اب تو کوئی شکوہ نہیں رہا۔ عثمان نے تینوں سے پوچھا۔

”بہت بہت شکریہ فوقیہ بولی۔

”مزہ آگیا آج تو“ فاخرہ نے کہا۔

”کہاں کہاں گھومتے پھرے۔“ عشرت بانو دلچسپی لیتے ہوئے بولیں۔

”بس ابھی کچھ نہ پوچھیں۔“ بھائی جان نے آج خوب میسر کردانی۔ ”سارہ بولی۔

”شکر ہے تم خوش تو ہوئیں۔“ عشرت بانو نے پیار سے کہا۔

”کل کا پروگرام ابھی۔“ سے بتادیں۔ عثمان نے جان بوجھ کر چھیڑا۔

”سچی؟“ فاخرہ حیران ہو کر بولی۔ ”کل بھی آپ لے جائیں گے نہیں۔“

”ضرور۔“ فوقیہ کی خاطر۔ ”مہمان جو ہیں۔ کیا یاد کریں گی۔“ عثمان نے کہا۔

فوقیہ ہیکٹ مٹھالتے ہوئے شکریہ ادا کرنے لگی۔ وہ اندر دونوں نہیں اچھی کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھیں۔

”کیوں۔“ ظریف کچھ نہ سمجھی۔

وہ دھیرے سے مسکرائے۔ شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر بولے۔ ”میں جب بھی آتا ہوں آپ ہی کرنل صاحب کے پاس ہوتی ہیں۔ اسی لیے خیال گزارا کہ یا تو آپ کو اپنے ڈیڑی سے سب سے زیادہ محبت ہے۔ یا پھر آپ تیمارداری اچھی کرتی ہیں۔“

ظریف نا سمجھ نہ تھی۔ ان کا اشارہ سمجھ گئی۔ شریعہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کے خیال میں یہ بات اچھی نہیں۔“

”سے تو۔“ ویسے ہی کہہ دیا۔ وہ کترائے۔

”یہ اتفاق ہی ہے کہ جب بھی آپ آتے ہیں۔ میں ہی ڈیڑی کے پاس ہوتی ہوں۔“ ظریف شریعتیہ لمبوں میں چپاتے ہوئے بولی۔ ”ویسے شائد باجی کو ڈیڑی سے کم محبت نہیں۔ اور تیمارداری بھی وہ مجھ سے بہتر کرتی ہیں۔“

”کرتی ہوں گی۔“ عثمان بظاہر لا پرواہی سے بولے۔ ”ہم نے تو جو دیکھا وہ کہہ دیا۔“

”وہ تھوڑی دیر کے لیے آتی ہیں۔ گھر بار کی ذمہ داری ان دنوں ان پر ہے۔“

کچھ کالج کی وجہ سے بھی زیادہ وقت یہاں نہیں رہتیں۔“

”اچھا۔“ عثمان نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن کہنا نہیں۔ ظریف مسکراتے ہوئے انہیں خلا حلقہ کر کے کشن کی طرف چلی گئی۔

اور

وہ اپنی گاڑی کی طرف آگئے۔

رات گئے تک وہ اپنی مہمان فوقیہ اور بہنوں کے ساتھ بازاروں میں گھومتے پھرتے رہے۔ فوقیہ ان کے لیے فاخرہ اور سارہ کی طرح ہی تھی۔ وہ اس سے

عثمان اپنے کمرے میں چلے گئے۔  
 فوقیہ نے عثمان کے خرمیے ہوئے سٹائف عشرت بانو کو دکھائے۔ فوقیہ  
 سے بھی زیادہ انہیں خوشی ہوئی۔ سٹائف خلوص و محبت کے اظہار ہی کے لیے  
 تو ہوتے ہیں۔

اب تو کسی دوسرے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی تھی۔ عثمان نے یقیناً فوقیہ  
 کو پسند کر لیا تھا۔ عشرت بانو نے اپنے خیال کا اظہار اسی رات مراد علی خان کے  
 سامنے بھی کر دیا۔ یہ بات ان کے لیے بھی خوش کن تھی۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے۔  
 خاندان میں پیدا ہونے والی کئی انجمنیں اس رشتہ سے دور ہو جانا تھیں۔  
 اور ان انجمنوں کو سلجھانے کا مراد علی خان نے پکا پکا ارادہ بھی کر رکھا تھا۔

فاخرہ نے ساڑی کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر پٹ کھول دیئے۔ اور نیکھا پوری  
 رنار سے چلا دیا۔

”خیریت۔ فوقیہ نے پوچھا۔

”بہت گرمی لگ رہی ہے۔“

”مجھے تو ٹھنڈ محسوس ہو رہی ہے۔ بہتر ہے پکھا بند کر دو۔ موسم ابھی اتنا گرم  
 تو نہیں ہوا۔“

”تم شال لپیٹ لو۔ پکھا بند کرنے سے جس ہو جائے گا۔“

”شال لپیٹ کر شکمے تلے بیٹھنے کی بھلا کیا تاک ہے۔ اس سے تو بہتر تھا بالکنی  
 میں بیٹھ جاتے یا نیچے لان میں چلے جاتے۔“

”بھیک ہے۔ لیکن میں نہیں یہاں ایک خاص تباہی والی ہوں۔“

”خاص بات۔“

”بالکل۔“

فاخرہ نے کونے والی میز پر رکھا ٹیپ اٹھایا۔ فوقیہ کے سامنے چھوٹی  
تپائی پر رکھتے ہوئے خود اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔  
ہاتھ میں پکڑا ہوا کیسٹ اس نے ٹیپ میں رکھ دیا۔

”چلاؤں“ اس نے آن والے بٹن پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی شوخ نظر دل  
سے فوقیہ کو دیکھا۔

”چلا بھی دو“ وہ الجھ کر بولی۔

فاخرہ نے ٹیپ آن کر دیا۔

ایک خوبصورت گانے کا درمیانی مصرعہ تھا۔ میں نے قسمت کی کیڑوں سے  
چرایا ہے تجھے۔

فوقیہ کچھ سمجھی۔ یہی مصرعہ بار بار چل رہا تھا۔ فاخرہ کے ہونٹوں میں دلی مسکراہٹ  
لکھلائی تھی بن رہی تھی۔

”یہ کیا؟“ فوقیہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

”پورا کیسٹ بھرا ہوا ہے“

”اسی مصرعے سے؟“

”ہاں“

”فضول۔ واسیات“

”کیوں“

”کیا تک ہے بھلا“

”یہی تو بات ہے“ فاخرہ نے آنکھیں گھماتے ہوئے اسے دیکھا۔ فوقیہ کچھ  
سمجھی۔ مصرعہ بار بار چل رہا تھا۔

”تیری ہر بات نرالی ہی ہوتی ہے۔ میں سمجھی تپہ نہیں کوئی خاص بات ہے۔“

”بتاؤ“

”آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ابھی بتاتی ہوں۔“  
فوقیہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے تجسس نگاہوں سے فاخرہ کو دیکھنے لگی۔ فاخرہ  
کے چہرے پر بڑی شوخ مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں ناچ رہی تھیں۔ اور  
خوبصورت چہرہ شرارت سے گلزار ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کیسٹ  
پکڑا ہوا تھا۔

”بتاؤ بھی ناکیا بات ہے۔“ فوقیہ نے بے تابی سے پوچھا۔ اس کی خوبصورت  
آنکھوں میں تجسس تھا۔ اور فاخرہ کی شوخی سے گالی خواہ مخواہ ہی سرخ ہونے  
لگے تھے۔

”گناہ سنو گی۔“ فاخرہ نے شرطنظر دل سے اسے دیکھا۔

”پہلے خاص بات تو بتاؤ۔“

”یہی خاص بات ہے۔“

”گناہ سننے کی؟“

”ہاں“

”میں سمجھی نہیں۔“

”سنو گی تو سمجھ بھی جاؤ گی۔“

”مجھے پسلیاں سمجھ نہیں آتیں۔“

”پسلی سمجھ آ جائے گی۔“

”عجیب باتیں کر رہی ہو۔“

”تم گناہ سن لو۔ عجیب و غریب کا چکر خود بخود ختم ہو جائے گا۔“

”حلو سنائو۔“

فاخرہ اسے چھڑنے لگی۔ اشاروں کنایوں سے تو روز چھڑتی تھی۔ آج تو اس کے ہاتھ خاص بات آگئی تھی۔ فوقیہ کی آنکھوں میں ستاروں کی چمک گھلنے لگی۔ مکمل ہو جانے۔ لبالب بھر جانے اور چھلک چھلک جانے کا احساس ہونے لگا۔

یہ کیسٹ تجھے دیا کس نے۔ فوقیہ نے غمور نگاہوں سے فاخرہ کو دیکھا۔ میں خود لائی ہوں بھائی جان کے ٹیپ میں سے نکال کر۔ کیوں۔

تبہیں منانے کے لیے۔ کیا ضرورت تھی۔ بس۔ بڑی ایکسائیٹڈ تھی میں۔ ہوں۔

رات میں بھائی جان کے کمرے میں جانے کس کام کے لیے گئی۔ تو ٹیپ پہل رہا تھا۔ یہی والا۔ اور پتہ ہے بھائی جان کیسے سن ہے تھے؟ فاخرہ نے فوقیہ کی طرف دیکھا۔

کیسے۔ وہ شرمیلی مسکلاہٹ سے بولی۔ بیڈ پر آڑے لیٹے ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھ سرے رکھے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور خود فراموشی کے عالم میں تھے صرف پاؤں ہلارہے تھے۔ خود فراموشی۔ فوقیہ ہنس پڑی۔

اللہ قسم۔ فاخرہ بخنیدگی سے بولی۔ میں کتنی دیر کھڑی رہی۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوا اور ایک بار پکلا بھی بولے ہی نہیں۔ سو رہے ہوں گے۔

جس کے لیے اتنی رازداری سے مجھے یہاں لائی ہیں محترمہ۔

بالکل خاص بات ہے سمجھ جاؤ تو۔ معاف ہی رکھو مجھے۔ ویسے آفریں ہے تمہاری بہت پر۔ بڑی محنت کی ہے ایک ہی مصرعہ بار بار ٹیپ کرنے میں۔ میں نے تھوڑا ہی لیا ہے۔ تو اور۔

فاخرہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پاگل ہو بالکل۔ فوقیہ تندرے بھلا کر بولی۔ یہ کیسٹ بھائی جان کا ہے فوقی۔ فاخرہ نے مسکراتے ہوئے فوقیہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ فوقیہ نے فاخرہ کی طرف دیکھا۔ اس کے گلابی گال گہرے ہو گئے۔ آنکھوں میں جناب آلود مسکلاہٹ اتر آئی۔ کیسٹ پر اب بھی وہی مصرعہ چل رہا تھا۔ میں نے قسمت کی لکیروں سے چڑا ہے تجھے۔ فوقیہ شرمین نگاہوں سے فاخرہ کو دیکھ رہی تھی۔ خاص بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

کیسے؟ فاخرہ نے اسے چھیڑا۔ فوقیہ نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ بند کر دیا۔ چلنے دو۔ فاخرہ نے پھر ٹیپ آن کر دیا۔ پورا کیسٹ بھرا ہوا ہے۔ کیا ہوا۔ فوقیہ بظاہر لا پرواہی سے بولی۔ اپنی اپنی پسند ہے۔ پسند نہیں۔ پیغام ہے جناب۔ فاخرہ نے اس کے گال کو پیار سے چھوا۔ فوقیہ کا چہرہ تہتا اٹھا۔ وہ کچھ بھی نہیں بولی۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے عثمان اس کے سامنے بیٹھے یہ مصرعہ گنگنا رہے ہیں۔

- پاؤں مسلسل ہلارہے تھے۔ اسی لیے تو کہا خود فراموشی کے عالم میں تھے۔

- ہوں۔

- یہ کیسٹ انہوں نے یقیناً تمہیں دینا تھا۔

- کیا پتہ؟

- پتہ کیوں نہیں۔ اور کیا میرے لیے انہوں نے یہ مہرہ اتنی محنت سے ٹیپ

کیا تھا۔

- میں کیا جانوں۔ فوقیہ کی مسکراہٹ دلپذیر تھی۔

- سب جانتی ہے۔ فاخرہ نے اسے گدگدایا۔

- خدا قسم کچھ بھی نہیں۔ فوقیہ نے صفائی پیش کی۔ تو ہی یہ کیسٹ اٹھا لائی

ہے۔ درنہ ایسی ویسی اب تک کوئی بات نہ تھی۔

- اب تو ہے نا۔

- چل چپ رہ۔

- ادوں ہوں۔ چپ تو رہ نہیں سکتی۔

- یہ کیسٹ وہیں رکھ دے جہاں سے لائی ہے۔

- وہ تو رکھ ہی دوں گی۔ چوری چوری لائی ہوں۔ بوائے جان فیکٹری گئے ہوئے

ہیں۔ مجھے اتھ تھوڑا سی لگانے دیتے۔

- فاخرہ نے ٹیپ بند کر کے کیسٹ نکالا۔

- انہیں پتہ چل جائے گا۔

- کس بات کا۔

- کیسٹ اڑانے کا۔

- کیسے؟

- اتنا چل گیا ہے۔

- ادھ ٹھیک۔ رپورس کر کے رکھنا چاہیے۔

- فاخرہ نے جلدی سے کیسٹ ٹیپ میں رکھا آن کیا اور رپورس کا مٹن دبا دیا۔

- چند لمحوں بعد اس نے ٹیپ بند کر کے کیسٹ نکالا۔ اور اٹھتے ہوئے بولی

میں یہ رکھاؤں وہیں۔

- رکھاؤ۔ فوقیہ نے کہا۔

- یہیں رہنا میں ابھی آتی ہوں۔ وہ کمرے سے تیزی سے نکلتے ہوئے مڑ کر بولی۔

- فوقیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

- اس کے جانے کے بعد فوقیہ کرسی میں نیم دراز ہو گئی۔ آنکھیں بند کر کے وہ

تصویراتی دنیا میں پہنچ گئی۔ تصویراتی دنیا جو حسین بھی تھی نہ تکین بھی۔

- رکھتا ہے۔

- ادھو بڑی آئی حکم چلانے والی - یہ بات ہے تو میں کالج سے سیدھی گھر آؤنگی  
- نہیں نہیں - شائندہ باجی حکم نہ سہی عرض سہی - میری خاطر - کسی کی خاطر -  
- کیا -

ظریفہ کھکھلا کر ہنس پڑی - شائندہ نے لمبی سی آواز میں کیا کہا تھا - اس کیا میں  
جان لینے کا احساس بھی تھا - اور نہ جاننے کا جیل بھی -

- بہت تیز ہوتی جا رہی ہے تو - شائندہ کے سخت لہجے میں بلا کی نرمی تھی -  
- کیا کروں - ہونا پڑتا ہے - ظریفہ نے بے چارگی سے منہ بنایا - تو شائندہ کو  
ہنسی آگئی -

- کیا تکلیف ہو گئی ہے - وہ بولی -

- مجھے تو کوئی نہیں - انہیں البتہ ضرور ہو گئی ہے - ظریفہ ہنس پڑی -  
- کسے؟ - اس نے ظریفہ کا کان مروڑا -

- نواز زادہ صاحب کو - ظریفہ کان چھڑاتے ہوئے مسکرائے گئی -

- بھو اس کیوں کرتی ہے - شائندہ نے اس کا کان چھوڑ دیا -

- بھو اس نہیں شائندہ باجی - وہ اب بھی مسکرائے گئی -

- میں تجھے ماروں گی - وہ مصنوعی غصے سے بولی -

- ادھو ہوں - ان باتوں سے کچھ نہیں ہو گا - جو بات ہے سو ہے - اس نے  
آنکھیں مسکائیں -

- کیا بات ہے - شائندہ نے تیزی سے کہا -

- وہ روزانہ ڈیڑی کو دیکھنے آتے ہیں - ظریفہ قدر سے دور ہو کر بولی -

- تو میں کیا کروں - شائندہ نے کہا -

- شائندہ باجی -

- کیا ہے -

- آج کالج سے واپسی پر آپ ہسپتال ضرور جائیے گا -

- اچھا -

- اور پھر شام تک وہیں رکھئے گا -

- کیوں -

- بس -

- ضروری ہے کیا -

- بے حد -

- کیوں -

- کہہ جو دیا -

- تیرا کہنا حکم کا اور جو تو نہیں رکھتا -

- آپ سمجھتی ہیں وہ ڈیڑی کے لیے آتے ہیں۔ ظرفیہ دو قدم اور پیچھے ہٹتے ہوئے شوخی سے بولی۔

- تمہارے لیے آتے ہوں گے۔ شائے نے الجھے ہوئے کہا۔  
- ادلی ہوں۔ میرے لیے نہیں۔ اس نے ہنستے ہوئے شوخی سے کہا۔  
شائے نے گھور کر بہن کو دیکھا۔ اس کی شوخی پر غصہ آنے کی بجائے ہنسی آرہی تھی۔ جسے بدقت روکے ہوئے تھی۔

ظرفیہ نے کل والی باتیں شائے سے کہہ دیں۔  
- اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے۔ کہ۔ شائے رک رک کر بولی۔  
- کہ آپ کا ہوسٹل ہونا ضروری ہے۔ ظرفیہ نے ہنستے ہوئے اس کی بات پوری کر دی۔

شائے الجھی الجھی اسے سمجھنے لگی۔  
- چلے آج آزمائش سہی۔ ظرفیہ تدریے توقف کے بعد بولی۔

- کس بات کی۔  
- ہر بات کی۔ فیصلہ ہو جائے گا۔  
- تو پاگل تو نہیں ہو گئی۔

- بالکل نہیں۔ ہوش حواس قائم ہیں۔ حقیقت کی بات کر رہی ہوں۔ آج آج ڈیڑی کے پاس شام تک رکے گا۔ اگر تو عثمان صاحب حسب معمول پانچ ما منٹ ٹھہر کر چلے گئے۔ تو کوئی خاص بات نہیں۔ اور۔ اگر۔ وہ۔ ظرفیہ شرارت سے آنکھیں نیچا تے ہوئے چبچبا کر رک رک کر بولی۔ وہیں گئے۔ تو بس سمجھ جائیے گا۔

شائے اکیدم سنجیدہ ہو گئی۔ سر جھکایا۔ چند لمحوں کی کھڑی رہی پھر اپنا چہرہ

سراٹھا کر ظرفیہ کو دیکھا۔

- کیوں شائے باجی۔ ظرفیہ جلدی سے اس کے قریب آگئی۔  
- تو جو کچھ کہہ رہی ہے نا۔ میں جانتی ہوں۔ شائے نے منہ پھیر لیا۔  
- جانتی ہیں۔ ظرفیہ خوش ہو کر بولی۔  
- ہاں۔ جواب بے حد سنجیدہ تھا۔  
- تو۔ تو۔ پھر آپ آج ڈیڑی کے پاس شام تک ضرور رکے گا۔  
- نہیں۔

- یہ کیا بات ہوئی۔  
- میں کسی خوش فہمی میں پڑنا نہیں چاہتی۔  
- یہ خوش فہمی کیسے ہوئی۔ حقیقت ہے۔

- وہ نوا بزاوہ صاحب ہیں۔ ظرفیہ کو بھی خوبصورت اور جوان لڑکی ان کی تفریح اور وقت گزاری کے خانے میں فٹ ہو سکتی ہے۔ میں یقیناً ایسا کبھی نہیں چاہوں گی۔ جو کچھ بھی تم نے محسوس کیا ہے یا سنا ہے سب امیر زادوں کے کھیل میں۔

ظرفیہ اس کی بات سمجھ گئی۔ بے رنگ سی سکر اسٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔  
اس نے توکل کی باتوں سے بڑی خوبصورت اور دل فریب کہانی بنائی تھی۔ رات بھر وہ شائے کی پرسترت زندگی کے خواب چنتی رہی تھی۔ اس نے تو خوابوں میں دونوں کو ازدواجی بندن میں بھی جکڑ ڈالا تھا۔ اپنے اور عثمان کے درمیان جو بلقائے خلیج تھی۔ جو دولت کی آہنی دیوار تھی۔ جو مراتب کا فرق تھا۔ اس نے اس کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا۔

شائے سے اتنی عقلمندی کی بات شاید ظرفیہ کی توقع کے خلاف تھی۔ اس



وہ ہر قدم ہونک ہونک کر رکھنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ احتیاط سحر کو توڑنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اسی دوپہر سحر کو توڑنے کی ایک کوشش اس نے عملی طور پر کی۔ کالج سے واپسی پر وہ لندن بک ڈپو گئی۔ آنٹی ٹینے کے بیٹے کی سالگہ پر گرٹنگ کارڈ بھیجا تھا۔ بس اس نے میں دیر تھی وہ کارڈ لینے چلی گئی۔ اتفاق ہی تھا کہ وہ دکان سے نکل رہی تھی۔ اور عثمان اندر آ رہے تھے۔ شائے نے انہیں دیکھا۔ لیکن کتر کر نکل جانا چاہا۔

لیکن

عثمان کی اس پر نظر پڑ چکی تھی۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اس کی طرف آئے۔ بتا بی شوق ان کے رویں رویں سے عیاں تھی۔ بڑی چاہت سے انہوں نے ہلو شائے کہا۔

شائے کے چہرے پر گہرا سٹ کے سائے لہرا گئے۔ اس نے عثمان کو دیکھا اور سر جھکایا۔

کیا حال ہے۔ عثمان نے بڑی اپنائیت اور بے تکلفی سے پوچھا۔

شکریہ۔ وہ صرف اسی قدر کہہ کر باہر جانے لگی۔

کہاں جا رہی ہیں۔ عثمان نے اس کے ساتھ ہی قدم اٹھایا۔

گھر۔ وہ بولی۔ دکان میں آنے جانے والوں سے وہ کچھ خائف سی ہو گئی تھی۔

میں ڈراپ کر دوں گا۔ وہ جلدی سے لوٹے۔

جی نہیں شکریہ۔ میں بس سے چلی جاؤں گی۔ وہ تیزی سے باہر آگئی۔

عثمان کو اس کے بیگانہ رویے سے خامی کو فٹ ہوئی۔ اذیت کے آثار

نے داد کے طور پر بس کے گنگے میں بانہیں ڈال دیں اور اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے بولی۔ آپ بڑی سمجھدار ہو گئی ہیں۔

کیا پہلو نہیں تھی۔ شائے مسکرائی۔

ظریف نے نفی میں سر ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ سمجھدار ہوتی تو نونا بڑے سے لفٹ ہی نہ لیتیں۔ اب وہ پیچھے پڑے گا تو کیا کرے گی۔

شائے بھی ہنس پڑی بظریف کی بانہیں گنگے سے نکالتے ہوئے بولی۔ پیچھا چھڑانا کیا مشکل ہے۔ لیکن یہ جو ہماری ماما ہیں نا۔ ایک دم لفٹ دینا شروع کر دیتی ہیں۔ واقعی وہ کیپٹن صاحب یاد ہیں۔ ماما کی لفٹ سے کس طرح فائدہ اٹھانے کے درپے تھے۔

دبی ماما اب کر رہی ہیں۔

لیکن شائے باجی عثمان صاحب ویسے نہیں لگتے۔

ان سے چار ہاتھ آگے ہی ہوں گے۔ کیونکہ کپتان صاحب سے خشتیت مرتبہ اور شکل و صورت میں بہتر ہی ہیں۔

ظریف چپ ہو گئی۔ شائے نے بھی باتوں کا موضوع بدل دیا۔

لیکن

موضوع بدل دینے کے باوجود شائے کے ذہن میں خیالات کی اپنی ہی رو دوڑ رہی تھی۔ اس نے عثمان کے تعلق جو کچھ ظریف سے کہا تھا۔ شاید اپنے آپ کو چھپانے کے لیے کہا تھا۔ ورنہ ان کی مسکور کن شخصیت کے جال میں تو وہ بڑی طرح جکڑی جا چکی تھی۔ جو کچھ بھی کہا تھا۔ شائے نے ابھی ہوش و حواس کو خیر باد نہیں کہا تھا۔ اپنے دل کے باغی ہو جانے کے باوجود دماغ اس کی گرفت میں تھا۔

سے جانے گئے ہیں۔ یہ وقت کب آتا ہے۔ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں کبھی  
رفتہ رفتہ آتا ہے اور کبھی پہلی نگاہ ہی میں وارد ہو جاتا ہے۔

عثمان پر بھی یہ وقت شاید پہلی نظر ہی میں وارد ہو گیا تھا۔ شائے انہیں اجنبی  
نہیں لگتی تھی۔ کھوٹی ہوئی شے محسوس ہوتی تھی۔ جسے انہوں نے اچانک پا  
لیا تھا۔ اپنے ہی تصور کا تراشا ہوا بت تھی۔ اپنی ہی چاستوں کی این تھی۔ اسے  
انہوں نے غیر محسوس ہی نہیں کیا۔ اپنے سے جوا تصور ہی نہیں کیا تھا۔

اسی لیے

انہیں

شائے کا بیگانہ رویہ کوفت دے گیا تھا۔

شائے انہوں نے اس کی پشت پر رکتے ہوئے پکارا۔

”جی۔ وہ رک گئی۔ فٹ پاتھر پر آنے جانے والوں کے درمیان وہ گہرا ہٹ  
محسوس کر رہی تھی۔

”آپ بس میں کیوں جا رہی ہیں۔ میں جو ہوں۔ آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“  
وہ بے تکلفی سے بولے۔

”جی نہیں۔ شکریہ۔ میں چلی جاؤں گی۔“ وہ رکتے رکتے بولی۔

”میرے ساتھ جانے میں ہچکچا رہی ہیں۔“ وہ بولے۔

”چاہیے بھی۔ کہتے ہوئے وہ رکتے والی بس کی طرف بڑھ گئی۔

عثمان بس کے چلے جانے کے بعد بھی چند لمحے وہیں کھڑے رہے۔

ان کے چہرے سے مترشح تھے۔ کس شدت سے وہ شائے کو دیکھنا چاہ رہے  
تھے۔ آج اتنے دنوں بعد وہ نظر آنی تو بالکل اجنبیوں کی طرح ملی۔ وہ تو قربت  
کی منزلوں سے گزر گئے تھے۔ اپنے اور شائے کے درمیان کوئی پردہ کوئی دیوار  
کوئی رکاوٹ محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔ پہلی ملاقات ہی میں وہ یوں آسودہ ہو گئے  
تھے۔ جیسے مدتوں ٹھکنے کے بعد منزل پالی ہو۔ شائے کا رویہ ان کے اس احساس  
کو اک جھٹکا تھا۔ سب کچھ کہنے سننے کو تو نہیں ہوتا۔ محسوس کرنے کو بھی ہوتا ہے  
جذروں کی آنچ تو صرف محسوس کرنے کی شے ہے۔ شائے نے کیوں یہ آنچ محسوس  
نہیں کی۔ دکان ہب کے بڑے سے درمیں کھڑے کھڑے عثمان کے ذہن میں سوچیں  
الجھ الجھ گئیں۔

شائے بس شاپ کی طرف جا رہی تھی۔ جو چند گز کے فاصلے پر تھا۔ اس نے  
ایک بار بھی ٹولپٹ کرنے دیکھا۔

عثمان نے اپنی الجھی سوچوں سے نکلنے ہوئے اسے دیکھا۔ اور دکان کے  
اندر جانے کی بجائے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے شائے کے پیچھے آ گئے۔

بازار میں زندگی رواں دواں تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ ٹریفک کا زور تھا۔  
دکانوں میں خریداری کا زور تھا۔ ریڑھیوں ٹھیلوں اور فٹ پاتھوں پر بکاز مال  
پڑا تھا۔ شور شرابا۔ ہبل اور دوردھوپ پورے عروج پر تھی۔

لیکن

مجتبوں اور چاستوں کی اپنی راہیں ہوتی ہیں۔ ان راہوں پر گامزن شہر  
سروں کو گرد و پیش کا احساس ہی کہاں ہوتا ہے۔ انہیں احساس ہوتا ہے تو  
اور صرف اپنے محبوب کی ذات کا۔ اور ان راہوں پر چلتے چلتے تو اک وقت  
ایسا بھی آ جاتا ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو بھی اپنے محبوب کی ذات کے جوا

تھے۔

”یہ سب کچھ اپنا ہے۔ کا احساس غالب تھا۔

ہر چند کہ شائد نے کل اپنے سرور دیے سے ان کی دلآزاری کی تھی۔ ذہنی کوفت دی تھی۔ چند گھڑیاں لال کی بھی گذری تھیں۔ پھر بھی اپنا نیت کا زعم نہیں ٹوٹا تھا۔ انہیں ہر لمحہ ہر آن یہی محسوس ہوتا تھا۔ کہ شائد ان کے اور صرف ان کے لیے ہے۔ قدرت نے اپنی صناعی کا یہ بہترین شاہکار صرف ان کے لیے ہی اب تک چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ یہ آفاقی مخلوق زمین پر اتاری ہی ان کے لیے ہے۔ اس پر ان کا حق مسلم حقیقت ہے۔ یقین ہے ایمان ہے۔

وہ اپنے عین خیالوں میں کھوئے تھے۔ کہ دروازہ کسی نے آہنگ سے بکایا۔ دلفریب خیالوں کا قسمل ٹوٹ جانے پر انہیں الجھن ہوئی۔ اور جب دوسری دفعہ دروازہ دوسرے دروازہ بجا تو جھنجھلا کر انہوں نے سر ہانے سکے ٹیپ کا بھن آن کرتے ہوئے پوچھا۔

”کون ہے۔“

دروازے پر فاخرہ تھی۔ بحکمہ آواز سے ڈر گئی۔

”کون ہے بھئی۔“ انہوں نے آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔ ٹیپ انہوں نے فوراً بند کر دیا۔

”میں ہوں بھائی جان۔“ فاخرہ بولی۔

”آجاؤ۔ کیا بات ہے۔“ انہوں نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

فاخرہ اندر آ گئی۔

”کیوں۔“

”آپ ابھی سے سونے جا رہے تھے۔ نوکھی نہیں بچے۔“

خواب گاہ کی ساری بتیاں کبھی تھیں۔ تیز رفتاری سے چلنے والے پنکھے کی گھول گھول فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ سگریٹوں کے دھوئیں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ عثمان اپنے بیڈ میں تھے۔ سر ہانے رکھے ٹیپ میں بڑے دھیمے سردن میں ان کا پسندیدہ مصرع چل رہا تھا۔

”میں نے قسمت کی لکیروں سے چرایا ہے تجھے۔“

عثمان آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ بند آنکھوں میں جاگتے خواب تھے۔

ان خوابوں میں کبھی سادہ چمک قمیض میں ملبوس بکیر تھرک جاتا۔ کبھی سیپ ایسا دمکتا بدن چمک جاتا۔ کبھی سبزی مال گریے آنکھیں اپنی قیامت خیز لہروں سے تلاطم بپا کر دیتیں۔ کبھی نرم و گداز جسم کی جذبات انگریز تیشیں چھیڑ چھاڑ کر جاتیں۔ کبھی نرم نرم چھوڑا الہی آواز نرم بکیر جاتی۔

کتنی دیر سے عثمان اپنی آنکھیں میں مقید خوابوں سے لطف اندوز ہو رہے

کر رکھی تھی۔ جب آئی تھی تو بے تکلف تھی۔ لیکن اب جھجک کا اظہار کرنے لگی تھی۔ باتوں میں بھی تکلف برتنے لگی تھی۔ دیکھنے اور مسکرانے میں بھی اس کے شعور کا پورا پورا دخل تھا۔

اسی کی ہدایت اور مہمانوازی کے جذبے کے تحت وہ فوقیہ کی ملازمت کر رہے تھے۔ تقریباً روز ہی کھانے لے جاتے۔ صبح ہوا خوری توان کی اپنی بھی عادت تھی۔ سارہ فاخرہ اور فوقیہ بھی ان کے ساتھ جانے لگی تھیں۔ شام کو بھی اگر باہر لے جاتے۔ کبھی کھانے میں کھانا کھلاتے۔ کبھی کلب لے جاتے۔ کبھی یونیورسٹی کے لیبیاں ماپتے پھرتے۔ لائبریریوں کو چھڑتے۔ اجنبیوں سے مذاق کرتے۔ لڑکیوں کی تعریف کا سامان ہیا کرتے رہتے تھے۔

ان سب باتوں میں ان کی کسی خواہش کا عمل دخل نہیں تھا۔ شائے تو ان کی پوری ہمتی کو اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ کسی اور کے متعلق تو سوچنے کی انہیں فرصت تھی نہ ضرورت۔ یہ بات ان کی ذہانت تک محدود تھی۔ فوقیہ تو اس کی زد میں نہ آتی تھی۔ بیچاری سادہ لوح لڑکی کو جب سے فاخرہ نے وہ ٹیپ سنایا تھا۔ پنوں کے ہنڈولے میں بڑے اقامت سے جھولنے لگی تھی۔

فاخرہ کی شوخی نے جیسے خطرے کی گھنٹی بجادی۔ عثمان فوقیہ کو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رکھنا چاہتے تھے۔ کل اس نے چلے جانا تھا۔ غالباً ساڑھے دس کی فلائٹ سے اب سے صبح تک کا مختصر سا وقفہ عثمان کے پاس تھا۔ فوقیہ کی سوچ کی رفتار پر قدغن لگانے کا انہوں نے مستحکم ارادہ کر لیا۔

مض فاخرہ کی فرمائش پر اس وقت وہ کبھی بھی باہر جانے پر رضامند نہ ہوتے اپنے حین تصور میں کھوئے و غریب معروضے رہتے۔ لیکن اب انہوں نے باہر جانا ضروری سمجھا۔ فوقیہ پر عیاں ہونے کا یوں موقع مل سکتا تھا۔

- نہیں تو۔ یونی لیا تھا۔

- بتایاں جو کچھ رکھی تھیں۔

- اندھیرا اچھا لگ رہا تھا۔

- باہر نہیں جائیں گے۔

- کہاں۔

- کہیں گھومنے پھرنے۔ فوقیہ کل جا رہی ہیں۔

- فوقیہ کے بہانے تم گھومنا پھرنے چاہتی ہو۔

- جی نہیں۔

- شریہ۔

- تیار ہو جائیں ہم۔

- تمہاری خوشی کی خاطر چلا جاؤں گا۔ درنہ بستر سے ہٹنے کا قطعی موڈ نہ تھا۔

- میری خوشی کی خاطر نہیں۔ فوقیہ کے لیے جانا پڑے گا۔

- ادل ہوں۔

- وہ کل جا رہی ہے۔

- جانا ہی تھا۔ کالج سے ہفتہ بھر کی چٹیاں تو کر لیں۔

- ہماری خاطر۔

- ہماری خاطر کیوں؟

- بس۔ فاخرہ شوخی سے مسکراتے ہوئے عثمان کو دیکھ کر کرے سے جاگ

گئی۔ اس کی شوخ شوخ نظروں نے جو کچھ کہا انہیں سمجھتے ہوئے دیر نہ لگی۔ دپے

بھی چند دنوں سے وہ فوقیہ کے رویے طرز عمل اور گفت و گو سے کچھ چونکا کر

”بھئی تیاری کی کیا ضرورت — جیسے تھیں ویسے ہی آجائیں۔ کسی خاص جگہ تو جانا نہیں ہے۔“

”بس آتے ہیں۔ کہہ کر فاخرہ پھر غائب ہو گئی۔“

عثمان جھنجھلائے۔ لیکن کمر بھی کیا سکتے۔ سنگریٹ پھینک کر برآمدے سے باہر آئے۔ اور گیراج سے موٹر نکالنے چل دیئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ گاڑی پورچ میں لے آئے اور اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے لڑکیوں کا انتظار کرنے لگے۔ انہوں نے نیا سنگریٹ سلگایا۔

چند منٹوں بعد فاخرہ سیٹھیاں پھلانگتی آگئی اس نے ہلکے نیلے رنگ کا سادہ لیکن خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔

”باقی دو محترمہ — عثمان نے فاخرہ سے کہا۔“

”آرہی ہیں۔“ فاخرہ زینے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”اتنی دیر لگا دی — جی تو نہیں چاہ رہا تم لوگوں کو باہر لے جاؤں۔“

”ہائے بھائی جان —“ فاخرہ پیار سے انہیں دیکھ کر بولی۔ اور پھر زینے کی طرف دیکھ کر خوشی سے کہا۔ ”لیجئے وہ آگئیں۔“

سائرہ اور فوقیہ ساتھ ساتھ چلتیں برآمدہ عبور کر کے پورچ کی طرف آگئیں۔ فوقیہ فرنٹ سیٹ پر عثمان کے برابر بیٹھ گئی۔ فائزہ اور سائرہ پچھلی نشست پر اجماع ہو گئیں۔ فوقیہ اور عثمان کو برابر برابر بیٹھے دیکھ کر وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسری کو شوخ شوخ اشارے کر رہی تھیں۔

”کہاں جانا ہے۔“ عثمان نے گاڑی بڑی سڑک پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”جہاں بھی لے جائیں۔“ فوقیہ نے کہا۔ فاخرہ اور سائرہ اپنی مسکراہٹ دبا کر رہ گئیں۔

وہ جلدی سے ڈرائنگ روم میں گئے۔ آئینے میں اپنے سر پر نظر ڈالی وہ لباس ٹھیک ٹھاک تھا۔ بالوں میں برش کھیرا۔ اور سنگریٹ بلگاتے ہوئے خواب گاہ سے باہر آ گئے۔

وہ بیرونی برآمدے میں آکر لڑکیوں کے نیچے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ مراد ملی خان کے شاید مہمان آئے ہوئے تھے۔

برآمدے میں انہیں کئی منٹ کھڑا ہونا پڑا۔ لڑکیوں کا دور دورہ تک پہنچ نہ تھا۔ وہ دائیں جانب گئے۔ عشرت بانو کی خاص ملازمہ جینا آرہی تھی۔

”جینا — انہوں نے رک کر اسے بلایا۔“

”جی صاحب۔“

”ذرا اوپر جانا۔“

”کہاں۔“

”فاخرہ سائرہ اور فوقیہ تیار ہو رہی ہیں۔ انہیں جلدی سے نیچے بھیج دو۔“

”بہت اچھا۔“

”دومنٹ کے اندر۔“

”بہت بہتر۔“

بھاری بھر کم جینا تعمیل حکم کے لیے اپنا وجود گھسیٹتے ہوئے زینہ چڑھنے لگی۔ چند لمحوں بعد فاخرہ زینے پر نمودار ہوئی۔

”بس پانچ منٹ اور بھائی جان۔“

”تم لوگ کیا کر رہے ہو۔“

”فوقیہ تیار ہو رہی ہے۔“

”شکریہ۔ فوقیہ اتراتے ہوئے مسکرائی۔  
سب گاڑی میں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے۔

اور

گاڑی بے مقصد سڑکوں کی لمبائیاں ماپنے لگی۔  
وہ سب کئی جگہ گئے۔ کہا دسڑکوں پر بھی اور غیر آباد راستوں پر بھی۔  
گپ شپ ہوتی رہی۔ ہنسی مذاق بھی رہا۔ لیکن عثمان فوقیہ سے جو کچھ کہنا  
چاہ رہے تھے۔ کہہ نہ سکے۔ انہیں الجھن ہونے لگی تھی۔ خاص کر فوقیہ کی بولتی  
ہوئی خاموش حرکات سے۔

یہ الجھن دودھ ہو سکی۔ عثمان مضطرب سے تھے۔ رات انہیں فکر و پریشانی  
سے ٹھیک طرح سے نیند بھی نہ آئی۔  
صبح فوقیہ نے چلے جانا تھا۔

ناشتے پر بھی کوئی بات نہ ہو سکی۔ سارا وقت فوقیہ کے قیام کے دلچسپ  
دقت کی باتیں ہوتی رہیں سب نے خوب لطف اٹھایا تھا۔ فوقیہ ان دنوں کو  
زندگی کے یادگار دن قرار دے رہی تھی۔ فاخرہ اور سائو اڈاس ہو رہی تھیں  
کچھ ایسا ہی حال فوقیہ کا بھی تھا۔ عثمان ایسے وقت میں سولے خاموش رہنے  
کے کرم بھی کیا سکتے تھے۔

گیارہ بجے کے قریب سب فوقیہ کو رخصت کرنے جا رہے تھے۔ عشرت  
بانو برآمدے میں آچکی تھیں۔ لڑکیاں بھی آنے والی تھیں۔ عثمان کو اپنے گاگلز کرے  
نے لانے تھے وہ جلدی سے اپنے کمرے میں گئے۔

ابھی وہ گاگلز اٹھا ہی رہے تھے۔ کہ کمرے میں فوقیہ آگئی۔  
عثمان نے اس کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔ اب آپ لوگ کچھ کہنے کا نہیں۔ جہاں بھی لے جاؤں گا۔ چلنا  
ہوگا۔“ عثمان مسکرا کر بولے۔

”منظور۔“ سائو نے کہا۔

”چاہے جہنم ہی میں لے جائیں۔ فاخرہ ہنسی۔

”بالکل۔“ عثمان بولے۔

”نہ بابا۔ یہ بات غلط ہے۔“ فاخرہ نے کہا۔ ”ہم تو پہلے بازار جائیں  
گے۔“ اس کی یہ کیم کھائیں گے

”ٹھیک ہے۔“ سائو بولی۔

”پھر گھومتے پھریں گے۔ موسم تو کچھ گرم ہے ہی پیاس لگے گی۔ کوئی کوئلہ  
ڈرنک پئیں گے۔“ فاخرہ نے کہا۔

”اس کے بعد۔“ عثمان مسکرائے

”اس کے بعد پان لیں گے۔“ وہ بولی۔

”پھر۔“ عثمان نے کہا

”اس کا ستر۔“ سائو نے ہنس کر کہا۔

سب مسکرائے گئے۔

عثمان سب کو نیک بارے گئے۔ کچھ دیر وہاں سب گپ شپ لگاتے  
رہے اس کی یہ کھائی اور اٹھ کر آگئے۔ باتیں کرتے ہوئے سب گاڑی کی طرف  
جانے لگے۔

”کلب ہی چلے جلتے۔ کل کتنا مزہ آیا تھا۔“ بنگو کا۔“ فاخرہ بولی۔

”جیتی فوقیہ تھیں۔“ مزہ سمجھ گیا۔ سائو نے کہا۔

”جیتی فوقیہ واقعی بہت مکی ہیں۔“ فاخرہ اس کا ہاتھ پیار سے دبا کر بولی۔

دل توڑنا بری بات ہی۔ لیکن غلط راہوں پر چل پڑنے سے پہلے صبح راستہ دکھا دینا تو اچھی بات ہوتی ہے۔

عثمان اس کے قریب آئے اور سنجیدگی سے بولے۔ اس کیسٹ کے علاوہ آپ جتنے کیسٹس چاہیں لے جاسکتی ہیں۔

مجھے صرف وہی چاہیے۔ وہ آتہنگی سے بولی۔  
معاف کیجئے گا۔ وہ آپ کے لیے نہیں ہے۔ عثمان نے گہری سنجیدہ اور ٹھوس آواز میں کہا۔

فوقیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے چہرے کا رنگت پہلے پیلی پڑی پھر سرخ ہو گئی۔ حیران نظروں سے عثمان کو یوں دیکھا جیسے سب کچھ سمجھنے سے تاصر ہو۔ جیسے کوئی انتہائی غیر متوقع بات ہو گئی ہو۔

عثمان معاملے کی نزاکت کو بھانپ گئے۔ وضاحت کر دینا ضروری تھی۔  
فوقیہ کو دیکھا۔ دھیرے سے مسکرا کر بولے۔ فوقیہ۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ یہ کیسٹ آپ کو نہیں دے سکتا۔ کیونکہ۔۔۔ وہ چند لمحے رُکے گا۔ گلاز کو گھاتے رہے پھر آتہنگی سے بولے۔ یہ اسی کے لیے ہے۔ جسے میں نے قیمت کی لکیروں سے چرایا ہے۔

فوقیہ زخم خوردہ لہجے میں بولی۔ کون ہے وہ۔

وہ جو بھی ہے۔ میرا آئیڈیل ہے۔ اور میں اسے اپنانے کے لیے منتخب کر چکا ہوں۔ عثمان نے جلدی سے کہا۔ اندکڑے سے باہر جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

فوقیہ کسی نصب شدہ بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کی ساری رعنائیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ خالی غولی نظروں سے وہ کمرے

اس کی آنکھیں بے حاد اس تھیں۔  
آئیے۔ عثمان نے جلدی سے کہا۔ اور پھر خود ہی بولتے بس میں آہی رہا تھا۔

میں۔۔۔ فوقیہ تیز ریزب کے عالم میں تھی۔  
کیوں؟ کیا بات ہے۔ عثمان اس کے قریب آگئے۔  
میں آپ سے ایک کیسٹ لینا چاہوں گی۔ وہ اداس مسکراہٹ سے بولی۔  
ادہ۔ ایک کیا آپ بہت سے لے جاسکتی ہیں۔ لے لیجئے۔ جو بھی پسند آئے۔ عثمان نے اطمینان سے سانس لیا۔  
آئیے منتخب کر لیں۔ عثمان نے پلاسٹک کے خوبصورت سٹینڈروں پر بلیتے سے رکھے ہوئے کیسٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فوقیہ سے کہا۔ جتنے چاہیں اٹھالیں۔

مجھے صرف ایک چاہیے۔ وہ دھیرے سے مسکرائی۔  
کونسا۔ عثمان نے پوچھا۔  
وہ۔ جس میں۔ ایک مصرعہ ٹیپ کیا ہوا ہے۔ وہ سُرخ ہوئے شکرین لہجے میں بولی۔

عثمان نے حیرانگی سے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ وہ۔ وہ آپ نے کیسے سنا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔

بس۔ وہ اٹھلائی۔ سن لیا۔ معلوم ہو گیا۔  
عثمان چند لمحے اسے تنہی رہے۔ اور وہ سُرخ ہوتی ہوئی نگاہیں جھٹکائے کھڑی مسکراتی رہی۔

موقع خود بخود پیدا ہو گیا تھا۔

سے جانے والے عثمان کو تک رہی تھی۔  
 کا پنچ کے برتن ٹوٹتے ہیں تو اکثر چننا کہہ جاتا ہے۔ کہ چایاں بکھر جاتی ہیں  
 لیکن بعض اوقات یہ برتن پڑے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ چننا کہہ جاتا ہے۔ نہ  
 کوئی ٹوٹنے کی صدا آتی ہے۔ کہ چایاں بھی نہیں بکھرتیں۔ ٹوٹ، جاتے ہیں بس  
 خاموشی سے۔ چپ چاپ۔

شائندہ ڈرینگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے پلک کے ہونٹے ابروؤں  
 کو مختلف زاویوں سے دیکھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے دونوں برابر کی نہیں  
 ہیں۔ ظریف اس کے برابر ہی کھڑی اسے ابروؤں کے بالکل ٹھیک ہونے کا  
 یقین دلارہی تھی۔

کمرے میں تیز روشنی تھی۔ پھر بھی شائندہ نے ڈرینگ ٹیبل پر لمبپ رکھا ہوا  
 تھا۔ وہ زوبی کے بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے جا رہی تھی۔ زوبی اس  
 کی کلاس فیلو اور بچپن کی دوست تھی۔ آج دعوت، دلیر تھی۔ انتظام ہوٹل میں تھا۔  
 زوبی نے اپنی چار سزیز ترین دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ شائندہ کے ہاں باقی تینوں نے  
 بھی آنا تھا۔ زوبی نے گاڑی بھیجا تھی۔ اور یہاں ہی سے سب نے دعوت میں شرکت  
 کے لیے ہوٹل جانا تھا۔

شائندہ نے خوبصورت پگملی لیس کا ڈریس پہنا ہوا تھا۔ یہ ڈریس اس نے ظریف



"بس بس" شائے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 "وہاں پہنچتے پہنچتے اڑ جائے گی۔"  
 "خیر ہے۔ اتنی زیادہ مہک بھی اچھی نہیں لگتی۔ ہلکی ہلکی ہونی چاہیے۔"  
 "ذرا میرے سینڈل لانا۔" شائے نے ظرفیہ سے کہا۔  
 "پہنا بھی دوں" ظرفیہ نہہری پکی تپلی ڈدریوں والے سینڈل اٹھاتے ہوئے  
 بولی۔  
 "تو ادر کیا۔ میں خود جھکوں گی۔ تو لباس میں سلوٹیں پڑ جائیں گی۔" شائے نے  
 ہنس کر کہا۔  
 ظرفیہ اس کے قدموں میں جھک گئی۔ شائے نے اپنے ہاتھوں کی دودھ  
 انگلیوں کی پوروں سے اپنا ڈریس فوراسا اونچا کیا۔ ظرفیہ نے اس کے بے انتہاء  
 خوبصورت پاؤں میں جوتے پہنا دیئے۔  
 "شکریہ۔" شائے نے مسکرا کر کہا۔  
 ظرفیہ بھی مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 شائے کمرے میں دو چار قدم چل کر اپنے سینڈلوں میں کسے پاؤں کو رواں کر  
 لگی۔ خوبصورت لباس میں، چلنے کا انداز بھی خوبصورت ہونا چاہیے۔ وہ  
 بڑے اتہام سے بڑے وقار سے قدم اٹھانے لگی۔  
 ظرفیہ مسکراتی ہی تھی  
 "شائے۔"  
 "ہاں۔"  
 "کیٹ آف آنر تو جیسے آپ ہی ہیں۔"  
 "کیوں۔"

کی مدد سے خود تیار کیا تھا۔ دونوں منہیں اکٹرا اپنے کپڑے خود ہی سیکارتی تھی۔ ماما  
 کو سلائی کا شوق تھا۔ یہ شوق دونوں بہنوں نے ورثے میں اپنی ماما سے پایا تھا۔  
 "یہاں سے ٹھیک نہیں لگتی۔" شائے نے دائیں ابرو کے درمیانی حصہ پر انگلی  
 رکھتے ہوئے غور سے آئینے میں دیکھا۔  
 "ادھ خلیا۔" ظرفیہ تنگ آ کر بولی۔ "شائے باجی بالکل ٹھیک ہیں۔ دو چار  
 بال بھی اکھاڑے تو بد وضع کر دیں گی۔ اب تو رہنے ہی دیں۔ آپ کی دوست آنے  
 والی ہوں گی۔"  
 "اب تک انہیں آ جانا چاہیے تھا۔"  
 "گھڑی بھی تو نہیں آئی۔"  
 "آنے والی ہو گی۔"  
 "بس اب آئینے کے سامنے سے ہٹ جائیے۔ سب اوکے ہے۔"  
 "اب اشک زیادہ تو نہیں۔"  
 "بالکل نہیں۔ آپ کے ہونٹوں کا رنگ ہی ایسا ہے۔ لب اشک کے بغیر بھی  
 گلابی ہوتے ہیں۔ ذرا سا گلابی پٹچ دیا ہے۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔"  
 "بس ٹھیک ہے نا۔ کپڑے بھی اور میک اپ بھی۔" شائے نے آئینے کے سامنے  
 پوری طرح اپنا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔  
 "بہت پیاری لگ رہی ہیں۔" ظرفیہ نے شائے کو پیار بھری نظروں سے  
 دیکھا۔ "کیوں نظر نہ لگ جائے۔ کاتل لگالیں۔"  
 "دند۔" شکریہ۔ "شائے پرے ہٹتے ہوئے بولی۔" ہاں لا ذرا میری پرفیوم۔" ظرفیہ  
 نے جھک کر پرفیوم اٹھائی۔ اور شائے کے سینے بازوؤں اور لپٹ پر سر پرے کرنے  
 لگی۔

- اتنا اتہام تو شاید گیسٹ آف آنر نے بھی نہ کیا ہوگا۔  
 - واہ وا۔۔۔ زونی کا خاندان بڑا مڈرن اور امیر ہے۔ وہاں تو جو بھی آیا ہوگا  
 ایک دوسرے سے بڑھ کر ہوگا۔ بھی فیشن دیکھنے ہوں۔ تو ان کے ہاں کی کسی  
 بھی تقریب میں چلے جاؤ۔  
 - ہم کیا جانیں زونی۔ مجھے بھی مدعو کر لیتی تو کیا تھا۔  
 - تیری اس سے دوستی تو ٹھہرا ہی ہے۔  
 - آپ کی تو ہے۔  
 - یوں تو وہ سب دوستوں کے خاندان والوں کو بلانے لگتی۔ تو صرف اسی کے  
 یہاں کافی ہوتے۔۔۔ پھر تیری دوست مجھے کبھی بلاتی ہیں؟  
 - شاذ و نہ نہیں بلایا تھا۔  
 - وہ تو ماما کے تعلقات تھے ان لوگوں سے۔  
 - اہ۔۔۔  
 ظریف کچھ کہنے کو تھی۔ کہ باہر سے گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔  
 - گاڑی آگئی۔ شائے نے کہا  
 - ہاں نکلتا ہے۔ لیکن وہ آپ کی مینوں سیلیاں۔  
 - اب تک آجانا چاہیے تھا انہیں۔  
 - وہ بھی کیل کانٹے سے لیس ہونے میں مصروف ہوں گی۔  
 - ظاہر ہے۔ اتنے بڑے فنکشن میں شریک ہونا ہے۔  
 - چلیے پھر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ان کا انتظار کیجئے۔  
 - چلو۔۔۔  
 دونوں کمرے سے نکل ہی رہی تھیں۔ کہ ماما کو ریڈور میں آگئیں۔

- گاڑی آگئی ہے شائے انہوں نے کہا۔  
 - جی ماما۔۔۔ بس عصمت سعدیہ اور کرن کا انتظار ہے۔  
 ماما قریب آگئیں۔ شائے کو ستر پا دیکھا۔ ماشاء اللہ وہ بڑے پیار  
 سے لولیں۔  
 - شکریہ۔ شائے نے ہونٹوں سے ماما کے گل کو چھو لیا۔  
 پھر مینوں ڈرائنگ روم میں آگئیں۔  
 ماما نے اپنے کمرے کے باہر شائے سے ہنسنے کو کہا۔  
 - ماما۔ شائے بولی۔ وہ بہت بھاری ہیں۔  
 - اچھے لگیں گے۔  
 - اور ہوں۔ بالکل ہی دلہن ہی نہ بنا دیں مجھے۔ یہ کوئی ٹھیک ہی اس  
 نے کافوں کی طرف اشارہ کیا۔  
 پانچ سات منٹ ہی انتظار کرنا پڑا۔ عصمت کرن اور ان کے بعد سعدیہ  
 بھی آگئی۔ عصمت نے کامداتی کام کاغذ پر سیٹ پینا ہوا تھا۔ کرن نے چوڑی  
 دار پاچا مرقعہ اور امی کی شادی کے کام والا بھاری دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ سعدیہ  
 نے نفرت کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔  
 شائے کا لباس اور ٹھیک اپ ان سب لڑکیوں سے سادہ تھا۔ لیکن وہ  
 ان میں یوں لگ رہی تھی۔ جیسے ستاروں کے جبرمٹ میں پورا چاند۔ ماما اور  
 ظریف کے علاوہ ان لڑکیوں نے بھی شائے کی منفرد شخصیت کو محسوس کیا۔  
 چاروں بے تکلف سیلیاں تھیں۔ ایک دوسرے کو پھیرنے لگیں۔  
 - چلیے بھئی۔ گاڑی کب سے آئی ہوئی ہے۔ شائے نے اٹھتے ہوئے کہا۔  
 - چلو۔ سب اٹھ کھڑی ہوئیں۔

پھل سیٹوں کے دروازے کھول دیئے۔ خود ان کے بیٹھ جانے تک زوربا باہر کھڑا رہا۔

ہوٹل کے اندر اور باہر شرک پر گاڑیاں ہی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ڈرائیور بشکل جگہ بناتا دروازے تک آیا۔ چاروں لڑکیوں کو اتارا اور گاڑی والوں نے لیا۔

سب ہوٹل کے مال میں جہاں مہمان جمع تھے آگئیں۔ رنگ دلوں کا سیلاب تھا۔ دہلیوں کی چکا چوری تھی۔ بھڑکیلے لباس تھے۔ فیشن ایبل طبقہ جیسے کسی نمائش میں جمع تھا۔ مرد و عورتیں بھی فیشن اور جدید تہذیب کے شاہکار نظر آ رہے تھے۔

دلہن کے لیے مسند بنائی گئی تھی۔ تحت نما مسند پر وہ بھاری جوڑے اور بیش قیمت زیورات۔ سے لدی بیٹھی تھی۔ عورتیں اور لڑکیاں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ نوجوان بیاہی مست مست عورتیں اسے خوب چھیڑ رہی تھیں۔ دولہا اپنے دوستوں میں گھرے تھے۔ رات کی رونڈا دوست حکما سن رہے تھے۔ ہنس مذاق عروج پر تھا۔ جب کوئی بزرگ عورت یا مرد قریب آتا تو سب چپ ہو جاتے۔ موضوع بدل دیتے۔ لیکن جونہی وہ دور جاتے زوروں کے فتنے پڑتے۔

زوربا نے اپنی بہیلیوں کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔ چند لمحے وہ سب سے باتیں کرتی رہی۔ پھر وہ کسی رشتہ دار کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کچھ دیر بہیلیاں اکٹھی رہیں۔ پھر مہانوں کے عہد میں بکھر گئیں۔ کسی کو کوئی پرانی واقعہ مل گئی۔ کوئی ماں کے شانے والوں سے باتیں کرنے لگی۔ کوئی یونہی مہانوں سے رسمی باتوں میں کھو گئی۔

- زیادہ دیر نہیں رکنا بیٹے۔ ماما نے سب سے کہا۔

- آئی آپ بھی امی کی طرح ہیں۔ کرن بولی۔

- سب مائیں ایک ہی ہوتی ہیں۔ ماما بولیں۔

- آجائیں گے آپ فکر نہ کیجئے گا۔ زوربا ہی پچھا کر جائے گی۔

- وہاں تو وقت کا تہہ ہی نہیں چلے گا۔ بہر حال تم لوگ بھی بھول نہ جانا

کہ والیں گھر بھی جانا ہے۔

لڑکیاں مسکراتے لگیں۔ ایسے دلچسپ موقعے روز روز تھوڑا ہی ملتے تھے۔

وہاں تو کانے بجانے کی بھی مغل منعقد ہونا تھی۔ شائد تو کچھ نہیں بولی ہاں کرن

نے ماما سے کہہ دیا۔ آئی آپ بے فکر رہئے گا۔ ہم اکیلے تو نہ ہوں گے۔ سناہ

وہاں دو ایک سنگر بھی آرہے ہیں۔ اس لیے پیز انٹی۔ پیز۔

کرن نے مسکراتے ہوئے ماما کی شوٹری کو چھوا۔ ماما مسکراتے لگیں۔

- بڑی شکل۔ ہم بیٹیوں نے وہاں رکنے کی اجازت لی ہے۔ شائد بھی ہمارے

ساتھ ہی آئے گی۔ کوشش کریں گے۔ جلد سے جلد آجائیں۔

- وہ تو بارے انداز سے ہی ظاہر ہو رہا ہے۔ ماما ہنس کر بولیں۔

- ہم لمبی تان کر سو جائیں گے۔ ظریف بولی۔ جب جی چاہے آئیں۔

- دروازہ تجھے ہی کھولنا پڑے گا۔

- اول ہوں۔ ماما ہی انھیں گی۔

- چلو تم کیوں بحث کرنے لگیں۔ شائد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ماما بولیں۔

دروازہ بھی کھل جائے گا۔

- اب جاؤ بھی خیر۔

سب نے ماما کو سلام کیا اور گاڑی کی طرف آگئیں۔ ڈرائیور نے اگلی اور

دستوں میں پھیلی ہو۔  
 بڑے غمور بڑے بھرپور انداز میں وہ شائے کو دیکھتے رہے۔  
 اور  
 سیپ کی چمکیلی زنجبخت میں سرخیاں اترتی رہیں۔

شائے بھی کبھی کسی سے مل رہی تھی۔ کبھی کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ چند نوجوان لڑکے اس کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ جواں بڑوں کی دو تین مائیں اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ موشی کی نمی نے تو اس سے اچھا خاما انٹرویو لیا۔ اس کے خاندان کا پوچھا اور گھر کا پتہ بھی لے لیا۔ لڑکی انہیں اپنے بیٹے کے لیے پسند آگئی تھی۔

شائے ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچی۔ اور وہیں اس کی نظر عثمان پر پڑی۔ جو دوستوں کے درمیان کھڑے تھے۔ وجیبہ بادقار اور شاندار۔ پیش تر اس کے کہ شائے ادھر ادھر ہو جاتی۔ عثمان نے اسے دیکھ لیا۔ کئی لمحے تو وہ دم بخود کھڑے اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ سادہ سادہ سی شائے دیکھی تھی۔ آج تو اس کا یہ رنگ دیکھ کر حیرت زدہ ہی تو ہونا تھا۔ شائے کی تو سادگی بھی پر کار تھی۔ یہاں تو بچنے بننے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ انہیں کسی پرپوں کے دہلیں کی تہزادی لگ رہی تھی۔

اجاب کا حلقہ توڑ کر وہ بے تابی اور بے قراری سے اس کی جانب آئے۔ حسن جہاں سوز میں جب جیا کی تیش بھی شامل ہو جائے۔ تو کون کا فرجل جانے سے بچ سکتا ہے۔ عثمان کو دیکھ کر۔ قریب پاکر شائے کے گالوں پر سرخیاں ہرا گئیں۔

ہال مہانوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ چہک رہے تھے۔ ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ دلہن کے حسن و جمال کی باتیں ہو رہی تھیں۔ شاندار شادی کے قصیدے پڑھے جا رہے تھے۔ لیکن عثمان کو کسی چیز کا جیسے احساس ہی نہ تھا۔ وہ تو بھرپور نظروں سے شائے کو یوں تک رہے تھے۔ جیسے بالقابل صرف اسی کا وجود ہو۔ وہی سارے ماحول میں چلی بسی ہو۔ وہی ساری

شائے کو پیش کیا تھا۔ دوسرا خود لیا تھا۔ دونوں آنے سامنے کھڑے صپ کرتے ہوئے باتیں کرتے رہے تھے۔

پھر خالی کلاس بیرے کی ٹرے میں واپس رکھتے دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہال سے باہر آگئے تھے۔

ذو عثمان نے باہر آنے کی پیش کش کی تھی۔ نہ ہی شائے نے ان کے ساتھ ٹور شرابے سے نکل کر باہر لبتا پر سکون فضا میں آنے اور تنہا چلنے پھرنے پر کوئی رد و کد کی تھی۔

باہر سب ہی اپنے اپنے حال میں مست تھے۔

عثمان اور شائے سنگ سنگ چلتے چہن کو عبور کر کے دوسری طرف نکل گئے۔

پورے دونوں موسم کی باتیں کرتے رہے۔ پھر شادی کی باتیں ہوتی رہیں۔ مئی کی باری سی دہلیں شائے کو بہت لگی تھی۔ وہ اس کی خوب تعریفیں کر رہی تھی۔

عثمان اس کی باتوں کی نمنگی میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ اس کے اہل پنے کی انور سے خاصے غفلت بھی ہو رہے تھے۔

”بہت پسند آئی آپ کو دہلیں“ عثمان نے گردن گھما کر شوخ نظروں سے شائے کو دیکھا۔

”کیوں؟“ آپ کو پسند نہیں آئی کیا۔“ شائے مسکراتے ہوئے بولی۔

”پرائی دہلیں میں کیوں پسند کرنے لگا بھلا۔“ وہ شوخی سے بولے۔

شائے مسکرا کر صرف انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ ان کی شوخی تو بڑی بے باکی سے دل رہی تھی۔

”پسند نا پسند کا مسئلہ تو اپنی دہلیں کے بارہ ہی میں اٹھ سکتا ہے۔“ وہ کن انکھیل

چمنوں میں لائیں جل رہی تھیں۔ بگی بگی خوشبو بھیلی تھی۔ ہال میں رش ہو جانے کی وجہ سے کچھ لوگ باہر کھلی فضا میں آگئے تھے۔ کچھ جوڑے تنہائی کے تلاشی تھے چمنوں میں پٹری پتھر پٹی نشتوں پر آنے سامنے بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ کچھ در درختوں کے سایوں تلے چہل قدمی کر رہے تھے۔ کہیں پرانے دوست مل گئے تھے۔ اور جھگڑے کی صورت میں کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

جانے رش سے گھبرائے یا تنہائی میں باتوں کی خواہش نے اکسایا۔ عثمان اور شائے بھی ہال سے باہر نکل آئے۔

ہال میں دونوں کے درمیان رسمی سی باتیں ہوئی تھیں۔ عثمان نے ماما اور ڈیڈی کے متعلق پوچھا تھا۔ شائے نے بتایا تھا۔ کہ وہ اکیلی ہی آئی ہے۔ زوئی اور اپنی دوستی کے ناطے سے وہ اس شادی میں شریک ہوئی تھی۔

ہال میں بیرے مشروبات پیش کر رہے تھے۔ عثمان نے کانچ کا گلاس اٹھا کر

سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے مسکرائے۔

۔ چلیے اندر چلیں۔ شائندہ نے ایک دم گردن موڑ کر ہال کی طرف دیکھا۔

۔ کیوں۔

۔ کافی گھوم لیا۔

۔ تنگ گئی ہیں۔

۔ یہی سمجھ لیں۔

۔ تو آئیے وہاں بیٹھے ہیں۔

عثمان نے ایک بیچ کی طرف اشارہ کیا۔ جو گھنے گھیر دار درخت تلے بچھا تھا۔ اور  
چمن کی تیز روشنیوں کی رسائی نہ تھی۔ ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ مدھم مدھم سی روشنی تھی اور  
چھوڑوں کی مہک ان اونگھتے اندھیروں اور سوتے اجالوں میں چچی ہوئی تھی۔  
شائندہ نے ادھر دیکھ کر نفی میں سر ہلادیا۔

۔ کیوں۔

۔ بس۔

۔ کھانے میں ابھی وقت ہے کہیں آپ بھوک تو محسوس نہیں کر رہیں۔

۔ نہیں۔ بھوک تو بالکل بھی نہیں۔

۔ پھر اندر کیوں جانا چاہ رہی ہیں۔

شائندہ نے اک نگاہ غلط انداز میں اس پر ڈالی اور اس کے بھرے بھرے جذبات  
ہونٹ مسکرائے۔

۔ آپ اندر نہیں جائیں گی۔ عثمان نے قدرے شوخ لہجے میں حکم دیا۔

۔ دیکھیے جی۔ میں رعب نہیں مانا کرتی۔ وہ بھی مسکرا کر بولی۔

۔ تو لیجیے۔ عثمان نے ہاتھ باندھ کر مجرموں کی طرح سر جھکاتے ہوئے کہا۔

ہایت عاجزی سے استدعا کر رہا ہے۔

وہ منہس پڑی۔ ننھا سا قہقہہ بے اختیار ہو کر پھیل گیا۔

۔ آئیے۔ عثمان نے شہ پاکر قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

شائندہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے مرمریں بیچ تک آگئی۔

۔ تشریف رکھیے۔ عثمان نے بیچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سر قدرے خم کیا۔

۔ میں یقیناً تھکی نہیں ہوں۔ وہ بولی۔

۔ شکریہ۔ کہیں تو میں بیٹھ جاؤں۔

۔ بیٹھ جائیے۔

۔ پہلے آپ۔ وہ مسکرائے۔

۔ جی نہیں آپ بیٹھیے۔ میں کھڑی رہوں گی۔

۔ بڑی خدی ہیں۔

۔ شاید۔

۔ چلیے میں بھی کھڑا ہی رہتا ہوں۔

۔ ضروری نہیں۔

۔ اچھا ابھی۔ اجازت ہو تو سگریٹ سلگا لوں۔ اس کی مہک بری تو نہیں لگتی۔

شائندہ نے سرفی میں ہلادیا۔

عثمان نے جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالا۔ سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر لائٹر

لٹا اور اس کی لرزرتی کانپتی روشنی میں سگریٹ سلگاتے ہوئے پوری آنکھیں کھول

لٹا کر دیکھا۔

شعلہ کی لہجے کا پتلا رہا

اور

- وہ اس کی کانپتی روشنی میں شائد کے بخو بصورت وجود کو دیکھتے رہے۔  
 - شائد ان کی اس حرکت پر چھینپ گئی۔ ایک بار پھر اس نے اندر جانے کا  
 عثمان سے کہا۔ لوگ جارہے ہیں۔  
 - جانے دیں۔ وہ لاپرواہی سے کش لیتے ہوئے بولے۔  
 - میں جاؤں۔ وہ کترارہی تھی۔  
 - گلابادوں کا۔ آواز بھی نہ نکل پائے گی۔ عثمان نے رعب سے کہا۔ بہت  
 سفاک قسم کا آدمی ہوں۔  
 شائد کی سنہی پھیل گئی۔  
 - اول ہوں۔ مذاق نہیں۔ وہ مزید رعب ڈالتے ہوئے بولے۔ خبردار جو  
 آئندہ اندر جانے کا اشارہ بھی کیا۔  
 شائد کھل کر سنیں ڈری۔ اس کے حین جسم میں ہلکے ہلکے خم پڑ گئے۔ وہ قدرے  
 جھک گئی۔ پھر سکتاتے ہوئے سیدھی ہو کر بولی۔ آپ بہت دلچسپ ہیں۔  
 - حرف دلچسپ؟۔ وہ سحریت کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولے۔  
 - اور؟  
 - اور۔ اور کچھ نہیں۔  
 - مجھے کیا پتہ؟  
 - کچھ جانا چاہیں گی۔  
 - جانتی ہوں۔  
 - کیا۔  
 - کہ آپ نوابزادہ ہیں۔  
 - ارہ خدایا۔ اس کے علاوہ بھی تو کچھ ہوں۔  
 - ہوں گے۔  
 - آپ کو کوئی سرکار نہیں۔  
 - نہیں ہونا چاہیئے۔  
 - یہ کیا بات ہوئی۔  
 - سیدھی سی بات ہے۔  
 - اور جسے خاندانے سیدھی سی بات سمجھنے کی استطاعت ہی نہ دی ہو۔  
 - اتنے کوڑھ مغز نہیں لگتے آپ۔  
 عثمان نے سگریٹ کے دو تین کش لے کر اس کا آخری سرا نیچے پھینک کر پاؤں  
 سے نکل دیا۔ وہ بڑی خوش دلی سے مسکرا رہے تھے۔  
 - شائد۔ چند لمبے چپ رہنے کے بعد وہ بولے۔  
 - جی۔ وہ درخت کی جھکی شاخ سے تپی نوچتے ہوئے بولی۔  
 - ایک بات پوچھوں۔ عثمان نے بنیدگی سے کہا۔  
 - شائد نے شرمیلی سی گہرا سٹھ موس کی۔ لیکن کہہ ہی دیا۔ پوچھیے۔  
 - آپ بھر سے کتراتی کیوں ہیں۔ وہ اس کو بغور دیکھتے ہوئے بولے۔  
 - میں۔؟۔ اس نے گہرا سٹھ چپانے کی کوشش میں مسکرا کر پوچھا۔  
 - ہاں۔  
 - نہیں تو۔  
 - اس دن بھی آپ کتراکر چلی گئیں۔  
 - کتن دن؟  
 - جس دن کارڈ خریدے تھے۔  
 - ارہ۔

- اور۔ اور کچھ نہیں۔  
 - مجھے کیا پتہ؟  
 - کچھ جانا چاہیں گی۔  
 - جانتی ہوں۔  
 - کیا۔  
 - کہ آپ نوابزادہ ہیں۔  
 - ارہ خدایا۔ اس کے علاوہ بھی تو کچھ ہوں۔

- مجھے یہی احساس ہوتا ہے۔ کہ آپ کو میں نے برسوں کی تلاش کے بعد پایا ہے۔  
 عثمان نے سادگی سے کہہ دیا تو شائدہ سنجیدہ ہو گئی۔ بچی نہیں تھی۔ عثمان کے  
 شوق و دلورے اور نگین کو محسوس کر سکتی تھی۔ اپنے من میں بھی ان کی موردِ توجہ بنائے  
 بیٹھی تھی۔ لیکن اک حدِ فاصل رکھنے کی قائل تھی۔ عثمان کا پس منظر آنکھیں چند صیانیے  
 کی حد تک چمکتا تھا۔ اپنی حیثیت کا بھی احساس تھا۔ اس لیے ان سے بے تکلفی سے  
 باتیں کرنے کے باوجود اپنے جذبات چھپانے کی خواہاں تھی۔  
 عثمان صاحب شائدہ نے سنجیدگی کو بے سکر اسٹ میں پھپھاتے ہوئے ان کی  
 طرف دیکھا۔

- ہوں۔ وہ نیا سگریٹ سلگا رہے تھے۔  
 مذاق کی باتیں اتنی سنجیدگی سے نہیں کیا کرتے۔ وہ ٹھہرتے ہوئے لمبے میں بولی۔  
 میری زندگی کی اصل حقیقت کو آپ مذاق سمجھیں تو یہ دوسری بات ہے۔ وہ  
 بولے۔ سگریٹ کا کش لے کر سلگتا سگریٹ انگلی میں دبائے دبائے انہوں نے  
 پشت کے پیچھے ہاتھ باندھ کر غور سے شائدہ کو دیکھا۔ وہ بڑی سو برگ لگ رہی تھی۔  
 نگاہیں جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

وہ ایک قدم اٹھا کر اس کے اور قریب آگئے۔  
 شائدہ۔ آپ کچھ بھی نہیں سمجھتیں۔؟

رازداری اور گھبرائواری نے شائدہ کے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیں۔ لیکن بڑے  
 تکی سے بولی۔ سمجھنا نہیں چاہتی۔  
 کیوں۔ وہ بے قراری سے بولے۔

اس لیے کہ۔ شائدہ نے رخِ قدر سے موڑ کر بوجھل آواز میں کہ۔  
 وہ چپ ہو گئی عثمان بے قراری سے اس کی پشت کی طرف بڑھے۔ اس کے

- جی؟  
 بس سے چلی گئی تھی نا۔  
 میرے ساتھ جانے میں قیامت تھی۔  
 کچھ بھی نہیں۔  
 پھر۔  
 یونہی۔  
 اور آج بھی کچھ دلیا ہی دطیرہ ہے۔  
 کیسا؟

- ہمارا اندر جانے کی بات کر رہی ہیں۔  
 کافی دیر سے باہر جو پھر رہے ہیں۔  
 مہینے گزر گئے یا سال؟  
 ہائے آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔  
 یقیناً آپ میری زبان سمجھ پاتی ہیں۔  
 وہ ہنستے ہوئے سر کو نفی میں ہلانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ او  
 کال بتاتا رہے تھے۔  
 شائدہ۔

- جی۔  
 میں اگر یہ کہوں کہ مجھے آپ کی مدتوں سے تلاش تھی۔ تو۔  
 میری

- ہاں۔  
 کیوں میں کوئی کھو گئی تھی۔



کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ کہونا شائندہ۔

”میں کھلونا بن کر ٹوٹنے کی ہمت نہیں پاتی اپنے میں۔“ وہ بولی۔  
 - شائندہ۔ - عثمان نے سختی سے اس کا کندھا پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھمبایا  
 ان کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ چہرے پر بڑی ٹھوس سختی تھی۔ شائندہ کو  
 بات نے ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ صادق اور پر خلوص جذبات کو۔  
 شائندہ ان پر صرف اک نظر ڈال سکی۔ پھر جھکا سر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔  
 ”میرا ایمان تھا۔ کہ آپ میرے خاموش جذبات کی بولتی سچائی سے آگاہ ہیں  
 وہ ذرا سارخ موڑتے ہوئے پوری دیانت داری سے بولے۔ آپ کی بات نے  
 مجھے دکھ پہنچایا ہے۔“

شائندہ کچھ نہیں بولی

چند لمحوں کے بعد عثمان کہنے لگے۔ جانے کیا بات ہے شائندہ۔ میں آپ کو  
 پہلی بار دیکھا تھا۔ تو اپنا سیت کا بھرپور احساس میرے رگ و پے میں دوڑ گیا تھا۔  
 آپ اجنبی نہیں لگی تھیں۔ غیر سیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے برسوں  
 کی تلاش کے بعد آپ کو اچانک پالیا ہے۔  
 شائندہ فرط جذبات سے لرز رہی تھی۔

عثمان کہے جا رہے تھے۔ شاید اسی احساس مجبور کرویا ہے۔ کہ آپ سے بے نگاہی  
 سے ملوں۔ آپ کی طرف سے بھی تکلف نہ ہو۔ میں صرف چند بار آپ سے ملا ہوں  
 لیکن روح میں بیشک کا احساس چا ہوا ہے۔ اس احساس کو میں چاہوں بھی تو اپنے  
 آپ سے الگ نہیں کر سکتا۔ اسے شاید موت بھی مجھ سے الگ کر سکے۔

شائندہ نے انتہائی بے چین ہو کر عثمان کی طرف دیکھا۔

سچائی نہ گوئی ہوتی ہے نہ بہری۔

عثمان کی آنکھوں میں سچائی تھی۔

شائندہ کی نظروں میں سچائی تھی۔

یہ سچائی گونجی تھی نہ بہری۔

بول رہی تھی

سن رہی تھی۔

چند لمحوں کی خاموشی میں عمر بھر کے عہد و پیمان بندھ گئے۔

شائندہ نے نظریں جھکاتے ہوئے سر جھبکایا۔

اور

عثمان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے آہستگی سے دبا کر چھوڑ دیا۔  
 ہیرے چنوں میں ادھر ادھر کبیرے لوگوں کو کھانے کی اطلاع دیتے پھر رہے تھے  
 عثمان اور شائندہ بھی ان کی اطلاع پر ہال کی طرف چل دیئے۔  
 دونوں محو رہ چکے تھے۔

"ہوں۔ سعدیہ نے منہ بنایا۔ اپنے نصیب کہاں۔ اول تو تھیں ہی نہیں آتا  
 کہ ہیں بھی یہ دن دیکھنا نصیب ہوگا۔ اگر خدا خواستہ ہو بھی گیا تو ایسے دوپٹے کی  
 تو امید ہی نہیں کی جاسکتی۔  
 - تقدیر کا پتہ تو ٹرا ہی ہوتا ہے۔ - شائے مسکرائی۔  
 - تمہارے تو چانسز ہیں بھی۔ - سعدیہ نے منہ کر شائے سے کہا۔ لیکن اپنے  
 لیے انفس فائوٹ پر منٹ بھی چانس نہیں ہے۔ -  
 - میرے لیے کیسے کہہ دیا۔ شائے نے پوچھا  
 - آپ کا حسن و جمال بہت بڑی قوت ہے محترمہ۔ - سعدیہ بولی  
 - واقعی۔ واقعی۔ - رضائے نے ہنستے ہوئے تاکید کی۔  
 - ویسے شائے کے لیے یوں بھی چانسز ہیں۔ کہ ان کی نانا کا تعلق افغانستان  
 کے شاہی خاندان سے ہے۔ نامرہ نے کہا۔  
 - جی ہاں۔ کوئی بھولا بھلا شہزادہ اپنی شہزادی کی تلاش میں کل ہی آئے گا۔  
 سعدیہ بولی۔  
 شائے کی آنکھوں کی جوت جاگ اٹھی۔ سعدیہ کی بات پر وہ مسکرانے لگی۔  
 - روز تو میں اپنی تقدیر پر آتا ہے۔ شکل و عقل اور اس پر یاں کا تعلق کسی شاہی  
 خاندان سے نہ باپ کا۔ - سعدیہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی شکل و صورت  
 کی سمارٹ سی لڑکی تھی۔ باپ درمیانے درجے کا بزنس میں تھا۔ بھائی اچھے  
 عہدوں پر فائز تھے۔ کس نفسی سے کام لے رہی تھی۔ شوخی کے موڈ میں تھی۔  
 جتنے کیوں لگی ہے۔ شاہی خاندان سے تعلق ہوتے ہوئے بھی کوئی شہزادہ تلاش  
 میں سرگرداں نہیں ہوا۔ شائے نے سرور و محو رہے میں کہا۔ عثمان کی بھرپور شخصیت  
 اس کی نظروں میں گھوم رہی تھی۔

سفید یونیفارم اور پنک دوپٹے میں کتا بین اٹھائے شائے اپنی چارپانچ ہیلوں  
 کے ساتھ کالج کے گیٹ سے باہر آ رہی تھی۔ موضوع زدوبی کے بھائی کی شادی  
 ہی تھا۔ شائے اور سعدیہ شادی کے قصے مزے لے لے کر دوسری لڑکیوں کو سنا  
 رہی تھیں۔  
 - دلہن بڑی پیاری ہے۔ شائے بولی۔  
 - ہے تو۔ - سعدیہ نے کہا۔ میک اپ بھی تو بیوٹی میلوں سے کر دیا ہوا تھا۔  
 اور زیور لباس کیا کینے۔ وہ تو خیر اچھی شکل و صورت کی تھیں ہم جیسوں پر بھی ایسی  
 چیزیں لہ جائیں۔ تو ایک دم شاندار لگنے لگیں۔  
 - یہ بات تو ہے۔ ماریہ بولی۔ سنا ہے اس کے غرارے اور دوپٹے پر کامانی  
 کا کام ہی نہراؤں رو۔ بچے کا ہوا تھا۔  
 - فکر نہ کرو۔ تمہیں بھی کبھی۔ کبھی تو دیا دوپٹہ نصیب ہو ہی جائے گا۔ فیروز نے  
 منہ کر سعدیہ سے کہا۔

ہوا نہیں تو ہو جائے گا۔ - نسیم بولی۔  
 تجھے یقین ہے۔ شائندہ نے اس کی کمر میں ٹھوکا دیا۔  
 ہاں۔ اسی لیے تو کیفیت ہو رہی ہے۔ سعدیہ بولی۔  
 چل فکر نہ کر شہزادہ اکیلا تو آئے گا نہیں۔ کئی مصاحب نوکر چاکر ساتھ ہوں گے۔  
 ہاں جی ہمارے لیے تو نوکر چاکر ہی رہ گئے نا۔ سعدیہ نے رونی سی صورت بنائی۔  
 سب لڑکیاں کھکھلا کر نہس پڑیں۔  
 چمٹی ہو چکی تھی۔ لڑکیوں کے غول کے غول گیٹ سے باہر جا رہے تھے۔  
 شرک کے دونوں طرف تانگوں گاڑیوں اور رکشوں کی قطاریں تھیں۔ کچھ فاصلے پر بس شاپ تھا۔ بہت سی لڑکیاں وہاں سے بس بھی کچھ اکر تی تھیں۔  
 گیٹ کے باہر چوکیدار کھڑا تھا۔  
 شائندہ بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ گیٹ سے باہر نکلی۔ تو گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے پکارا۔ شائندہ بی بی۔  
 کیا ہے فضل رحیم۔ شائندہ نے پوچھا۔  
 آپ کو گاڑی لینے آئی ہے۔ وہ بولا۔  
 گاڑی۔  
 ہاں جی۔ وہ بس شاپ کے پرلی طرف کھڑی ہے۔  
 تمہیں کس نے بتایا۔  
 وہ صاحب تھوڑی دیر ہوئی کہہ گئے ہیں۔  
 شائندہ نے فضل رحیم کو دیکھا۔ کچھ پوچھنا چاہا لیکن خاموش ہی رہی۔ ڈیڑی

اس وقت اسے لینے نہیں آسکتے۔ پھر۔ پھر۔ وہ کچھ کچھ سمجھ گئی۔ سعدیہ بولی۔  
 چلو جی جاؤ تم اکیلے۔  
 بدتمیز۔ ذرا گاڑی میں لفٹ کی آخر سی کردیتیں۔ سعدیہ بولی۔  
 مجبوری ہے۔ شائندہ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔  
 ماریہ کار کشا آیا ہوا تھا۔ وہ خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ باقی لڑکیاں بھی اپنے اپنے تانگوں کی طرف چلی گئیں۔ سعدیہ نے بس پکڑنا تھی۔ اور شائندہ نے گاڑی کی طرف جانا تھا۔ دونوں نے ساتھ ساتھ چلتے شرک عبور کی۔  
 اور لفٹ پاتھ پر آگئیں۔ سعدیہ نے گھرنے جا کر نوٹس تیار کرنے تھے۔ جلدی جلدی قدم اٹھاتے وہ بس شاپ کی طرف بڑھی۔ بس آرہی تھی۔  
 خدا حافظ۔ اس نے جاتے جاتے ہاتھ ہلایا۔  
 خدا حافظ۔ شائندہ نے کہا اور بس شاپ سے آگے نکل گئی۔  
 چند قدموں پر ہی لفٹ پاتھ کے ساتھ سفید گاڑی کھڑی تھی۔ شائندہ کو جاننے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا۔ کہ عثمان اسے لینے آئے تھے۔ خوشی کی بھرپور لہر اس کے اندر مچنے لگی۔  
 عثمان کل گھر بھی آئے تھے۔ ماما نے حسب عادت، ان کا خیر مقدم تھا۔ اتنے دن نہ آنے کا شکوہ بھی حسب عادت کرویا تھا۔ ڈیڑی نے بھی ان کو خوش آمدید کہا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹہ ٹھہرے تھے۔ زیادہ تر باتیں ماما اور ڈیڑی ہی سے کرتے رہے تھے۔ لیکن خاموشیوں کی بھی تو زبان ہوتی ہے۔ انہوں نے شائندہ سے کیا کچھ نہیں کہا۔ اور شائندہ کیا کچھ نہیں سمجھی تھی۔  
 شائندہ گاڑی کے قریب آئی۔  
 عثمان سیٹ پر بڑے اطمینان سے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔

- آپ - شائے نے ہنستے ہوئے ساختہ سی حیرانی سے کہا ۔  
- جی ہاں ہیں ۔ - عثمان نے اس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا ۔

- کیوں ۔

- آپ کو لینے آیا ہوں ۔

- کیوں ۔

- کیا کیوں کیوں لگا رکھی ہے ۔ سلام ندعا ۔ اچھا طریقہ ہے آپ کا چلیے

- آئیے ۔

- لیکن ۔

- ادہ خدایا ۔ آئیں گی یا جاؤں ۔

- آپ آئے کیسے ۔

- ماما نے بھیجا ہے ۔

- سچ ۔

- سچ ہو تو کیا کریں گی اور جو سچ نہ ہوا تو کیا کر لیں گی ۔

- سچ ہوا تو فوراً ساتھ چل دوں گی اور اگر نہ ہوا تو ۔

- میں زبردستی گاڑی میں ڈال کر اغوا کر لوں گا ۔

- ہائے ۔

- بننے نہیں ۔ لوگ کافی ہیں اور گرد ۔ کیا سوچیں گے ۔

- شائے نے ارد گرد دیکھا اور پھر سکتاے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی ۔ جھوٹ

- کہہ رہے ہیں نا کہ ماما نے بھیجا ہے ۔ آپ ابھی ماما کے پاس سے آ رہے ہیں ۔

- نہیں ۔ گاڑی شارٹ کرتے ہوئے عثمان بولے ۔

- پھر کب کہا تھا ۔

- رات ۔

- جھوٹ ۔

- ہر بات جھوٹ ہے تو سچی کوئی ہے ۔ رات میں کیا نہیں تھا آپ کے ہاں ۔  
- کہے تھے ۔

- پھر ماما نے بھی کہا تھا ۔

- کیا ۔

- کہ جب جی چاہے ۔ شائے کو کالج سے اڑا لیا کروں ۔

- جھوٹے کہیں کے ۔

- سچی کہیں کی ۔

- دونوں ہنس پڑے ۔ عثمان گاڑی بھیڑ بھاڑ سے نکال کر بیرونی شاہراہ  
پر لے آئے ۔

- یہ آپ کو کیا سوچھی ۔ وہ ہنسی

- اگر روز سوچھا کرے تو اعتراض تو نہ ہوگا ۔ عثمان نے گردن تدرے گھا

- کر شائے کو دیکھا ۔

- کیوں نہ ہوگا ۔ اس نے کتابیں اپنے اور عثمان کے درمیان رکھتے ہوئے

- کہا ۔

- نہیں ہونا چاہیے ۔ عثمان نے کتابیں اٹھا کر پچھلی سیٹ پر پھینک دیں ۔

- عثمان کی اس حرکت پر شائے چپکے چپکے مسکرا دی ۔ لیکن وہ ہٹ کر اور

- کھڑکی کی طرف ہو گئی ۔ عثمان کے لبوں پر بڑی شوخ مسکراہٹ تیرنے لگی ۔

- گانا سنیں گی ۔ عثمان نے کچھ دور جانے کے بعد پوچھا ۔

- شائے نے اثبات میں سر ہلایا ۔

”جاپان رہے ہیں۔ شائے نے پوچھا۔

”جاپان۔ وہ بولے۔

”شائے کھکھلا کہہ نہیں پڑی۔

”کیوں۔ وہ بولے۔

”جاپان جارہے ہیں آپ بڑی کار۔“ وہ دلفریب انداز میں پھر نہیں پڑی۔

عثمان مسکراتے۔ پھر بولے۔ ”شائے میں کچھ دنوں کے لیے جاپان جارہا ہوں۔

کس لیے۔ شائے ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

”کام ہے کچھ۔ کاروباری سلسلے میں۔“

”ہوں۔“

”شاید دو ہفتے لگ جائیں۔“

”جی۔“

”میں ماسی لیے آپ کو کالج سے لایا ہوں۔ کچھ کہنے کے لیے۔“

”جی؟“

عثمان کچھ آگے کو جھکے پھر پیچھے ہٹے۔ سٹیڈنگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گردن گھما کر

شائے کو دیکھا اور پوری سنجیدگی سے بولے۔ ”رات نما، آپ کے کسی رشتے کا ذکر

کر رہی تھیں۔“

شائے کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے سر جھکایا اور گود میں رکھے ہاتھوں

کو آپس میں الجھانے لگی۔

”انہوں نے آپ کے ڈیڑھی سے غالباً کوئی ایسی ہی بات کی تھی۔ ہوں۔“

شائے نے بڑی اداس نظروں سے عثمان کو دیکھا۔

”شائے۔ وہ سنجیدہ ہو کر بولے۔

عثمان نے ٹیپ آن کر دیا۔ ان کا پسندیدہ مصرعہ چلنے لگا۔

عثمان لائق سے بیٹھے گاڑی چلاتے رہے۔

ایک ہی مصرعہ تین چار بار سنتے ہی شائے بولی۔ ”ٹیپ خراب ہے شاید۔“

”کیوں۔“

”ایک ہی مصرعہ بار بار چل رہا ہے۔“

عثمان نے غموں رنگا ہوں سے شائے کو دیکھا اور مسکراتے گئے۔ ”ٹیپ خراب

کیونکہ ہوا۔“

وہی مصرعہ اب بھی چل رہا تھا۔ کچھ لمحے تو شائے کو کچھ تپ نہ چلا۔ لیکن جب

مصرعہ بار بار چلتا رہا اور عثمان کی آنکھوں کی شوخیاں گہری ہوتی گئیں۔ تو وہ

کہ بولی۔ ”بہت پسند ہے؟“

”حب حال ہے۔“

شائے کے گالوں پر سرخی لہرا گئی۔

”پورا کیسٹ اسی سے بھرا ہے؟“ وہ بولی۔

”پسند آیا؟“ عثمان نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

شائے نے شانِ استغناء سے کندھے سکوترے۔ اس کے چہرے پر بڑی جاندار

بشاشت تھی۔

”میرے دل کی آواز ہے۔“ عثمان سرشار سے تھے۔ شائے نے شرمیلی نگاہوں

سے انہیں دیکھ کر رخ دوسری طرف پھیر لیا۔

گاڑی صاف دشتاف شکر پر تیزی سے جارہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بس

گاڑی یا رکشا کراس کر جاتا اور کبھی پیچھے سے آنے والی کوئی گاڑی سن سے

گزر جاتی۔

”شانہ باجی دیکھ نہیں رہیں آپ۔ کام کر رہی ہوں۔ میرے جاکر دیکھنے سے کیا ہوگا۔ جو کوئی آیا ہے اندر ہی آئے گا۔“  
”بہت بری عادت بنتی جا رہی ہے تیری۔“  
”کونسی۔“

”جرح کرنے کی۔“

”اچھا بابا جاتی ہوں۔ غصے کیوں ہوتی ہیں۔“  
آج کالج سے چھٹی تھی۔ دونوں بہنوں نے مل کر گھر صاف کیا تھا۔ ماما کا دستور تھا کہ چھٹی کے دن صبح ہی صبح دونوں بہنوں کو گھر کی صفائی پر لگا دیتیں جب عذرانی ملانے کے لیے آیا کرتی تھی۔ لیکن اوپر اوپر سے صفائی کر دیا کرتی تھی۔ کونوں عدرول میں دھول مٹی جمع ہوتی رہتی۔ ماما چونکہ خود نفاسست پسند تھیں۔  
”یہ ہمیشہ سے ان کا طریقہ چلا آ رہا تھا۔ کہ چھٹی کے دن سارے گھر کی مکمل صفائی رہتی۔ اب سچیاں جو ان تھیں۔ اپنا یہ فرض انہوں نے دونوں کو سونپ دیا تھا۔  
”عذرانی سے مل کر گھر کوشیشے کی طرح صاف کرنا اب ان کا کام تھا۔  
”صفائی کے بعد مساج کر داکے نہانا اور صاف ستھرا لباس پہنا بھی ماما ہی کی بیت کا نتیجہ تھا۔

”ظریفہ کتا ہیں میز پر پھینک کر باہر گئی۔ چند لمحوں بعد واپس آئی۔ کوئی نئے چہرے

”نئے چہرے۔“ شانہ نے پوچھا۔

”ہاں دو موٹی موٹی عورتیں ہیں۔ گوری گوری گول ٹول سی۔ کافی مالدار لگتی ہیں۔ پہلے کبھی نہیں دیکھا انہیں۔ ماما ان کے پاس بیٹھی ہیں۔ میرے جانے کا یہ نشان ہوا۔ کہ ماما نے چائے بنانے کا آرڈر دے دیا۔“ ظریفہ نے ساری معلومات

”ظریفہ۔“

”کیا ہے۔“

”دیکھو ذرا کون آیا ہے۔“

”کیوں۔“

”گاڑی رکھی ہے باہر۔“

”ڈیڑی آئے ہوں گے۔“

”بے وقت۔“

”تو پھر ماما کی کوئی دوست ہوگی۔“

”اس لیے تو کہا ہے جاکر دیکھو۔“

”ماما ادھر ہی گئی ہیں دیکھ لیں گی۔“

”تو نہیں اسنے کی۔“

ظریفہ کے جانے کے بعد منراشرف نے انتہائی انکساری سے کہا - آپ کی بچی ہمیں بہت پیاری لگی تھی - ہم فوہار میں رہتے ہیں - اس نے شہر کے خوبصورت ترین ملائقیہ میں اپنی کوٹھی کا پتہ بتایا -  
 ماما مسکرا کر سر ہلاتی رہیں -

- میرا بیٹا انجلی ہے - اس کے لیے رشتہ کی تلاش تھی - شائے کو دیکھ کر ہم رہ نہیں سکے - آپ کے ہاں آپ بچے ہیں - وہ مسکرائی -

- سارا خاندان ڈھکا چھپا نہیں ہے - منراشرف بولیں اور پھر اپنی فیملی کے چہرہ چہرہ لوگوں کے نام لینے لگیں -

"ہمارے بھائی جان بھی ڈاکٹر ہیں - اس نے اشرف کے متعلق بتایا - اللہ کا فضل ہے - سب کچھ دے رکھا ہے اس نے - بس اچھی لڑکی کی تلاش تھی - ہم اس لیے ماحر خدمت ہوئے ہیں -"

- آپ ہمارے متعلق جہاں سے چاہیں پوچھ سکتی ہیں - میرا بیٹا بھی ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے - وہ ہارٹسٹڈیز کے لیے امریکہ جانا چاہتا ہے - منراشرف بولیں - "جی" ماما جہد حق گوش تھیں -

- میں انہیں اکیلے نہیں بھیجا چاہتی - شادی کر کے بیوی بھی ساتھ لے جائیں - آپ تو جانتی ہیں - وہاں کا ماحول اکیلے لڑکے کو میں کسی طور بھیجنے کی حامی نہیں - ماما چپ تھیں - ہاں ان کی باتوں پر مسکراہٹ آپوں آپ لبوں پر آ رہی تھی - پہلے آنے والے دونوں رشتہوں سے یہ رشتہ کہیں بہتر تھا -

دونوں ہنسن اپنی خواہش کا اصرار کرتی رہیں - ماما صرف ہوں ہاں ہی کر رہی تھیں - پہلی ہی دفعہ کچھ کہنا مناسب نہیں تھا -  
 "ہیں کچھ تو بتائیے نا - منراشرف بولی -

چند منٹوں بعد ظریفہ ٹرائی سجائے آگئی - بالوں کو اب اس نے برش کر کے ہیڑ بنڈ سے باندھ لیا تھا - جو گیٹھی پر اسی کے ہم رنگ پھولدار کرتاپن رکھا تھا -  
 گلے میں دو قسم کی کوئی چیز نہ تھی -  
 - شائے کہاں ہیں - منراشرف بنے پوچھا -

- نہار ہی ہیں - ظریفہ بولی -  
 ماما انہیں چھٹی کے دن کی ٹیلیوں کی روٹین بتانے لگیں -  
 "بڑی خوشی کی بات ہے - منراشرف بولیں - آپ بچوں کو گھر کی ٹرننگ پنا نہیں بھولیں -"

ماما نے سر کے ہلکے سے اشارے سے ان کو تنظیم دیتے ہوئے شکریہ کہا - لڑکیوں کے لیے یہ بات انتہائی ضروری ہے - گھر کی دیکھ بھال کھانا پکانا سینا پرونا ضرور آنا چاہیے - میری دونوں بچیاں ماشاء اللہ ماہر ہیں ان کاموں میں -

- بالکل ہونا چاہیے - منراشرف بولی - مجھے تو وہ لڑکیاں نہ رہ گئی ہیں - جو فیشن تو زمانے بھر کی جانتی ہیں - لیکن گھر کے کام کاج میں مفر ہوتی ہیں -

- اور وہ بھی - منراشرف مسکرائی - جو صرف گھر کا کام کاج کر لیتی ہیں - سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کی تمیز ہی نہیں ہوگی -

- ہاں گھر لیا اور مادران - دونوں خاصیتیں قسمت ہی سے یکجا ملتی ہیں - منراشرف نے کہا -

- اور مل جائیں - تو واقعی خوش قسمتی میں کوئی شک نہیں - منراشرف معنی خیز انداز میں مسکرائی -

ظریفہ نے سب کو کافی بنا کر پانی ساتھ لے کر بھی پیش کئے - عورتیں اسے پسند آتی تھیں - دونوں بڑی ہنس مکھ لگتی تھیں -

پرزبان پھرتے ہوئے ظریفہ کو بے بسی سے تنکے لگی۔

۔ شائندہ باجی۔ کیا ہوا۔ کچھ تو کہیں۔ نہیں پسند تو بھی کہہ دیں۔ زبردستی تو ہوا  
ہی ہے۔ مجھ سے تو کچھ نہ چھپائیں۔ ظریفہ نے دوچار بار اصرار کیا۔ تو شائندہ نے  
اس کے کان میں رکتے رکتے سرگوشی کر دی۔

۔ سچی۔ ظریفہ ششدری رہ گئی۔ بات جیسے قابل یقین نہیں تھی۔ وہ کئی  
لمحے شائندہ کو تنکے رہی پھر اسے ہلا کر پوچھا۔ سچی۔

۔ ہاں۔ شائندہ نے شرما کر مسکراتے ہوئے کہا۔

۔ اوہ۔ یہ بات تو۔ پھر ماما کو اور کیا چاہئے۔ وہ باہر جانے کو اٹھی وہ  
دوڑ کر خوشخبری ماما کو دینا چاہتی تھی۔

۔ ابھی ماما سے کچھ نہیں کہا۔ شائندہ نے ظریفہ کا ہاتھ پکڑ کر پھر بٹھالیا۔  
۔ کیوں۔ وہ حیرانگی سے بولی۔

۔ چند دن رک جاؤ۔

۔ اور اگر وہ اور ڈیڈی آج ہی کوئی۔ سافیلہ کر بیٹھے تو۔۔  
ہوں۔

۔ میں تو ابھی ماما سے کہتی ہوں۔

۔ ہائے نہیں ظریفہ۔ پھر کئی وقت سہی۔ عثمان دو تین روز میں واپس آ رہے ہیں۔  
ان کے آنے تک کچھ نہیں کہنا۔ ماما کیا سوچیں گی۔

۔ جیسے آپ کی مرضی۔ بہر حال ماما ڈیڈی نے اس رشتے کے حق میں فیصلہ دے بھی  
دیا۔ تو بابر دولت رکوالیں گے۔۔ ہوں شائندہ باجی۔

ظریفہ پھر من کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر جھول گئی۔ شائندہ کی سرگوشی نے اسے  
بے انداز خوشیاں دی تھیں۔

۔ اچھا جی۔ جو خدا کو منظور ہوگا۔ ماما نے جواب دیا۔

دولوں بنہیں گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے بھی ماما سے پرزور اصرار کرتی گئیں۔  
رشتہ انتہائی معقول تھا۔ ماما کے من میں خوشی کی قندیلیں جل اٹھی  
تھیں۔ دونوں عورتوں کے جانے کے بعد وہ خوش خوش اندر آئیں۔ تو ظریفہ نے  
پوچھا۔ کون تھیں یہ ماما۔

۔ شائندہ کے لیے رشتہ آیا ہے۔ ماما نے خوشی چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔  
۔ اور وہ جو دو پہلے ہیں۔ ظریفہ بولی۔

۔ یہ ان دونوں سے بڑھ کر ہے۔ لڑکا انجینئر ہے۔ باپ ڈاکٹر۔ نو بہار میں  
کوٹھی ہے۔ اور لڑکا ہائرسٹڈیز کے لیے امریکہ جا رہا ہے۔ شادی کر کے۔  
۔ شادی کر کے۔

۔ ہاں وہ لوگ بیوی کو بھی ساتھ ہی بھیجنا چاہتے ہیں۔  
۔ بہت خوب۔ بہت اچھا۔ ظریفہ خوشی سے اچھل پڑی۔ بھاگتی ہوئی  
کمرے میں گئی۔ اور نوید شائندہ کو سنا ڈالی۔ ایک ہی سانس میں وہ ساری باتیں کر  
گئی۔

شائندہ کا چہرہ کسی طور لباش نظر نہ آیا تو وہ بولی۔ کیوں شائندہ باجی۔ اتنا  
اچھا رشتہ آیا ہے۔ خوشی نہیں ہوئی آپ کو۔

۔ نہیں۔

۔ کیوں۔

۔ بس۔

کیا بات ہے شائندہ باجی۔ ظریفہ اس کی گردن میں بازو ڈالتے ہوئے جھول  
کر بولی۔ ماما تو بہت خوش نظر آ رہی ہیں۔ شائندہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ ہنٹول



بہت خوشی کی بات ہے بیگم -  
بتائیے نا -

عثمان جس کام کے لیے جا پان گئے ہیں نا -  
ہوں -

وہ ہو گیا -  
شکر ہے -

بہت فائدہ ہوگا - بہت زیادہ فائدہ ہوگا -  
اللہ کا احسان ہے -

واقعی - اور عثمان بھی اب بزنس کو پوری طرح سمجھنے لگے ہیں -

ماشا اللہ سمجھ لاری میں کیا شک ہے - انہوں نے تو اپنا کاروبار بھی کافی پھیلا  
رکھا ہے - تعلیم کے بعد جو تین سال یورپ ہی میں رہے - صرف گھومتے پھرتے  
ہی نہ رہے تھے - کاروبار شروع کر رکھا تھا -

ہاں میں جانتا ہوں -  
اچھی بات ہے نا -

ہے تو سہی - لیکن میں سمجھتا ہوں - عثمان کو اب وہ سارے کام سمیٹ کر بیٹھ گیا  
کر لینا چاہیے - یہاں آپ کے ہیں اور رہنا بھی یہیں ہے - اس لیے میرا کام ہی سنبھالیں  
تو بہت ہوگا - علاوہ ان زمینیں ہیں - اس کی دیکھ بھال - باغات کا حساب کتاب  
میں تو ٹھیک چکا ہوں اب -

ہاتھ تو برابر بٹا رہے ہیں آپ کا -

پوری طرح سنبھال لیں - تو میرا ذہنی بوجھ ہلکا ہو جائے -

آہستہ آہستہ سنبھال ہی لیں گے - اب ایک دم ہی تو وہ سب ذمہ داریاں اپنے

آپ فرض ذکر لیں - مناسب یہی ہے - کہ جانے سے پہلے عثمان سے پوری  
رضا مندی لے لیں -

آپ بھی حد کرتے ہیں - فوقیہ یہاں آئی تھی - عثمان نے اسے ناپسند نہیں کیا -

یہ تو ٹھیک ہے پھر بھی آپ یقین سے کیے کہہ سکتی ہیں -  
خدا کو کسی نے دیکھا نہیں عقل بے پیمانہ ہے - عثمان ایسے ویسے ہوتے تو باہر  
سے ہی کچھ لاتے کسی کو - اس ماحول سے جو فتنیل خدا سرخرو ہو کر آیا ہے ظاہر ہے وہ

اپنے رسم و رواج اور طور و طریق کے تقدس کو پا مال نہیں کر سکتا -

آپ بصد ہیں - کہ عثمان سے پوچھیں بغیر اس کا رشتہ طے کر دیں -

رشتہ تو طے کر بھی دیا - رسی بات کے لیے کراچی جاؤں گی -

تو گویا -

ہاں بھابی سے فون پر دو چار بار بات ہو چکی ہے - وہ بہت خوش ہیں -

خوش تو ہم بھی بہت ہیں - اسی رشتے سے خاندان جو کبھرا پڑا ہے پھر متحد ہو جائیگا -

بس - اسی لیے تو یہ رشتہ ضرور ہونا چاہیے - آپکی دلی خواہش پوری ہو جائیگی -

بالکل - بالکل -

عثمان سے رہنا ہی بات کرنا ہے کہ لونگی - انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا - فائدہ

اور سارو بھی جانتی ہیں کہ عثمان نے فوقیہ کو پسند کیا ہے -

ہوں -

مراد علی خان پھر ڈاک اٹھنے پٹنے لگے - ایک خط کھولا - تو خوشی سے ان کے

چہرے پر روشنی ہی پھیل گئی -

ماشا اللہ ماشا اللہ - وہ خط دوبارہ پڑھتے ہوئے بولے -

کیا بات ہے -

- عثمان آگئے ہیں - چند دنوں تک کراچی جا رہی ہوں -  
 عاصمہ نے ہمارک ہاؤس کی - وہ فوقیہ کو بھی جانتی تھی - اچھی لڑکی تھی -  
 عاصمہ دو دن رہ کر چلی گئی - اس کے توسط سے عثمان اور فوقیہ کے رشتے  
 کی متوقع بات سارے خاندان اور ملنے ملائے والوں میں پھیل گئی -

اور  
 جب ہمارک بایں ملنے لگیں - فون پر خوشی کے اظہار ہونے لگے - تو عشرت بانو  
 سنسنا گئیں - اور انہوں نے کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا - بھابی کو اپنی آمد اور غرض  
 دعاغت سے بھی مطلع کر دیا -

عثمان کو سارہ نے بتایا کہ امی حضور کراچی تشریف لے جا رہی ہیں -  
 اچھا - عثمان نے سارہ کی مسکراہٹ کو سمجھ بیٹھ کر کہا -  
 آپ نے پوچھا ہی نہیں کہ کیوں؟ - وہ ہنس کر بولی -  
 خیریت! - عثمان کچھ ٹٹکے -

- بات بچی کرنے جا رہی ہیں - ہوں سمجھے آپ - اس نے شوخی سے آنکھیں گھمائیں  
 تو عثمان جیسے اچھل پڑے -

- کیسی بات کس کی بات - انہوں نے بہن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سختی سے پوچھا -  
 آپ بیٹے نہیں بھائی جان - وہ بولی -

- فاخرہ - میری بات کا جواب دو - وہ سختی سے بولے -

- ہائے اللہ - کیا جواب دوں - آپکی بات بچی کہہ نے جا رہی ہیں -

- میری کیا مطلب؟ -

- مطلب یہ کہ آپکی اور فوقیہ کی ممکنہ کی بات -

- فاخرہ -

اپنے اوپر لینے سے رہے -  
 مراد علی خان سر ملاتے ہوئے مسکرائے - بیگم کی طرف دیکھا اور بولے - ہاں جی  
 آپ جو زرداری ای الری پر ڈال رہی ہیں - فی الحال تو وہی منبھالیں گے - یہیں کام  
 کرتے رہنا پڑے گا - ٹھیک ہے -

وہ آخری خط اٹھا کر دیکھنے لگے -  
 عشرت بانو اخبار تہہ کر کے اپنا لفافہ ہاتھ میں لیتے ہوئے انھیں - کچھ ٹھنڈا  
 بھیجو ادول - انہوں نے مراد علی خان سے پوچھا -  
 بیچ دیں سکولیش کا ایک گلاس - زیادہ ٹھنڈا نہ ہو -  
 اچھا -

عشرت بانو اندر چلی گئیں - اور وہ کام میں مصروف ہو گئے -  
 ان کے دو تین عاصمہ کی نذر ہوئے - وہ عشرت بانو کی بچپن کی دوست تھی  
 اور فاخرہ کے رشتہ کی خواہشمند بھی - کبھی کھل کر بات تو نہ کی تھی - کہ مالی اعتبار سے  
 عشرت بانو کا مقابلہ نہ تھا - لیکن خاندانی تھی - اسی لیے آس لگائے بیٹھی تھی -  
 رشتوں ناطوں کی باتیں ہوئیں - تو عشرت بانو نے صاف کہہ دیا - عثمان کی  
 شادی کر لوں - پھر کچھ اور سوچوں گی - پھر فاخرہ ابھی تعلیم بھی مکمل نہیں کر پائی -  
 تین سال تک ارادہ ہے -

عاصمہ نے ہنس کر کہا - ہم لوگ پانچ سال بھی انتظار کر لیں گے -

عشرت بانو نے سارا زور عثمان کی شادی پر صرف کرنا تھا - اس لیے فاخرہ کے  
 رشتے کا کوئی تسلی بخش جواب تو نہ دیا - ہاں عثمان اور فوقیہ کے نزدیک ساری  
 باتیں عاصمہ کو بتادیں -

- کب تک ارادہ ہے -

اب تو معاملہ ہی اور تھا۔  
نوابی خاندان کے روایت پسند لوگ تو متوسط طبقے کی لڑکی کو اپنے خاندان  
میں شامل کرنے کا سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

ہنگامہ ہوا

اور

خوب ہی ہوا۔

لیکن عثمان کے جذبے پچھے تھے لگن کامل تھی۔ مونکے کی چٹان بن کر مقابلہ  
کرنے کو تیار ہو گئے۔

فاخرہ شہزادہ کر عثمان کا مزہ دیکھنے لگی۔ جو اس کے کندھے کو جھنجھوڑتے  
ہوئے ہراساں سے نظر آنے لگے تھے۔

بھائی جان۔۔۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

عثمان اس کا کندھا چھوڑ کر تیزی سے عشرت بانو کے کمرے کی طرف چلے گئے۔

اور

پھر

جو ہم چٹا

اس سے

مراد عمل کے در و دیوار لرز گئے۔

عشرت بانو تو سوچ بھی نہ سکتی تھیں۔ کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

فاخرہ اور سائرہ کو بھی دھچکا لگا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کہ عثمان فوریہ  
کے مقابلے میں کسی اور لڑکی کو پسند کرتے ہیں۔ ایک ایسی لڑکی جو فوقیہ کی طرح نوابی  
خاندان سے تعلق نہیں رکھتی۔ اور مراد علی خان تو گم صم ہی ہو گئے۔ وہ بار بار عشرت  
بانو کو عثمان کی صلاح لینے کا کہہ رہے تھے۔ لیکن ان کا خیال ہرگز نہیں تھا۔ کہ  
عثمان اپنے سے کمتر خاندان کی کسی لڑکی اپنا شریک حیات بنانا چاہیں گے۔ ان  
کی نظر میں اپنے ہی خاندان کی دو چار اور لڑکیاں تھیں۔ جو ہر لحاظ سے عثمان کے  
لیے بہترین ساتھی ثابت ہو سکتی تھیں۔ عشرت بانو کا چونکہ سوتیلہ رشتہ تھا اس  
لیے مراد علی خان عثمان کو پابند نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اگر فوقیہ کو پسند کر لیتے تو  
انہیں خوشی ہوتی۔ اور جو ناپسند کر کے کسی دوسری۔ خاندان ہی کی لڑکی کا انتخاب  
کر لیتے تو افسوس بھی نہ ہوتا۔

لیکن

اتنی بڑھی کہ زندگی اجیرن ہو گئی۔

مراد علی خان نے بھی پہلے صبر و تحمل سے کام لیا۔ آرام سے سمجھایا۔ مجبوری ظاہر کی۔ شریف لڑکی کے رسوا ہو جانے کا احساس دلایا۔ اپنی پوزیشن سمجھائی۔ سوتیلے ناطے کی بات کی۔

لیکن

عثمان پر جوں جوں دباؤ بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے ارادے میں استکمال پانے سے تھے۔ شائے کا چھوڑ دینے کا فودہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ تو ان کی زندگی تھی۔ زندگی سے زندہ رہتے ہوئے کون الگ ہو سکتا ہے۔

مراد علی خان اس رات انہیں اپنی خواب گاہ میں طلب کیا۔ عثمان روز روز کی چچ چچ سے تنگ آچکے تھے۔ آج وہ بھی آخری فیصلہ کرنے کے ارادے سے باپ کے سامنے آئے تھے۔

عشرت بانو بھی وہاں موجود تھیں۔ اور دروازوں کے پیچھے پردوں سے کان لگائے فاخرہ اور سائرہ بھی کھڑی تھیں۔

مراد علی خان نے بے چینی سے ہلٹے ہوئے باتیں شروع کیں۔ روز والا لیکچر آج درانداز انداز میں دیا۔ بیچ بیچ میں عشرت بانو بھی لقمہ دیتی رہیں۔

عثمان چپ چاپ کھڑے رہے۔

”کیا تم اپنا فیصلہ بدل سکتے ہو۔“ مراد علی خان نے تلخ لہجے میں کہا۔

عثمان سر جھکانے کھڑے تھے۔ آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ باپ کو دیکھا اور پھر سر قدرے خم کر لیا۔

”اب وقت ہے۔ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکتے ہو۔“ مراد علی خان تیزی سے بولے۔

مراد علی طوفان کی زد میں تھا۔

عثمان اپنی ضد پر اڑے تھے عشرت بانو ہر حیل آزمایا چکی تھیں۔ پیار سے معاملے کی نوعیت سمجھائی تھی۔ رشتے داری کی نزاکت کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔ خاندانی حالات کی صحت مندرکھٹ لینے کے امکان کا تذکرہ کیا تھا۔

لیکن عثمان ٹس سے مس نہ ہوئے۔

فاخرہ اور سائرہ کی وساطت سے بھی عشرت بانو نے انہیں ٹھکانا چاہا۔ لیکن وہ تو ایک ہی دفعہ جھاڑ کھا کر ڈر گئیں۔ دوبارہ بات کرنے کی جرات ہی نہ ہوئی۔

یہ بھی طرح بات ذہن کی۔ تو عشرت بانو دوسرے تھکنڈے استعمال کرنے لگیں۔ سوتیلے پن کا زہر گھلنے لگا۔ اور حالات بد سے بدترین ہو گئے۔ کشیدگی

ان کو تارے نہ نظر آئے تو دیکھ لیجئے گا۔ اترا جائے گا بھوت سر سے متوسط  
بلتے کی لڑکی کے خواب بھی چکنا چور ہو جائیں گے۔ ہمارے برابر آنے کی حیرت  
ہی رہے گی اس کے دل میں۔

”امی حضور۔ ماں کی باتوں پر ان کا خون کھول گیا۔

وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کہ مراد علی خان غصے سے لال پلے ہوتے ہوئے  
بولے۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں بیگم۔ ایک عام سے گھرانے کی معمولی لڑکی مراد علی کی  
دہلیز پر قدم نہیں رکھ سکتی۔ یقیناً وہ اسی لیے تمہارے پیچھے پڑی ہے۔ کہ۔“  
”ادہ۔“ عثمان نے ہونٹ شدت جذبات سے دانتوں تلے دبا  
لیے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں سن سکے۔ مڑے اور تیزی سے خوابگاہ  
سے باہر آ گئے۔

والدین کے حضور میں یہ ناقابل تلافی گستاخی تھی۔

لیکن وہ اسی طرح اپنے غصے کا اظہار کر سکتے تھے۔ شائد کے متعلق اس  
سے زیادہ توہین آمیز الفاظ سننے کی ان میں بہت نہ تھی۔ انہیں شدید  
صدمہ ہوا تھا۔

اور وہ رات انہوں نے جیسے کانٹوں پر کاٹ دی۔

اسی رات انہوں نے اپنی آئندہ زندگی کے بہت اہم فیصلے کر لیے۔  
شائد کے متعلق جو الفاظ مراد علی خان اور عشرت بانو نے استعمال کیے  
تھے۔ ان کے سینے میں انگاروں کی طرح چپک گئے تھے۔ اب ان کے پیش  
نظر شائد سے شاد می ہی نہ تھی۔ بلکہ شائد کو ان لوگوں کے مقابل لانے کا بھی  
فیصلہ کر لیا۔

”میں نے جو فیصلہ کیا ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر کیا۔ ہے اور نہیں اس پر پوری  
قوت سے قائم ہوں۔ عثمان نے بچے تلے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔  
”چکھ لینے دیں مزہ ان کو۔“ عشرت بانو غصے سے کانپتے ہوئے فرمائیں۔ جو  
لڑکی ان کے اعصاب پر مسلط ہے۔ اس کے ذہن میں صرف یہ خیال ہے کہ  
نوا بزاہہ صاحب لاکھوں کر ڈروں کے مالک ہیں۔ ہونہ۔“

”امی۔“ عثمان نے بے چین ہو کر کہا۔ ”آپ غلط بیانی سے کام نہ لیں۔“  
”عثمان۔“ مراد علی خان نے گرجتے ہوئے تمکھنا نہ انداز میں کہا۔ ”والدین سے  
بات کرنے کے آداب فراموش نہ کریں۔“

”سب کچھ فراموش ہو گا جی۔“ عشرت بانو بولی۔ ”عشق کا بھوت سوار ہے

سر پہ۔“

”یہ میری زندگی کا سوال ہے۔“ عثمان بولے۔

”تو تم نہیں ٹھوگے اپنے فیصلے سے۔“ مراد بولے۔

”نہیں۔“ آہنی جواب تھا۔

”اچھا۔“ مراد علی خان نے سختی سے ہونٹ بیچ لیے۔ چند لمحے چپ رہے

پھر فیصلہ کن انداز میں بولے۔ ”تو پھر ہم نے بھی ایک فیصلہ کر لیا ہے۔“

”یقیناً مجھے عاق کرنے کا۔“ عثمان زیر لب مسکرائے۔

”ہاں۔“ تمکھم آواز میں جواب تھا۔

عثمان خاموش ہو گئے۔ عشرت بانو اس خاموشی کو پسائی سمجھ کر زہر ہل مسکرائی

لبوں پر لاتے ہوئے بولیں۔ ”بالکل ٹھیک فیصلہ کیا آپ نے۔“ صاحبزادے کو

کرنے دیں من مانی۔ زندگی کی آسائش میسر نہ آئی۔ تو آجائیں گے راہ راست

پر۔ متوسط طبقے کی ضرورتوں اور حاجتوں اور محرومیوں کا مزہ چکھ ہی لیں۔

ملے تھے۔ ساری صورت حال اس کے گوش گزار کرنی تھی۔  
وہ چٹھی کے وقت کالج کے گیٹ پر تھی۔ جونہی شانہ باہر نکلی انہوں نے  
اسے اپنے ساتھ چلنے کا کہا۔

شانہ اتنے دنوں بعد انہیں دیکھ کر خوش تو ہوئی لیکن ان کا حلیہ اور انداز  
دیکھ کر قدرے گہرا بھی گئی۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ چلی گاڑی کی طرف آئی عثمان  
نے احوال پرسی کے سوا کوئی اور بات نہ کی۔

۔ بیٹھے۔ عثمان نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

شانہ خاموشی سے سیٹ پر بیٹھ گئی۔ عثمان دوسری طرف آئے دروازہ کھولا  
اور اپنی نشست پر بیٹھ کر گاڑی چلا دی۔

شانہ ان کی پریشان حالت دیکھ کر چپ سے پریشان ہو گئی۔ وہ اتنے دنوں  
بعد ملے تھے۔ کسی شوقی کسی لگن کا اظہار نہ کیا تھا۔ شانہ ان کے ساتھ آتو گئی تھی  
لیکن اب دل ہی دل میں ڈر لگنے لگا تھا۔ اس خوف کو دور کرنے کے لیے اس نے  
آہستگی سے کہا۔ "بہت دن لگا دیئے آپ نے۔"

۔ ہاں۔

۔ کب واپس آئے تھے۔

۔ دو ہفتے بعد آگیا تھا۔

۔ اور۔

۔ آپ سے ملنے نہ آسکا؟

۔ ہاں۔

۔ بس کچھ حالات ہی ایسے تھے۔

شانہ کو الجھن تو ہو رہی تھی۔ لیکن کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔

عثمان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھوں میں سرخ ڈور سے نمایاں تھے۔ لباس  
کی طرف سے بھی قدرے لا پر واہی برتی ہوئی تھی۔

دو ہفتے کی بجائے چار ہفتے بعد وہ شانہ سے ملے تھے۔ گھر کے حالات  
تناؤ کے اس درجے پر آچکے تھے۔ جہاں ٹوٹ جانے کا امکان یقینی تھا۔

ڈھیلوں کی طرح اس گھر میں رہ رہے تھے۔ روز زندگی تو بچ رہی تھی مگر  
دلوں نے عشرت بانو اور مراد علی تو ان سے کلام تک کرنے کے روادار نہ تھے۔

یہی حال فاختہ اور سائرہ کا تھا۔ ہاں عشرت بانو طنز کے پیر پور وار کرنے سے نہ  
چوکتی تھی۔ ان دیکھی لڑکی کو انہوں نے کیسے کیسے ذلیل نہیں کیا تھا۔ عثمان کا سب

کچھ برداشت کرتے کرتے دل برداشتہ ہو چکے تھے۔

تاخیر اب معاملات کو اور سنگین بنا دیتی۔ الجھاؤ بڑھتے ہی چلے جاتے۔  
وہ ہزار ختم ہو جاتی چاہیے تھی۔ اسی لیے بڑے سوچ و بچار کے بعد عثمان شانہ

میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ آپ میری پریشانیوں میں اضافہ نہ کریں۔ عثمان چھاؤں میں جاتے ہوئے بولے۔  
 "کچھ بتائیں بھی۔" شائے بھی پریشان نظر آنے لگی۔  
 عثمان بوٹ کے ٹو سے گھاس سلٹے رہے۔ پھر سگریٹ سلگایا۔ اور چوتھے پرایک پیر رکھ کر قدرے جھکتے ہوئے بولے۔ "شائے۔ میں نے جانے سے پہلے آپ سے کہا تھا۔"  
 "جی کہا تھا۔" شائے بے رنگ سی سگریٹ ہونٹوں پر لیے بولی۔  
 "ماما سے کچھ کہنے سے میں آپ سے سب کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"  
 کیا؟

عثمان نے سگریٹ کے تین کش لیے۔ اور پھر چوتھے پر شائے کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ سوکھی گھاس کے تنکے اکھیڑتے ہوئے بولے۔ "جب میں نے یہ بات کہی تھی نا۔"  
 "جی۔" وہ قدرے گھبرا گئی۔

"اس وقت پوزیشن اور تھی۔" عثمان پھینکی سی سگریٹ سے بولے۔ چند لمبے رکے۔ شائے کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔  
 "ہاں شائے۔" اس وقت میں نواز زادہ عثمان علی خان تھا۔ وہ بچیدگی سے بولے۔

"اور اب۔" شائے کے ہونٹ تک بے رنگ ہو گئے۔

"اب صرف عثمان ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"میں سمجھی نہیں۔" اس کے ہاتھ پاؤں سنسنار ہے تھے۔

"شائے۔ میں اب ایک عام سا آدمی ہوں۔" انہوں نے اک گہری ٹھنڈی آہ

راستہ خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔ گاڑی شاہراہ سے چھوٹی سڑک پر اتر آئی تھی۔ اور اب شہر سے باہر جا رہی تھی۔ تین چار میل آگے جانے کے بعد عثمان نے گاڑی سڑک سے نیچے اتار دی۔ اور ایک ہموار جگہ پر روک دی۔  
 یہ خاموش اور سناں جگہ تھی۔ کہیں گنے درختوں کے جھنڈ تھے کہیں جھاڑیاں اگی تھیں۔ کہیں سرکٹڑے تھے۔ چھوٹے بڑے پتھر تھے۔ بے نیچم سے زمینی کٹاؤ تھے۔ کوئی سیرگاہ نہیں تھی۔ نہ ہی تفریح کے لیے موزوں جگہ۔  
 شائے گاڑی سے نکلنے میں کچھ لمپ و پیش کیا۔  
 "آجائیے۔" عثمان سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے۔  
 شائے باہر نہیں نکلی۔ عثمان نے دو تین دفعہ امر کیا۔

"بس ٹھیک ہوں یہاں ہی۔"  
 گرمی ہے۔ باہر آجائیے۔ یہاں سناں ہے۔ درختوں تلے موسم اچھا ہے۔  
 وہ عثمان کو دیکھنے لگی۔ جو بے تحاشا سگریٹ پھونک رہے تھے۔ چہرہ دیران دیران سا تھا۔ اور آنکھوں میں لال لال ڈھڑے نمایاں تھے۔  
 "آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔" شائے نے انہیں دیکھ کر کہا۔  
 "کچھ نہیں۔ بہت زیادہ ہوں۔" وہ بولے۔  
 "کیوں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"باہر آئیے وہاں بیٹھ کر بتاتا ہوں۔" عثمان نے گھنے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ جس کی چھاؤں ماتا کی سی ٹھنڈک لیے تھی۔  
 شائے پھر بھی باہر نہیں نکلی تو عثمان جھجلا گئے۔ غصے سے ڈانٹ کر اسے باہر آنے کا کہا۔

"شائے ڈر گئی۔ خوفزدہ سی ہو کر سہمی سہمی باہر آ گئی۔"

کی ہلکی ہلکی لڑش اپنے میں جذب کرتے ہوئے چپ رہے۔  
چند گھڑیاں اور گزر گئیں۔

پھر  
عثمان نے شائندہ کا سر کندھے سے اٹھایا۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں  
میں تھامتے ہوئے بولے۔ "بزدل کہیں کی۔ میری طرف دیکھ۔ کتنے طوفانوں کا  
مقابلہ کر رہا ہوں۔ شائندہ۔ ساری دنیا ایک طرف اور آپ ایک طرف۔  
میرے فیصلے کی آہنی چٹان سے جو بھی ٹکرائے گا اپنا سر ہی پھوڑے گا۔"  
شائندہ ان کے ہاتھوں سے چہرہ چھڑاتے ہوئے سر جھکایا۔  
"میں نے آپ سے حرف ہی پوچھنا تھا۔ کہ صرف عثمان آپ کو قبول ہے۔"  
وہ دھیرے سے مسکرائے۔ شائندہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔  
"ماما کے پاس میں آج شام آؤں گا۔ پہلے آپ اپنی مرضی سے آگاہ کر دیں۔"  
نہوں نے شائندہ کی ٹھوڑی کو اپنی انگلی کے سہارے سے اونچا کیا۔  
"کہئے۔ بندہ ناچیز منظور ہے۔"

شائندہ نے آنکھیں کھول کر عثمان کو دیکھا۔ خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے  
بُباری تھیں۔ عثمان کا جی چاہا ان آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب جائیں۔  
بے ہوشی کے لیے۔  
"منظور۔" عثمان بولے۔

شائندہ کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے پھر سر جھکایا۔  
"شکریہ۔" عثمان نے آگ گہری سانس لی۔ ان کے سر سے بوجھ اتار گیا۔  
"میں سے نظر آنے لگے۔ پھر انہوں نے سگریٹ سلگایا۔ اور اٹھ کر بیٹھنے لگے۔  
میں آج شام ماما کے پاس آؤں گا۔ میں اب حالات کی تندہی اور تلخی

بھری۔ مجھے اب حضور نے عاق کر دینے کی دھمکی دی ہے۔ اور یقیناً عاق بھی کر دیگی۔  
جی۔ شائندہ کی آنکھیں پٹی پٹی تھیں۔ اس کا حلق سوکھنے لگا تھا۔ وہ کچھ  
بھی سمجھ نہ رہی تھی۔

"شاید آپ سمجھی نہیں ہیں میری بات۔"  
"اس نے سرفی میں ہلا دیا۔"

آپ ایک عام سے انسان کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

شائندہ حرف آنکھیں کھولے عثمان کو تک رہی تھی۔

عثمان نے شائندہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بڑی ملائمت سے اپنا ہاتھ  
اس کے نرم دگلاز ہاتھ پر پھیرتے ہوئے دھیرے سے بولے۔ شائندہ اب حضور  
میری شادی اپنے عزیزوں میں کرنا چاہتے ہیں۔ میری امی کمپن میں فوت ہو  
گئی تھیں۔ دوسری امی اپنی بیٹی جی لانا چاہتی ہیں۔"  
شائندہ کی سانسیں الجھنے لگیں۔ بے اختیار سوچ کر اس نے عثمان کے ہاتھ کو  
مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"لیکن۔" عثمان نے اپنا بازو شائندہ کے گرد لے جاتے ہوئے اسے اپنے  
قریب کرتے ہوئے کہا۔ شائندہ آپ میری جان میری زندگی اور میری خوشی ہیں۔  
میں آپ کے بغیر کسی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ دو ہفتے سے گھر میں جیسے طوفان  
اٹھا ہوا ہے۔ والد صاحب مانتے ہیں۔ نہ امی۔ نتیجہ یہی نکلتا تھا۔ کہ وہ مجھے عاق  
کر دیتے۔"

عثمان۔ شائندہ نے بے اختیار سوچ کر سر عثمان کے کندھے پر ڈال کر آنکھیں  
بند کر لیں۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیجنے لگے۔ اور اس کا عثمان کے مضبوط  
بازو کے حلقے میں آیا ہوا وجود ہولے ہولے کانپنے لگا۔ عثمان اس کے وجود



کیسے عظیم تھے وہ۔

شائندہ کے دل میں محبت تلاطم پاکر رہی تھی۔ عقیدت سے دل لبالب پیمانے کی طرح چمک رہا تھا۔ اور جہاں باقی کیفیت کے ان نازک لمحوں میں اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ ڈیڑھی اور ماما اگر کسی طور عثمان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ بھی ہو سکے۔ تو وہ عثمان کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار ہو گئی۔ وہ اس دوسرے پر کان کھڑی ہوئی تھی۔ جہاں ایک طرف راہیں عثمان کی راہوں سے ہتی تھیں۔ اور دوسری طرف والدین کی رضامندی کی طرف جاتی تھیں۔ اس نے عثمان کی راہوں پر چلنے کا اہل فیصلہ کر لیا۔

کچھ دیر دونوں وہیں گھومتے پھرتے رہے۔ شائندہ نے اپنے سے اپنی باتوں سے عثمان کو ہر طرح سے یقین دلادیا۔ کہ اس نے اپنی زندگی کا ساتھی چن لیا ہے۔ اور اب اس کے بڑھے قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔

”واقعی شائندہ“ عثمان بے تابی سے بولے۔

”جی“ اس نے مستحکم آواز میں کہا۔ میں ہر قدم پر آپ کا ساتھ دوں گی۔

”اوہ۔ میری زندگی“ انہوں نے شائندہ کو بازوؤں میں لے کر کہا۔

شائندہ نے ان کے سینے سے سر لگا دیا۔

سے تنگ آچکا ہوں جو ہونا ہے ہو ہی جائے۔ وہ بولے۔

شائندہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

عثمان ٹپکتے ہوئے شائندہ کو اپنے گھر میں حالات بتاتے رہے۔ شائندہ چپ بیٹھی سنتی رہی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ حالات نے جو موڑ لیا تھا۔ کیا خبر ماما اور ڈیڑھی کے لیے قابل قبول ہو گا بھی کہ نہیں۔ اور وہ عثمان کے حتی میں فیصلہ دے بھی سکیں گے کہ نہیں۔

اما حضور کی حیثیت خاندان میں مطلق العنان بادشاہ کی سی ہے۔ ان کے فیصلے کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی۔ وہ جو بات کہہ دیں تمہارے لیے لکیر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں وہ دل کے کھوڑ نہیں اگر میری اپنی امی زندہ ہوتیں۔ تو یقیناً اما حضور کے فیصلے میں لچک کی گنجائش ہوتی۔ اب معاملہ اور ہے۔ دوسری امی بھی میرے ساتھ برا سلوک شاید نہ کرتیں۔ لیکن معاملہ ان کی بھتیجی کا ہے۔ انہوں نے میرے انکار کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔

شائندہ اسی انداز میں بیٹھی رہی۔

عثمان اپنے اہل خانہ کے ہاتھوں لہو لہان جذبات شائندہ کے سامنے

بجھرتے رہے۔

شائندہ کو عثمان کی حالت قابل رحم لگ رہی تھی۔ صرف اس کی خاطر وہ والدین بجائے بہنوں اور گھر بار سے منہ موڑ رہے تھے۔ لاکھوں کروڑوں کی جائیداد پر لات مار رہے تھے۔ آسائش کی پرست زندگی چھوڑ کر کھول کی راہ پر گامزن ہونے کو خندہ پیشانی سے قبول کر رہے تھے۔

کتنے بلند

”واہ جی“

ماما نہنٹس پٹیں۔ سردار علی نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو بولیں: ”آپ کس زمانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ شائد مجھ سے دوستوں کی طرح بے تکلف ہے۔ میں خود اس سے پوچھ لوں گی۔“

”اچھی بات ہے۔“

ماما اور سردار علی کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کبھی پلان بناتے۔ کبھی بیٹی کو جہا کر کے خیال سے اداس ہو جاتے۔

”نچھے تو اب محسوس ہوا ہے۔ کہ اپنی کچی مجھے کتنی عزیز ہے۔ جانے دل کو کیا ہونے لگتا ہے جب سوچتا ہوں۔ کہ شائد چلی جائے گی۔ قدرت کا بھی عجیب ہی نظام ہے۔ وہ بولے۔“

”دنیا کا دستور ہی یہی ہے۔“ ماما بھی اداس نظر آنے لگیں۔ خوشی بھی ہوتی ہے رنج بھی۔

”اچھا جی۔ خدا مہارک کرے۔“

”شائد خوش رہے گی تو یہیں بھی خوشی ہوگی۔“

”بالکل۔“

”ہاں تو پھر کل میں ان لوگوں کو دعوت دے دوں۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“

معالج مشورے کافی دیر ہوتے رہے۔ غار فیہ گھر پہنچی تھی۔ اس کے

کانوں میں بھی باتوں کی جھنک پڑتی رہی۔ اسے ہول آرہا تھا۔ معاملہ تو آخری بچے پر جانپنا تھا۔ اور ادھر عثمان تھے کہ پلٹ کر کٹے ہی نہ تھے۔ شائد بھی اس نسل میں ماما سے کچھ کہنے نہ دیتی تھی۔

”پھر کیا کیا جائے۔“

”کرنا کیا ہے ہاں کر دو۔“

”یوں کرتے ہیں۔ کہ کسی دن ان لوگوں کو دعوت پہ بلا لیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ جب فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ تو پھر جیسے چاہیں کر لیں۔ رشتے

کے بارہ میں تو ہر طرف سے تسلی ہو ہی گئی ہے۔“

”وہ لوگ شائق بھی تو بہت ہیں۔ ہر روز فون آتا ہے یکم اشرف کا۔ دو تین

دفعہ ابھی بھی ہیں۔“

”بس ٹھیک ہے۔ ہاں شائد کے علم میں بھی تو ہے ماساری بات؟“

”ضرور ہوگی۔ اس کے سامنے ہی تو ساری باتیں ہوتی ہیں۔ پھر کچی ہے

ابھی۔ اسے کیا اعتراض ہوگا۔ اس سے اچھا رشتہ تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”پھر بھی اس سے پوچھ ضرور لینا۔ غریب سے کہہ دینا پوچھ لے گی۔“

”پھر تیری سوچ پاگل پن کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارا ان کا کیا مقابلہ۔ دو  
پارہ دفعہ گھر کیا آگئے کہ تو خواب ہی دیکھنے لگی۔  
اور جو خواب پورے ہو گئے تو۔“

”میں تیری طرح نا پختہ ذہن نہیں ہوں۔ پر دیکھ کر ہی اڑا ان کرتی ہوں۔  
اونھ۔ آپ تو جانے کیا ہیں ماما۔ میں نے کہا نا۔ کہ وہ۔“  
”کیا۔؟“

”وہ شائے کے لیے پرویز ل دیں گے۔“  
”تجھے کس نے کہا۔ یا یونی کہے جا رہی ہے۔“  
”جو کچھ سمجھ لیں۔“

ماما حیرانچی سے اس کا منہ سمجھنے لگی۔ وہ مسکرائے جا رہی تھی۔ ماما نے دوبارہ  
پوچھا۔ ”یہ بات تو نے کس بنا پر کہی ظریفہ۔“  
”عثمان پر پرویز ل دیں گے ماما۔“

”اوہ خداوند!۔“  
”خدا کی قسم سچ کہتی ہوں۔ وہ جاپان گئے ہوئے ہیں والپس پر آئیں گے آپ کے  
پاس۔“

ماما کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انہیں ظریفہ کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا  
لیکن یقین نہ کرنے کی بھی بات نہیں تھی۔  
وہ عجیب کی کشمکش میں مبتلا ہو گئیں۔

”آپ ابھی منشا شرف کا کوئی جواب نہ دیں ماما۔ یہ نہ ہو کہ آپ ادھر ہاں کر دیں  
اور عثمان۔“

”مجھے تو تیری باتوں کی سمجھ نہیں آرہی۔“

لیکن آج اس نے تہیہ کر لیا۔ کہ وہ سب کچھ ماما کو بتا دے گی۔ شائے ابھی  
تک کالج سے واپس نہ آئی تھی۔ موعدا اچھا تھا۔  
سردار علی کے باہر جانے کے بعد ماما کہیں میں آئیں۔ تو ظریفہ وہیں کھڑی تھی۔  
آج اس نے ماما سے کیسی افغان ڈش بنائی تھی۔  
”ماما۔“

”ہوں۔“  
”سنا ہے آپ کسی دعوت کا اہتمام کر رہی ہیں۔“  
”ہاں منشا شرف وغیرہ کو بلانا ہے۔“  
”کیوں۔“

”بھئی اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ہاں کر دیں۔ اس سے اچھا رشتہ کہاں  
ملے گا۔“  
”ماما۔“

”جو اس سے اچھا رشتہ بھی آجائے تو۔“  
”کیا مطلب؟“  
”ماما۔ عثمان علی خان بھی اپنا پرویز ل دے دیں تو۔“  
”کیا۔“

ماما نے حیران ہو کر تقریباً چہینے ہوئے کہا۔ پھر ہنس پڑیں۔ پگلی۔ یہ  
تجھے کیا سوچھی۔“

”بس سوچھ گئی۔ اتنے اچھے ہیں وہ۔“  
”اچھے ہونے میں کیا شک ہے۔ لیکن جانتی ہے وہ کون ہیں۔“  
”جانتی ہوں۔“

لیکن

یہ سب کچھ اتنا کچھ تھا۔ کہ ماما کا اپنا آپ اس کے سامنے کچھ نہیں تھا۔  
بے شک شائندہ کو قدرت نے حسن و جمال فراخ دل سے بخشا تھا۔ ماما نے اس  
کی تربیت بھی نہایت عمدہ کی تھی۔ اور گو ماما کا خاندان بھی افغان شاہی خاندان  
سے قریبی نسبت رکھتا تھا۔ پھر بھی اس وقت وہ لوگ متوسط طبقے کے لوگ تھے  
جس کے پاس لمبی چوڑی جائیدادیں تھیں۔ رجھاری بنک بلین۔ گذر اوقات اچھی  
ہو جاتی تھی۔ اتنا ہی تھا کہ متوسط طبقے سے نکل کر اونچے طبقے میں ملنا ملنا ہوتا تو سفید  
پوشی کا بھرم قائم رہتا تھا۔

شائندہ کوئی دد گھٹنے لٹ کالج سے آئی۔ تو سرشار سی نظر آرہی تھی۔ آنکھوں  
میں جیسے نشہ گھل رہا تھا۔ چہرہ تہما رہا تھا۔ اور سنہری ہونٹوں پر ہونٹیں ہونٹیں تھیں۔  
وہ کبھی کبھی نوٹس لینے اپنی سیلی کے ہاں کالج ہی سے چلی جایا کرتی تھی۔ کبھی  
بس بس ہو جاتی تو بھی لیٹ پٹپٹا کرتی تھی۔ ماما نے آج بھی سرسری طور سے پوچھا۔  
بس نہیں ملی تھی یا سعدیہ کے ہاں چلی گئی تھیں۔  
شائندہ گول مول سا جواب دے کر اپنے کمرے میں آگئی۔

کتا میں میز پر جھینک کر وہ بیئر پر آڑی پڑ گئی۔ وہ بے حاشوش نظر آرہی تھی۔  
چپ تھی لیکن انگوٹوں کی گنگناہٹ اس کے وجود سے موسم پہلی بارش کے شفاف  
قطروں کی طرح ٹپک رہی تھی۔

ظریفہ کمرے میں آگئی۔ تو وہ اٹھ بیٹھی۔

شائندہ باجی۔ اتنی دیر لگا دی آج۔ اس نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

جواب دینے کی بجائے وہ اٹھی۔ اور ظریفہ کے گلے میں بانیں ڈال کر اُسے  
دو تین چکر دے ڈالے۔

عثمان صاحب کی دلہنی کا انتظار کرنا چاہیے۔

ماما کچھ زبولیں۔ تو ظریفہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ شائندہ باجی بھی اپنا فیصلہ  
عثمان کے حق میں دیں گی۔

کیا کہہ رہی ہو ظریفہ۔

سب کچھ تو بتا دیا ہے۔ آپ سمجھ جائیں نا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ماما  
ششدر سی کھڑی تھیں۔ ظریفہ نے دھیان بٹانے کو اپنی تیار کی ہوئی ڈش ماما کو دکھائی  
اور بولی۔ دیکھیں ماما۔ ذرا چکھیں ٹھیک بنا ہے سالن۔

ماما نے بے منی سی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ کھلکھلا کر سنس پٹری ماں کے  
قال پر پیار کرتے ہوئے بولی۔ عثمان سے اچھا رشتہ بھی کوئی ہوگا ماما۔؟  
تو نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔

کیوں۔ پریشان کر دیا ہے یا خوش۔

پتہ نہیں۔ ماما نے پریشانی مٹا سرت سے ہاتھوں کو جنبش دی۔ سر ہلایا اور آہنگی  
سے بولیں۔ تو پھر ان لوگوں کو ابھی دعوت نہ دی جائے۔

بالکل بھی نہیں۔ بلکہ جواب ہی دیدیں۔ ظریفہ بے حاشوش نظر آرہی تھی۔

ماما سوچ میں ڈوب گئیں۔ اچھا خاصا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ عثمان اور شائق کا مقابلہ  
ہی کیا تھا۔ جہاں تک اخلاق کا تعلق تھا۔ عثمان سے وہ کئی بار مل کر اس کی معترف ہو  
چکی تھیں۔ صورت شکل اور شانہ و وقار کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ کسی خواہوں  
کے دل میں کے شہزادے سے کیا کم تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اس کے علاوہ  
خاندانی لوا بہ تھے

کیا بات ہے۔ ظریف نے قدم روکتے ہوئے اس کی بانیں گلے سے نکال کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

بوجھ بھلا۔ وہ مسکرائی۔

عثمان واپس آگئے۔ ظریف نے فوراً کہا۔

ہاں۔ وہ واپس آگئے ہیں۔ آج۔ آج ماما کے پاس آئیں گے۔

وہ سرخوشانہ انداز میں بولی۔

ظریف کو شرارت سوچی منہ لٹکاتے ہوئے پھرے پر اداسی مسلط کرتے ہوئے بولی

اب کیا فائدہ۔

کیوں۔ شائندہ کا دل تھم گیا

ماما نے آج ہی ان لوگوں کو ہاں کر دی۔ ظریف نے کہا۔

ظریف۔ شائندہ بے اختیار سو کر چیخی۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور جسم کا پٹنہ

لگا۔

ظریف ڈر گئی۔ جلدی سے بن کے گلے میں بانیں ڈال کر چھوڑتے ہوئے بولی۔

وہ عادیں مجھے۔ میں نے پچالیا آپ کو۔

ظریف۔ میں مذاق برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ صریح بات کرو۔ وہ نڈھال

سی ہو کر لپٹک پڑ بیٹھ گئی۔

ظریف نے جلدی سے ساری بات اسے بتادی۔ شائندہ کی جان میں جان آئی

مکراتے ہوئے بولی۔ تو نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔

آپ تو مانتی ہی نہیں تھیں۔ عثمان کے آنے سے پہلے ماما کو کچھ بتا دوں۔

وہ تو میں ہی ایک دم اتنی عقلمند ہو گئی۔ جو سنبھال لیا معاملہ۔ ورنہ۔ گئی

تھیں آپ۔ یہ صریح امریکی۔ ظریف نے چھیڑا۔

اوں ہوں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تنکھم آواز میں بولی۔

ماما ہاں کر دیتیں۔ تو پھر۔

پھر میں انکار کر دیتی۔

اور جو عثمان بھی نہ آتے تو۔

کیوں نہ آتے۔

اور جو۔ اتنا زعم۔

بالکل۔

ویسے شائندہ باجی۔ مجھے عثمان پہلے دن ہی بہت اچھے لگے تھے۔ میں

نے دعا کی تھی۔

چل چھوٹی۔

سچی۔

چل ہٹ باتیں پھر نانا۔ کھانا نہیں دینا۔ روز کی بھوک لگی ہے۔

کچن میں ہی آجانیے۔ میں آپ کے لیے کھانا نکالوں گی۔ آپ مجھے ساری

باتیں بتائیں۔

کونسی باتیں۔

دہی جو آج ہوئی ہیں۔ دو گھنٹے آپ لیٹ یونہی تو نہیں آئیں۔ ظریف

نے شوخی سے آنکھیں پچاتے ہوئے کہا۔

چل ہٹ۔ بس نہیں ملی تھی دیر ہو گئی۔

اور عثمان کے آنے کا الہام ہو گیا۔ شام گھر بھی آئیں گے یہ پیغام آپ کو

ہواؤں نے دیا۔

یہی سمجھ لو۔ شائندہ تھوڑے سے مسکرائی۔ تاہم بہت سے راز اگل دیئے۔

کرتے اور پھر کھیل میں لگ جاتے۔

ظریفہ اور شائندہ بھی چپن ہی میں تھیں۔ بوگن دیلیا کی باڑ کے پاس دونوں کھڑی تھیں۔ سراپا انتظار تھیں۔ عثمان نے ماما کے پاس آنا تھا۔

ظریفہ شائندہ سے پوری رپورٹ لے چکی تھی۔ اسے کچھ خدر شے بھی محسوس ہو رہا تھا۔ کیا عجب ماما پر پوزل رد کر دیں۔ ماں باپ کی عدم موجودگی میں رشتہ کرنے میں راضی ہی نہ ہوں۔ پھر عثمان کے عاق ہو جانے کی صورت میں ان کی بلزیشن بھی ایسی ہو جاتی تھی۔ کہ سوچنا ضروری محسوس ہوتا تھا۔

ظریفہ یہ خدر شے محسوس کر رہی تھی۔ لیکن شائندہ سے اس نے اظہار نہیں کیا۔ شائندہ بڑی مطمئن اور مسرور تھی۔ اس نے جو فیصلہ کر لیا تھا۔ اس پر پوری طرح قائم تھی۔

شائندہ نے دور ہی سے عثمان کی گاڑی دیکھ لی۔ تو اس کے گالوں پر شفق ہوٹ پڑی۔ اس کی نظروں کا تعاقب ظریفہ نے کیا۔ تو بے اختیار نہ بولی۔ وہ آگئے۔

ہاں۔ شائندہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے کی طرف گئی۔

کہاں جا رہی ہیں۔ ظریفہ نے پوچھا۔

اندر۔

کیوں۔

بس۔

ظریفہ اس کے پیچھے دوڑی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ عثمان آ رہے ہیں۔ اور آپ اندر بھاگی جا رہی ہیں۔ وہ ماما کے پاس آ رہے ہیں۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ دوپہر خاصی گرم تھی۔ لیکن اب موسم قدرے بہتر تھا۔ ہلکی ہلکی نیم گرم ہوا چل رہی تھی۔ سبزے اور درختوں کی وجہ سے نیم گرم ہوا بھی خوش گوار محسوس ہو رہی تھی۔

لان میں گھنے پڑیلے کر سیاں کچھی تھیں۔ میز پر کچھ رسالے اور اخبار تھے سردار علی خان کے دو تین دوست آئے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی وہ سب اٹھ کر گئے تھے۔ انہیں بھی ساتھ ہی لے گئے تھے۔ ان کے جاتے ہی جمی اپنا فٹ بال لے کر آگئے تھے۔ برابر والی کوٹھی سے دوستوں کو بھی بلایا تھا۔ اور کھیل پورے زور و شور سے شروع کر دیا تھا۔

ماما روش پر جھکی تازہ کھلنے والے پھول دیکھ رہی تھیں۔ وہ دو تین بار پھول کو بال کھیلنے سے منع کر چکی تھیں۔ فٹ بال جس روش یا کیماری پر بھی آکر گرے تا نو زائیدہ پھولوں کو مسل دیتا۔ بچے تھے باز کہاں آتے۔ ماں سے معذرت

”لیجئے۔“ عثمان نے ماما سے ہال کے کمرے کی طرف اچھال دیا۔ سب بچے ہال کے کمرے میں سے بھاگ گئے۔

”ظریفہ کرسیاں درمیان میں لے آؤ۔“ ماما نے ظریفہ سے کہا۔

لیکن اس کے جانے سے پہلے ہی عثمان بڑھ کر دو کرسیاں ادھر لے آئے اور دو گھسیٹ لائی۔

”تشریف رکھیے۔“ عثمان نے ماما سے کہا۔

”آپ بھی بیٹھیے۔“ ماما بیٹھتے ہوئے بولیں۔

عثمان کرسی قدرے پیچھے ہٹا کر ظریفہ سے بولے۔ ”آئیے آپ بھی۔“

ظریفہ کے بیٹھنے کے بعد وہ بھی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”بہت دنوں بعد آئے آپ۔“ ظریفہ نے کہا۔

”کچھ کاروباری مصروفیات تھیں۔“ وہ بولے۔

”جاپان گئے ہوئے تھے نا۔“ وہ بولی۔

”ہاں۔“ عثمان اس کی آنکھوں کی شوخی سے کچھ خفیف ہو گئے۔ انہیں یاد

کرنے میں دیر نہ لگی۔ کہ شائستہ نے ظریفہ کو ہر بات بتا دی ہوئی ہے۔

ماما جاپان کے سفر کے متعلق سوالات کرنے لگیں۔ جن کا جواب وہ

بڑے شائستہ انداز میں دیتے رہے۔

”آپ نے تو ساری دنیا دیکھ رکھی ہے شاید۔“ ظریفہ باتیں سننے کے بعد

بولی۔

”نہیں۔“ اسٹریلیا نہیں دیکھا۔ روس کبھی نہیں گیا۔ چین سے بھی نا آشنا

ہوں۔“ وہ مکرانے۔

”اس کا مطلب ہے باقی سب ممالک دیکھ چکے ہیں۔“

”ان کے آنے تک رکھے تو ہوں۔“ جب معاملے کی بات کریں گے اندر چلی جائے گا۔

”نہیں بھئی۔“

ظریفہ نے دیکھا شائستہ بڑی ندوس ہو رہی تھی۔ چہرہ ہمتا نے لگا۔ لیکن ٹھنڈے برف ہو رہے تھے۔

گاڑی جنگل کی اندرونی شرک پر آئی۔ تو شائستہ ہاتھ چھڑا کر اندر بھاگ

عثمان نے ماما کو لان میں دیکھا۔ تو گاڑی شرک پر ہی ایک طرف روک کر با

آگئے۔

ماما نے انہیں دیکھا۔ حسب عادت خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ آؤ

ان کا خیر مقدم بے ساختہ نہیں تھا۔ ماما کا دل ایک بار تو اچھلا تھا۔ اور

انہوں نے بھرپور نظروں سے عثمان کا جائزہ لیا تھا۔

سفید مٹائی کڑھائی کے ٹبل کے کرتے اور شلوار میں وہ وجاہت کا پیکر

لگ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ہمشیہ والی تازگی نہیں تھی۔ ہلکی سی پریشا

کا عکس صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔ شائستہ کا دل بھی دھک دھک

کمرہ تھا۔ آزمائش سے گزر رہے تھے۔ شائستہ نے تو سب کچھ سن کر بھی انہیں

قبول کر لیا تھا۔ کیا خبر ماما کا رویہ کیا ہوگا۔ وہ یہی سوچ رہے تھے۔

انہیں دیکھ کر ظریفہ بھی ادھر آگئی۔ سلام کرتے ہوئے اس کی خوبصورت

شوخی آنکھیں تراخ تراخ بول رہی تھیں۔

جی نے بھی انہیں آکر مؤدبانہ سلام کیا۔ ماما نے بچوں سے ہال لے لیا

اور انہیں کھلی طرف جا کر کھیلنے کی ہدایت کی۔ ”کوئی اور کھیل کیلئے جا کر“

”بال دے دیں ماما۔“ ادھر نہیں آئیں گے۔

اور۔ ماما نے پوچھا

”جی نہیں سکرے۔“ وہ بولے پھر کرسی پر پہلو بدلا۔ آگے کو جھکے۔ پھر پیچھے پھٹ گئے۔ ماما سے کچھ کہنا تھا۔ اس کے لیے موزوں الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔

”کیا بات ہے عثمان۔“ ماما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور ان کی شکل آسان کر دی۔ میں آج آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرنے حاضر ہوا ہوں۔ عثمان نے ماما کو دیکھ کر ہلکے سے ہنس دیا۔

”اما جان گئیں۔ لیکن تجا بلی عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولیں۔“ کہیے۔ ”مجھ نہیں آرہا کہ بات کیسے شروع کروں۔“ وہ کچھ خفیف سے ہنس رہے تھے۔ ماما ہنس پڑیں۔

”اما۔“ انہوں نے پہلی دفعہ انہیں ماما کہا۔ ماما کے دل میں متا کے جذبات ابل پڑے۔ جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے۔ قاعدے کے مطابق میرے بزرگوں کو آپ کے پاس چاہیئے تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے انفر دگی سے بولے۔

اما خوش رہیں۔

لیکن۔ میں۔ خود ہی آپ کی خدمت میں گزارش کرنے حاضر ہوا ہوں۔ وہ ہانڈاز میں بیٹھے ہوئے بولے۔

ہوں۔ ماما صرف اسی قدر کہہ سکیں۔

مجھے اپنا بیٹا بنا دیجئے ماما۔ انہوں نے جلدی سے یہ جملہ کہہ دیا۔

اما چپ رہیں۔ کئی لمحے عثمان سر جھکائے بیٹھے رہے۔ ان کا دل دھڑک تھا۔ اور امید و بیم کا مرحلہ بڑا تکلیف دہ تھا۔ ماما کے تاثرات کیا تھے۔ وہ رنکے۔

پھر جرات کر کے انہوں نے سر اٹھا کر ماما کو دیکھا۔ کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ کہ

”تقریباً۔“

ظریفہ مختلف ممالک کے متعلق ان سے پوچھنے لگی۔

کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ماما نے ظریفہ سے کہا۔ چائے بناؤ۔

جی نہیں سکرے۔ میں چائے نہیں پیوں گا۔

کچھ ٹھنڈا۔

ہاں ایک گلاس پانی۔

ظریفہ سکولیش لے آؤ۔

اچھا۔

ظریفہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ ہٹانے شانہ

کھڑکی باہر دیکھ رہی تھی۔

”بکو نہیں۔“ شانہ اس کے ساتھ ہی اندر چلی گئی۔

سکولیش اس نے ملازم کے ہاتھ بھجوادیا۔ جانتی تھی وہ ماما سے کچھ راز کی

باتیں کریں گے۔ اس لیے قصداً باہر نہیں گئی۔ شانہ ہی کو چھڑتی رہی۔

”اے سکولیش! نا کہ گلاس عثمان کو پیش کیا۔ عثمان نے شکریہ کہہ کر گلاس

لیا اور آہستہ آہستہ سب کرنے لگے۔ ماما نے بھی اپنا گلاس اٹھالیا۔ اور خاموشی سے

پینے لگیں۔

کئی لمحے بڑی بوجھل سی خاموشی رہی۔

عثمان کچھ عجیب رہے تھے کہ خیال سے بار بار اس ہورہے تھے۔ کہ یہ ظریفہ

ان کے والدین کو انجام دینا چاہیئے تھا۔

انہوں نے گلاس میں چند گھونٹ سکولیش کے چھوڑ دیئے۔ گلاس ٹرے پر رکھا

سے واپس رکھ دیا۔



بھی شائے متعارف نہ ہو پائے گی۔

لیکن

پھر بھی ماما کے ذہن میں بہت سے دوسرے تھے۔ خوف تھے ڈر تھے۔ جن کا انہوں نے اظہار تو نہیں کیا۔ لیکن ذہن میں یہ سب رنگنے لگے۔

میری گزارش کا کچھ تو جواب دیں ماما۔ عثمان نے ماما کی گھیر چپ سے مایوس ہوتے ہوئے پوچھا۔

ماما بھی کسی مسئلہ سمیٹ لبوں پر لے آئیں۔ اور بولیں۔ مجھے تو خود سمجھ نہیں رہی کہ کیا جواب دوں۔

پھر بھی۔

عثمان کیا یہ بہتر نہیں ہوگا۔ کہ آپ اپنے والدین کی رضامندی حاصل کریں۔ عثمان نے کسی کی پشت پر سر ٹکاتے ہوئے آسمان میں اڑنے والے پرندوں کو دیکھتے ہوئے آزرہ لہجے میں کہا۔ میں اپنی طرف سے ہر کوشش کر چکا ہوں۔ وہ رضامند نہیں ہوتے۔

انسوس سے کھٹا پڑتا ہے۔ کہ وہ آج کے دور میں بھی روایت پسند اور اد پرچ کے فائل ہیں۔

یعنی وہ ایک عام سی لڑکی کو اپنے خاندان میں شامل کرنے کو کسی صورت تیار ہوں گے۔

عثمان نے گھر اگر ماما کو دیکھا اور جلدی سے بولے۔ اسی لیے میں نے گھر بار والدین خاندان سب کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

ماما چند لمحے چپ رہیں۔ پھر بنجیدگی سے بولیں۔ یہ اچھی بات نہیں۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔

ان کی بات انہیں گراں گذری ہے یا اچھی لگی ہے۔

میری والدہ حیات نہیں ہیں۔ عثمان نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ اور پھر سوتیلی ماں ان کی پیچھی اپنے باپ سب کے متعلق ماما کو بتا دیا۔ ماما کا چہرہ رنگ بدل رہا تھا۔

ابا حضور مجھے عاق کر دیں گے۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں زندہ رہنے کے لیے تنگ دود کر سکتا ہوں۔ میرے پاس لاڈ کی ڈگری ہے۔ میری چھوٹی سی بزنس بھی چل رہی ہے۔ جرمنی میں کچھ کاروبار ہے۔ یہاں میں کار بالک گیس فیکٹری بنوا رہا ہوں۔ ابا حضور نے سرمایہ روک بھی لیا جب بھی میں اسے کسی نہ کسی طور مکمل کر ہی لوں گا۔ میری مرحومہ امی کی زمین۔ بنک میں پیسہ اور بہت سے ٹیکسٹ میرے نام ہیں۔ میں شائے کے شان شایان مقام انہیں دوں گا۔ میں نے بے شمار لڑکیوں میں سے ان کا انتخاب کیا ہے۔ ماما۔ آپ مجھے مایوس نہ کیجئے گا۔

ماما سر جھکائے ان کی باتیں بڑی بنجیدگی سے سن رہی تھیں۔

والدین کی طرف سے سب راہیں میرے لیے بند ہو چکی ہیں۔ آپ نے بھی راستے بند کر دیئے تو یقین کیجئے گا ماما۔ زندگی میرے لیے بیکار ہوگی۔

ماما کرسی میں کسی مرمی کی طرح پڑی تھیں۔ عثمان۔ ان کا حسب و نسب سوسائٹی میں مقام۔ شخصیت حیثیت سبھی کچھ ٹھیک تھا۔ لیکن والدین کی ناراضانہ سے رشتہ کرنے والی بات سوچ طلب تھی۔

عثمان نے انہیں ہر طرح سے یقین دلایا۔ کہ عاق ہو جانے کے باوجود وہ شائے کے لیے زندگی کی ہر کسانش بہرہ رت مہیا کریں گے اور اس کے لیے انہیں دن رات محنت بھی کرنا پڑی تو گمراہ نہیں کریں گے۔ مالی دشواری جیسی کسی شے سے

عثمان اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماما بھی اٹھ بیٹھیں۔

”ماما“ عثمان نے پورے خلوص سے کہا۔

”جی“

”میں نے جو کچھ کہا ہے آپ بنجیدگی سے غور کریں۔ میں آپ کو تبادول کر شائد میرا پہلا اور آخری انتخاب ہے۔ آپ نے انکار کر دیا تو۔ تو۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ۔“

وہ چپ ہو گئے۔

ماما نے ان کی بے کلی اداسی اور پریشانی کو پورے طور سے محسوس کیا۔ جلدی سے بولیں۔ ”آپ چند روز انتظار کریں۔ میں اور شائد کے ڈیڈی سوچنے کے لیے کچھ وقت ضرور چاہیں گے۔“

”میں انتظار کروں گا۔ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔“ ہفتہ دو ہفتے بتی دیر آپ کہیں۔“

ماما نے اثبات میں سر ہلایا۔

”شکریہ“ عثمان نے اداس اور پشیمردہ لہجے میں کہا۔ اور پھر ماما سے اجازت ہائی۔

ماما ان کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔ ”آپ کا پروفونزل آنا اچانک اور سائل سے الجھا ہوا ہے۔ کہ میں ذہنی طور پر تیار ہونے کے لیے وقت ضرور لے گا۔“

”میں آپ کا ممنون احسان ہوں۔“

”بہر حال چند دنوں تک آپ کو مطلع کر دیں گے۔ ماما نے کہا۔“

عثمان عقیدت سے ان کی الٹی تھیلی پر بوسہ دیا۔ خدا حافظ کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔

”لیکن“

”جی“

”ہم یہ رشتہ کبھی دیں۔ تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر آپ کے والدین رضامندی دے دیتے تو میرے خیال میں ہمارے لیے امتزاض والی کوئی بات نہ تھی۔“

لیکن۔ اب۔“

”ماما۔“ عثمان نے حرف اسی قدر کہا۔ الفاظ ان کے حلق میں اکٹھے ہو گئے۔ انتہائی مایوس اور بے انتہا پریشان نظر آنے لگے۔ سخت ذہنی کوفت میں مبتلا تھے۔ بار بار آنکھیں سختی سے میچ لیتے۔ یوں لگ رہا تھا اذیت ان کی برداشت سے باہر ہے۔

کئی لمحے خاموشی رہی۔

پھر

ماما بولیں۔ ”شائد کے لیے دو تین رشتے اور بھی آ رہے ہیں۔ بہر لحاظ سے عثمان آپ کو ان پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن مسئلہ یہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ کہ آپ کے والدین اس رشتے پر راضی نہیں۔ لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔ ہماری پوزیشن کیا ہوگی۔ آپ کے والدین ہمارے اور ہماری بیٹی کے متعلق کتنی غلط رائے قائم کریں گے۔“

عثمان نے دکھ بھری نظروں سے ماما کو دیکھا۔ ”شاید اپنی بھجور آپ ٹھیک سوچ رہی ہیں۔ لیکن میں جو قدم اٹھا چکا ہوں۔ وہ پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ آپ مجھے مایوس بھی کر دیں تو بھی والدین سے مصالحت نہیں ہوگی۔ میں وہ نہیں کر سکتا جو

وہ چاہتے ہیں۔“

ماما ان کے عزم سے متاثر نہ ہوئیں۔

”پھر ماما اور ڈیڈی اتنی لمبی کجھوں میں کیوں اُلجھے ہوئے ہیں۔“  
 ”لوگوں سے ڈرتے ہیں۔“  
 ”بس۔“

”ہاں۔“  
 ”لیکن تم نے بتایا تھا۔ کہ ماما اور ڈیڈی کی بھی کو میرج تھی۔“  
 ”ہوں۔ تھی۔“  
 ”پھر۔“

”لیکن ان کا معاملہ مختلف تھا۔“  
 ”کیسے۔“

”دونوں کے والدین کو ان کی نند کے سامنے جھکنا پڑا تھا۔ شادی ماں باپ  
 نے کی تھی۔“  
 ”اوہ۔ خدایا۔ مجھ سا بد قسمت انسان شاید کوئی نہ ہوگا۔“  
 ”خدا نہ کرے۔“  
 ”نظر تو ایسا ہی آتا ہے۔“  
 ”گہرا لگئے۔“

”جو صلہ اس بری طرح آزمایا جا رہا ہے شائے۔ گہرا نہ جاؤں۔ تو ادھر کیا  
 کروں۔ ان دنوں مجھے اپنی ماں شدت سے یاد آتی ہیں۔“  
 ”میں اسی لیے تو مایوس نہیں ہوں۔ کہ میری اپنی ماں ہیں۔ اور وہ اپنا فیصلہ  
 کرتے ہوئے مجھے نظر انداز نہیں کریں گی۔“  
 ”مجھ سے اب انتظار نہیں ہو سکتا۔“  
 ”ماما سے آپ نے ہفتے دو دنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور آج تو صرف چار دن

.. شائے ..

.. جی ..

.. معاملہ کہاں تک پہنچا ہے ..

.. دورا ہے پر ..

.. وہ تو پہلے دن ہی تھا ..

.. بس روز ہی بحث ہوتی ہے ..

.. میرے حق میں ..

.. کبھی حق میں کبھی مخالف ..

.. انجام کیا ہوگا ..

.. اچھا ہی ہوگا ..

.. یقین ہے ..

.. ہاں ..

ہی گزرے ہیں۔

”یہ چار دن چار صدیاں لگ رہی ہیں۔“

”لگنی تو نہیں چاہئیں۔“

”کیوں۔“

”آپ روز ہی تو کالج سے اڑا لاتے ہیں مجھے۔“

”یہ تو صبر کی اور بھی آزمائش ہوتی ہے۔ میں اب آزمائشوں سے نکل آنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنا کر زندگی سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔“

شانہ مسکرا دی۔

شہر سے باہر جموں دی میدانی علاقے میں بڑی سست رفتاری سے ہتی تھی۔ اس کے کنارے بڑے سرسبز اور شاوا ب تھے۔ گھنے درختوں کے خوش گوار ساٹھ اس موسم میں راحت بخش تھے۔ پانی بڑی روانی سے بہتا تھا۔ اور اس کے بہاؤ سے چھو کر ہوائیں نم آلودی ہو جاتی تھیں۔ درختوں کے سالیوں تلے یہ ہوائیں بڑی نرم بخش فضا پیدا کرتی تھیں۔

عثمان اور شانہ ایک گھنے درخت کے خوش گوار چھاؤں تلے بیٹھے تھے۔ خود رو گھاس اور نرم آلودٹی کا فرش ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔ عثمان درخت کے تنے کے ساتھ قدرتی سی غیر محسوس ڈھلان پر لیٹے تھے۔ حالات سے لڑتے لڑتے تھک چکے تھے۔ چہرے پر بڑی پتھر مرگی تھی۔ آنکھوں میں بے خوابی کی کیفیت تھی۔ مراد محل میں ہی رہ رہے تھے۔ لیکن سب کا ساتھ بالکل چھوٹ چکا تھا۔ ان سے کوئی بات کرتا نہ نزدیک پھٹکتا۔ والد تو شکل تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔

ادھر ماما نے بھی اپنا کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ تذبذب کا عالم تھا۔ شانہ کا قرب

حاصل تھا۔ اس کی محبت کا یقین تھا۔ لیکن پھر بھی جیسے صلیب پر لٹکے تھے۔ جب تک شانہ کے والدین ان کے حق میں فیصلہ نہ دے دیتے۔ جاسکھی کا عالم طاری ہی رہتا تھا۔

شانہ ان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اسے حوصلہ نہ تھا۔ نظریہ اس کی پوری پوری دکالت کر رہی تھی۔

اور

پھر

اس نے خود بھی تو فیصلہ کر لیا تھا۔

عثمان کا ساتھ دینے کا فیصلہ — وہ تو صرف ماما اور ڈیڈی کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے امید تھی۔ کہ وہ عثمان کے حق میں ہی فیصلہ دیں گے۔ صرف ذہنی طور پر لوگوں کی باتوں سے بچنے کے لیے تیار ہونے کی ضرورت تھی۔ یہی امید تھی جو وہ خاموشی سے والدین کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔

”عثمان“

”ہوں۔“

”اٹھیے اب۔“

”کیوں۔“

”کافی دقت ہو گیا۔“

”تھوڑی دیر اور۔“

”نہیں۔ چلیے اب۔ آج مجھے کالج کا کافی کام کرنا ہے۔“

”گولی مارو کام کو۔“

شانہ ہنس پڑی۔ عثمان اٹھ بیٹھے۔

ان کے اٹھتے ہی شانہ کھڑی ہونے لگی۔ تو عثمان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔ بہت جلدی ہے جانے کی۔  
- کافی دیر ہو گئی ہے۔  
- شانہ۔

ہوں۔  
- کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ کہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔  
تم جتنی دیر بھی میرے پاس بیٹھی رہتی ہو۔ مجبور مجبور ہوتی ہو۔  
- عثمان۔ شانہ نے جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑالیا۔ اس کا منہ بن گیا۔ اور وہ عثمان سے روٹھ گئی۔ ان کی بات نے شانہ کے جذبات کو واقعی ٹھیس پہنچائی تھی۔

روٹھنے کی ادا اتنی پیاری تھی۔ کہ عثمان دل تھام کر رہ گئے۔  
- شانہ۔ عثمان نے اسے بلایا۔

وہ منہ موڑے بیٹھی رہی  
عثمان نے پھر اسے پکارا

وہ چپ رہی۔

عثمان مسکراتے ہوئے اس کے اور قریب ہو گئے۔ اپنی بات کی سنگینی کا انہیں اب احساس ہوا۔ معذرت کرنے کے لیے انہوں نے شانہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمانا چاہا۔

لیکن اس نے ان کا کندھے پر رکھا ہوا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا۔

عثمان مسکانے لگے۔ شانہ تو سنجیدگی سے روٹھ گئی تھی۔

- شانہ۔ وہ اس کے کندھے کے قریب اپنا چہرہ کرتے ہوئے اس کے کان

میں جیسے سرگوشی کر رہے تھے۔

وہ کندھے اچکا کر کچھ آگے کو جھک گئی۔

- معاف کرو شانہ۔ عثمان بولے۔ جانے کیوں ایسی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں۔ میں ان دنوں کچھ غیر متوازن ذہن رکھتا ہوں۔ کبھی کبھی مایوسی میں الٹی پلٹی باتیں سوچنے لگتا ہوں۔ آئندہ ایسی فضول باتیں نہیں کروں گا۔

وہ منہ پھرے ان کی طرف پشت کر کے بیٹھی تھی۔ عثمان کی کبھی بات کا اس نے جواب نہ دیا۔ عثمان نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ایک لمحے میں اپنی طرف گھمایا۔  
ان کا دل ٹپ اٹھا۔

شانہ رو رہی تھی۔

ان کی باتوں سے اسے اتنا صدمہ پہنچا۔ انہیں اپنے آپ پر بے طرح غصہ آ رہا آیا۔ شانہ کا دل دکھانے کا تو وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

انہوں نے شانہ سے معافی مانگنی چاہی۔

کئی لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکے۔ شانہ کی حسین جھلجھلی کرتی آنکھوں کے سحر میں ڈوب گئے۔ جن کا یہ انداز تو انہوں نے پہلے بار دیکھا تھا۔

شانہ نے ان کے بازو سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ تو یہ گرفت اور سخت ہو گئی۔

- شانہ۔ میری زندگی۔ مجھے معاف کر دو۔ آئندہ کبھی اتنی ذلیل بات نہیں کہوں گا۔ تم بھی روٹھ گئیں۔ تو سمجھ لو۔ کہ زندگی روٹھ جائے گی مجھ سے۔ مجھے تم پر تہمیدی محبت پر اعتماد ہے شانہ اسی اعتماد کے ہمارے توجہ رہا ہوں۔  
شانہ کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔

عثمان نے اپنے رومال میں یہ آنسو پانی جذب کر لیا۔

شانہ کو مٹانے میں انہیں کافی دیر لگی۔ پیار کی زندگی کا یہ انوکھا اور دلغریب

تجربہ تھا۔ عثمان کو یقین ہو گیا تھا۔ کہ اب وہ دونوں کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ جب دونوں جانے کے لیے اٹھے تو عثمان نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے شکر آواز میں کہا۔ "شانہ مجھے یقین ہو رہا ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے۔ کہ میں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ میرے والدین یا تمہارے ماما ڈیڈی۔ کوئی بھی نہیں الگ نہیں کر سکتا۔ ہیں نا۔"

"شکر ہے یقین تو آیا۔" شانہ نے بیگے تبسم سے طنز کیا۔

عثمان سرشار سے لہجے میں بولے۔ "اب میں بایوس نہیں ہوؤں گا۔" شانہ کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں آج رات ماما سے ملنے آؤں گا۔" عثمان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ لب لباب ہو گیا۔ اب میں مزید انتظار کر سکتا ہوں نہ صبر۔"

شانہ کے ہاتھ پر ان کے ہاتھ کی گرفت آہنی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے گاڑی میں آ بیٹھے۔

شام عثمان نے ماما کو فون کیا۔ کہ رات وہ ان کے پاس اپنے سوال کا جواب لینے آرہے ہیں۔ آج وہ شانہ کے ڈیڈی سے بھی کھل کھرات کرنے والے تھے۔ رات کھانے کے بعد وہ اپنے دوستوں احمر اور نسیم کے ساتھ بازار چلے گئے۔ گھنٹہ بھر ان کے ساتھ رہے۔ اپنے عزم و ارادے سے انہیں بھی آگاہ کیا۔ اس زمانے میں والد پر اپنے فیصلے مسلط کرنے والے والدین ان کی نظروں سے نہیں گزر رہے تھے۔ کم از کم ان کے گھرانوں میں تو والدین نے نئی پود کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ عقل مندی ہی کی تھی۔ اپنی برتری کا بھرم بچوں کی گستاخی سے ٹوٹنے نہیں دیا تھا۔

عثمان کے حالات سن کر انہیں دکھ بھی ہوا اور خوشی بھی۔ کہ عثمان محبت کے

معاطف میں اتنے سنجیدہ اور ایسے نچمہ موم تھے۔ کوئی سوانحہ کے قریب عثمان شانہ کے ہاں آئے۔ آج گرم ہوا چل رہی تھی۔ اور رات کا نمی گزر جانے کے باوجود فضا میں تپش موجود تھی۔ بیرونی لان میں ماما اور ڈیڈی یقیناً انہیں کے میں بیٹھے تھے۔ پیدل فلین پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ جس سے تپش کچھ گوارہ ہو رہی تھی۔

عثمان کے فون آنے پر ماما اور ڈیڈی نے اپنا آخری فیصلہ کر لیا تھا۔ شانہ نے ماما کو براہ راست اپنی رضامندی سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب کسی اور فیصلے کی گنجائش کہاں تھی۔ محبت اور شش کے طوفانی دور سے خود بھی گزر چکے تھے۔ انہیں عثمان کی دلی کیفیت اور شانہ کے جذبات کا پوری طرح احساس تھا۔

عثمان تو آج آخری فیصلے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کے آئے تھے۔ لڑنے مرنے والی بات ان پر صادق آتی تھی۔ شانہ کو اپنا حق سمجھ کر ان سے مانگنا تھا۔ انکار کی صورت میں وہ حق چھین لینے کی پالیسی پر بھی عمل کرنے کو تیار تھے۔

لیکن

اس کا موقع ہی نہیں آیا۔

وہ آئے تو ڈیڈی نے تپاک سے ان سے ہاتھ ملایا۔ بغل گیر ہوئے اور سینے سے لگائے۔ چند سیکنڈ ان کی میٹھ چپکے رہے۔

ماما نے بھی ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

خیر مقدم اتنا پر تپاک اور محبت آمیز تھا۔ کہ عثمان کو اپنے حق میں فیصلہ ہو جانے کا ہر امید ہی نہ ہوتی یقین بھی ہو گیا۔

لان ہی میں مینوں بیٹھے۔ ادھر ادھر کی رسمی باتیں ہوئیں اور پھر ماما نے مکررات ہوئے ان سے کہا۔

- کیا ہر ج ہے۔ اب تو بات ہو گئی نا۔

- بے جا ڈبھئی۔ جانیے عثمان۔ ماما نے مسکرا کر عثمان سے کہا۔  
عثمان مسکراتے ہوئے اٹھے۔ ظریفہ انہیں ساتھ لے کر اندر آ گئی۔ شائے  
لنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ ظریفہ نے عثمان کو بھی اس کے پاس بٹھا دیا۔  
در پھر دونوں کو خوب خوب چھڑتی رہی۔  
آج اس کے گھر کے افراد کے علاوہ گھر کے درو دیار بھی خوش تھے۔ باہر  
ماور ڈیڈی نہیں رہے تھے۔ اور اندر ظریفہ عثمان کے چہچہے کو سنا رہے تھے۔

- مبارک ہو عثمان بیٹے۔ ہم نے شائے تمہیں سو نپ دی۔ تم دونوں کا اللہ  
ننگیان ہو۔  
عثمان کے کانپتے لبوں سے شکل ٹھکریے کا غلط نکلا۔ ان کی حالت غیر سی ہو  
گئی۔ بے کما خوشیاں تھیں۔ بار نہ بھلنا مشکل ہو گیا۔  
سردار علی نے بھی مبارکباد کہی۔ وہ شدت جذبات سے مغلوب مغلوب سر جھکا  
بیٹھے رہے۔ بے حد حساب خوشیوں کے ساتھ ساتھ انہیں چھین بھی محسوس ہو  
رہی تھی۔ کاش یہ موقع والدین کے زیر سایہ میسر ہوتا۔  
ان کی آنکھوں میں ہلکی سی دھندلاہٹ آئی۔ لیکن وہ جلد ہی سنبھل گئے۔  
ماما اور ڈیڈی منگنی اور شادی کی بات کر رہے تھے۔ عثمان کو ابھی یقین نہ آ رہا  
تھا۔ کردہ گوہر مقصود پا چکے ہیں۔  
ظریفہ ماما ڈیڈی کے فیصلے سے آگاہ تھی۔ کچھ دیر تو وہ اندر ہی بیٹھی رہی۔  
جب یقین ہو گیا۔ کہ بات ہو چکی ہو گی۔ باہر آئی۔  
عثمان کو مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ پھر ماما کی کمری کی پشت پر آئی جھک کر  
ماں نے کان میں سرگوشی کی۔ ہو گئی بات۔

- ہو گئی۔ ماما نے کہا۔  
- مبارک۔ اس نے سب سے کہا  
- شکریہ۔ عثمان مسکرائے  
- ماما۔

- ہوں۔  
- عثمان بھائی کو اندر لے جاؤں۔  
- ماما نہیں پڑیں۔ بڑی شریعہ ہو۔

"کیونکر۔ سمجھاؤ ذرا۔"

"بھئی اگر شادی ہو رہی ہے۔ تو ظاہر ہے والدین شادی کر رہے ہیں۔ پوری شان اور آں بان کے ساتھ۔ اور اگر تم شادی کر رہے ہو۔ تو۔۔۔"

عثمان کھلکھلا کر ہنس پڑے انہوں نے اپنا ہاتھ گرجوشتی سے ہادی کے ہاتھ پر مارا۔ "بڑے عقل مند ہو۔"

"تو کیا چند سمجھ رکھا ہے۔"

"نہیں یار یہ بات نہیں۔ ویسے داد دیتا ہوں تمہاری سوچ کی۔"

"اچھا تو اب کہو۔ شادی ہو رہی ہے یا کر رہے ہو۔"

"شادی کر رہا ہوں۔"

"واقعی۔"

"بالکل۔"

"اور۔ تمہارے۔"

"والدین؟"

"ہاں۔"

عثمان کرسی پر پیچھے کو سٹنگٹ۔ سگریٹ کے دو ایک کش لیے۔ ہادی کو دیکھا اور بولے۔ "بہت کوشش کی وہ مانتے نہیں۔ اپنے سے کتر کسی مانڈان کی لڑکی کو بھوننا۔ نہ کاہ سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"اور تم نے کیسے سوچ لیا۔"

"میں خاندان کی نہیں انسان کی عظمت کا قائل ہوں۔"

"اوہ زندہ باد۔ زندہ باد۔" ہادی نے نعرہ مارا۔ اور ارد گرد میزوں پر بیٹھے لوگ گردنیں موڑ موڑ کر انہیں دیکھنے لگے۔

"ہادی۔"

"مہوں۔"

"میں شادی کر رہا ہوں۔"

"شادی؟"

"ہاں۔ شادی۔ سمجھ نہیں ہو۔ میں شادی کر رہا ہوں۔"

"سمجھا واقعی نہیں۔ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ یا تم شادی کر رہے ہو۔"

"بے وقوف۔ مطلب تو ایک ہی ہوا۔"

"ایک کیسے؟"

"یعنی شادی ہو رہی ہے بس۔"

"اوں ہوں۔ شادی ہو رہی ہے یا تم کر رہے ہو۔ دونوں باتوں میں الجھ"

المشرقین ہے صاحب۔"



”ہاں۔“

”تو جناب میں شادی کر رہا ہوں۔ شائے کے ساتھ۔“

”شائے۔“

”کیوں۔“

”منفرد سنا نام ہے۔“

”وہ خود بھی منفرد ہے۔“

”یہ تو ظاہر ہے۔ ورنہ خاندان ماں باپ اور دھن دولت سے مزہ مٹرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔“

”بڑے سمجھدار ہو گئے ہو۔“

”پیشہ سے ہوں۔“

”جی ہاں۔ اچھا چائے تو اٹھا لیے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

”ہونے دو۔ تمہاری باتیں گرا گرم جو ہیں۔“

عثمان مسکرانے لگے۔ شائے اور اس کے خاندان کے متعلق انہوں نے مختصر الفاظ میں ہادی کو بتا دیا۔

”خاندان ایسا نجی نہیں۔ کہ تمہارے والدین درخود اعتنا دہی نہ سمجھتے۔“

ہادی بولا۔ ”با عزت لوگ ہیں۔“

”یار کوئی ایک محبت تو نہیں نا۔“

”کیا مطلب؟“

”اسی کی جتنی ہیں ایک۔ معاملہ ان کی وجہ سے اتنا سنجیدہ ہو گیا۔“

”یعنی۔“

”یعنی وہ اپنی جتنی کے حق میں ہیں۔ اور بات کافی بڑھا بھی چکی تھیں۔“

دونوں ریٹورنٹ کے چھوٹے سے ایئر کنڈیشنڈ ہال بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چند میزیں اور بھی تھیں۔ جن پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ کاروباری قسم کے لوگ اپنے کاروبار ہی کی باتوں میں لگے تھے۔ کچھ کالجوں کے درپیش مسائل پر چائے پیتے ہوئے باتوں میں مشغول تھے۔ ان کے علاوہ دو ایک میزوں پر کچھ جوڑے بیٹھے تھے۔ میاں بیوی تھے۔ یا ایک دوسرے کے شیدائی۔ بحال ہال میں شام کے وقت خاصی گھاگھی تھی۔ ماحول پرسکون تھا۔ آداب کا خیال ہر ایک کو تھا۔ دھیمے لہجوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ ہادی کے فہرہ زن ہونے پر کئی لوگوں نے اسی لیے مڑ مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ کہ ریٹورنٹ میں باتیں کرنے کا دستور نہیں تھا۔

عثمان نے سگریٹ کا ادھ جلا حصہ ایش ٹرے میں ڈال دیا۔ اور مسکرا کر ہادی سے بولے۔ ”ہادی ریٹورنٹ میں بیٹھے ہو۔“

”کیا ہوا۔“

”تمہارے فہرہ متا نے لوگوں کو متوجہ کر لیا ہے۔“

”بڑی بات ہے کیا۔“

”اور اچھی ہے؟“

”خیر۔ یہ بتاؤ کہ شادی کہاں کر رہے ہو کیسے کر رہے ہو۔ کیونکہ کر رہے ہو۔“

ہادی کے سوال کے آخری حصے پر عثمان ہنس دیئے۔ چائے کی پیالی اٹھا لی اور ایک گھونٹ لے کر پیالی واپس دکتے ہوئے بولے۔ ”تمہارے ایک

ہی سوال میں کئی سوال ہیں۔ کس کس کا جواب دوں۔“

”سب کا تفصیل کے ساتھ۔“

”یہ بات۔“

- اور جناب ڈٹ گئے اپنی بات پر۔  
- ہادی - میں خود نہیں سمجھ پاتا - کہ مجھے کیا ہو گیا ہے - شاید کے بغیر تو شاید  
میں ابھی نہیں سکوں گا - اگر میں اپنے جذبات کے اظہار کے لیے عشق کا لفظ  
استعمال کروں - تو یہ لفظ نہایت ناممکن اور بوجھ سا لگتا ہے۔  
- اتنی درجہ جاکے ہو۔

- اسے پہلی بار دیکھا تھا - تو یہ بات محسوس کی تھی - وہ مجھے اپنے آپ سے الگ  
کوئی شے نہیں لگتی - اور تم یقین کر دو گے کہ میرے یہ احساسات پہلے دن ہی تھے  
جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

- عثمان اتنی سنجیدگی سے باتیں کر رہے تھے کہ ہادی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔  
- ہاں تو اب مجھے شادی کے سلسلے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے - عثمان بولے۔  
- میں حاضر ہوں۔ ہادی نے کہا۔

- یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ گھر والے شادی میں شرکت نہیں کریں گے۔ اب اس  
نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کوئی غیر خاندان کی ایسی کسی گھر کی دہلیز پر قدم نہیں  
سکتی۔

- ہوں۔

- یہی دو مسئلے ہیں جس میں تمہاری ضرورت ہے۔

ہادی نے پوری پوری مدد کا یقین دلایا۔

- چند دوست نکاح میں شرکت کے لیے ہوں۔ عثمان بولے۔ لمبا چوڑا اجازت

کرنے کی ضرورت نہیں۔

- ٹھیک ہے۔ ہو جائے گا۔ بلکہ نسیم رضا احمد اور فیروز کی بیویاں بھی آجائیں گی۔

- یہ تو ہو جائے گا۔ اصلی مسئلہ گھر کا ہے۔

- میرا گھر حاضر ہے۔  
- شکریہ ہادی - گھر مجھے کم از کم ایک سال کے لیے چاہیے۔ کہ لے کر لے رہی  
مل جائے۔  
- کوشش کروں گا۔

- زیادہ سے زیادہ ایک سال - اس دوران انشاء اللہ میں اپنا بندوبست کر  
لوں گا۔ میرا ارادہ ہے جگہ لے کر اپنی پسند سے گھر بناؤں۔ خیر وہ تو بعد کی  
باتیں ہیں۔ فی الحال گھر مل جائے۔ چاہے دو بیڑیوں کا ہو۔  
- ہوں۔

- شادی سے پہلے گھر مل جائے۔ تو اسے رہائش کے قابل بھی بنانا ہے۔ کچھ  
سامان - فرنیچر - اور - ہادی کو اچانک جیسے اک بات یاد آگئی۔ عثمان کی بات  
کٹتے ہوئے بولا۔ یا خوب یاد کیا۔

- کیا۔

- گھر کا مسئلہ حل ہی سمجھو۔

- کیسے؟

- لیکن - تم شاید اسی شہر میں گھر لینا چاہو گے۔

- ضروری نہیں۔

- تو پھر یہ گئی بات۔

- کیسے؟

- میرے ایک دوست بھیر اشفاق ہیں۔

- ہوں۔

- وہ ڈیپوٹیشن پر تین سال کے لیے لیا جا رہے ہیں۔

اور گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے پردگرام بنانے لگے۔

- شادی ہو کب رہی ہے۔ ہادی نے پوچھا۔

- جلد ہی۔

- پھر بھی کتنے دنوں کتنے ہفتوں کتنے مہینوں بعد۔

- مہینوں والی بات غلط ہے۔ ہاں دو تین ہفتے ضرور لگ جائیں گے۔ ویسے ابھی تاریخ وغیرہ کی بات نہیں ہوئی۔

- لڑکی والوں کو تیاری کے لیے تو کچھ دن ضرور چاہیے ہوں گے۔ تم تو خانہ کے کٹ کن کر وہاں پہنچ جاؤ گے۔ لیکن ان کا تو کنبہ قبیلہ ہوگا۔

- ضرور ہوگا۔ ویسے بھی مجھے اس بات کا دکھ بھی بہت ہے۔ خوشیوں کے سینے میں جیسے خچر سا چبھا ہوا ہے۔ کاش والدین کو کسی طرح راضی کر سکتا۔

- ابھی کوشش جاری رکھو۔

- بے فائدہ ہوگی۔

- پھر بھی۔

- نکاح سے پہلے ایک دفعہ پھر کوشش کروں گا۔ لیکن جانتا ہوں۔ جس دن

نکاح کا نام لیا۔ اسی دن گھر سے جواب مل جائے گا۔

- ابھی تو گھر ہی میں ہونا۔

- نہ ہونے کے برابر۔ کوئی کلام تک نہیں کرتا۔ اباما کے ساتھ ساتھ مہینوں نے بھی بایکٹ کر رکھا ہے۔ تعلق تو ان کے رویے سے ہے۔ بہت دکھ ہوتا ہے۔

یاب۔ گھر میں ایک لمحہ رکنے تو جی نہیں چاہتا۔ مجبوری کے تحت وہاں ہوں۔

- افسوس ہے۔

- ہاں تو پھر۔ گھر کی امید رکھوں۔ عثمان نے چند لمحے رہنے کے بعد پوچھا۔

- پھر۔

- ان کا ذاتی منظر ہے۔ دو بیڈروم کا بالکل نیا بنا ہوا۔ اور نئے سامان آراستہ۔

- لیکن۔

- وہ گھر کر ایسے پر دنیا چاہتے ہیں۔ لیکن کسی ایسے آدمی کو جو ان کے گھر اور ان کی چیزوں کی پوری پوری حفاظت اور دیکھ بھال کر سکے۔ اگر تمہیں اس جگہ سے چالیس پچاس میل دور رہنے پر اعتراض نہ ہو۔ تو وہ گھر تمہارے لیے بے حد موزوں ہے۔

- تم ہی اس سلسلہ میں ان سے بات کر سکتے ہو۔

- آج ہی فون کروں گا۔

- انہیں کب جانا ہے۔

- ہفتے دو ہفتے کے اندر اندر۔ چند دن ہوئے میں ان سے ملا تھا۔ گھر کی وجہ سے وہ خاصے پریشان تھے۔

- ہو سکتا ہے پریشانی دور ہو گئی ہو۔

- یہ تو فون کر کے ہی پتہ چل سکتا ہے۔

- پھر آج ہی کر فون۔

- کل تمہیں مطلع کر دوں گا۔ اگر انہوں نے ابھی تک کسی کو نہ دیا ہوا تو پھر کوئی وجہ ہی نہیں۔ کہ گھر نہ ملے۔

- مل جائے تو میری بہت بڑی پریشانی دور ہو جائے گی۔

- ہاں۔

- دونوں نے چائے کی ایک ایک اور پیالی بنائی۔ نئے سگریٹس ملا گئے۔

”کل ہی بتا دوں گا۔ آج رات انہیں فون کر کے تہہ کر لوں گا۔ نہ بھی ہوا۔ تو نکل کر دو۔ کہیں نہ کہیں بندوبست ہو ہی جائے گا۔“ میرا گھر تو حاضر ہے۔“  
 ”بہت بہت شکریہ۔ خدا کرے کہ وہ گھر مل جائے۔“  
 دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر بیرے کو بلا کر پل ادا کیا اور دونوں ریسٹورانٹ سے نکل کر باہر آ گئے۔  
 ”نسیم سے بھی بل دیا جائے۔ ہادی نے اپنی گاڑی کی طرف جاتے جاتے پوچھا۔  
 ”کس لیے؟“  
 ”یہ مکان وغیرہ کے لیے۔ پھر نکاح کے لیے کچھ دوستوں کو اکٹھا کرنا ہے۔“  
 ”چلو چلتے ہیں۔“  
 ”او۔“

ہادی اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ اور عثمان اپنی گاڑی میں آ بیٹھے۔ دونوں آگے پیچھے روانہ ہو گئے۔ دس منٹ بعد وہ نسیم کے گھر میں بیٹھے تھے۔ نسیم کی بیوی سارہ بھی ان کی باتوں میں شریک تھی۔  
 عثمان کو صلاح و مشورے کی ضرورت تھی۔ شائے کے لیے انہیں کیا کچھ لینا چاہئے تھا۔ یہ سب مسز نسیم انہیں بتا رہی تھی۔  
 رات کا کھانا بھی سب نے اکٹھے یہیں کھایا۔ ساڑھے دس کے قریب ہادی اور عثمان نے اجازت چاہی۔ سارہ نے بہت سی چیزیں شائے کے لیے انہیں لوٹ کر وادی تھیں۔

”انگوٹھی سب سے پہلے خریدیے۔ سارہ نے عثمان کو خدا حافظ کہنے سے پہلے کہا۔  
 ”کل ہی خرید لوں گا۔“ عثمان مسکرائے۔

وہ رات گئے گھر واپس آئے۔ ان کا ذاتی ملازم انتظار میں تھا۔ باقی اہل خانہ

کہاں تھے کیا کر رہے تھے سو گئے تھے یا جاگ رہے تھے۔ انہیں کچھ تہہ نہ چلا۔  
 عثمان کے سر سے آج بہت سے بوجھ اتر گئے تھے۔ جب وہ سونے کے لیے بیڈ پر لیٹے۔ تو اپنے آپ کو ہلکا ہلکا محسوس کیا۔  
 لیکن

اس کے باوجود دل میں کسک ہوتی رہی۔ اپنوں سے کٹ کر جینے کا تجربہ خاصہ کلیف دہ تھا۔

جی۔

جلو اطلاع دیں انہیں۔

آپ اندر آکر بیٹھیے۔ اس نے جلدی سے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول

لیا۔

عثمان ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ اس نے جلدی سے دونوں بچے کھول دیئے۔ اور بچے کے نیچے کھڑے ہو کر ماما کا انتظار کرنے لگے

دومنٹ کے اندر اندر ہی ماما آ گئیں۔

عثمان نے قدرے سر جھکا کر انہیں سلام کیا۔

اور

انہوں نے کمال شفقت سے اپنے دستور کے مطابق ان کی پیشانی چوم لی۔ بہت کے اس پر خلوص اظہار پر عثمان سرشار سے ہو گئے۔

یہاں گرمی ہے۔ ماما بولیں۔

آج واقعی بہت گرمی ہے۔

مناسب سمجھیں تو میرے کمرے میں آجائیں۔ وہاں کنڈلینز لگا تھا۔

ماما۔

جی۔

دیکھیں۔

کیا۔

ایک بات کہوں۔

ضرور۔

آپ نے جب مجھے بیٹا بنانے کا شرف بخشا ہے۔ تو میری بیٹیوں کی طرح ہی

عثمان گھر سے نکلے تھے۔ تو ہوا بالکل بند تھی۔ پچھلے پہر کی دھوپ دھل رہی تھی۔ لیکن دروازہ کھل رہا تھا۔ ایئر کنڈلینز کمرے میں تو گرمی کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن جو نہی باہر نکلتے گرمی کی شدت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی۔ انہوں نے ٹھنڈے پکڑے پن رکھے تھے۔ لیکن پھر بھی پسینہ بار بار پونچھا پڑ رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے تو کچھ ٹھنڈک محسوس کر کے طبیعت بحال ہوئی۔

وہ شائے کے ہاں آئے۔ آج انہوں نے ماما سے شادی کے متعلق کھل کر بات بھی کر لی تھی۔ اور انگوٹھی خریدنے بھی جانا تھا۔

گاڑی برآمدے کے سامنے روک کر انہوں نے برآمدے میں مکی بیل بجائی۔

کون۔ اسلام نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ اور پھر عثمان کو دیکھ کر مؤدبانہ

بولا۔ آپ۔ آئیے۔ میں بیگم صاحبہ کو اطلاع دیتا ہوں۔

گھر پر ہی ہیں نا؟

کیا حال چال ہے۔ ماما نے ان کے جانے کے بعد بیڈ کی چادر بیٹھے بیٹھے  
 ٹیک کرتے ہوئے عثمان سے پوچھا۔  
 "شکریہ۔ ٹھیک ہوں۔"  
 "گھر والے۔"

"حسب دستور۔"  
 "کچھ لپک نہیں آئی۔"  
 "ناممکن ہے۔"

"اپنی سہی کو شش تو کرتے رہو۔"  
 "کر رہا ہوں۔ لیکن امید نہیں۔"

"سچی عثمان۔ اگر آپ کے والدین بھی اس شادی میں شریک ہوئے تو ہمارے  
 لیے خوشی اور فخر کا مقام ہوتا۔"

"میں اچھی طرح سمجھتا ہوں ماما۔ لیکن آپ شاید ان لوگوں کی خود پسندی سے  
 واقف نہیں ہیں۔ اور اب تو انہوں نے انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ میں عینی منت  
 و حاجت کروں گا۔ وہ اتنے ہی سخت گیر ہوتے جائیں گے۔"  
 "افسوس ہے۔"

"بالکل۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں۔ کہ ان کا غصہ کبھی نہ کبھی اترا بھی جائے  
 گا۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا نہ ہوتا۔ تو شاید وہ اپنے غصے کو عمروں تک پھیلا دیتے۔  
 لیکن اب یقین ہے۔ کہ زیادہ عرصہ کٹ کر نہیں رہیں گے۔ پھر میں نے بھی عزم  
 کر رکھا ہے۔ کہ انہیں کسی نہ کسی طرح۔ کبھی کبھی منا ہی لوں گا۔"  
 "خدا تمہیں سلامت رکھے۔"

عثمان نے عقیدت سے ماما کو دیکھا۔ پھر ڈیڑی کے متعلق پوچھا۔

ٹریٹ کریں۔ یہ سکلفاتی باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ اپنا سٹیت کا احساس کھو گئی  
 ہیں۔"  
 ماما کھلکھلا کر سنسٹیں۔

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔  
 "ابھی تو کہہ رہی تھیں۔ آپ مناسب سمجھیں تو۔ جی۔ آپ۔ یہ وہ۔"  
 عثمان بولے۔ تو ماما نے جھقبہ لگاتے ہوئے ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور یہ اختیار  
 پیار کر لیا۔  
 عثمان خوش ہو گئے۔

ماما انہیں ساتھ لے کر اپنے بیڈ روم میں آ گئیں۔ شائندہ اور نظریہ بھی وہیں  
 لیٹی تھیں۔ امی اور جی بھی پٹنگ پر لیٹے تھے۔ شائندہ اور نظریہ تو عثمان کے اندر آنے  
 سے پہلے ہی کرے سے نکل گئیں۔ ایسی جی اٹھ بیٹھے۔  
 ہو۔"

دونوں نے عثمان کو سلام کیا۔ اور پٹنگ سے نیچے کود آئے۔ عثمان نے انکی  
 احوال پرسی کی۔ وہ تعظیم سے جواب دیتے رہے۔ بیڈ کے قریب ہی ایک کرسی پر عثمان  
 بیٹھ گئے۔ ماما بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئیں۔  
 "ایسی جی۔ ماما بولیں۔"

"جی۔"  
 "چلیے جا کر نہائیے۔ بہت ریسٹ لے لیا۔ اب سکول کا کام شروع ہو جائے  
 سمجھے۔"

"جی ماما۔"

دونوں ماں کے حکم پر باہر چلے گئے۔

”شکریہ“ عثمان نے کہا۔ ایک گھونٹ لیا۔ سکولیش نظر لیتے شاید دو چار قطرے ڈالے تھے۔ پانی بھی ٹھنڈا نہیں تھا۔ بہت ہدمزہ تھا۔

ظریفہ نہیں کر بولی۔ پھیکا تو نہیں۔

”یہ تو آپ کو بھی پتہ ہوگا“ عثمان ہنس کر بولے۔

ظریفہ بولی۔ میں نے چکھا تھوڑا ہی ہے۔

”اب چکھ لیں۔“ عثمان نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ تو ظریفہ ہنسنے لگی۔

”اما بھگ لیں اس نے شرارت کی ہے۔“

”بہت شریہ ہے۔ اس سے بچ کر رہنا عثمان۔“ ماما نے کہا۔

”مجھ لوں گا۔“ ظریفہ سے عثمان نے مسکرا کر کہا۔

”لائیے دوسرا بنا دوں۔“ ظریفہ بولی۔

”جی نہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ میں خود بناؤں گا۔“

”کیوں۔“ اعتبار نہیں رہا۔

”بالکل۔“

”ہائے نہیں بھائی جان۔ اب قسم سے ٹھیک ٹھیک بناؤں گی۔“

”میں خود بنانا جانتا ہوں۔“

عثمان اٹھ کر میز کی طرف آئے اور اپنے لیے سکولیش بنالیا۔ ظریفہ ہنستی رہی۔

”آپ کے لیے بھی بناؤں۔“

”میں خود بنا لوں گی۔“

”میرے ہاتھ کا پی کر دیکھیں۔ کبھی نہ پایا ہوگا ایسا۔“

”پلیٹے بنا لیں۔“ ظریفہ جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اما اور وہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔

عثمان نے سکولیش بنالیا۔ اتنی چینی ڈالی۔ کہ شربت شیر اس بن گیا۔

”ان کے کسی چیز کی چوری ہو گئی ہے۔“ ماما ہنسیں۔ ”ان کے ہاں صبح گئے ہوئے ہیں۔ ابھی تک آئے نہیں۔“

”ہاں تو ماما۔“ عثمان مسکرائے کچھ جھکے۔ پھر چپ ہو گئے۔

”کیا۔“

”کچھ تاریخ واریخ۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اما بولیں۔“ طے کر لیتے ہیں۔ جو نہیں مناسب معلوم ہو۔ ویسے کچھ دن ہیں

ضرور ملنا چاہئیں۔

”کس لیے۔“

”تیاری وغیرہ کے لیے۔“

”چھوڑیں ماما۔“ فضول رسکوں کو۔ کسی لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت نہیں۔

صرف اتنے دن درمیان میں رکھیں۔ کہ میں شانہ کے لیے کچھ ڈرلینر تیار کروا سکوں۔

ماما نے قہقہہ لگایا۔

”اپنے لیے وقت چاہئے۔ اور یہی وقت کی ضرورت نہیں۔“ شریہ۔

”جلد سے جلد۔“

”ہاں ہاں۔“ ہو جائے گا۔ لیکن کچھ گھر بار کا کیا۔ اپنے گھر تو شاید۔

”سب ہو جائے گا۔“ یہ میری ذمہ داری ہے ماما اور میں اپنی ذمہ داری اچھی

طرح سمجھتا ہوں۔

ماما کچھ کہنے کو تھیں۔ کہ ظریفہ ٹرے میں سکولیش لیے آگئی۔

عثمان کو اس نے بڑی تہہ کاغذی سے سلام کیا اور حال احوال پوچھا۔ وہ بہت

خوش تھی۔ کونے والی میز پر ٹرے رکھ کر اس نے سکولیش بنائی۔ اور گلاس ماما

اور عثمان کو پیش کیے۔

- شائزہ کے لیے -

- ہوں -

- آپ اجازت دیں۔ تو شائزہ کو ساتھ لے جاؤں۔ ان کی پسند سے خریدنا چاہتا ہوں۔

اما چند لمحے تو چپ رہیں۔ پھر مسکرا کر بولیں۔ - تو تم اسے ہی لینے آئے ہو۔ -

- جی۔ -

- اچھا۔ -

عثمان خوش ہو گئے۔ جلدی سے اسٹاک کھڑے ہوئے۔  
- بیٹھو بیٹی ابھی۔ اس سے پوچھ تو لوں۔ ساتھ جائے گی بھی کہ نہیں۔ -  
- کیوں نہ جائیں گے۔ عثمان بولے تو اما مسکرانے لگیں۔  
- تم ٹھیکو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ -

- اما۔ - میں نے ان کے لباس بھی نبوانے ہیں جب تک وہ ساتھ نہ ہونگی مجھے  
لیا پتہ چلے گا۔ -

- اچھا بیٹی۔ -

- آپ جانتی ہیں۔ کہ اب سب کچھ مجھے ہی کرنا ہے۔ اس لیے شائزہ کی پسند ناپسند  
کھینا ہوگی۔ -

- ٹھیک ہے۔ -

اما چلی گئیں اور عثمان کمرے میں پہننے لگے۔ دیوار پر لگی اما اور ویڈیو جوائی  
کی تصویر دیکھتے ہوئے انہیں یوں لگا جیسے اما انہیں شائزہ ہی کھڑی ہو۔ ماں بیٹی  
اس قدر مشابہت تھیں۔ وہ خاصے حیران ہوئے۔

اما تھوڑی دیر بعد آگئیں۔ شائزہ کو ساتھ لے جانے کی انہوں نے عثمان کو

- لیجئے۔ جناب۔ عثمان نے گلاس اسے دے دیا۔

لیکن ایک گھونٹ ہی سے جیسے منہ میں شیر اگھل گیا۔ میٹھا اسے ویسے ہی پسند نہیں  
تھا۔ براس منہ بناتے ہوئے غسل خانے کی طرف دوڑی۔

عثمان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اما بھی ہنسنے لگی۔

ظریفہ منہ صاف کر کے والپس آگئی۔ دونوں میں کچھ دیر لطیف سی چوڑ بھاڑ ہوتی  
رہی۔

- ظریفہ۔ -

- جی اما۔ -

- اب باتوں میں وقت گزار دو گی۔ چائے نہیں پلاؤ گی۔ -

- چائے نہیں اما۔ -

- کیوں۔ پی آئے۔ -

- ابھی نہیں پی۔ لیکن آپ نہ بنائیں۔ کم از کم میرے لیے۔ -

- ہو کیوں۔ -

- مجھے جانا ہے۔ -

- کہاں۔ -

- بازار۔ -

کہیں باہر بیٹے کے ارادے ہوں گے۔ ظریفہ بولی۔

- جی ہاں۔ - عثمان نے مسکرا کر کہا۔

ظریفہ چلی گئی۔ اما کے لیے چائے تو بنوانا تھی۔

اس کے جانے کے بعد عثمان نے اما سے کہا۔ میں نے آج انکو کھٹی خریدنا۔

اوہ۔ اچھا۔ - اما کچھ نہ سمجھیں۔



اجازت دیدی۔

عثمان خوشی سے پھیل سے گئے۔ آپ کتنی اچھی ہیں!۔ وہ اظہارِ شکر کے طور پر بولے۔

اما انہیں ساتھ لے کر باہر آ گئیں۔ کچھ ہی دیر میں ظریف کے ساتھ شائندہ بھی آ گئی۔ اس نے آسمانی پھولدار وائل کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ آسمانی رنگ کا چھوٹا سا دوپٹہ گلے میں تھا۔ چہرے پر نکھار اور تازگی تھی۔ ماں اور بہن کے سامنے عثمان کے ساتھ جاتے ہوئے لاج بھی آرہی تھی۔ ویسے بھی اب اسے عثمان سے بھی شرم آنے لگی تھی۔ ماما سے تو اس نے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جائے گی۔ لیکن ظریف نے خوب جھاڑ پلائی تھی۔ اور ماما نے بھی یہی مناسب سمجھا تھا۔

عثمان نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اور وہ لمبائی شرمائی ایک طرف لگ کر بیٹھ گئی۔ عثمان نے ماما کو سلام کیا۔ ظریف کو ہاتھ ہلایا اور گاڑی چلا دی۔ ان دونوں کے سامنے وہ بڑے شریف بنے رہے۔ شائندہ کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔

لیکن گاڑی گیٹ سے نکلتے ہی ان کی تمام تر توجہ شائندہ کی طرف تھی۔

”دعا سلام۔ یہ کیا بات ہوئی“ عثمان نے دروازے کے ساتھ لگ کر مٹی سکڑی شائندہ کو دیکھ کر بڑے رعب سے کہا۔

شائندہ نے آواز کی تندی محسوس کی۔ تو گھبرا کر عثمان کو دیکھا۔

”ہاں ہاں۔ اب پہلے والی بات نہیں ہے جناب۔“ عثمان اسی انداز میں بولے۔

آپ کو بتا دوں کہ مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔“

”جی۔ شائندہ سہم گئی۔

آپ کو آتے ہی مجھے سلام کرنا چاہیے تھا۔ یہ نہیں کہ منہ بنا کر بیٹھی رہیں۔

جیسے روٹھی ہوئی ہیں۔ عثمان لیجے میں زور پیدا کرتے ہوئے۔ ان کے ماتھے پر

شکلیں تھیں۔ اور آنکھوں سے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

روٹنے کی کیا بات ہے۔ شائندہ مبشکل کہہ پائی۔

تو یہ کیا انداز ہے۔

اور کیا کروں۔

جان جان - میری جان - عثمان نے لاٹسے کہتے ہوئے بازو اس کی کمر میں ڈالا - اور سیٹ پر اپنے قریب گھسیٹ لیا -  
ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا - اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اسے اپنے ساتھ لگائے وہ گاڑی چلا رہے تھے - انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان کی ٹینگوں و سنتوں میں ہلکے پھلکے پرندوں کی طرح اڑے جا رہے ہیں - وہ اپنا مخصوص اور پسندیدہ مہرٹ لگنا رہے تھے -  
گاڑی شہر کی گنجائش آباد سڑکوں پر آئی - تو عثمان نے شائے کی کمر سے ہاتھ نکال لیا اور شائے سنبھال کر بیٹھ گئی -

شائے -

جی -

اب پہلے جیولر کے پاس جانا پسند کریں گی - یا پہلے چائے پی لیں -

مجھے کچھ نہیں پتہ - زیادہ دیر نہ ہو لیں -

کیوں -

ماما نے کہا تھا -

اب ماما کا آپ پر کوئی حق نہیں سمجھیں -

ابھی ہے -

اچھا - تو پھر میں کل ہی کالج کا بندوبست کرتا ہوں - اپنا حق تو پورا تسلیم کیا جائے گا -

شائے شرمیلی مسکراہٹ لیے انہیں دیکھنے لگی - کیسے مست ہوئے جا رہے تھے وہ -

ان کی خوشیوں کا اندازہ کرنے میں شائے کو دیر نہیں لگی -

دونوں ریٹورانٹ کی طرف بڑھ گئے -

قریب بیٹھیں -

شرم آتی ہے -

کیوں - کیا پہلی دفعہ آئی ہیں میرے ساتھ -

پہلے اور بات تھی -

پہلے تو بری بات تھی - غیر قانونی طریق سے میرے ساتھ فرار ہوتی تھیں - آج تو ہم قانونی طریق سے ساتھ ساتھ آئے ہیں -

تو - تو میں کیا کروں - مجھے کیا کرنا چاہیے -

شائے نے ہم کو مچھی پھٹی آنکھوں سے عثمان کو دیکھا - جن کا موڈ خاصہ بگڑا

ہوا دکھائی دے رہا تھا - عثمان نے گردن گھما کر اسے دیکھا - جس کی یہ ادا ان کے لیے

بالکل سی سی تھی - دل لوٹ پوٹ ہی تو کیا - اداکاری اب نہ کر سکے - کھٹکھٹلا کر سنہرے

دیئے - شائے کی جان میں جان آئی -

میں نہیں بولتی - آپ سے - وہ حوصلہ پا کر خشکی کے انداز میں بولی -

کیوں - عثمان نے پوچھا -

جان نکال دی میری -

ڈر گئی تھیں -

اور نہیں تو کیا -

اچھی بات ہے -

واہ جی -

ہاں ہاں - میاں کا عیب بیوی پر ہوتا ہی چاہیے - خوب ڈرایا دم کایا

کہوں گا -

ہائے اللہ - عثمان کی فیل آنکھوں کو دیکھ کر شائے شرمائی گئی -

ایک کہیں میں بیٹھے ہوئے عثمان نے ہیرے کو چائے کا آرڈر دیا۔  
 خوبصورت کہیں کے صاف تھرے میز پر دونوں آنے سامنے بیٹھے تھے۔ لطف  
 لذت کی اپنی دنیا تھی۔ خاموشی میں بھی اور باتیں کرتے ہوئے بھی سرشاری کی کیفیت  
 تھی۔ عثمان نے سگریٹ سلگایا تھا۔ اور کبھی دھوئیں کی آڑ سے اور کبھی بھونک سے  
 دھواں اڑا کر وہ اپنے سامنے بیٹھی شائے کو تمک رہے تھے۔  
 اپنی قسمت پر اپنی خوش نصیبی پر انہیں ناز محسوس ہو رہا تھا۔  
 "شائے۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں۔"  
 "آپ۔ یائیں؟"  
 "میں!۔ یقین نہیں آتا۔ کہ میں نے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پالیا ہے۔ مجھے تو  
 لگتا ہے۔ میں نے واقعی تمہیں قسمت کی لکیر دل سے چرایا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں شائے۔  
 شائے بڑے دلغریب انداز اور شانِ قفاخر سے مسکرا دی۔ اس نے سن رکھا  
 تھا کہ محبت میں لوگ دیوانے ہو جاتے ہیں۔ آج اس دیوانے کو وہ حقیقت کی دنیا  
 میں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ پر ناساں تھی۔

چائے کے بعد دونوں جیولر کے پاس گئے۔ یہ شہر کی سب سے بڑی جیولری  
 کی دکان تھی۔ ہیرے کا جتنا نفیس کام ان کے ہاں ہوتا تھا۔ اور کہیں نہ تھا۔ ان  
 کے ریٹ دوسرے جیولروں سے قدرے زیادہ تھے۔ لیکن یہ ضرور تھا۔ کہ سکہ بند  
 چیز مل جاتی تھی۔ لینے والے کو دھوکا نہیں دیا جاتا تھا۔

سیل میں کھڑے تھے۔ دکان کی مقبولیت ان سیل مینوں کی تربیت بھی تھی۔ ہر  
 گاہک کا وہ بڑی عزت سے استقبال کرتے تھے۔ کوئی چیز خریدے یا نہ خریدے  
 وہ عزت افزائی کے لیے کچھ جاتے تھے۔

عثمان اور شائے دکان میں داخل ہوئے۔ تو ایک سیل مین ان کی طرف متوجہ

ہوا۔ کچھ اور لوگ بھی خریداری میں مصروف تھے۔  
 "جی فرمائیے۔ سیل مین نے ٹوڈ ب لہجے میں پوچھا۔  
 "جہانزیب ہیں۔؟" عثمان نے پوچھا۔  
 "جی۔ اندر۔ آؤ، میں ہیں۔"  
 عثمان نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا سیل مین کو دیتے ہوئے بولے۔ "یہ ان  
 تک پہنچا دو۔"  
 سیل مین "بہتر" کہتے ہوئے اپنی سیٹ سے باہر نکلا اور کھلی طرف چلا گیا۔  
 عثمان اور شائے شوکیوں میں رکھے زیورات اور اصلی چاندی کے منقش  
 برتن دیکھنے لگے۔  
 سیل مین کی بجائے جہانزیب خود ہی باہر نکل آیا۔  
 "ہلو عثمان۔" کہتے ہوئے وہ بڑی گرمجوشی سے ان کی طرف بڑھا۔  
 "ہلو۔" عثمان نے بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔  
 "زہے نصیب آپ تشریف لائے۔" وہ انکساری سے بولا۔  
 "بس آہی گئے۔ سوچا مدت ہوئی کھال اتر دئے۔ آج آپ سے اتر دہا ہی  
 لیں۔ عثمان مسکرائے۔  
 "ادہ نہیں۔ نہیں۔" وہ کھیناز سی ہنسی ہنسا۔ "آپ کی اپنی دکان ہے۔  
 آئیے اندر چل کر بیٹھئے۔"  
 "آئیے شائے۔" عثمان نے کہا۔  
 "آپ؟" وہ شائے کی طرف دیکھ کر بولا۔  
 "میری منگیتر۔" عثمان نے کہا۔  
 "ادہ۔" وندر فل۔ آئیے آئیے تشریف لائیے۔ بہت خوشی ہوئی۔"

وہ ان دونوں کو اپنے آفس میں لے آیا۔

جیولر کا آفس تھا۔ ایئر کنڈیشنڈ اور خوبصورتی سے آراستہ تھا۔

”باہر تو ہلاکی گرمی ہے۔“ عثمان شائندہ کے قریب بیٹھے ہوئے بولے۔

جہانزیب کچھ دیر رسمی سی تکلفاتی باتیں کرتا رہا۔ مراد علی خان ان کی بیگم اور دیگر اہل خانہ کی احوال پر سی کی۔ پھر بیل بجائی۔

لازم آگیا۔

”آپ کو کپڑے لینے گئے یا سیلون آپ۔“

”سیلون آپ۔“ عثمان نے اپنے لیے کہا۔ اور آپ۔“

”سیلون آپ۔“ شائندہ بولی۔

عثمان کی جس طرح عزت افزائی ہو رہی تھی۔ شائندہ متاثر نظر آرہی تھی۔ ان کے مرتبہ اور خانہ دانی حیثیت کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔

لازم آرڈر لے کر چلا گیا۔ تو عثمان نے جہانزیب سے انگوٹھیاں دکھانے کو

کہا۔

وہ اٹھ کر باہر گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں لے آیا۔

”لپند کریں۔ اس نے بڑے احترام سے انگوٹھوں کے ڈبے شائندہ کے سامنے

رکھ دیئے اور خود اپنی کمری پر جا بیٹھا۔ شائندہ اور عثمان انگوٹھیاں دیکھنے لگے۔

بہت نفیس بہت خوبصورت اور بڑی دیدہ زیب انگوٹھیاں تھیں۔ دو تین انگوٹھیاں

تو شائندہ کو بے حد لپند آئیں۔ لیکن اس نے اپنی لپند کا اظہار نہیں کیا۔ کیا ان

کی قیمت کتنی ہو۔ اور عثمان کی قوت خرید کی حد کہاں تک ہو۔

”کوئی لپند ہے۔“ عثمان نے شائندہ سے پوچھا۔

”سبھی اچھی ہیں۔“ وہ بولی۔

”بھی سبھی لینے کی ابھی گنجائش نہیں۔“ عثمان نے مذاق کیا۔

”ہائے اللہ میں نے کب کہا ہے۔“ وہ شرما گئی۔

”فی الحال ایک لپند کریں۔“

”میری لپند ممکن ہے آپ کی لپند نہ ہو۔“

شائندہ نے ایک اداسے دلغریب سے عثمان کو دیکھا اور بولی۔ ”آپ کی لپند غیر معمولی ہے۔“

”وہ تو ہے۔“ عثمان نے پیار بھری نگاہ شائندہ پر ڈالی۔

شائندہ قیمت کے چکر سے بچنے کے لیے امرار سے بولی۔ ”بس آپ خود ہی

لپند کریں۔ مجھے کچھ تر نہیں۔“

عثمان نے وہی انگوٹھی اٹھائی۔ جس پر شائندہ کی نظر انتخاب اٹکی ہوئی تھی۔

”یہ کیسی ہے۔“ عثمان بولے۔

شائندہ دھیرے سے مسکرا کر بولی۔ ”یقین کریں مجھے بھی یہی لپند آئی تھی۔“

”پہلے کیوں نہیں بولیں۔“

”دیکھنا تھا۔ کہ ہماری لپند ایک جیسی ہے یا مختلف۔“

”اوہ۔“ عثمان کا جی چاہا کہ شائندہ کو بازوؤں میں بھر لیں۔ لیکن شوخ

اور بولتی ہوئی نگاہ پر ہی اکتفا کیا۔

لازم سیلون آپ لے آیا۔ جہانزیب نے دونوں کو پیش کیں۔ میری خود

لے لی۔

سیلون آپ پتے ہوئے شائندہ اور عثمان انگوٹھی لپند کرتے رہے۔ کبھی کوئی

انگوٹھی اس انگوٹھی کے ساتھ رکھ کر دیکھتے۔ کبھی کوئی۔ لیکن وہی نظروں میں چھپی

تھی۔ چنانچہ اسے ہی خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔

انگوٹھی کی قیمت سن کر شائے کو تو پسینہ آگیا۔ لیکن عثمان نے اس سلسلے میں کوئی بات ہی نہ کی۔ صرف اتنا کہا۔ "شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔"

"کبھی نہیں جی۔ پہلے کبھی ہوا ہے۔ آپ کا خاندان ہمارے سب سے اونچے گاہکوں میں سے تھے۔" جہانزیب بولا۔ پھر وہ عشرت بانو کی خریدی ہوئی ڈائمنڈ کی چیزوں کی فہرست گنوانے لگا۔ شائے حیرت سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ انگوٹھی خرید لی گئی۔ مالک نے سرخ پتیلیں ڈبیہ میں انگوٹھی رکھ کر عثمان کو دیتے ہوئے کہا۔ "کلی رنگ ہے۔ خدا مبارک کرے۔"

"شکریہ" عثمان نے کہا۔

"کچھ زیورات بھی لیتے ہیں۔" عثمان نے جہانزیب سے کہا۔ دو چار دنوں تک ہم پھر آئیں گے۔

"ضرور ضرور۔" اپنی پسند کی ہر چیز ملے گی۔ آپ کی اپنی دکان ہے۔

کندن۔ نورتن۔ فیروز۔ ایمر لڑھرقم کا پتھر ہے ہمارے پاس۔ بہت فنیس چیزیں بنائی ہیں ان سے۔

عثمان دو چار دن میں پھر آنے کا وعدہ کر کے دکان سے باہر آگئے۔

"گاڑی میں بیٹھے ہوئے بولے۔" آپ کے لباس بھی تیار کروانا ہیں۔ میرے خیال میں کل آجائیں گے۔

"جی۔"

"ابھی دیکھنا چاہیں تو جمیل سنر کے پاس چلتے ہیں۔"

"کل ہی۔"

"ٹھیک ہے۔ پہلے ہی دن بہت دیر لگا دی۔ تو ممکن ہے کل ماما کچھ پابندیاں لگا دیں۔ شائے مسکرا دی۔

اور عثمان گاڑی چلانے لگے۔ لیکن گاڑی گھر جانے کی بجائے اس سمت جا رہی تھی جس سمت کالج سے آنے پر جایا کرتی تھی۔

جیوندی کے کنارے۔

"گھر نہیں جا رہے۔"

"نہیں۔"

"تو پھر کدھر۔"

"ادھر۔" جدھر پہلے جاتے تھے۔ بڑی پرسکون جگہ ہے۔

شائے چپ ہو گئی۔

عثمان نے سڑک سے نیچے اتار کر گاڑی روک دی۔ پہلے خود باہر آئے۔ پھر شائے کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ باہرین کافی تھا۔ ہوا ابھی تک بند تھی۔ آسمان کے شمال مشرقی کنارے کچھ گدلائے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا آندھی آنے والی ہے۔ ماحول کا ساکن ہونا بھی بتا رہا تھا۔ آندھی آنے والی ہے۔

شائے نے آسمان کی طرف نگاہ ڈالی۔

"کوئی ڈر نہیں۔ آندھی آرہی ہے شاید۔ اچھا ہے درامو ہم خوش گوار ہو جائے گا۔"

شائے کو ساتھ لے کر عثمان ندی کے کنارے آگئے۔ ایک ٹوٹے ہوئے درخت کے تنے پر شائے بیٹھ گئی۔ یہ تناں کنارے کے ہلکے پانی میں پڑا تھا۔ اس نے پاؤں سے چلپا مار دیئے۔ آندھی کے صاف دھنات دھیرے دھیرے بستے لگاتے پانیوں کو اپنے خوبصورت پاؤں سے اچھالنے لگی۔ شلوار کے پائچے اس نے قدرے اونچے کر لیے تھے۔ اور اس کی خوبصورت جذبات انگیز منڈیاں لڑا رہی تھیں۔

پھر عثمان نے جیب سے انگوٹھی کی ڈبیہ نکالی۔ ڈبیہ کھول انگوٹھی کو محبت  
عقیدت اور احترام سے دیکھا۔

”لاڈلہ تھ۔“ عثمان نے شائندہ سے کہا

شائندہ نے ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔ فطرت سے اس کا حرف ہاتھ ہی  
نہیں سارا وجود کپکپا رہا تھا۔ عثمان نے خالی ڈبیہ جیب میں ڈالی۔ انگوٹھی کو  
ہونٹوں سے لگایا اور بڑی سنجیدگی سے انگوٹھی شائندہ کی انگلی میں ڈال دی۔  
”مبارک ہو شائندہ۔“ انہوں نے اس کا خوبصورت ہاتھ پکڑے پکڑے  
کہا۔

شائندہ نے دھیمے مسکراتے گلگاتے لہجے میں کہا۔ ”شکریہ۔“

عثمان نے اس کا ہاتھ اٹھایا۔ اور ہونٹوں تک لے گئے۔ اپنے پیار کی پہلی  
نہر انہوں نے شائندہ کے ہاتھ پر ثبت کر دی۔ جب انہوں نے شائندہ کا ہاتھ  
نیچے کیا۔ تو شائندہ کے ہاتھ کی گرفت ان کے ہاتھ پر بڑی مضبوط تھی۔

عثمان خوشی سے جھوم اٹھے۔ اور پھر دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے گاڑی تک  
آگئے۔ گاڑی چلاتے ہی انہوں نے ٹیپ بھی آن کر دیا۔ ان کا پسندیدہ مہر  
پٹنے لگا۔ عثمان بھی ساتھ ساتھ گلگتا رہے تھے۔ میں نے قیمت کی لکیروں سے  
پر لیا ہے تجھے۔

آندھی زور و شور سے آرہی تھی۔ اب اس کی پیش رو ہوائیں چلنا شروع  
ہو گئیں۔ کبھی کبھی تیزریلا بھی آجاتا۔ اور درختوں کے درمیان سے گزرتے  
ہوئے شاخیں شاخیں کا شور مچا جاتا۔

عثمان تو جیسے مہوکت کھڑے تھے۔ پر اور پنڈلیاں بھی اتنی حسین ہو سکتی ہیں۔  
یہ نیا انکشاف تھا۔

اور

پھر

یہ جان کر کہ یہ سب کچھ ان کا اپنا ہے۔ بالکل اپنا۔ ان پر مخمونا نہ سی کیفیت  
طاری ہو گئی۔ وہ آگے بڑھے اور جھک کر پانی میں نہری مچھلیوں کی طرح تیرتے  
اچھلتے کودتے پیر اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیے۔

”ہائے نہیں۔“ شائندہ نے جلدی سے اپنے پاؤں چھڑا لیے۔ یہ یقیناً  
عثمان کی شان کے خلاف تھا۔ کہ وہ اس کے پیر چھوئیں۔ نادان لڑکی ان جذبول  
سے آگاہ ہی کب تھی۔ کہ انہوں نے پیر کیوں پکڑ لیے تھے۔  
شائندہ اچھل کرتے سے اٹری پاؤں میں چپل پہن کر بولی۔ لگتا ہے آندھی  
تیزی سے آرہی ہے۔ چلیے واپس چلیں۔

عثمان نے بھی آسمان کے اس گوشے کی طرف دیکھا۔ جو گدلا گدلا سا تھا۔ دائم  
آندھی آرہی ہے۔ گدلا ہٹ اور ٹیلا رین تیزی سے بڑھ رہا تھا۔  
”آندھی سے ڈرتی ہو۔“ عثمان نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولی۔ سخت ڈر لگتا ہے مجھے آندھی اور طوفان سے۔ کیا  
خوفناک منظر ہوتا ہے۔ جیسے بدروحی ہر طرف چمکھارتی پھرتی ہوں۔

عثمان ہنس دیئے۔ ”ڈر لو کہیں کی۔“ میرے ہوتے ہوئے بھی ڈر لگے گا۔  
شائندہ نے اثبات یا نفی میں جواب نہیں دیا۔ ان کی بات پر مست شرابی کی طرح  
لہرا گئی۔ عثمان نے بازو کے سہارے اسے تھام لیا۔ شائندہ چند لمحوں بعد پیچھے ہٹ  
گئی۔ عثمان اسے مسکرا کر دیکھتے رہے۔

شانہ کا نصیب یوں کھل جائے گا۔ یادہ اتنے بڑے خاندان کی بہو بنے گی کسی کے دہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ چونکہ شادی عثمان والدین کی رضا مندی کے بغیر کر رہے تھے۔ اس لیے سب کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا تھا۔ انہوں نے بیروں نے بھی نے قصے کو خوب ہی اچھا الا۔ باتیں بنائیں۔ طنز کئے۔

لیکن  
شانہ

یا

اس کے گھر والوں کو اب کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ اپنی دھن میں مست شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

عثمان نے بھی اپنے طور سارے بند و بست کر لیے تھے۔ ان کے دوست ہادی نے میجر اشفاق سے بنگلہ کرائے پر لے لیا تھا۔ چھت کے اوپر والے کمرے میں انہوں نے اپنا ضروری سامان بند کر کے بنگلے کی چابیاں ان کے والے کر دی تھیں۔ فرنیچر قالین پر دے اور ایسی ہی دوسری چیزیں استعمال کے لیے رہنے دی تھیں۔ میجر اشفاق خوش تھے۔ کہ انتہائی معقول کرایہ بھی مل گیا اور رہنے والے بھی ڈھنگ کے لوگ ملے۔

شادی سے چند دن پہلے عثمان شانہ کو گھر دکھانے لے گئے۔

چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ نئے ساز و سامان سے آراستہ تھا۔

”جب تک ہمارا اپنا گھر نہیں بنے گا۔ ہیں اس گھر میں رہنا پڑے گا۔ عثمان نے شانہ سے کہا۔“ پسند ہے۔“

”بہت اچھا ہے۔“ وہ بولی۔

”پھوٹی سی خجنت ہوگی ہماری۔“ عثمان نے سرشار لہجے میں کہا۔

شادی کی تقریب عثمان تو سادگی سے سرانجام دینا چاہتے تھے۔ لیکن اما اور شانہ کے ڈیڈی اپنی پہلی خوشی پوری آن بان سے منانا چاہتے تھے۔ اور ایسی صورت میں جب کہ خود عثمان نے شانہ کے لیے زیورات اور لباس ہونے میں پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ وہ کیونکر سادگی پر اکتفا کر لیتے۔

تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔ ماما اور ڈیڈی دن رات تیاریوں میں لگے تھے۔ ظریفہ اور شانہ بھی خوب مصروف تھیں۔ خوشیاں رم جھم برس رہی تھیں۔ جب بھی شانہ کا کوئی ڈر لیں تیار ہو کر آتا۔ یا عثمان زیور لے کر آئے اہل خانہ کے دل فرما سرت سے جھوم اٹھتے۔

شانہ کی بہلیاں بھی مصروفیت کے ان دنوں میں کچھ ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ رشک اور حسد کی ملی کینسیت سے دوچار بھی تھیں۔ یہی حال دوسرے ملنے ملانے والوں کا تھا۔ عزیزوں رشتہ داروں کا تھا۔ دکھ اور حسد سے سینے جٹنے لگے تھے۔

ہاں ٹھیک ہے۔ جب کچھ نہیں ہو سکتا تو سوچنے سے فائدہ۔ کل بھی میں نے اپنی طرف سے کوشش کی تھی۔ لیکن امی یا ابا بات سننے کے بھی روادار نہیں۔ وہ یہی سمجھتے ہیں۔ کہ شادی کے بعد جب میں حالات سے نیپٹ نہ سکوں گا۔ تو ان کے در پر آپڑنے ہی میں عافیت سمجھوں گا۔ وہ مجھے شکست دینے کے لیے من مانی کرنے دے رہے ہیں۔

عثمان۔

لیکن شائد میں نے ساری پلاننگ کر لی ہے۔ ساری۔ میں تمہیں مراد ملالوں سے کہیں زیادہ ادنیٰ کردوں گا۔ انہیں سب کچھ کر کے دکھاؤں گا۔

میں نے سب کچھ سوچ رکھا ہے۔ سب کچھ۔ میں تمہارے لیے دنیا کی ہر سائش پاکر دوں گا۔

عثمان۔ شائد سنجیدگی سے بولی اس کا ہاتھ عثمان کے ہاتھ میں تھا۔

ہاتھ کا پورا دباؤ اس نے عثمان کے مضبوط ہاتھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔

میری چیز کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ مل گئے۔ تو سب کچھ مل گیا ہے۔

بعد اچھ نہیں چاہیے۔ یہ گھر ہمارے لیے کافی ہے۔ اچھا ہے۔

پچھنے ذہن پر کوئی بار نہ ڈالیں عثمان۔ یہ سب کچھ بھی میرے لیے بہت

بارہ ہے۔ بہت ہی زیادہ۔

عثمان نے اس کا ہاتھ سختی سے پکڑتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ شائد۔ میرے

ہاتھ تمہارے لیے کیا کچھ ہے۔ بتا نہیں سکتا۔ جی چاہتا ہے۔ دنیا

ماری سائشیں تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں۔

مجھے صحت اور صرف آپ کی ضرورت ہے۔ شائد نے سران کے کندھے

کا گھر بڑے پیار سے کہا۔

ہاں۔ وہ سرور لہجے میں بولی۔

سال ڈیڑھ سال یہاں رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد انشاء اللہ ہم اپنے نئے گھر میں

کریں گے۔ شائد وہ گھر میرے خالوں کی تعبیر ہو گا۔ اتنا خوبصورت بناؤں گا۔ اتنا

عالمی شان ہو گا۔ کہ تمہارے رہنے کے قابل دلی ہی جگہ میرے تصور میں ہے۔ مراد

مل سے بھی خوبصورت ہو گا ہمارا گھر۔

شائد کی نیلی آنکھوں سے مسکراہٹ پھوٹ رہی تھی۔

مجھے دکھ تو ہوتا ہے۔ کہ تمہیں شادی کے بعد مراد مل کی بجائے یہاں آنا پڑے

گا۔ کاش اباحضور انجی روایتی سختی سے کام نہ لیتے۔ تو آج میری خوشیوں کا رنگ

ہی ادا ہوتا۔ شائد۔ کبھی میری اپنی امی زندہ ہوتیں نا۔ تو یہ موقع آنا ہی نہ تھا۔

شائد خاموش رہی۔ عثمان کچھ جذباتی سے ہو رہے۔ یقیناً ان کے دل میں بڑی

ککھ تھی۔

.. تمہارے شان شایاں میں ایک چیز بھی نہیں ہو اسکا۔ میری شادی

والدین کرتے۔ تو۔ تو۔ شائد تم نے ہمارے ہاں کی شادیاں کبھی دیکھی تو

نہ ہونگی۔

شائد نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اتنی شاہکار ہوتی ہیں۔ کہ کیا بتاؤں۔ میں جب تمہارے بارے میں سوچتا

ہوں۔ تو اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہوں۔ تمہیں وہ رسپشن دمل سکے گا۔ جو اس

خاندان کی بھرپور کی صورت میں ملنا چاہیے تھا۔

عثمان۔ آپ اس بارے میں بالکل زبردست چاہیں۔



زارہ بھی بے حد خوبصورت تھا۔ اس کی گوشت پر جو سلے کا کام تھا دید کے قابل تھا۔

شائندہ کو ماننے اپنے رواج کے مطابق تین چاروں سے خوشبوؤں بھرے پانی سے روزانہ غسل کرانا شروع کیا تھا۔ خوشبو دار بن کا مساج کرنے کے لیے بھی خاص عورت بلائی تھی۔ یہ ساری خوشبوئیں شائندہ کے حسین جسم میں رچ گئیں۔ دلہن بنانے سنوارنے کے لیے بیوٹی پارلر سے حیدر احمد کو بلایا گیا تھا۔ شائندہ کو تو قدرت نے حسن و جمال کا مرقع بنایا تھا۔ اس پر حیدر احمد کی گھنٹوں کی کاوش، شامانہ ٹھاٹھ کا لباس اور نفیس زیورات۔ شائندہ دلہن بنی تو اس پر آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ اس شادی پر بڑی بڑی باتیں بنانے والے۔ طنز کے تیر چلانے والے اور محبت کی شادی کو بری نظر سے دیکھنے والے بھی شائندہ کے حسن کے معترف ہو گئے۔

ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ ہر طرف سے ایسی ہی صدائیں آرہی تھیں۔ عثمان نے بھی کچھ شہزادوں کی سی سج و سج نکالی تھی۔ کنوایا کی شیرانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے تھے۔ آنکھوں میں نشہ ڈول رہا تھا۔ شائندہ کو اپنا لینے کا خوشی سرشار کیئے تھی۔ مرادوں کی تکمیل خوبصورت چہرے کو بڑا دلنشیں وقار بخشنے ہوئے تھی۔ نکھار سی نکھار تھا۔ خدا جانے یہ شادی اگر والدین کے زیر سایہ ہوتی تو ان کی خوشیوں کا رنگ کیا ہوتا۔ حسن کننا حسین ہو گیا تھا۔

عثمان اپنے چند دوستوں اور ان کی بیویوں کے ساتھ آئے۔ نکاح گھر پہنچا ہوا تھا۔ ایجاب و قبول کے مراحل جلد ہی طے ہو گئے۔ مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ چوہارے بانٹے گئے اور شہرلوں میں رنگین کاغذوں میں سجائی گئی مٹھائی خوبصورت جوان لڑکیاں اٹھائے اگئیں۔ ہر مہمان کا منہ انہوں نے میٹھا کر دیا۔

عثمان نشے سے جیسے جھوم گئے۔ گھر دیکھ کر دونوں والپس آگئے۔ کھانا ہوٹل میں کھایا اور اس کے بعد کتنی ہی دیر گھومتے پھرتے رہے۔ عثمان نے شادی کے بعد مہینے بھر کا جوہر و گرام بنایا تھا۔ شائندہ کو بتایا۔

”پہلے چاروں کے لیے ہوٹل میں کرہ بک کر دیا ہے۔“ عثمان نے شائندہ سے کہا۔ تو اس کی آنکھوں میں حیا کے سائے ڈول گئے۔

”اس کے بعد ہم سوات جائیں گے۔ کالام چار دن قیام ہوگا۔ وہاں سے والپس آکر کاغان۔ پھر مری اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے کابل۔ عثمان نے شوق فراواں سے سرشار ہو کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ شائندہ کی جھکی جھکی نظروں کو پیار سے دیکھتے ہوئے عثمان نے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ اداسے دلفریبی سے مسکرائی۔

”تمہیں کچھ پتہ بھی ہے۔“ عثمان نے شوخی سے پوچھا۔ تو اس نے شرما کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

شادی کا دن بھی خوب تھا۔ ریشم تو ہوٹل میں تھا۔ لیکن اما کی بہیلیاں عزیز دوست سب گھر پہ جمع تھیں۔ شائندہ کا سامان سب کو دکھا کرنے بیٹھے بیٹھوایا گیا تھا۔ اور عثمان کے لائے ہوئے زیورات اور طربسات سب کو دکھائے جارہے تھے۔ جدید ترین لباس بھی تھے۔ اور پرانی وضع کے طربسات بھی۔ لوگ انگٹ بزدل تھے۔

عروسی جوڑا تو ذاتی دید کے قابل تھا۔ عثمان نے اپنی پسند کا بنوایا تھا۔ شاہی لباس لگتا تھا۔ لمبا چوڑا نشیو کا دوپٹہ سنہری کام سے بھرا ہوا تھا۔ کنوایا کا نرٹا

پڑا ل رکھا تھا۔ اس کے دزنی دپٹے کے پلو پڑے نو عمر لڑکیاں اس کے پیچھے کھڑی تھیں۔ کیمرو میں تصویریں لینے میں مصروف تھے۔ ہادی نے کیمرو پڑ رکھا تھا۔

”اجازت ہے جی۔ مسز رضانے ماما اور ڈیڈی سے پوچھا۔

”جی۔“ ماما نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”سپر د خدا۔“ ڈیڈی گلو گریہ لے میں بولے۔ ظریفہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”بسم اللہ۔“ مسز رضانے شائے کا ہاتھ پکڑ کر عثمان کے ہاتھ میں دے دیا۔ ”

ظریفہ نے قدم اٹھایا۔ شائے کا ہاتھ انہوں نے دھیرے سے دبایا۔ اور سہارا دے کر آگے بڑھے۔

اور پھر شائے دعاؤں کے سایے میں عثمان کے سنگ سنگ چلتی ہوٹل کے بال سے باہر آئی۔ اور پھولوں سے لادی گاڑی میں عثمان کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ ظریفہ ماما ڈیڈی ایسی جی سبھی گاڑی کے گرد کھڑے تھے۔

گاڑی ہادی نے چلائی۔ اور دوسرے دوست بھی دونوں کو ہوٹل پہنچانے اپنی اپنی گاڑیوں میں آ بیٹھے۔ عثمان کی گاڑی پر پھولوں کی پتیاں برساتی گئیں۔ ان کے رخصت ہوتے ہی مہمان بھی ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔

ہوٹل کا کمرہ پہلے سے بک کر دیا گیا تھا۔ دوستوں نے اس کمرے کو پھولوں اور رنگ دار کاغذوں نہری تاروں سے خوب سجایا تھا۔ گوجلہ عروسی دیا تو نہ تھا۔ جیسا اگر مراد محل میں شادی ہوتی تو ہوتا۔ پھر بھی دوستوں کے خلوص اور محبت کا رنگ نمایاں تھا۔

شائے کو بیڈ پر بٹھا کر رضا۔ تسنیم اور اختر کی بیویاں اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

تیز تیز موسیقی کے ریکارڈ بجے اور اس پر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے رقص کر کے خوشی کا مظاہرہ کیا۔

کھانے کے لیے سب ہوٹل پہنچے۔ پرنکنت کو انا تھا۔ سب نے سیر سو کر کھلایا۔ شائے کو بھی دلہن کی مسند پر بٹھایا گیا تھا۔ عثمان خوشی سے پھولے نہ سمارہے تھے۔ ان کے دوست انہیں ان کے انتخاب کی داد دے رہے تھے۔

یہاں بھی کچھ دیویوزک کے ساتھ پینلوں نے رقص کیا۔ ہنسی مذاق ہوا۔ فلک شگاف تہقے پڑے۔ خوشی کا اظہار ہر طریق سے کیا گیا خوشی کے ان لہجوں کو سلولائیڈ پر کیمرو میں منتقل کرنا گیا۔

ساڑھے نو بجے کے قریب ہادی نے عثمان کی طرف سے اجازت چاہی۔ ہوٹل میں ان کا کمرہ بک تھا۔ رخصتی کا مرحلہ والدین کے لیے کرب کا مرحلہ ہوتا ہے۔ ایسا کرب جس میں خوشیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ماما کا دل دھک سے ہوا۔ لیکن یہ لمحہ بھی تو آنا ہی تھا۔

”آپکی امانت ہے۔“ ماما نے گلو گریہ آواز میں کہا۔ ڈیڈی نے بھی یہی بات کہی۔

عثمان نے آگے بڑھ کر ماما کے سامنے سر جھکا دیا۔ ماما نے انہیں گلے سے لگا کر خوب خوب پیار کیا۔ پھر ڈیڈی عثمان سے لبلل گیر ہوئے۔ انکی پیشانی پر شفقت سے بوسہ دیتے ہوئے بولے۔ ”خدا تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔“

”آمین۔“ ارد گرد کھڑے لوگوں نے کہا۔ سارے مہمان شائے اور عثمان کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ شائے کو نوجوان سہاگنوں نے مسند سے اٹھایا۔ اور عثمان کے پہلو میں کھڑا کر دیا۔ وہ بید گھرائی ہوئی تھی۔ سہارے کے بغیر کھڑا ہونا ممکن نہ تھا۔ سارا بار بار۔ نے منہ تسنیم

اس کے کانوں میں جانے کیا کھسک رہی تھی۔ شائندہ تو شراباشر مار کر جھنجھکی گئی اور ان تینوں کے قہقہے بلند ہوتے رہے۔

ہادی رضا نسیم اور اختران کی شوخی اور شرارت سے مغلوط ہو رہے تھے۔ گھنٹہ بھر یہ لوگ اودھم مچاتے رہے۔

پھر ہادی نے گھڑی دیکھی۔ اور سب سے واپس چلنے کو کہا۔ بہت دقت ہو گیا۔

عثمان کی جگہ فکر آپ کو کیوں ہے۔ مسر رضا چکی

بھی وہی تو مجھے تو کہہ رہے ہیں۔ ہادی نے شوخی سے کہا۔

کہا تو نہیں تھا۔ لیکن اب کہنا پڑے گا۔ ورنہ تم لوگ تو اپنے آپ ٹٹلنے کے نہیں عثمان نے ہنس کر کہا۔

چلو بھی آج تم پر رحم فرماتے ہیں۔ اختر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ یہ بڑی تہی

اور نایاب رات ہے۔ اس کا کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔

اور تم کئی گھنٹے ضائع کر چکے ہو۔ عثمان نے کہا۔

واقعی۔ مسر نسیم بولی۔ چلو نسیم۔ باقی کل۔

سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ عثمان نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ اور انہیں چھوڑنے

باہر تک آئے۔

چند لمحوں بعد وہ کمرے میں واپس آ گئے۔ دروازہ بند کیا اور بیڈ کی طرف

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے آ گئے۔ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا ٹیپ انہوں نے آن لیا۔

ہلکے ہلکے سروں میں۔ دھیمی دھیمی آواز میں ان کا پسندیدہ مہرچاپنے لگا۔

شائندہ کا دوپٹہ بیڈ سے نیچے تک لٹک رہا تھا۔ اور وہ گھٹنوں میں سر دینے لگی

بیٹھی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ عثمان نے کئی گھنٹہ تک

قریب آ گئے تھے۔

عثمان کا دل بھی بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ انہیں یقین ہی نہ آ رہا تھا۔ کرسیاں بچ بچ ان کی زندگی میں داخل ہو چکی ہیں۔ ان کی اپنی ہو چکی ہے۔

وہ چند لمحوں کے بعد کمرے کے پاس کھڑے رہے۔ انہیں کوئی بات ہی نہ سوجھ رہی تھی۔ زبان جیسے گنگ تھی۔

میں بیٹھ سکتا ہوں شائندہ۔ انہوں نے کافی سمٹ کر کہا۔ تو شائندہ کا سر اور جھک گیا اور وہ زیادہ ہی سمٹ گئی۔

عثمان مسکراتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئے۔

شائندہ۔ انہوں نے اس کا جھکا ہوا سر اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اور جھک گئی۔

عثمان اس کے بالکل قریب ہو گئے۔ سر اٹھاؤ شائندہ۔ یوں تو تہا ہری

گردن دکنے لگے گی۔ میں کوئی اور تو نہیں۔ عثمان ہی ہوں۔ بیٹی غلط بات۔

چہرہ اٹھاؤ۔ اوں ہوں۔

عثمان جذبات سے مغلوب آواز میں شائندہ کو چہرہ اٹھانے کا کہتے رہے۔

لیکن وہ اسی انداز میں بیٹھی رہی۔

اچھا تو یہ بات ہے۔ سختی کرنا پڑے گی۔ ہوں۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں

سے اس کا جھکا ہوا سر پکڑ کر اس کا چہرہ اڑا دیا۔ شائندہ نے سر جھکانا چاہا۔

لیکن اب اس کا چہرہ عثمان کے ہاتھوں میں تھا۔ دونوں ہاتھوں میں اس

کا چہرہ تھامے وہ شدید متحیر اور اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

آنکھیں کھولو شائندہ۔ انہوں نے غمور لہجے میں سرگوشی کی۔ لیکن وہ آنکھیں

کھولنے کی بجائے سر جھکانے کی جدوجہد کرتی رہی۔ مضبوط اور جذباتی ہاتھوں

سے چہرہ چھڑانا ممکن ہی کہاں تھا۔ اصرار کی گرمی بڑھ رہی تھی۔ جوش جذبات اور دلالت تو مندر تھے۔ شائندہ نے پل بھر کو آنکھیں کھولیں۔ اور بند کر لیں۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر بڑی خوبصورت تھی۔

”شائندہ — میری زندگی۔ عثمان کے لبوں سے مہم سہی آواز نکلی۔ ان کا سر جھکا اور انہوں نے اپنے ہونٹ شائندہ کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ جذبات کی ساری حدت، عشق کی ساری حرارت اور پیار کی ساری حلاوت انہوں نے ان ہونٹوں میں جذب کر دی۔

اور

پھر انہوں نے

سہاگ رات کے نشاط افروز لمحوں کا ہزارواں حصہ بھی ضائع نہیں کیا۔ لمحے لمحے کا رس پھوٹا۔ پل پل سے خوشی کشیدی۔ اپنی شوریدہ سرخوشیوں کو پوری پوری طرح بکنے دیا۔ ساری رات آنکھوں ہی میں گذر گئی۔

اور

جب دن کی پہلی کرن نے کمرے میں گھس آنے کی جسارت کی۔ تو دونوں کو ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے بے خبر سوتے پایا۔

تین دن ملٹن ہوٹل میں قیام اور دعوت و لمیہ سے فارغ ہو کر عثمان اور شائندہ سوات روانہ ہو گئے۔ دو دن سید و شریفین میں رکے اور پھر کالام چلے گئے۔ اونچے اونچے اونچے فلک بوس پہاڑوں سے گھری یہ جگہ قدرت کے حسن کا شاہکار تھی۔ خاموش اور پرسکون فضا کو دریائے سوات کا تیز بریلا پانی اپنے شور اور غراہٹوں سے ہی توڑتا تھا۔ لیکن یہ شور اور غراہٹیں بھی اس قدر قی حسن کا ایک حصہ تھیں۔

چھوٹے سے ریسٹ ہاؤس میں دونوں مقیم تھے۔ شائندہ کو یہ جگہ بہت ہی پسند آئی تھی۔ اس لیے تین دن کی بجائے سات دن یہاں رکنے کا پروگرام بنا تھا۔

دونوں زیادہ وقت تو اپنے کمرے ہی میں گزارتے۔ انہیں تو جیسے ارد گرد کا ہوش ہی نہیں تھا۔ محبت کے متوالے ایک دوسرے کو پا کر دنیا و مافیہا سے

شانہ نہیں پڑی۔

- یوں ہنسو گی۔ تو ضرور ہی گریں گے۔

- کیوں۔

- بس۔

- بس کیوں۔

- ہنسنے ہوئے تم اتنی پیاری لگتی ہو۔ کہ میرا سارا دھیان تمہاری طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ راستہ دیکھنے کی بجائے تمہیں دیکھنے لگتا ہوں۔

- مانی۔

- ہوں۔

- بیٹھیں یہاں۔

- یہاں کہاں۔

- اس تہ پر۔

- اتنی ڈھلان پر۔ یہ تہ پر لڑھک گیا تو۔

- نہیں لڑھکے گا۔

- سر تسلیم خم ہے حضور۔ موت کے منہ میں جانے کا حکم بھی دیں گی تو بندے کو غدار نہ ہوگا۔

عثمان ایک بڑے سے تہ پر بیٹھ گئے۔ شانہ ان کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی ان کی گردن میں بازو ڈالتے ہوئے بولی۔ مانی۔ ایک بات پوچھوں۔

- پوچھو۔ عثمان نے اس کی۔ کر میں بائیں ڈال کر اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

- کیا آپ واقعی مجھے اتنا پیار کرتے ہیں۔

بھولے جا رہے تھے۔

کبھی کبھی تو عثمان کو بے تعینی سی ہوتی۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتے۔ کہ کیا واقعی انہوں نے اپنا گوہر مقصود پایا ہے۔ کیا حقیقتاً شانہ ان کی ہو چکی ہے۔

ان کی اپنی۔ بالکل اپنی۔

اس دن دھوپ نکھر رہی تھی جس سے موسم نکھر آیا تھا۔ شانہ اور عثمان

آج دریا کے کنارے تصویریں اتارنے جا رہے تھے۔ کیمرو عثمان نے کندھ پر

لٹکا رکھا تھا۔ شینو نے جو ٹیلا سرخ فلیپر۔ پلے جرسی اور سرخ سیرینڈ لگا رکھا تھا۔

دونوں منبیل منبیل کر نیچے اتر رہے تھے۔ کہیں دریا پاؤں اونچا نیچا پڑ جاتا۔

تو دونوں لڑکھڑاتے جاتے۔ لیکن ایک دوسرے کے ہمارے کرنے سے بچ

جاتے۔

- شینو۔ عثمان نے کہا۔ شانہ پیار میں اب شینو بن چکی تھی۔ اور عثمان بھی

اب شانہ کے لیے مانی تھے۔

- شینو۔

- جی۔

- اگر ہم نے ایک دوسرے کا سہارا نہ لیا ہوتا تو اس ڈھلان سے پھسل کر سید

دریا برد ہو سکتے تھے۔

- ہائے مانی۔ کتنی بری بری باتیں سوچتے ہیں آپ۔

- بری یا اچھی۔

- پھسلنا اور دریا برد ہونا اچھی بات ہے۔

- میں نے ساتھ اگر کالفظ استعمال کیا ہے۔ اور سہارے کی افادیت دیا

کی ہے۔

کتنا۔  
- جتنا اظہار کرتے ہیں۔  
- اوں ہوں۔

عثمان نے سرفری میں بلایا۔ تو شائے کے دل کی دھڑکن جیسے تم گئی۔  
- کیا؟ - وہ حیران ہو کر بولی۔  
- جو تم نے پوچھا ہے ناشینو۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ عثمان نے شوخی سے کہا۔

- کیا واقعی آپ مجھے اتنا پیار نہیں کرتے جتنا ظاہر کرتے ہیں۔  
- ہاں۔ میں جھوٹ بولنے کا عادی نہیں۔ صاف گو آدمی ہوں۔ سچی بات کہہ رہا ہوں۔

شائے کا چہرہ کچھ بے رنگ سا ہو گیا۔ اس کا منہ بن گیا۔ بڑی روٹھی روٹھی نظروں سے عثمان کو دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو مجھے یہ امید نہ تھی۔ کہ تم ایسا حوصلہ شکن جواب دو گے۔

اس نے آستکی سے عثمان کے گلے سے بائیں نکال لیں عثمان نے بھی اس کی کمر سے باز والاگ کر لیے۔ اور اٹھتے ہوئے بولے۔ ان کی آنکھوں میں شوخی چل رہی تھی۔ لیکن چہرہ بخیرہ بنا کر کھا تھا۔

- بس اتنا ہی پوچھنا تھا۔  
- وہ کچھ نہیں۔  
- شینو۔

وہ اب بھی چپ رہی۔  
- کیا ہو گیا ہے۔ عثمان نے روٹھی روٹھی شائے کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

وہ اداس سی نظر آنے لگی تھی۔ عثمان کو بڑا لطف مل رہا تھا۔

- کھڑی کیوں ہو۔ نیچے نہیں جانا۔ عثمان نے چھیڑا۔

- چلے۔ وہ بے حد اداس ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی رووے گی۔ عین کا یہ انداز جس جس طرح عثمان کے دل پر وار کر رہا تھا۔ لطف و مسرت کے جذباتوں سے وہ سرشار ہوئے جا رہے تھے۔

- لاؤ ہاتھ پکڑاؤ۔ عثمان نے شائے کو قدم اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔  
- وہ چپ چاپ نیچے اترنے لگا۔

- سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ عثمان نے اس کے پیچھے پیچھے اترتے ہوئے پوچھا۔

وہ اب بھی کچھ نہیں بولی۔ سنجیدگی سے خفا ہو گئی۔

- روٹھ گئی ہو شینو۔ عثمان نے اس کے برابر آتے ہوئے پوچھا۔

- روٹھنا کس بات پر۔ وہ بے رخی سے بولی۔

- بھی تمہارا موڈ کچھ بگڑ گیا ہے۔

- آپ کا تو ٹھیک ہے نا۔

- جب تک دونوں کا ٹھیک نہ ہو نیچے جانے کا فائدہ۔؟

شائے رک گئی۔ خند لہے چپ چاپ کھڑی رہی۔ عثمان نے جلدی سے کیمرو نکالا۔

- اور شائے کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کی تصویر لے لی۔

- یہ تصویر یاد گار ہوگی۔ عثمان کیمرو بند کرتے ہوئے مسکرائے۔

- کیوں۔

- جناب کا موڈ جو آف ہے۔ دو فٹ لمبا چہرہ آنے کا نا تصویر میں۔

- آپ سے کس نے کہا تھا تصویر لینے کو۔

”میرے دل نے“

”ضرورت کیا تھی“

”نور اچھا تھا“

”مجھے بتائے بغیر کیوں لی تصویر“

”ادھر“ ”مخترمہ“ ”بھولیے نہیں“ میں آپ کا شوہر ہوں۔ اور لیے

ایسے بیمار تھی رکھتا ہوں جناب پر“

”جی۔ بڑے آئے۔“ ”حق جتانے والے“ ”وہ اب تو باقاعدہ خفا ہو گئی تھی۔“

”شیونو“

”ادشینو“

”شیونو۔ بھری ہو گئی ہو۔ سستی نہیں۔ میں بلارہا ہوں“

”فرایئے حضور۔“

”شانہ نے غصیلنگاہ ان پر ڈالتے ہوئے بڑے طنز سے کہا۔“

”کوئی جڑی بوٹی تو نہیں کھائی بیباں سے۔“ ”عثمان نے سنجیدہ جتنے ہوئے

اسے چھیڑا۔“ ”غصہ کس بات کا ہے“

”آپ نے نیچے جانا ہے یا میں واپس جاؤں“ ”وہ عثمان کی بات اُن سی کرتے

ہوئے بولی۔“

”عثمان پھر ڈٹ کر تھپڑ پر بیٹھ گئے۔“

”پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں ایک ایسی ہو گیا کیا ہے۔“

”آپ کو اس سے کیا۔“

”کیوں۔ ہم نے قطع تعلق تو نہیں کر لیا۔“

”میرے ہاں آپ کی باتوں کا کوئی جواب نہیں۔ میں واپس جا رہی ہوں۔“

”کہاں۔“

”کمرے میں۔“

”وہ تیزی سے اوپر چڑھنے لگی۔ ناہوار جگہ پر قدم نبھل نبھل کر رکنا پڑ

رہا تھا۔ کنکر پتھر اور مٹی کئی جگہ سے کھسک جاتی اور لڑھکتی ہوئی دھلان سے

نیچے چلی جاتی۔“

”عثمان نے اس کی۔ اوپر چڑھتے ہوئے ایک اور تصویر لے لی۔“

”پھر وہ خود بھی اسٹے۔ اور شانہ کے پیچھے پیچھے اوپر چڑھنے لگے۔“

”انہوں نے دو ایک دفعہ شانہ کو بلایا بھی۔ لیکن اس نے کوئی جواب دیا۔“

”شانہ ہمارا تصویریں لینے کا پروگرام تھا۔“

”ضرورت نہیں مجھے۔“

”بتاؤ گی نہیں کہ تمہیں ہوا کیا ہے۔“

”کچھ نہیں ہوا۔“

”رو کیوں رہی ہو۔“

”شانہ نے گھر دن موڑ کر غصے سے عثمان کو دیکھا۔ جو بڑی دھڑائی سے

اسے چڑائے جا رہے تھے۔ شانہ اوپر پہنچ گئی۔ وہ سیدھی رلیٹ ہاؤس کی

لڑن تیز قدموں سے چل دی۔“

”عثمان بلندی پھلانگ کر اوپر آئے اور لمبے لمبے دگ بھرتے اس کے پیچھے پلکے۔“

”ذاتی ہی مذاق میں معاملہ کچھ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ عثمان شانہ کی سادگی اور بھولے پن

پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ اور اس کے اس رویے سے لطف بھی لے رہے تھے۔“

”شانہ براؤسے تک جا پہنچی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئے۔ شانہ نے دروازہ

کولا اور اندر چلی گئی۔“

”تمہاری تصویر لڑی۔“ عثمان نے پوچھا۔  
 ”ہاں اٹکل۔“ سب بچے بیک وقت بولے۔  
 ”جو آپ کے ممی ڈیڈی ناراض ہوئے تو۔“  
 ”نہیں ہوئے۔“

”جائیے پہلے اجازت لے کر آئیں۔“

بچے بھاگے اور رلیٹ ہاؤس کے پچھلے کمروں کی طرف گئے۔ توڑی ہی دیر  
 بعد بچے اچھلتے کودتے واپس آگئے۔ فونی اور ثمرہ اپنی اپنی اور گلی اپنے ڈیڈی  
 کو بھی ساتھ لے آئے۔

یول رلیٹ ہاؤس کے باقی کمینوں سے عثمان کا تعارف ہو گیا۔ بچوں کی  
 تصویریں لے کر وہ اپنے نئے دوستوں سے باتیں کرنے لگے۔  
 گلی کے ڈیڈی نے کیریاں باہر منگوالیں۔ دھوپ بڑی شاندار تھی۔ فونی اور  
 ثمرہ کے ڈیڈی بھی باہر آ گئے۔

ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ کلام کے حن کی باتیں بھی ہوئیں اور اپنے  
 اپنے کمروں کی بھی۔ فراغت اور سکون کے لیے یہ لوگ دو تین دن کے لیے یہاں  
 آئے ہوئے تھے۔

”آپ اکیلے ہی آئے ہوئے ہیں۔“ ثمرہ کی ممی نے پوچھا۔ تو عثمان مسکرا کر  
 رلے۔ ”ہماری شادی کو ایک مہینہ ہی ہوا ہے۔“ شائے کی طبیعت کچھ اچھی نہیں  
 ہو کر ہے میں۔“

”اوہ بہت اچھی بات ہے۔“ آپ ہمیں ان سے ضرور ملو ایسے گا۔“ فونی کی  
 کانے کہا۔

”آپ کا قیام کب تک ہے۔“

پہلے تو عثمان نے بھی اس کے پیچھے ہی اندر جانے کا سوچا۔ لیکن شوخی اسکا  
 یہی تھی۔ لطف کے اس انوکھے تجربے کو ذرا طول دینا چاہتے تھے۔ برآمدے  
 میں کھڑے کھڑے شائے سے پوچھا۔ ”کیا ارادہ ہے بیٹی۔“ تسریں نہیں اترائیں۔  
 ”نہیں۔“ وہ غصے سے بولی۔

”میں اکیلا چلا جاؤں۔“ کچھ مناظر ہی کمرہ بند کر لوں۔“ عثمان بڑے تحمل کا اظہار  
 کر رہے تھے۔

”مجھے کیا پوچھتے ہیں۔“ جائیے۔“ وہ پہلے سے زیادہ تلخ لہجے میں بولی۔  
 عثمان مسکرا دیئے۔

اور

پھر

اندر جانے کی بجائے برآمدے سے باہر نکل آئے۔ رلیٹ ہاؤس کے پچھلے  
 طرف والے میدان میں چلے گئے۔

یہاں ایک ایرانی جوڑا چل قدمی کر رہا تھا۔ کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ اور پارٹی  
 مزدور ٹکڑیوں کے گٹھے سردیوں پر انھوں نے پچھلے چھوڑی کالی کالی چھتوں والے  
 کچے مکانوں کی طرف جا رہے تھے۔

عثمان نے بچوں سے دوستی کرنے کا سوچا۔ وہ ان کے درمیان آن کھڑے  
 ہوئے۔

”آپ کا نام۔“ آپ کا نام۔“ انہوں نے باری باری سب  
 بچوں سے پوچھا۔ بچے کھیل چھوڑ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اپنا اپنا بتایا۔  
 فونی۔ ثمرہ۔ پوپ۔ گلی۔ جی سب بچے ان سے جلد ہی فری ہو گئے۔ اپنے اپنے  
 ممی ڈیڈی کے متعلق بھی بہت کچھ انہیں بتا دیا۔



اپنی طرف گھایا۔ اور سنس دیئے۔

شانہ نے غصے سے ان کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

- پاگل سی لڑکی - عثمان نے اس کا رخ اپنی طرف موڑ کر اس کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے اپنا چہرہ اس کے چہرے سے لگا دیا۔

- بیٹے - وہ اب بھی غصے میں تھی۔ لیکن عثمان کو شہا لینے کی سکت اس کے نازک وجود میں کہاں تھی۔

- بہت بے وقوف ہو شیونو - عثمان اسے پیار کرتے ہوئے۔ اور پھر کتنی ہی دیر اسے مانتے رہے کہ گدگداتے رہے۔

- اب تمہاری موٹی عقل میں میری بات ہی نہ آئے تو میرا کیا قصور - وہ مکتلاتے ہوئے بولے۔

- بات جو بڑی اچھی کی تھی نا - وہ کچھ کچھ من گئی۔

عثمان کھلکھلا کر سنس دیئے پھر بولے۔ شانہ میں اب بھی کہتا ہوں۔ کہ جتنا میں اظہار کرتا ہوں۔ اتنا پیار نہیں کرتا۔

شانہ نے اپنے اوپر جھکے ہوئے عثمان کو غصے سے پرے دھکیلنا چاہا۔ لیکن عثمان نے اس پر پورا ڈبا ڈال کر سننے ہوئے کہا۔ کتنی بے وقوف لڑکی ہو تم۔

- ہوں - اس نے منہ پر سے شانے کی کوشش کی۔ تو عثمان نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں پکڑ کر کہا۔ شیونو میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں تمہیں کتنا پیار کرتا ہوں۔

اس کے ماننے کا کوئی آلہ اب تک ایجاد ہی نہیں ہوا۔ یہ اظہار تو اس پیار کا ہزاروں حصہ بھی نہیں شینے۔ جو میں تمہیں کرتا ہوں۔ کیا سمجھیں؟ -

- کچھ نہیں۔ شانہ اتراتے ہوئے مسکرائی۔

- تمہارے کچھ ہی نہ سمجھا کرو۔ یونہی روٹھا رہا کرو۔ خدا قسم جواب نہیں

- پرسوں والی ہے۔

- پھر تو ضرور ملاقات کروادیں گے آپچی۔ شانہ بھی بہت خوش ہوں گی آپ سے مل کر۔

عثمان نے نعت گھنٹہ ان لوگوں کے ساتھ گزارا۔ پھر نئے کا وعدہ کر کے دوسری طرف نکل گئے۔ بے مقصد گھومتے پھرتے رہے۔ جنت کش پہاڑیوں سے بھی انہوں نے کچھ دیر باتیں کیں۔

کافی وقت یونہی گزار کر وہ اپنے کمرے کی طرف آئے۔ دروازہ آہنگ سے کھولا۔ اور چورسی نظر شانہ پر ڈالی۔ وہ بیڈ میں ادھڑی پڑی تھی۔ منہ

تکیے میں دے رکھا تھا۔ اور کبل سے سارا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔

شانہ دبے دبے قدموں سے بیڈ کے قریب آئے۔ جھک کر اسے دیکھا۔

- شینو - انہوں نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ وہ کندھے ہلا کر اسی طرح پڑی رہی۔

عثمان نے اس کا کندھا ہلایا۔ شینو:

وہ اب بھی چپ رہی۔

عثمان ٹی پی پر بیٹھ گئے۔ شینو کی لپٹ ان کی طرف تھی۔ انہوں نے اس پر جھکے ہوئے اس کے چہرے سے نیچے شہانا چاہا۔ لیکن اس نے چہرہ باہر نہیں نکالا۔

عثمان نے سختی سے نیچے پکڑ کر پرے ہٹایا۔ تو شانہ نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا۔

عثمان کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ واقعی روتی رہی تھی۔ اس کا چہرہ ناک اور آنکھیں سرخ اور بھیگی ہوئی تھیں۔ عثمان کو اس پر اتنا پیار آیا اتنا پیار۔

تہی چاہا اسے سینے میں چھپالیں۔ اس پر پوری طرح جھکے ہوئے اس کا چہرہ

تمہارے اس انداز کا - عثمان بولے -  
 " بہت اچھی لگتی ہوں " وہ کھلکھلا کر سنہیں پڑی -  
 - بہت بُری - عثمان اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے -  
 پھر کتنی ہی دیر دونوں پیار کا مہلی اظہار کرتے رہے -

کالام نے والپی پریسید و شریف میں دونوں کچھ گھنٹے ٹھہرے۔ یہاں کی علاقائی چیزیں عثمان کو بہت پسند تھیں۔ چاندی کے زیور اور کوچی ڈریس انہوں نے ٹائڈ کے لیے خریدے۔

دو دن پشاور میں بھی قیام کیا۔ خریداری کی۔ لیکن گرمی کے پیش نظر زیادہ دن یہاں رہ نہ سکے۔ ایک ہفتے کے لیے کابل بھی گئے۔ واپس آنے مری چند گئے گذارے پھر ایبٹ آباد گئے۔ یوں پھرتے پھرتے کافان جا پہنچے۔

یہاں بھی قدرت نے حسن کے انمول خزانے لٹائے تھے۔ یہ جگہ کالام سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ سرسبز علاقہ گلاب کے پھولوں کے قدرتی تختے اور درونچے پتیا ہوا ٹھنڈے یخ بستہ پانی کا دریا۔ حدنگاہ تک حسن ہی حسن تھا۔ خوبصورت پس منظر میں عثمان نے شائندہ کی بے شمار تصویریں لیں۔ شائندہ نے ٹان کے عکس سلولا ٹیڈ پتارے اور بہت سی تصویریں دونوں نے اکٹھی لیں اُسے رومانوی پوز بنانا کر۔ بڑے حسین انداز اپنا اپنا کر۔ کیمرے کی آئینہ

- نہیں ابھی موڈ بن رہا ہے -

- میرا موڈ باہر جانے کا ہے -

- میرا گھر بیٹھنے کا - خط لکھ بہت دن ہو گئے -

- آکر لکھا جاسکتا ہے -

اسی بات پر دونوں کی تکرار ہو گئی۔ عثمان کو شائے پر غصہ آگیا۔ کتنا دل چاہ رہا تھا ان کا اس وقت باہر گھومنے کو۔ ماما کے خط کو اس نے ترجیح دی تھی۔ ماما کو وہ اس کی خاطر ماں باپ رشتے دار سب کو چھوڑ چکے تھے۔ ملال قدرتی تھا۔ وہ اکیلے باہر چلے گئے۔

شائے نے بھی کوئی پروا نہ کی۔ وہ ماما کو خط کھینے بیٹھ گئی۔ اپنی سردار اور شاد زندگی کی پوری تصویر اس نے الفاظ میں کھینچ دی۔

خط بند کر کے وہ عثمان کا انتظار کرنے لگی۔ وہ نہیں آئے۔ شام اندھیروں میں ڈوب رہی تھی۔ سردی کافی بڑھ گئی تھی۔ اور بادباراں کے طوفان کی آمد آمد تھی۔ وہ گھر آکر کمرے سے نکلی۔ برآمدے میں کھڑی ہو گئی۔

لیکن

وہ نہیں آئے۔ تو وہ چوکیدار کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسے عثمان کو بلانے کے

لیے بھیجا۔

عثمان سامنے والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کراچی سے آئے ہوئے کچھ فوجوان میں کھیل رہے تھے۔ ان سے علیک سلیک آج صبح ہما ہوئی تھی۔ وہ انہیں بھی کھیل میں شامل کرنے پر مصر ہوئے۔ شرط خج کے بہترین کھلاڑی تھے عثمان۔ سب کھیل میں اتنے محو ہوئے کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ نوبت کے قریب چوکیدار انہیں ڈھونڈتا ہوا ادھر آیا۔ بیگ صاحب کی پریشانی کا بتلاتے ہوئے

جن کے اک اک انداز کو متعید کرتی رہی۔

دونوں بے انتہا خوش تھے۔

سارا دن دونوں یا تو دشوار گزار راستوں پر چڑھتے رہتے۔ یا کمرے میں بند

ہو کر محبت کے نغمے لاتے رہتے۔

کبھی کبھی لڑائی بھی ہو جاتی۔ شائے کسی بات کا برامان جاتی۔ تو منہ پھلائی

عثمان اسے منا لیتے۔ پیار کرتے اور اپنی بے مثال محبت کا یقین دلاتے۔

کبھی عثمان کو کسی بات پر غصہ آجاتا۔ تو وہ چپ کار روزہ رکھ لیتے۔ یہ لمحات

شائے کے لیے انتہائی اذیت ناک ہوتے۔ لیکن وہ جلد ہی اپنی غلطی کا اعتراف

کر کے منا لیتی۔

خینکھی۔ چند گھنٹوں پر ہی محیط ہوتے۔ اس سے زیادہ برداشت کی طاقت

عثمان میں ہوتی نہ شائے میں۔

اس شام بالکل معمولی سی بات تھی۔

- شینے -

- جی -

- چلو باہر چلیں -

- نہیں -

- فردپ آفتاب کا منظر دید کے قابل ہے -

- میں نہیں جاسکتی -

- کیوں -

- ماما کو خط لکھنا ہے -

- آکر لکھ لیا۔ پوسٹ تو صبح ہی ہوگا -

انہیں فوراً ان کے پاس جانے کی تاکید کی۔

عثمان اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں شانہ کی پریشانی سے کوئی توہوئی۔ لیکن اس سے ناراض جوتھے۔ یہ سزا دینا ہی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آگئے۔ ناراضگی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ شانہ بے اختیار ان کی طرف بڑھی۔ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شاکی انداز میں بولی۔ کوئی اس طرح بھی کرتا ہے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر آپ کہاں چلے گئے تھے۔

عثمان نے سرد مہری سے اسے دیکھا۔ کپڑے تبدیل کیے اور آکر لیٹر میں پڑ گئے۔

کھانا نہیں کھائیں گے۔ شانہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔  
نہیں۔ انہوں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ تو شانہ ہم گئی۔ اتنے غصے میں تو اس نے آج انہیں ہلکی بار دیکھا تھا۔ اس نے دو تین بار پمنت کھانا کھانے کے لیے انہیں کہا۔ لیکن جواب نفی میں ملا۔

شانہ نے خود بھی کھانا نہیں کھایا۔ ٹرے دلیے کی ویسے پڑی رہی۔  
بیڈ ایک ہی تھا۔ شانہ کپڑے تبدیل کر کے آئی۔ کتنی سی دیر کھڑی رہی۔ پھر ایک ٹی پرائسنگ سے بیٹھی۔ اور کنارے ہی کے اوپر لیٹ کر گھبراہٹ سے  
یہ سرد ترین رات تھی۔ پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں سے پھل پھل آنے والی مہربان تند جھکڑ بن رہی تھیں۔ مین کی چتو سے ٹھکر ٹھاکر شاں کرتے گذرنے لگی تھیں۔ بادل بھی گہراے تھے۔ اور دور بہت دور بجلیاں لہرا لہرا کر گرنے کو مچل رہی تھیں۔ کبھی کبھی ان کی خوفناک کرٹک دل کو دھلا دیتی۔  
دونوں روٹھے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف پشتیں کیے کناروں کی طرف

بٹے ہوئے تھے۔ شانہ کو روتا آ رہا تھا۔ بھلا اتنی بڑی کونسی بات ہو گئی تھی۔ جو عثمان نے یوں آنکھیں پھیر لی تھیں۔ وہ چپکے چپکے رونے لگی۔

نیز عثمان کو بھی کہاں آ رہی تھی۔ شانہ رو رہی تھی۔ انہیں علم تھا۔ لمحوں کے توقف کے بعد ہلکی ہلکی شوشوں کی آواز عثمان کو آ رہی تھی۔

لیکن وہ پہل کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ قصور شانہ کا تھا۔ منانا اسے ہی چاہیے تھا۔ انہیں شانہ کے رونے سے بے حد الجھن ہو رہی تھی۔ سمجھ نہ پارہے تھے۔ کردہ کیا شے ہے۔ خود روٹھے پھر بھی رونے لگتی ہے۔ اور جو عثمان روٹھیں پھر بھی آنسو بہانے لگتی ہے۔

شانہ نے آنسوؤں کا حربہ کارگر نہ دیکھا۔ تو جھلا کر کئی بار ادھر سے ادھر کر وٹیں بدلیں۔ اسے بھی اب عثمان پر غصہ آ رہا تھا۔ نہیں بولتے نہ بولیں۔ اس نے جھلا کر سوچا۔ اور سو جانے کی کوشش کی۔  
دونوں نے آج کی خفگی کو انا کا مسئلہ بنالیا۔

لیکن

قدرت مسکرا رہی تھی۔ دونوں کی انا کا بھرم اس نے رکھ لیا۔

بادل زور زور سے گر جا اور بجلی کہیں تڑپ کر گرہی۔ ایک خوفناک گرج اور دلا دینے والا دھماکا ہوا۔ طوفان سے ڈرنے والی شانہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ غضب تو یہ ہوا۔ کہ بتی بھی بند ہو گئی۔ شانہ لڑتے ہوئے زور زور سے رونے لگی۔ تو عثمان کے شفق ہاتھوں نے اسے تھام کر اپنے ساتھ لگالیا۔ اپنے بازوؤں میں بیٹھے ساتھ لگائے وہ اسے یوں تھکے رہے جیسے ننھی میا بچی ہو۔ وہ کتنی ہی دیر کانپتی رہی۔ ڈرتی رہی۔ لڑتی رہی۔ اور عثمان کی چپاتی میں منہ چھپا کر روتی رہی۔ عثمان اسے جوشیلے انداز میں پیار کرتے رہے۔

کیا بتاؤں۔

اگر میں مرجاؤں تو۔

پہلے آپ بتائیں کہ اگر میں مرجاؤں تو آپ کیا کریں گے۔

پہلے میں نے پوچھا ہے۔

کیا ہوا۔

نہیں پہلے تم بتاؤ۔

عثمان شوخی سے مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے بازو شانہ کی کمر میں جمائی کر کے اپنے ساتھ لگالیا۔

بتاؤ نا۔

پہلے آپ بتائیں۔

میں بتاؤں گا۔ لیکن پہلے تم بتاؤ۔

خدا کرے جو ایسا موقع آئے۔

خدا کرے یا نہ کرے یہ دوسری بات ہے۔ یونہی پوچھ رہا ہوں۔ مرتے توڑا ہی جا رہا ہوں۔ وہ ہنس کر بولے۔

ہوں۔

شانہ نے اپنا سران کی گود میں رکھ دیا۔ ابر بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔

میں آپ کے ساتھ ہی مرجاؤں گی۔

عثمان کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ انہوں نے شانہ کے بالوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ میری زندگی ہونا۔

شانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بالکل۔

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتے رہے۔ شانہ

یہ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ان کی محبت کو مضبوط اور مستحکم بنا رہی تھیں۔ دونوں کو احساس ہو جاتا تھا کہ ایک دوسرے کے لیے وہ لازم و ملزوم ہیں۔ زندہ رہنا تو ایک طرف وہ تو ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

اس دن دونوں کچھ الٹی ہی بنے تکی اور بے سرو پامی باتیں کر رہے تھے۔ دونوں کا موڈ بڑا خوش گوار تھا۔ ہنستے ہنستے بے حال ہو رہے تھے۔

بڑی نہری دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ گلاب کے پھولوں کے تختوں کے چوڑے بیج سرسبز جگر پر دونوں بیٹھے تھے۔ چمکتا ہوا دن تھا۔ ہوا بند تھی۔ اور فضا میں کچھ حرارت سی آگئی تھی۔

شانہ۔ عثمان نے شانہ کو پیار سے بلایا براؤن شارٹ سکرت مسٹرڈ بلاؤڈ اور مسٹرڈ چپڑے کے لائنگ بوسٹ پہنے۔ وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ بالوں کا انڈونیشی سٹائل جوڑا بنانے سے اس کی گردن کی خوبصورتی نمایاں تھی۔

مانی۔ شانہ نے جیسے عثمان کی نقل اتاری۔

دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

شینو ایک بات بتاؤ۔

کہیئے۔

میں اگر مرجاؤں۔ تو تم کیا کر دو گی۔

شانہ نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اللہ کرے۔ کیسی بری بری باتیں منہ سے نکالتے ہیں آپ۔

عثمان نے اس کے ہاتھ کو دانتوں سے ہلکا سا کاٹ لیا۔

اوی۔ شانہ نے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ اپنا ہاتھ ملتے ہوئے عثمان کو دیکھنے لگی۔

بتاؤ نا۔

روک کر جلدی سے کہا۔

ثانی۔۔۔ شائندہ نے ان کے سینے پر دونوں ہاتھ زور سے مارے۔  
عثمان کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ شائندہ بھی ہنسنے لگی۔ وہ اٹھ بیٹھی اور شاکی انداز  
میں عثمان کو دیکھ کر بولی۔ "مرد ہوتے ایسے ہی ہیں۔"

عثمان بولے۔ "دیکھیے جناب مذاق کی بات ہو رہی ہے۔ موڈ بگڑ نہ جائے۔  
دیے کوئی خاص ہرچ تو نہیں۔ تم تو مری بچی ہو گی۔ میں جو چاہے کرتا پھر دوں۔"  
"ہوں۔" شائندہ نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر کہا۔ "میرا نام بھی شائندہ ہے۔"  
آپ نے ایسی حرکت کی تو قبر سے بھی نکل آؤں گی۔

عثمان ہنسنے ہنسنے دوہرے ہو گئے۔ پھر نہی کو روکتے ہوئے پوچھا۔ "قبر  
سے نکلی کر کیا کر لو گی؟"

اس ڈائن کا گلا دبوچ دوں گی۔ اور آپ کو۔ آپ کو زندہ ہی قبر میں گھسیٹ  
کر لے جاؤں گی۔ وہ ہنس پڑی۔ عثمان کا ہنسنے ہنسنے برا حال تھا۔

توبہ۔ توبہ۔ کیسی خطرناک ہو تم۔ مگر کبھی چین نہ لینے دو گی۔ وہ رد مال  
سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولے۔ زیادہ ہنسنے سے آنکھوں سے پانی نکلنے  
لگا تھا۔

آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ کس سے پالا پڑا ہے مانی۔ شائندہ نے ہنس کر کہا۔  
"اپنی جان اپنی روح اپنی زندگی سے۔" کہتے ہوئے عثمان نے شائندہ کو پکڑنا چاہا۔  
لیکن وہ جلدی سے اٹھ بھاگی۔ عثمان بھی اس کے پیچھے لپکے۔  
دونوں کے حسین اور پر مسرت قہقہے گونجنے لگے۔

ان کی گود میں سر رکھے گھاس پر ہی لیٹ گئی۔

اب آپ بتائیے۔ شائندہ ان کی مائی سے کھیتے ہوئے بولی۔  
کیا۔ عثمان شوخ نگرہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔  
"میں مرجاؤں تو آپ کیا کریں گے۔"

"بتاؤں۔"

"ہاں۔"

"نہیں بتاتا۔"

"کیوں جناب۔ اپنی دفعہ یہ بے ایمانی۔ پچ پچ بتائیے۔"

"ہوں۔ پچ پچ۔"

"ہاں۔"

"تم مگر گنا۔"

"ہوں۔"

"تو چند دن تو میں خوب ماتم کروں گا۔"

"پھر؟"

عثمان کی آنکھوں سے شوخی اور شرارت ٹپک رہی تھی۔ لیکن بخیرہ بننے کی  
کوشش کر رہے تھے۔ بولے۔

"نہیں بتاتا۔"

"بتانا ہو گا۔"

"اچھا سنو۔"

"ہوں۔"

چند دن ماتم کرنے کے بعد کوئی اور لڑکی تلاش کر لوں گا۔ انہوں نے نہی

تخائف پاکر سب بہت خوش ہوئے۔

عثمان اور شائندہ نے یہاں دودن قیام کیا اور پھر اپنے نئے گھر میں چلے آئے۔ عثمان کے ذاتی لازم نعمت خان اور فضل دین بھی مراد محل سے آگئے۔ اماں فطال نے بھی مراد محل ان کی خاطر چھوڑ دیا۔

میسر اشفاق کا یہ بنگلہ چھوٹا سا تو تھا۔ لیکن نیا تھا۔ اور قرینے سے آراستہ تھا۔ وہ از قلم فرخچر پردے اور قالین وغیرہ اسی طرح چھوڑ گئے تھے۔ یوں اس نئے جوڑے کو گھر کی بجاوٹ کا زیادہ تر دہنیں کرنا پڑا۔ شائندہ نے اپنے شوق ہی سے کچھ معمولی سار و بدل کیا۔ بیڈ روم کی ترتیب اپنی مرضی کے مطابق کی۔ اشفاق صاحب کا بیڈ اٹھوا کر دوسرے کمرے میں ڈلوایا اور اپنی شادی کا نیا بیڈ ماسٹر بیڈ روم میں کچھ الیا۔ یہاں پردے بھی اس نے اپنے بیڈ کی مناسبت سے نئے لگوائے۔

چند ہی دنوں میں دونوں اپنے ارد گرد رہنے والوں سے متعارف ہو گئے۔ پچھلے بنگلے میں زیدی اور ان کی نئی بیاتھاٹھینہ زیدی سے ان کی خاصی دوستی ہو گئی۔ بڑا ہنس مکھ اور پر غلوص جوڑا تھا۔ دائیں طرف کے بنگلے میں ایک لکھ پتی بیوہ تہا رہتی تھی۔ اس کی دونوں بیٹیاں بیاہی ہوئی تھیں۔ کم گو عورت تھی۔ اس سے حرم علیک سلیک ہی ہوئی۔ باین ہاتھ بہت بڑا بھرا پر اکندہ آباد تھا۔ بین کمال کی کئی انیکسیسیرالی کوٹھی بھی شاید ناکافی تھی۔ درجن بھر بچے چار پانچ عورتیں چھ سات مرد بزرگ جانے کتنے لوگ آباد تھے۔ شائندہ اور عثمان ان لوگوں سے بھی ملے۔ لیکن شائندہ نے محسوس کیا۔ کہ ان کی اور ان لوگوں کی ذہنی تفادات بے تکلف ہونے کی نوبت نہ لائے گی۔ پھر بھی ہمسایہ داری نبھانا ہر چاہئے تھی۔ کبھی کبھی مل لینے میں ہرج نہیں تھا۔ اچھے شریف اور بادھن قسم

ماہر عمل مناکر دونوں واپس آئے۔ تو ماڈیڈی ظریف انہیں دیکھ کر خوشی سے چھوٹے نہ مائے۔

۔ شائندہ بچی آپ کتنی خوبصورت ہو گئی ہیں۔ ظریف توبے اختیار کر رہی تھی۔ کیوں پہلے بہت صورت تھی کیا۔ شائندہ نے اٹھلا کر کہا۔

ماشاء اللہ ماشاء اللہ صحت بہت اچھی ہو رہی ہے۔ ڈیڈی بولے۔

۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ ماما نے پیار اور فرخ سے دونوں کو دیکھ کر کہا۔

عثمان سکا رہے تھے۔ گھر والوں کی خوشیوں سے انہیں بھی خوشی ہو رہی تھی۔

شائندہ سب کے لیے تحائف لائی تھی۔ اس نے سواتی چھڑ ڈیڈی کو دیا۔

ماما کے لیے گرم میکی اور اسی کی عمرنگ گرم ٹوپی لائی تھی۔ ظریف کے لیے کابل

سے آرٹیفشل جیولری خریدی تھی۔ چڑے کا کوٹ بھی لائی تھی۔ ایسی جی کے

لیے شرٹس اور جریاں خریدی تھیں۔

ہوتے۔ وہ دیکھتی کہ اس کی دوستی کا دم بھرنے والی خزانہ کے چہرے بے رنگ ہو جاتے ہیں۔ اس بات سے اسے بے حد خوشی ہوتی اور وہ عثمان کی آنکھوں میں اپنی خوبصورت نظروں سے بھانکتے ہوئے شوخ ہو جاتی۔ عثمان بھی فخر سے مسکرا دیتے۔

شانہ تو اس کہا گہمی اور رنگیلی دنیا میں بڑی معروف ہو گئی تھی۔ کلب ہوئی۔ دعوتیں اور دوستوں کے ہاں جانا آنا ہی مقصد زندگی بن گیا تھا۔ لیکن عثمان کے سامنے اور بھی بہت کچھ تھا۔ یہ وقت تو جیسے وہ عارضی طور پر گزار رہے تھے۔ عملی زندگی کا آغاز اتنا سہل نہ تھا۔ ماں باپ سے تو نموڑ چکے تھے۔ ان سے کچھ پانے کی توقع تھی۔ نہ ہی ان کی امانا اجازت دیتی تھی۔ جو کچھ کرنا تھا خود کرنا تھا۔ اور ان کے جو عزائم تھے۔ ان کے لیے انہیں بہت کچھ کرنا تھا۔

فیکٹری جو وہ بنوا رہے تھے۔ شادی کے چکر میں تکمیل کے مراحل کو دہانہ کی تھی۔ مراد علی خان نے ان کی خاطر دہاں سرمایہ لگایا تھا۔ لیکن اب یہ کام انہوں نے خود ہی کرنا تھا۔ فیکٹری کو مکمل کر کے چلانے کے لیے ابھی لاکھوں کی ضرورت تھی۔

اس کے علاوہ وہ اپنا خوبصورت اور شاندار گھر بھی بنوانا چاہتے تھے۔ ایسا گھر جہاں شانہ کے ساتھ رہ کر وہ مراد علی والوں پر ثابت کر سکیں کہ ان کی مدد و تعاون کے بغیر بھی وہ شان سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ زمین انہیں مراد علی کے ارد گرد ہی ملے۔ انہوں نے کئی ایکشنوں کو پہلے سے ہی کہہ رکھا تھا۔

ان سارے کاموں کے لیے لاکھوں کا سرمایہ درکار تھا۔

کے لوگ تھے۔ وادی اماں نے قوشانہ کو اتنا پیار کیا تھا کہ شانہ اور عثمان دونوں ہی مرعوب ہوئے تھے۔ شغفتوں کے سائے کے پسند نہ ہونگے۔

زیدی اور شینہ کلب کے باقاعدہ ممبر تھے۔ عثمان اور شانہ نے بھی رکنیت لے لی۔ اور کلب آنا جانا باقاعدگی سے شروع ہو گیا۔ تمبولا اور بنگو کا قوشانہ کو جیسے جنون ہو گیا۔ فلم دیکھنے بھی ضرور جاتی۔ اور کارڈز کھیلنا بھی ضرور ہی تھا۔ کلب میں بھی کئی لوگوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یوں تھوڑے ہی دنوں میں عثمان اور شانہ کا حلقہ احباب خاصہ وسیع ہو گیا۔ سرسبز ایزی خاصی دلچسپ خاتون تھی۔ اس نے دونوں کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ پھر شانہ نے بھی ان کو گھر بلایا۔ ناصرہ احمد۔ جاوید خان۔ آصف قریشی۔ نادرہ۔ صبوحی۔ جمیل۔ عرفی۔ منصور جلیل وغیرہ سبھی ان کے اچھے دوستوں میں شمار ہونے لگے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں سے راہ نرم ہوئی۔

یوں نئے شہر کی اجنبیت دور ہو گئی۔ شانہ تو پورے سکون اور اطمینان سے اپنی نئی زندگی میں کھو گئی۔ حسن و جمال قدرت نے فیاضی سے دیا تھا۔ عثمان کی خاندانی حیثیت نے اس حسن و جمال کو بڑا خوبصورت پس منظر دیا۔ یوں شانہ اپنے حلقہ احباب میں اک خاص شان اور امتیاز کی حامل بن گئی۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ضرور ہوا کہ عزت و قدر ملی۔ لیکن یہ بھی ہوا کہ شانہ کے اندر فخر و غرور کا بت بڑھنے پھیلنے لگا۔ اسے اپنے حسن اپنی حیثیت کا شعوری احساس ہونے لگا۔ اور محفل پر چھا جانے کی۔ دوسروں پر سبقت لے جانے کی خواہش اس کے اندر ہر دم چھلنے لگی۔ پہلے وہ بنتی سنورتی تھی۔ تو صرف عثمان کہہ لے۔ لیکن اب آرائش و زیبائش کا مقصد دوسری کو مرعوب کرنا بھی ہوتا۔ جب کسی محفل میں۔ دوستوں کے جگٹھے میں اس کی تعریفوں کے پل باندھے جا رہے



عثمان کی مرحومہ امی کی کچھ اراضی عثمان کے نام منتقل ہو چکی تھی۔ ان کا پیہ سرمایہ بیرونی کمپنیوں میں بھی لگا ہوا تھا۔ باہر کے دو بنکوں میں بھی کچھ سرمایہ تھا۔ یہ سب عثمان ہی کا تھا۔ زمین کا انتقال تو ان کے نام تھا۔ فوری طور پر بیچی جاسکتی تھی۔ ہاں شیراز کی فروخت اور بنکوں سے روپیہ لینے کے لیے لمبی چوڑی کاروائیاں کرنا تھیں۔ کچھ سرمایہ ان کا اپنا بھی تھا۔ جو چھوٹی سی بزنس میں لگا رکھا تھا۔ یہ سب کچھ سیٹ کر ملک میں لانا تھا۔ جو ایک صبر آزما اور تھکا دینے والا مرحلہ تھا۔

لیکن یہ سب کچھ عثمان کو کرنا ہی تھا۔ ورنہ ان کی پلاننگ کسی کام کی نہ تھی۔ عثمان کو اب دن رات یہی فکر دامن گیر تھی۔ اس شام شانہ نے بڑا خوبصورت لباس پہنا۔ میک آپ سے اپنے من کو دوا آتش کیا۔ کلب جانے کے لیے تیار ہو کر وہ کمرے میں آئی۔ تو عثمان فائلیں کھوکھوکے کام میں مصروف تھے۔

”مانی“

”ہوں۔“

”ابھی تیار نہیں ہوئے۔“

”کہاں جانا ہے۔“

”شانہ نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے عثمان کی گردن میں بازو ڈال کر جھٹکتے ہوئے ان کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ عثمان پن میز پر رکھ کر شوق اور پیار سے شانہ کو دیکھنے لگے۔ اس نے عثمان کی پسندیدہ پرفیوم لگا رکھی تھی۔ عثمان جیسے نشے میں جھوم گئے۔ انہوں نے عثمان سے چوراک جہانی لی۔ اور بازار

شانہ کی کمر میں جمائل کر دیئے۔  
”اٹھیے نا۔“

”کہاں جانا ہے۔“

”کلب۔ بنگو ہے آج۔“

”اوہ خدایا۔ مجھے تو ڈھیر سارا کام کرنا ہے ابھی۔“

شانہ فائل اک طرف کرتے ہوئے ان کے سامنے میز پر بیٹھ گئی۔ فائلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی یہ کیا جنجال ڈال رکھے ہیں آپ۔  
”جہان من۔ عملی زندگی تو شروع کر رہے۔ اس کے لیے تنگ دود کا آغاز ہے یہ۔“ عثمان کمرے کی لپشت سے اپنی لپشت لگاتے ہوئے انکڑائی لے کر بولے۔

”عملی زندگی تو شروع ہو چکی ہے۔ وہ مسکرائی۔“

”تمہیں سب کچھ تو بتا دیا ہے۔ میزے پاس کیا ہے اور میں نے کیا کچھ کرنا ہے۔“

”جانی۔ اتنے تردد میں کیوں پڑ رہے ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ آپ ہر وقت سوچوں میں ڈوبے رہتے ہیں۔“

”سب کچھ تمہارے لیے تمہاری خاطر۔ تمہارے واسطے۔“ عثمان نے آگے کو ہر کر شانہ کو پیار کرنا چاہا۔

”وہ مسکراتے ہوئے پیچھے ہو گئی۔“

”اوں ہوں۔“

”کوئی اوں ہوں نہیں۔“ عثمان نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہلکا جھٹکا دیا۔ وہ ان کی گود میں آ رہی۔

- اچھا بھلا ہے یہ گھر ضرورت کو کافی - تین سال تو یہاں رہ سکتے ہیں ۔  
 - میرا بس چلے ناشینو ۔  
 - ہوں ۔  
 - تو تین دنوں میں اپنا گھر بنا کر تمہیں لے جاؤں وہاں - خوبصورت شاندار  
 اور ہر آسائش سب پر گھر میں ۔۔  
 شانہ مسکرائی اور پھر سنس کر بولی - مراد محل والوں پر رعب ڈالنے کے لیے  
 رہے ہیں سب کچھ ۔  
 - اوہ شانو - میں تمہیں کہاں لے جانا چاہتا ہوں - کس بلندی پر پہنچانا چاہتا  
 ہوں - تمہارا سیٹس - تمہارا وقار ۔۔  
 - بس بس ۔۔ وہ کھلکھلا کر سنس پڑی - بہت بہت شکریہ - پہلے جلدی  
 تیار ہو جائیے - اٹھیے - اٹھیے نا ۔۔  
 حن کا اصرار تھا - عثمان انکار کیونکر کرتے - تھوڑی دیر بعد تیار ہو کر شانہ  
 لے کر کلب آ گئے ۔  
 جہاں دوستوں نے والوں اور اجنبیوں نے ان کا استقبال جوش اور دلولے  
 کیا - شانہ اور عثمان پورے ہال میں منفرد نظر آ رہے تھے ۔  
 دن گزار رہے تھے - عثمان کی مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں - اراضی کا ایک  
 انہوں نے بیچ دیا تھا - دوسرے کا سودا ہو رہا تھا - پراپرٹی ڈیلروں - اینجنیوں  
 ریکلوں کے چکروں میں پڑے تھے - جو پیسہ وصول ہو چکا تھا - فیکٹری کا کام  
 رن کر دیا تھا ۔  
 انہیں دنوں خان نجیب اللہ خان کی کوٹھی بکنے کی خبر ان تک پہنچی ۔  
 بچان کی من پسند تھی - ان کے بچپن کا خواب تھی - اسے تو ہر صورت انہوں

- نہیں مافی نہیں - اس نے عثمان کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تمام کر بیٹھے  
 ہوئے کہا - سارا میک اپ خراب کر دو گے ۔۔  
 - مت کیا کر وہ ضرورت ہی نہیں اس تصنع کی ۔  
 - واہ جی ۔۔  
 - خدا قسم ضرورت نہیں تمہیں ۔۔  
 - بہت اچھا صاحب - بس اب جلدی سے اٹھیے - تیار ہو جائیے - شینہ  
 کافون آیا ہے - وہ جا بھی چکے ہوں گے ۔۔  
 - تم اگر نہ ہی جاؤ تو ۔۔  
 - اول ہوں - بنگو ہے آج ۔  
 - تو پھر لیو کر دو - ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ ۔  
 - آپ نہیں جائیں گے ۔  
 - نہ جاؤں تو بہت سا کام کر لوں گا ۔  
 - اُف خدایا - کام کام ۔۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی ۔۔ کریزی میں آپ بھی ۔  
 - پیسہ کہاں سے آئے گا محترمہ ۔۔ عثمان نے اس کے سراپا پر پور ننگا ہ ڈالتے  
 ہوئے کہا ۔  
 - جتنا ہے اتنا ہی کافی ہے - سرگرداں ہونے کی کیا ضرورت ہے ۔۔  
 - تم نہیں سمجھ سکتیں - ضرورت کا احساس مجھے ہے ۔۔  
 - ضرورت کیا ہے - جتنی پیسائیں گے بھلتی چلی جائے گی ۔  
 - فیکٹری مکمل نہ ہو ۔۔  
 - آہستہ آہستہ ہو جائے گی ۔  
 - اور گھر بھی نہیں چاہیے ۔۔

پورے چھ ماہ بلند چالو ہو جائے گی۔ سارا کام تسلی بخش رفتار سے ہو رہا ہے۔  
کچھ لون اپلائے کر دوں گا۔ فیکٹری کے لیے۔ ہاں کوٹھی مل جائے تو اس  
کے لیے سرمائے کا بندوبست کرنے کے لیے دوڑ دو سوپ کرنا پڑے گی۔  
"اس لیے تو کبہ رہا ہوں۔ اتنے بار ذہن پر ایک دم نہ ڈالیں۔ فیکٹری مکمل  
ہو جانے دیں۔ پھر گھر بھی بتالیں گے۔"

"شانویہ جگہ جو مل رہی ہے نا۔ وہ تو میں نے بہ صورت خریدنی ہے۔ اس  
کے لیے خواہ کچھ بھی کرنا پڑے۔"

"خدا کرے آپ کی خواہش پوری ہو جائے۔"

"اب بات کی ناکام کی۔ عثمان نے شانڈ کو پیار کر لیا۔"

"قیمت کا اندازہ بتایا ہے ایکسٹ نے۔"

"پھر وہی۔ تمہیں کیا ہے نا تم بالکل فکر نہ کرو۔ دعا کر لیں یہ کام ہو جائے۔  
باقی سب کچھ میں کر لوں گا۔ تم اپنے ذہن پر رتی بھر بار نہیں ڈالو۔ سبھیوں۔ کل نجیب اللہ  
خان سے مل کر سب کچھ تہہ چل جائے گا۔ ہمارے ان سے خاندانی مراسم بھی ہیں۔  
کچھ بات بنے ہی گی نا۔"

"کل آپ وہاں جائیں گے۔ شانڈ کو جیسے کچھ یاد آگیا۔"

"ہاں۔ کیوں؟"

"کل چھ بجے ڈاکٹر سے ٹائم لے رکھا ہے۔"

"ادہ ہاں۔"

نے غریب نہ تھا۔ پراپرٹی ڈیلر نے انہیں فون پر مطلع کیا۔ تودہ خوشی سے اچھل پڑے۔  
کیا بات ہے۔ شانڈ نے پوچھا۔

"شینو۔ دعا کرو۔ یہ جگہ مجھے مل جائے۔ انہوں نے فرط مسرت سے  
اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"

"مراد محل سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پرانی کوٹھی ہے۔ بہت خوبصورت  
محل وقوع ہے۔ ادنیٰ نیچے ٹیلوں پر بنی ہوئی ہے۔ صدیوں پرانے درختوں میں  
گھری ہوئی۔ پچھلے طرف سے جمیوندی گزرتی ہے۔ آف یہ جگہ مل گئی نا۔ تو تم  
دیکھو گی۔ میں اسے کیا سے کیا بنا دوں گا۔ جنت ہو گی شینو جنت۔ جس

میں میری۔"

انہوں نے شانڈ کو پیار سے دیکھ کر کہا۔

"لیکن آنا پیسہ؟"

"سب بندوبست کر لوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔"

"کیسے نہ کروں۔"

"میری زندگی۔ میری جان۔ انہوں نے شانڈ کو لپٹا تے ہوئے کہا۔"

تمہیں فکر کی ضرورت نہیں۔ فکر کرنے کو یہ جو ہوں۔"

"اچھا جی۔ آپ فکر مند ہوں۔ اور میں بے فکر رہوں۔"

"تم صرف دعا کرو۔ کہ یہ جگہ مجھے مل جائے۔ باقی سب کچھ ہو جائے گا۔"

زمین بیچ دوں گا۔ باہر سے سرمایہ لے آؤں گا۔ ٹیٹرز میں امی مرحومہ کے  
ان کو ڈسپوز آف کر دوں گا۔ سب سوچ رکھا ہے میں نے۔"

"فیکٹری کے لیے بھی پیسہ چاہیے۔ سب سوچ لیں پہلے پھر کوٹھی کا سودا کریں۔"

"میری جان تمہیں کیا ہے نا اس تردد میں تم نہ پڑو۔ فیکٹری انشاء اللہ

چند دنوں سے شانڈ کی طبیعت کچھ گری گری رہنے لگی تھی۔ مگر اورینڈ لیوں  
پر درہو رہا۔ کبھی چکر آ جاتا۔ کبھی جی تھلا نے لگتا۔ اماں فضلان تو جان گئی تھی۔  
انہوں نے شانڈ سے کہا بھی تھا۔ لیکن ڈاکٹر کو دکھانا ضروری تھا۔

شانہ لان ہی میں تھی۔

آج موسم صبح بارش ہو جانے کی وجہ سے بہت اچھا ہو گیا۔ اس وقت بھی آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور بھگی فضا بڑی خوش گوار لگ رہی تھی۔ چمن کی قیاں روشن تھیں۔ فضل دین میز سے برتن اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ آصف اور منصور جلیلی آئے ہوئے تھے۔ عثمان کا انتظار کر کے وہ دس منٹ ہی ہوئے واپس ہو گئے۔ اماں فضلال گھاس پر بیٹھی تھی۔

عثمان گاڑی سے نکلے شانہ کو دیکھا تو کیا ریاں پھلانگتے ہوئے ادھر لپکے آتے ہی شانہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر چلائے۔ شانو۔ مبارک ہو۔ کام بن گیا۔

پچ۔ شانہ نے خوش ہو کر کہا۔

ہاں۔

سودا ملے ہو گیا۔

سمجھو سب کچھ ہو گیا۔ تین ماہ کے اندر جریشی ہو جائے گی۔ کتنی بڑی خوشخبری ہے۔ ہے نا۔ انہوں نے خوشی میں شانہ کو چکر دے ڈالا۔

ہے ہے۔ صاحبزادے۔ اماں فضلال جلدی سے بولی۔

کیوں اماں۔

جسم جو ڈر رہے ہیں آپ تو یگم صاحبہ کو۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔

وہ خوشی سے بولی۔

ادہ ہاں۔ گئی تھیں ڈاکٹر کے پاس۔ انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

شانہ نے مکرراتے ہوئے سرانبات میں ہلایا۔

شانہ نے ڈاکٹر سے ٹائم لیا تھا۔ کل دکھانے جانا تھا۔

میں چھ بجے تک آجاؤں گا۔

نہ آسکے تو۔

تو تم خود چلی جانا۔

نہوں۔

مناسب سمجھو تو منر زیدی کو ساتھ لے جانا۔

اچھا۔

میں کوشش کروں گا۔ کچھ بجے سے پہلے ہی آجاؤں۔ بحال۔ نہ آسکا تو تم ضرور چلی جانا۔ اور اب تو تمہیں ایسے ایسے کام خود کرنے کی عادت ڈالنا پڑے گی جان۔ تمہارا یہ خادم آنے والے دنوں میں اتنا مصروف ہوگا۔ اتنا مصروف کہ شاید اپنی ہوش بھی نہ رہے۔

سخت خارا آتی ہے مجھے۔ شانہ مسکرائی۔ ہزار دفعہ کہا ہے۔ کہ آپ کے ساتھ جھونپڑی بھی ہونا۔ تو میں خوش رہ سکتی ہوں۔ محلوں کی مجھے خواہش ہے نہ ضرورت۔ ضرورت ہے تو صرف آپ کی۔ مانی صرف آپ کی۔

اور مجھے ضرورت ہے اک شانہ ار محل کی۔ جس میں اس پر ہی کو اس کے شان شاں طریق سے رکھ سکوں۔ عثمان نے شانہ کی ٹھوڑی کو پیار سے چھوتے ہوئے کہا۔

شانہ چپ ہو گئی۔ عثمان کے جنون خیز جذبول کی اسے خبر تھی۔ اس کے لیے وہ کیا کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتی تھی۔

دوسری شام شانہ کو منر زید زیدی ہی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ اس دن عثمان کو ساڑھے آٹھ کے قریب واپس آئے۔

”کیا کہا انہوں نے۔“ عثمان نے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ شرما کر بولی۔

”یار تمہیں کبھی کسی بات کا پتہ بھی ہوتا ہے۔“ وہ سرور لہجے میں بولے۔

”خوشخبری ہے صاحبزادے صاحب۔“ اماں فضلال سنس کر بولی۔ ”بارک

ہو۔ خدا بٹیا دے گا۔“

”اوہ۔۔۔ سچ۔۔۔ شیئو۔۔۔“ عثمان کی آنکھوں میں جیسے قندیلیں جل اٹھیں۔

چہرہ خوشی سے تہمتانے لگا۔ انہیں اتنی بڑی خوشخبری کا جیسے یقین ہی نہ آ رہا

تھا۔

”سچ شانو۔“ انہوں نے پھر پوچھا۔

شانہ نے سراشات میں ہلاتے ہوئے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپایا۔

عثمان خوشی سے جیسے دیوانے ہو گئے۔ شافو کو بازوؤں میں لپیٹ کر

بینے سے لگاتے ہوئے بے اختیار ہو کر اسے پیار کر لیا۔

”ہائے اللہ۔“ شانہ نے ان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے

اماں فضلال کی طرف اشارہ کیا۔ ”کچھ تو خیال کریں۔“

”خیر ہے۔“ عثمان خوشی سے سرشار لہجے میں بولے۔ ”اپنی ہی اماں ہے۔“

اماں فضلال مسکراتے لگی۔

اس رات عثمان کو پوری طرح نیند نہ آئی۔ پل پل بعد جاگ کھل جاتی۔ خدانے

اتنی بڑی خوشیاں انہیں ایک دن ہی دی تھیں۔ وہ سوئی ہوئی شانہ کو

اپنے بینے میں چھپا لینے کی خواہش شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ لیکن آج

انہوں نے شانہ کے آرام کے خیال سے اسے جگایا نہیں۔

”شانہ بھابی آپ تو ابھی تیار ہی نہیں ہوئیں۔“ ٹینے نے آتے ہی کہا۔

”عثمان نہیں آئے ابھی۔ ان کا انتظار کر رہا ہوں۔“ شانہ بولی۔

”آجائیں گے وہ بھی۔ آپ تو تیار ہو جائیں۔ مردوں کو تیار ہوتے کوئی دیر لگتی

ہے۔ اٹھیے آپ۔“

شانہ اٹھی۔ اور ٹینہ اس کے ساتھ ہی اس کے بیڈ روم میں آگئی۔

آج منشر شیرازی کے ہاں زبردست قسم کا ڈنر تھا۔ شہر کے متمول اور فیشن اہل

لوگوں کا اجتماع کسی نمائش سے کم نہیں ہوتا۔ ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے

کی کوشش ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو نمایاں کرنے اور لوگوں کی نظروں میں اونچا

کرنے کا احساس غالب رہتا ہے۔

شانہ نے وارڈ روم بکھولی اور لباس کا انتخاب کرنے لگی۔ ٹینہ نے خوبصورت

مارٹھی پہنی ہوئی تھی۔ میک اپ بھی سلیقے سے کیا ہوا تھا۔ قیمتی پیرل کاسٹ

بھی ساڑھی کی مناسبت سے خوب تھا۔ وہ خاصی سمارٹ اور دلکش لگتی تھی۔

”ساڑھی پنیں گی یا کچھ اور“ شینے نے میز سے میگزین اٹھا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”شانے نے ہنگامے میں لٹکا ہوا خوبصورت ڈریس نکالا۔ اصلی ریشم کا پورا خوبصورت ڈریس جو موسم کی مناسبت سے انتہائی دلکش اور دیدہ زیب تھا۔ شینے نے رشک سے اس ڈریس کو دیکھا اور پھر منہ بناتے ہوئے بولی۔ یہ آپا پسند ہے یا عثمان بھائی کی“

”دونوں کی“ وہ ہنس کر بولی۔

”خوش قسمت ہیں بھابی۔“

”کیوں“

”زیدی تو ہمیشہ مجھ پر اپنی پسند ہی مسلط کرتے ہیں۔“

”مافی کا بھی یہی حال ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے تو خوشی ہوتی ہے۔“

”سچ پوچھو تو یہ ڈریس بھی مافی ہی کی پسند کا ہے۔“

”پسند بھی کام کی ہو تو بات ہے نہ“ شینے نے کچھ کسری کا احساس پاتے ہوئے

کہا۔ ”زیدی کو تو بس ساڑھی کے سوا کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔“

”آج تو زیدی صاحبہ صاحبہ ساتھ نہیں تھے۔ اپنی پسند کے کپڑے پہن لیتی۔“

”میرے پاس ساڑھیوں کے سوا اور کوئی لباس ہے ہی نہیں۔ شلوار قمیضیں

گھر پہننے والی ہیں۔“ شانے شان سے مسکرا دی۔

”تم بیٹھو۔ میں تیار ہو جاؤں۔“ شانے نے کہا۔ ”ویسے زیدی صاحبہ کب

آ رہے ہیں۔“

”سنڈے کو“

”اچھا۔ بیٹھو تم۔“

”آپ تیار ہو جائیں۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھتی ہوں۔“

وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ اور شانے تیار ہونے لگی۔

شانے جوں جوں لوگوں سے مل رہی تھی۔ اپنی تعریفیں سن رہی تھی۔ اس میں

خود نمائی کا احساس کچھ زیادہ ہی بیدار ہوتا جا رہا تھا۔ آج تیار ہوتے ہوئے

بھی یہی جذبہ کار فرما تھا۔ تیار ہو کر قد آدم آئینے پر آپ کو ہر رخ سے دیکھا۔ اسے

یقین ہو گیا کہ آج کی مفل پر وہ چھا جائے گی اور یقیناً اس کے مقابلہ کی کوئی

عورت پوری مفل میں نہ ہوگی۔ کھلا گھروار ڈریس اس کی کمر پر اگر اتنا تنگ

ہو گیا تھا۔ کہ پٹے کی سی کمر کی خوبصورتی نمایاں ہو گئی۔ اس کے پہاڑوں سے ڈھلانی

کنڈھوں پر لباس کی صرف مہین ڈریاں تھیں۔ جو بڑی خوبصورتی سے بندھی تھیں

اس کے سینے کی سرپوشی لباس کی خوبصورت فرزہ کر رہی تھیں۔ پشت آدھی

سے زیادہ تنگی تھی، جو صرف جذبات انگیز نہیں، میان خیز بھی تھی۔ اس نے

کنبیوں پر مہین گلو زینہ تھے۔ ایک بازو پر خوبصورت سا بازو بند تھا۔ ایک

آپ اور بالوں کا شل اچھوتا تھا۔

وہ تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ تو شینے اسے دیکھتے ہی رہ گئی۔

”کیوں“ شانے شان سے مسکرائی۔

”آپ تو واقعی قیامت ہیں۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”لوگ کہتے ہیں؟“ شانے نے حیرانگی سے پوچھا۔

”جانے دیں بھابی۔ جیسے آپ جانتی ہی نہیں۔“

”بچی کچھ نہیں جانتی۔“

ہیں لوگ آپ۔ ایک خدا نے صورت ہی ایسی دی کہ نظروں میں اتر جائے اس پر ایسے ایسے لباس اور پیر آپ کی خوش گفتاری۔ بھلے بھلے دل ہار بیٹھے ہیں۔ وہ شوخی سے بولی۔

ان بھلے بھلوں کے نام میں بھی تو سنوں۔ شائے نے ہنس کر کہا۔  
کوئی ایک دو تھوڑے ہیں۔ وہ بھی ہنس کر بولی۔  
دس بیس ہیں۔

زیادہ ہی۔

بس اب بناؤ نہیں۔

سچ کہتی ہوں بھابی۔

ٹینے ہنس کر شائے کو دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ایک بات بتاؤں بھابی۔

کچھ عورتیں آپ سے بہت جلتے گی ہیں۔

مثلاً۔

آپ کی دوست ہی ہیں۔

کون۔

منصور جلیلی۔ منیر جاوید خان۔ منیر عرفی۔ نادرہ اور۔ اور۔

بس بس ٹینے۔ یہ سب میری بہترین دوست ہیں۔

خدا قسم بہت باتیں بناتی ہیں۔ وہ تو آپ سے خائف ہیں۔ سب کا یہی

خیال ہے کہ دوستی ترک کر دیں۔

کیوں۔

انہیں ڈر ہے۔ کہ کہیں ان کے میاں صاحبان آپ پوری پوری جان

لیفت نہ ہو جائیں۔

ہائے اللہ۔ کیسی باتیں کرتی ہو ٹینے۔

دونوں ہنسنے لگیں۔ ٹینے۔

دونوں ہنسنے لگیں۔ ٹینے نے اپنے کانوں میں ہونٹیں شائے کو بتائیں۔ تو وہ براں رہ گئی۔

منصور اور منیر منصور میں تو کئی دفعہ زبردست قسم کی لڑائیاں بھی ہو چکی ہیں۔

ہ بولی۔ یہی حال منیر جاوید کا بھی ہے۔

حد ہو گئی۔ شائے نے کہا۔ لیکن عورت تھی نا۔ دل ہی دل میں ان باتوں سے

لٹ لینے لگی۔ بظاہر اس نے ٹینے کے سامنے ان باتوں کی صحت سے انکار کیا۔

ان اپنے حسن کے حدود اربعے سے واقف تھی۔ یہ باتیں غلط نہیں ہو سکتی تھیں۔

اس سے اس کی گردن تن سی گئی۔ یہ بات ہے تو ان عورتوں کی تنگ دلی کی

یاد ہے۔

بالکل اعتماد نہیں انہیں اپنے خاوندوں پر۔ ورنہ ایسی باتیں سوچیں ہی کیونکر۔

کبھی منیر چوہدری سے نہیں سب باتیں۔

تو گویا یہ سب کچھ اپنی سیکرٹ ہے۔ شائے ہنسی

بالکل بالکل۔

ہائے اللہ کتنی بُری بات ہے۔

بہت جلتی ہیں آپ سے۔

اور دوستی کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔

ٹوٹ جائے گا کسی دن۔ آپ نے شاید محسوس نہیں کیا۔ کہ اب آپ کے

منصور جلیلی اور جاوید بغیر بیویوں کے کبھی نہیں آئے۔

کرتے اور پھر کھیل میں لگ جاتے۔

ظریفہ اور شانہ بھی چپن ہی میں تھیں۔ بوگن ویلیا کی باڑ کے پاس دونوں لڑی تھیں۔ سراپا انتظار تھیں۔ عثمان نے ماما کے پاس آنا تھا۔

ظریفہ شانہ سے پوری رپورٹ لے چکی تھی۔ اسے کچھ خبر شہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ کیا عجب ماما یہ پروپونزل رد کر دیں۔ ماں باپ کی عدم موجودگی میں رشتہ لسنے میں راضی ہی نہ ہوں۔ پھر عثمان کے عاق ہو جانے کی صورت میں ان کی ہڈیوں بھی ایسی ہو جاتی تھی۔ کہ سوچنا ضروری محسوس ہوتا تھا۔

ظریفہ یہ خبر شہ محسوس کر رہی تھی۔ لیکن شانہ سے اس نے اظہار نہیں کیا۔ نانہ بڑی مطمئن اور مسرور تھی۔ اس نے جو فیصلہ کر لیا تھا۔ اس پر پوری طرح قائم تھی۔

شانہ نے دوری سے عثمان کی گاڑی دیکھ لی۔ تو اس کے گالوں پر شفقت ہوٹ پڑی۔ اس کی نظروں کا تعاقب ظریفہ نے کیا۔ تو بے اختیار نہ بولی۔  
”اے اگے۔“

”ہاں۔“ شانہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے کی طرف گئی۔

”کہاں جا رہی ہیں۔“ ظریفہ نے پوچھا۔

”اندر۔“

”کیوں۔“

”بس۔“

ظریفہ اس کے پیچھے دوڑی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ عثمان آ رہے ہیں۔ اور آپ اندر بھاگی جا رہی ہیں۔

”وہ ماما کے پاس آ رہے ہیں۔“

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ دوپہر خاصی گرم تھی۔ لیکن اب موسم قدرے بہتر تھا۔ ہلکی ہلکی نیم گرم ہوا چل رہی تھی۔ سبزے اور دشتوں کی وجہ سے یم گرم ہوا بھی خوش گوار محسوس ہو رہی تھی۔

لان میں گھسنے پڑتے کر سیاں کبھی تھیں۔ میز پر کچھ رسالے اور اخبار تھے سر دار علی خان کے دو تین دوست آئے ہوئے تھے۔ ابھی ابھی وہ سب اٹھ کر گئے تھے۔ انہیں بھی ساتھ ہی لے گئے تھے۔ ان کے جاتے ہی جمی اپنا فٹ بال لے کر آگئے تھے۔ برابر والی کوٹھی سے دوستوں کو بھی بلا لیا تھا۔ اور کھیل پورے زور و شور سے شروع کر دیا تھا۔

ماما روش پر جھکی تازہ کھنے والے پھول دیکھ رہی تھیں۔ وہ دو تین بار پھول کو بال کھیلنے سے منع کر چکی تھیں۔ فٹ بال جس روش یا کھیل پر بھی آکر گرے تا نو زائیدہ پھولوں کو مسل دیتا۔ بچے تھے ہانک کال آتے۔ ماں سے مغذرت



”یہی۔“ عثمان نے ماما سے ہال لے کر ان کی طرف اچھال دیا۔ سب بچے ہال لے کر وہاں سے بھاگ گئے۔

”ظریف کریاں درمیان میں لے آؤ۔“ ماما نے ظریف سے کہا۔ لیکن اس کے جانے سے پہلے ہی عثمان بڑھ کر دو کریاں ادھر لے آئے تو دو گھسیٹ لائی۔

”تشریف رکھیے۔“ عثمان نے ماما سے کہا۔

”آپ بھی بیٹھیے۔“ ماما بیٹھے ہوئے بولیں۔

عثمان کرسی قدرے پیچھے ہٹا کر ظریف سے بولے۔ ”آئیے آپ بھی۔“

ظریف کے بیٹھے کے بعد وہ بھی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”بہت دنوں بعد آئے آپ۔“ ظریف نے کہا۔

”کچھ کاروباری مصروفیات تھیں۔“ وہ بولے

”جاپان گئے ہوئے تھے نا۔“ وہ بولی۔

”ہاں۔“ عثمان اس کی آنکھوں کی شوخی سے کچھ خفیف ہو گئے۔ انہیں باور

رسنے میں دیر نہ لگی۔ کہ شائے نے ظریف کو ہر بات بتا دی ہوئی ہے۔

ماما جاپان کے سفر کے متعلق سوالات کرنے لگیں۔ جن کا جواب وہ

بے شائے انداز میں دیتے رہے۔

”آپ نے تو ساری دنیا دیکھ رکھی ہے شاید۔“ ظریف باتیں سننے کے بعد

رہا۔

”نہیں۔“ آسٹریلیا نہیں دیکھا۔ روس کبھی نہیں گیا۔ چین سے بھی نا آشنا

نہیں۔ وہ مسکرائے۔

”اس کا مطلب ہے باقی سب ممالک دیکھ چکے ہیں۔“

”ان کے آنے تک رکھیے تو ہسی۔ جب معاٹے کی بات کریں گے اندر چلا۔“

”نہیں بھی۔“

ظریف نے دیکھا شائے بڑی نرس ہو رہی تھی۔ چہرہ تہمتا لگا۔ لیکن ٹھنڈے برف ہو رہے تھے۔

”گاڑی بنگلے کی اندرونی سڑک پر آئی۔“ تو شائے ہاتھ چھڑا کر اندر بھاگ

عثمان نے ماما کو لان میں دیکھا۔ تو گاڑی سڑک پر ہی ایک طرف روک کر

آگئے۔

ماما نے انہیں دیکھا۔ حسب عادت خندہ پشانی سے خیر مقدم کیا۔

”ان کا خیر مقدم بے ساختہ نہیں تھا۔“ ماما کا دل ایک بار تو اچھلا تھا۔

انہوں نے بھرپور نظروں سے عثمان کا جائزہ لیا تھا۔

سفید تانی کڑھائی کے ٹبل کے کرتے اور شلوار میں وہ وجاہت کا

لگ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ہلشہ والی تازگی نہیں تھی۔ ہلکی سی پر

کا عکس صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔ شائے ان کا دل بھی دھک دھک

کر رہا تھا۔ آزمائش سے گزر رہے تھے۔ شائے نے تو سب کچھ سن کر ہوا

قبول کر لیا تھا۔ کیا خبر ماما کا رویہ کیا ہوگا۔ وہ یہی سوچ رہے تھے۔

انہیں دیکھ کر ظریف بھی ادھر آگئی۔ سلام کرتے ہوئے اس کی خوبصورت

شوخی آنکھیں تراخ تراخ بول رہی تھیں۔

جی نے بھی انہیں آکر مودبانہ سلام کیا۔ ماما نے بچوں سے بال

اور انہیں پچھلی طرف جا کر کھیلنے کی ہدایت کی۔ ”کوئی اور کھیل کھیلو جا کر

”بال دے دیں ماما۔ ادھر نہیں آئیں گے۔“

تقریباً —

ظریفہ مختلف محالک کے متعلق ان سے پوچھنے لگی۔

کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ماما نے ظریفہ سے کہا۔ چائے بنالو۔

جی نہیں شکریہ — میں چائے نہیں پیوں گا۔

کچھ ٹھنڈا —

ہاں ایک گلاس پانی۔

ظریفہ سکولیش لے آؤ۔

اچھا۔

ظریفہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا پردہ ہٹائے شاہ

کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔

بکونہیں۔ شائے اس کے ساتھ ہی اندر چلی گئی۔

سکولیش اس نے ملازم کے ہاتھ بھجوا دیا۔ جانتی تھی وہ ماما سے کچھ راز

باتیں کریں گے۔ اس لیے قصداً باہر نہیں گئی۔ شائے ہی کو چھپتی رہی۔

اس نے سکولیش بنا کر گلاس عثمان کو پیش کیا۔ عثمان نے شکریہ کہہ کر گلاس

لیا اور آہستہ آہستہ سب کرنے لگے۔ ماما نے بھی اپنا گلاس اٹھالیا۔ اور خاموش

پینے لگیں۔

کئی لمحے بڑی بوتھل سی خاموشی رہی۔

عثمان کچھ جھجک رہے تھے کہ خیال سے بار بار اداس ہو رہے تھے۔ کہہ

ان کے والدین کو انجام دینا چاہیے تھا۔

انہوں نے گلاس میں چند گھونٹ سکولیش کے چھوڑ دیئے۔ گلاس بے میل

سے واپس رکھ دیا۔

اور — ماما نے پوچھا

”جی نہیں شکریہ“ وہ بولے پھر کرسی پر پہلو بدلا۔ آگے کو جھکے۔ پھر پیچھے پھٹ

گئے۔ ماما سے کچھ کہنا تھا۔ اس کے لیے موزوں الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔

”کیا بات ہے عثمان۔ ماما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور ان کی شکل آسان کر دی۔

”میں آج آپکی خدمت میں کچھ عرض کرنے حاضر ہوا ہوں۔ عثمان نے ماما کو دیکھ

کر ہلکے سے مسکرتے ہوئے کہا۔

ماما جان گئیں۔ لیکن تجا بل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولیں۔ کہیے۔

”سمجھ نہیں آرہا کہ بات کیسے شروع کروں۔ وہ کچھ خفیف سے ہنسنے لگے۔

ماما بس بڑیں۔

”اما۔ انہوں نے پہلی دفعہ انہیں ماما کہا۔ ماما کے دل میں متا کے جذبات ابل پڑے

”جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے۔ قاعدے کے مطابق میرے بزرگوں کو آپ کے پاس

آنا چاہیے تھا۔ وہ سر جھکانے ہوئے آخر دگی سے بولے۔

ماما خوش رہیں۔

لیکن۔ میں۔ خود ہی آپکی خدمت میں گزارش کرنے حاضر ہوا ہوں۔ وہ

ای انداز میں بیٹھے ہوئے بولے۔

”ہوں۔ ماما صرف اسی قدر کہہ سکیں۔

”مجھے اپنا بیٹا بنا میبے ماما۔“ انہوں نے جلدی سے یہ جملہ کہہ دیا۔

ماما چپ رہیں۔ کئی لمحے عثمان سر جھکائے بیٹھے رہے۔ ان کا دل دھڑک

رہا تھا۔ اور امید و بیم کا مرحلہ بڑا تکلیف دہ تھا۔ ماما کے تاثرات کیا تھے۔ وہ

بچوں کے۔

پھر جرات کر کے انہوں نے سر اٹھا کر ماما کو دیکھا۔ کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ

بھی شائزہ متعارف نہ ہو پائے گی۔  
لیکن

پھر بھی ماما کے ذہن میں بہت سے دوسرے تھے، خوف تھے ڈرتے تھے، جس کا انہوں نے اظہار تو نہیں کیا۔ لیکن ذہن میں یہ سب رنگینے لگے۔  
"میری گزارش کا کچھ تو جواب دیں ماما۔" عثمان نے ماما کی گھیر چپ سے مایوس ہوتے ہوئے پوچھا۔

ماما پھکی سی مسکراہٹ لبوں پر لے آئیں۔ اور بولیں۔ "مجھے تو خود سمجھ نہیں آرہی، کیا جواب دوں۔"  
"پھر بھی۔"

"عثمان کیا یہ بہتر نہیں ہو گا۔ کہ آپ اپنے والدین کی رضامندی حاصل کریں۔" عثمان نے کمرے کی نشت پر سر ٹکاتے ہوئے آسمان میں اڑنے والے پرندوں دیکھتے ہوئے آزدہ لہجے میں کہا۔ "میں اپنی طرف سے ہر کوشش کر چکا ہوں۔" "دہ رضامند نہیں ہوتے۔"

"افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ وہ آج کے دور میں بھی روایت پسند اور ادب کے قائل ہیں۔"

"یعنی وہ ایک عام سی لڑکی کو اپنے خاندان میں شامل کرنے کو کسی صورت تیار ہوں گے۔"

عثمان نے گہرا کر ماما کو دیکھا اور جلدی سے بولے۔ "اسی لیے میں نے گھر بار لین خاندان سب کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

ماما چند لمبے چپ رہیں پھر بنجیدگی سے بولیں۔ "یہ اچھی بات نہیں۔" میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔"

ان کی بات انہیں گراں گزری ہے یا اچھی لگی ہے۔

"میری والدہ حیات نہیں ہیں۔" عثمان نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ اور پھر سوتیلی ماں ان کی بھتیجی اپنے باپ سب کے متعلق ماما کو بتا دیا۔ ماما کا چہرہ رنگ بدل رہا تھا۔

"ابا حضور مجھے عاق کر دیں گے۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں زندہ رہنے کے لیے تگ و دو کر سکتا ہوں۔ میرے پاس لاڈ کی ڈگری ہے۔ میری چھوٹی سی بزنس بھی چل رہی ہے۔ جرمی میں کچھ کاروبار ہے۔ یہاں میں کار بالک گیس فیکٹری بنوا رہا ہوں۔ ابا حضور نے سرمایہ روک بھی لیا جب بھی میں اسے کسی طور مکمل کر رہی ہوں گا۔ میری مرحومہ امی کی زمین۔ بنک میں پیہ اور بہت سے شیئر میرے نام ہیں۔ میں شائزہ کے شان شایان مقام انہیں دوں گا۔ میں نے بے شمار لڑکیوں میں سے ان کا انتخاب کیا ہے۔ ماما۔ آپ مجھے مایوس نہ کیجئے گا۔"

ماما سر جھکانے ان کی باتیں بڑی بنجیدگی سے سن رہی تھیں۔

"والدین کی طرف سے سب راہیں میرے لیے بند ہو چکی ہیں۔ آپ نے بھی اپنے بند کر دیئے تو یقین کیجئے گا ماما۔ زندگی میرے لیے بیکار ہو گی۔"

ماما کمرے میں کسی مرمی بت کی طرح پڑی تھیں۔ عثمان۔ ان کا حسب و نسب سوسائٹی میں مقام۔ شخصیت۔ حیثیت سبھی کچھ ٹھیک تھا۔ لیکن والدین کی ناراضگی سے رشتہ کرنے والی بات سوچ طلب تھی۔

عثمان نے انہیں ہر طرح سے یقین دلایا۔ کہ عاق ہو جانے کے باوجود وہ شائزہ کے لیے زندگی کی ہر کسانش ہر سہولت ہبیا کریں گے اور اس کے لیے انہیں دن رات محنت بھی کرنا پڑی تو گھر نہ نہیں کریں گے۔ مالی دشواری جیسی کسی شے سے

عثمان اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماما بھی اٹھ بیٹھیں۔

”اما۔“ عثمان نے پورے خلوص سے کہا۔

”جی۔“

”میں نے جو کچھ کہا ہے آپ سنجیدگی سے غور کریں۔ میں آپ کو تباہی کا نشانہ میرا پہلا اور آخری انتخاب ہے۔ آپ نے انکار کر دیا تو۔ تو۔ میں میں کہہ سکتا کہ۔“

وہ چپ ہو گئے۔

ماما نے ان کی بے کلی اداسی اور پریشانی کو پورے طور سے محسوس کیا۔ لڑی سے بولیں۔ ”آپ چند روز انتظار کریں۔ میں اور شائے کے ڈیڑی سوچنے کے لیے کچھ وقت ضرور چاہیں گے۔“

”میں انتظار کر دوں گا۔“ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔ ”بہتہ دو ہفتے ہی دیر آپ کہیں۔“

ماما نے اثبات میں سر ہلایا۔

”شکریہ۔“ عثمان نے اداس اور پشیمردہ لہجے میں کہا۔ اور پھر ماما سے اجازت لے لی۔

ماما ان کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔ ”آپ کا پروپونل اتنا اچانک اور سائل سے الجھا ہوا ہے۔ کہ میں ذہنی طور پر تیار ہونے کے لیے وقت ضرور لے گا۔“

”میں آپ کا ممنون احسان ہوں۔“

”بہر حال چند دنوں تک آپ کو مطلع کر دیں گے۔“ ماما نے کہا۔

عثمان عقیدت سے ان کی الٹی تھیلی پر بوسہ دیا۔ خدا حافظ کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔

”لیکن۔“

”جی۔“

”ہم یہ رشتہ کر بھی دیں۔ تو دنیا کیا کہے گی۔ اگر آپ کے والدین رضامندی دے دیتے تو میرے خیال میں ہمارے لیے اعتراض والی کوئی بات نہ تھی۔“

لیکن۔ اب۔“

”اما۔“ عثمان نے صرف اسی قدر کہا۔ الفاظ ان کے حلق میں اکٹھے ہو گئے۔ انتہائی مایوس اور بے انتہا پریشان نظر آنے لگے۔ سخت ذہنی کوفت میں مبتلا تھے۔ بار بار آنکھیں نمٹی سے میچ لیتے۔ یوں لگ رہا تھا اذیت ان کی برداشت سے باہر ہے۔

کئی لمحے خاموشی رہی۔

پھر

ماما بولیں۔ ”شائے کے لیے دو تین رشتے اور بھی آ رہے ہیں۔ ہر لحاظ سے عثمان آپ کو ان پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن مسئلہ یہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ کہ آپ کے والدین اس رشتے پر راضی نہیں۔ لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا۔ ہماری پوزیشن کیا ہوگی۔ آپ کے والدین ہمارے اور ہماری بیٹی کے متعلق کتنی غلط رائے قائم کریں گے۔“

عثمان نے دکھ بھری نظروں سے اما کو دیکھا۔ ”شاید اپنی بجائے آپ ٹھیک سوچ رہی ہیں۔ لیکن میں جو قدم اٹھا چکا ہوں۔ وہ پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ آپ مجھے مایوس بھی کر دیں تو بھی والدین سے مصالحت نہیں ہوگی۔ میں وہ نہیں کر سکتا جو وہ چاہتے ہیں۔“

ماما ان کے عزم سے متاثر ہو گئے۔

”پھر ماما اور ڈیڈی اتنی لمبی بحثوں میں کیوں اُلجھے ہوئے ہیں۔“  
 ”لوگوں سے ڈرتے ہیں۔“  
 ”بس۔“

”ہاں۔“  
 ”لیکن تم نے بتایا تھا۔ کہ ماما اور ڈیڈی کی بھی کو میرج تھی۔“  
 ”ہوں۔ تھی۔“  
 ”پھر۔“

”لیکن ان کا معاملہ مختلف تھا۔“  
 ”کیسے۔“

”دونوں کے والدین کو ان کی نند کے سامنے جھکنا پڑا تھا۔ شادی ماں باپ  
 نے کی تھی۔“  
 ”اوہ۔ خدایا۔ مجھ سا بد قسمت انسان شاید کوئی نہ ہوگا۔“  
 ”خدا نہ کرے۔“  
 ”نظر تو ایسا ہی آتا ہے۔“  
 ”گہرا لگئے۔“

”حوصلہ اس بری طرح آزمایا جا رہا ہے شائے۔ گھبرانے جاؤں۔ تو ادھر کیا  
 کروں۔ ان دنوں مجھے اپنی ماں شدت سے یاد آتی ہیں۔“  
 ”میں اسی لیے تو مایوس نہیں ہوں۔ کہ میری اپنی ماں ہیں۔ اور وہ اپنا فیصلہ  
 کرتے ہوئے مجھے نظر انداز نہیں کریں گی۔“  
 ”مجھ سے اب انتظار نہیں ہو سکتا۔“  
 ”ماما سے آپ نے ہفتے دو ہفتے کا وعدہ کیا ہے۔ اور آج تو صرف چار دن

”شائے۔“  
 ”جی۔“  
 ”معاملہ کہاں تک پہنچا ہے۔“  
 ”دور ہے پر۔“  
 ”وہ تو پہلے دن ہی تھا۔“  
 ”بس روز ہی بحث ہوتی ہے۔“  
 ”میرے حق میں۔“  
 ”کبھی حق میں کبھی مخالف۔“  
 ”انجام کیا ہوگا۔“  
 ”اچھا ہی ہوگا۔“  
 ”یقین ہے۔“  
 ”ہاں۔“

ہی گزرے ہیں۔

”یہ چاروں چار صدیاں لگ رہی ہیں۔“

”لگتی تو نہیں چاہئیں۔“

”کیوں۔“

”آپ روز ہی تو کالج سے اڑا لاتے ہیں مجھے۔“

”یہ تو صبر کی اور بھی آزمائش ہوتی ہے۔ میں اب آزمائشوں سے نکل آنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنا کر زندگی سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔“

شانہ مسکرا دی۔

شہر سے باہر جمیوندی میدانی علاقے میں بڑی سست رفتاری سے ہتی تھی۔ اس کے کنارے بڑے سرسبز اور شاداب تھے۔ گھنے درختوں کے خوش گوار سایے اس موسم میں راحت بخش تھے۔ پانی بڑی روانی سے بہتا تھا۔ اور اس کے بہاؤ سے چھو کر ہوا میں نم آلود سی ہوجاتی تھیں۔ درختوں کے سایوں تلے یہ ہوائیں بڑی نعت بخش فضا پیدا کرتی تھیں۔

عثمان اور شانہ ایک گھنے درخت کے خوش گوار چھاؤں تلے بیٹھے تھے۔ خود رو گھاس اور نم آلودٹی کا فرش ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔ عثمان درخت کے تنے کے ساتھ قدرتی سی غیر محسوس ڈھلان پر لیٹے تھے۔ حالات سے لڑتے لڑتے تھک چکے تھے۔ چہرے پر بڑی پتھر مرگ تھی۔ آنکھوں میں بنے خواب کی کیفیت تھی۔ مراد عمل میں ہی رہ رہے تھے۔ لیکن سب کا ساتھ بالکل چھوٹ چکا تھا۔ ان سے کوئی بات کرتا نہ نزدیک ہسکتا۔ والد تو شکل تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔

ادھر مانے بھی اپنا کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ تذبذب کا عالم تھا۔ شانہ کا قرب

حاصل تھا۔ اس کی محبت کا یقین تھا۔ لیکن پھر بھی جیسے صلیب پر لٹکے تھے۔ جب تک شانہ کے والدین ان کے حق میں فیصلہ نہ دے دیتے۔ جاسکتی کا عالم طاری ہی رہتا تھا۔

شانہ ان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اسے حوصلہ نہ تھا۔ نظریہ اس کی پوری پوری دکالت کر رہی تھی۔

اور

پھر

اس نے خود بھی تو فیصلہ کر لیا تھا۔

عثمان کا ساتھ دینے کا فیصلہ۔ وہ تو صرف ماما اور ڈیڈی کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے امید تھی۔ کردہ عثمان کے حق میں ہی فیصلہ دیں گے۔ صرف ذہنی طور پر لوگوں کی باتوں سے بچنے کے لیے تیار ہونے کی ضرورت تھی۔ یہی امید تھی۔ وہ خاموشی سے والدین کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔

”عثمان۔“

”ہوں۔“

”اٹھیے اب۔“

”کیوں۔“

”کافی وقت ہو گیا۔“

”تھوڑی دیر اور۔“

”نہیں۔ چلیے اب۔ آج مجھے کالج کا کافی کام کرنا ہے۔“

”گولی مار دو کام کو۔“

شانہ ہنس پڑی۔ عثمان اٹھ بیٹھے۔

ان کے اٹھتے ہی شانہ کھڑی ہونے لگی۔ تو عثمان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔ بہت جلدی ہے جانے کی۔  
- کافی دیر ہو گئی ہے۔  
- شانہ۔

- ہوں۔  
- کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔  
تم جتنی دیر بھی میرے پاس بیٹھی رہتی ہو۔ مجبور مجبور ہوتی ہو۔  
- عثمان۔ شانہ نے جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس کا منہ بن گیا۔ اور وہ عثمان سے روٹھ گئی۔ ان کی بات نے شانہ کے جذباتوں کو واقعی ٹھیس پہنچائی تھی۔

روٹھنے کی ادا اتنی پیاری تھی۔ کہ عثمان دل تھام کر رہ گئے۔  
- شانہ۔ عثمان نے اسے بلایا۔

وہ منہ موڑے بیٹھی رہی  
عثمان نے پھر اسے پکارا

وہ چپ رہی۔

عثمان مسکراتے ہوئے اس کے اور قریب ہو گئے۔ اپنی بات کی سنگینی کا انہیں اب احساس ہوا۔ معذرت کرنے کے لیے انہوں نے شانہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمانا چاہا۔

لیکن اس نے ان کا کندھے پر رکھا ہوا ہاتھ سختی سے جھٹک دیا۔  
عثمان مسکانے لگے۔ شانہ تو سنجیدگی سے روٹھ گئی تھی۔

- شانہ۔ وہ اس کے کندھے کے قریب اپنا چہرہ کرتے ہوئے اس کے کان

میں جیسے سرگوشی کر رہے تھے۔

وہ کندھے اچکا کر کچھ آگے کو جھک گئی۔

- معاف کرو شانہ۔ عثمان بولے۔ جانے کیوں ایسی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں۔ میں ان دنوں کچھ غیر متوازن ذہن رکھتا ہوں۔ کبھی کبھی مایوسی میں الٹی پٹی باتیں سوچنے لگتا ہوں۔ آئندہ ایسی فضول باتیں نہیں کروں گا۔

وہ منہ پھیرے ان کی طرف پشت کر کے بیٹھی تھی۔ عثمان کی کئی بات کا اس نے جواب نہ دیا۔ عثمان نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ایک لمحے میں اپنی طرف گھمایا۔  
ان کا دل ٹپٹپ اٹھا۔

شانہ رو رہی تھی۔

ان کی باتوں سے اسے اتنا صدمہ پہنچا۔ انہیں اپنے آپ پر بے طرح غصہ آ رہا آیا۔ شانہ کا دل دکھانے کا تو وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

انہوں نے شانہ سے معافی مانگنی چاہی۔

کئی لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکے۔ شانہ کی حسین جھلک کرتی آنکھوں کے حرمیں ڈوب گئے۔ حسن کا یہ انداز تو انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

شانہ نے ان کے بازو سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ تو یہ گرفت اور سخت ہو گئی۔

- شانہ۔ میری زندگی۔ مجھے معاف کر دو۔ آئندہ کبھی اتنی ذلیل بات نہیں کہوں گا۔ تم بھی روٹھ گئیں۔ تو سمجھ لو۔ کہ زندگی روٹھ جانے لگی مجھ سے۔ مجھے تم پر تہماری محبت پر اتنا دھڑکا ہے شانہ اسی اعتماد کے ہمارے توجہ رہا ہوں۔  
شانہ کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔

عثمان نے اپنے رومال میں یہ آنسو پانی جذب کر لیا۔

شانہ کو منانے میں انہیں کافی دیر لگی۔ پیار کی زندگی کا یہ انوکھا اور دلغریب

تجربہ تھا۔ عثمان کو یقین ہو گیا تھا۔ کہ اب وہ دونوں کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ جب دوا جانے کے لیے اٹھے تو عثمان نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے محکمہ آواز میں کہا۔ شائد مجھے یقین ہو رہا ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے۔ کہ میں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ میرے والدین یا تمہارے ماں ڈیڈی۔ کوئی بھی نہیں الگ نہیں کر سکتا۔ ہیں نا۔۔

شکر ہے یقین تو آیا۔۔ شائد نے بھیگے متم سے طنز کیا۔

عثمان سرشار سے لہجے میں بولے۔ اب میں یایوس نہیں ہوؤں گا۔

شائد کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔

میں آج رات ماما سے ملنے آؤں گا۔ عثمان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ لبن بہت

ہو گیا۔ اب میں مزید انتظار کر سکتا ہوں نہ سبر۔

شائد کے ہاتھ پر ان کے ہاتھ کی گرفت آہنی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے گاڑی میں آ بیٹھے۔

شام عثمان نے ماما کو فون کیا۔ کہ رات وہ ان کے پاس اپنے سوال کا جواب لینے آ رہے ہیں۔ آج وہ شائد کے ڈیڈی سے بھی کھل کر بات کرنے والے تھے۔

رات کھانے کے بعد وہ اپنے دوستوں احمد اور نسیم کے ساتھ بازار چلے گئے۔

گھنٹہ بھر ان کے ساتھ رہے۔ اپنے عزم و ارادے سے انہیں بھی آگاہ کیا۔ اس

زمانے میں اولاد پر اپنے فیصلے مسلط کرنے والے والدین ان کی نظروں سے نہیں

گزر رہے تھے۔ کم از کم ان کے گھرانوں میں تو والدین نے نئی پود کے سانے تیار

ڈال دیئے تھے۔ قتل مندی ہی کی تھی۔ اپنی برتری کا بھرم بچوں کی گستاخی سے

ٹوٹنے نہیں دیا تھا۔

عثمان کے حالات سن کر انہیں دکھ بھی ہوا اور خوشی بھی۔ کہ عثمان محبت کے

معاملے میں اتنے سنجیدہ اور ایسے پختہ عزم تھے۔

کوئی سوالو بجے کے قریب عثمان شائد کے ہاں آئے۔ آج گرم ہوا چل رہی تھی۔

ادرات کا ٹی گزر جانے کے باوجود وضائیں پیش موجود تھیں۔ بیرونی لان میں ماما

اور ڈیڈی یقیناً انہیں کے میں بیٹھے تھے۔ پیدل غین پوری رفتار سے چل رہا تھا۔

جس سے پیش کچھ گوارہ ہو رہی تھی۔

عثمان کے فون آنے پر ماما اور ڈیڈی نے اپنا آخری فیصلہ کر لیا تھا۔ شائد نے

ماما کو براہ راست اپنی رضامندی سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب کسی اور فیصلے کی گنجائش

کہاں تھی۔ محبت اور شش کے طوفانی دور سے خود بھی گزر چکے تھے۔ انہیں عثمان کی

دل کی کیفیت اور شائد کے جذبات کا پوری طرح احساس تھا۔

عثمان تو آج آخری فیصلے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کے آئے تھے۔ لڑنے

مرنے والی بات ان پر صادق آتی تھی۔ شائد کو اپنا حق سمجھ کر ان سے مانگنا تھا۔

انکار کی صورت میں وہ حق چھین لینے کی پالیسی پر بھی عمل کرنے کو تیار تھے۔

لیکن

اس کا موقع ہی نہیں آیا۔

وہ آئے تو ڈیڈی نے تپاک سے ان سے ہاتھ ملایا۔ بغل گیر ہوئے اور سینے

سے لگائے۔ چند سیکنڈ ان کی پیٹھ تھپکتے رہے۔

ماما نے بھی ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

خیر مقدم اتنا پر تپاک اور محبت آمیز تھا۔ کہ عثمان کو اپنے حق میں فیصلہ ہو جانے

کا ہر امید ہی نہ ہوئی یقین بھی ہو گیا۔

لان ہی میں بیٹوں بیٹھے۔ ادھر ادھر کی رسمی باتیں ہوئیں اور پھر ماما نے مکررات

ہوئے ان سے کہا۔



- کیا ہرج ہے۔ اب تو بات ہو گئی نا۔

- لے جاؤ بھئی۔ چاہیے عثمان۔ ماما نے مسکرا کر عثمان سے کہا۔

عثمان مسکراتے ہوئے اٹھے۔ ظریفہ انہیں ساتھ لے کر اندر آگئی۔ شائزہ پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ ظریفہ نے عثمان کو بھی اس کے پاس بٹھا دیا۔ اور پھر دونوں کو خوب خوب چھڑتی رہی۔

آج اس کے گھر کے افراد کے علاوہ گھر کے درو دیوار بھی خوش تھے۔ باہر ماما اور ڈیڈی نہیں رہے تھے۔ اور اندر ظریفہ عثمان کے قہقہے گونج رہے تھے۔

”مبارک ہو عثمان بیٹے۔ ہم نے شائزہ تمہیں سوئپ دی۔ تم دونوں کا اللہ نگہبان ہو۔“

عثمان کے کانپتے لبوں سے شکل شکریے کا لفظ نکلا۔ ان کی حالت غیر سی ہو گئی۔ بے کن خوشیاں تھیں۔ بار نہ بھلنا مشکل ہو گیا۔

سردار علی نے بھی مبارکباد کہی۔ وہ شدت جذبات سے مغلوب مغلوب سر جھکا بیٹھے رہے۔ بے حد حساب خوشیوں کے ساتھ ساتھ انہیں چھین بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کاش یہ موقع والدین کے زیر سایہ میسر ہوتا۔

ان کی آنکھوں میں ہلکی سی دھندلاہٹ آئی۔ لیکن وہ جلد ہی منجھل گئے۔ ماما اور ڈیڈی منگنی اور شادی کی بات کر رہے تھے۔ عثمان کو ابھی یقین نہ آ رہا تھا۔ کہ وہ گوہر مقصود پا چکے ہیں۔

ظریفہ ماما ڈیڈی کے فیصلے سے آگاہ تھی۔ کچھ دیر تو وہ اندر ہی بیٹھی رہی۔ جب یقین ہو گیا۔ کہ بات ہو چکی ہوگی۔ باہر آئی۔ عثمان کو مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ پھر ماما کی کمری کی پشت پر آئی جھک کر

ماں نے کان میں سرگوشی کی۔ ہو گئی بات۔

”ہو گئی۔ ماما نے کہا۔“

”مبارک۔ اس نے سب سے کہا۔“

”شکریہ۔ عثمان مسکرائے۔“

”ماما۔“

”ہوں۔“ عثمان بھائی کو اندر لے جاؤں۔“

ماما نہیں پڑیں۔ بڑی شریعہ ہو۔“

”کیونکہ۔۔۔ سمجھاؤ ذرا۔“

”بھئی اگر شادی ہو رہی ہے۔ تو ظاہر ہے والدین شادی کر رہے ہیں۔

پوری شان اور آں بان کے ساتھ۔ اور اگر تم شادی کر رہے ہو۔ تو۔۔۔  
غمان کھلکھلا کر سانس پڑے انہوں نے اپنا ہاتھ گرجوشتی سے ہاوی کے ہاتھ  
براراً۔۔۔ بڑے عقل مند ہو۔۔۔

”تو کیا چند سمجھ رکھا ہے۔“

”نہیں یا یہ بات نہیں۔ ویسے داد دیتا ہوں تمہاری سوچ کی۔

اچھا تو اب کہو۔ شادی ہو رہی ہے یا کر رہے ہو۔“

”شادی کر رہا ہوں۔“

”واقعی۔“

”بالکل۔“

”اور۔۔۔ تمہارے۔“

”والدین؟۔“

”ہاں۔“

غمان کر سی پر پیچھے کو سر ہٹ گئے۔ سگریٹ کے دوایک کش لیے۔ ہادی  
کو دیکھا اور بولے۔ ”بہت کوشش کی وہ مانتے نہیں۔ اپنے سے کمتر کسی  
مائنان کی لڑکی کو بیو بنانا۔ نہ کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”اور تم نے کیسے سوچ لیا۔“

”میں خاندان کی نہیں انسان کی عظمت کا قائل ہوں۔“

”اوہ زندہ باد۔۔۔ زندہ باد۔“ ہادی نے نعرہ مارا۔ اور ارد گرد میزوں  
پر بیٹھے لوگ گردنیں موڑ موڑ کر انہیں دیکھنے لگے۔

”ہادی۔“

”ہوئی۔“

”میں شادی کر رہا ہوں۔“

”شادی؟۔“

”ہاں۔ شادی۔ سمجھے نہیں ہو۔ میں شادی کر رہا ہوں۔“

”سمجھا واقعی نہیں۔ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ یا تم شادی کر رہے ہو۔“

”جے وقوف۔ مطلب تو ایک ہی ہوا۔“

”ایک کیسے؟۔“

”یعنی شادی ہو رہی ہے پس۔“

”اوں ہوں۔ شادی ہو رہی ہے یا تم کر رہے ہو۔ دونوں باتوں میں الجھ

المشترقین ہے صاحب۔“

"ہاں۔"  
 "تو جناب میں شادی کر رہا ہوں۔ شائے کے ساتھ۔"  
 "شائے۔"  
 "کیوں۔"  
 "منفرد سانا نام ہے۔"  
 "وہ خود بھی منفرد ہے۔"  
 "یہ تو ظاہر ہے۔ ورنہ خاندان ماں باپ اور دھن دولت سے مزہ مڑنے  
 کی ضرورت نہ ہوتی۔"  
 "بڑے سمجھدار ہو گئے ہو۔"  
 "میں سمجھ رہا ہوں۔"  
 "جی ہاں۔ اچھا چائے تو اٹھائیے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"  
 "ہونے دو۔ تمہاری باتیں گرا گرم جو ہیں۔"  
 "عثمان مسکرانے لگے۔ شائے اور اس کے خاندان کے متعلق انہوں نے مختصر  
 الفاظ میں ہادی کو بتا دیا۔"  
 "خاندان ایسا بھلی نہیں کہ تمہارے والدین درخود اعتنا دہی نہ سمجھتے۔"  
 "ہادی بولا۔ باعزت لوگ ہیں۔"  
 "پار کوئی ایک مصیبت تو نہیں نا۔"  
 "کیا مطلب؟"  
 "امی کی بھینجی ہیں ایک۔ معاملہ ان کی وجہ سے اتنا بخیدہ ہو گیا۔"  
 "یعنی۔"  
 "یعنی وہ اپنی بھینجی کے حق میں ہیں۔ اور بات کافی بڑھا بھی چکی تھیں۔"

دونوں ریسٹورنٹ کے چھوٹے سے ایئر کنڈیشنڈ ہال بیٹھے چائے پی رہے  
 تھے۔ چند میزیں اور بھی تھیں۔ جن پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ کاروباری قسم  
 کے لوگ اپنے کاروبار ہی کی باتوں میں نگے تھے۔ کچھ کالجوں کے درپیش ہال  
 پر چائے پیتے ہوئے باتوں میں مشغول تھے۔ ان کے علاوہ دو ایک میزوں پر  
 کچھ جوڑے بیٹھے تھے۔ میاں بیوی تھے۔ یا ایک دوسرے کے شیدائی۔ بحر حال  
 ہال میں شام کے وقت خاصی گھاگھی تھی۔ ماحول پرسکون تھا۔ آداب کا خیال ہر  
 ایک کو تھا۔ دھیمے لہجوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ ہادی کے نعرہ زن ہونے پر  
 کئی لوگوں نے اسی لیے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔ کہ ریسٹورنٹ میں باتیں کرنے کا  
 دستور نہیں تھا۔  
 عثمان نے سگریٹ کا ادھ جلا حصہ ایش ٹرے میں ڈال دیا۔ اور مسکرا کر ہادی  
 سے بولے۔ "ہادی ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہو۔"  
 "کیا ہوا۔"  
 "تمہارے نعرہ متانہ نے لوگوں کو متوجہ کر لیا ہے۔"  
 "بڑی مات ہے کیا۔"  
 "اور اچھی ہے؟"  
 "خیر۔ یہ بتاؤ کہ شادی کہاں کر رہے ہو کیسے کر رہے ہو۔ کیونکر کر رہے ہو؟  
 ہادی کے سوال کے آخری حصے پر عثمان ہنس دیئے۔ چائے کی پیالی اٹھا  
 لی اور ایک گھونٹ لے کر پیالی واپس رکھتے ہوئے بولے۔ "تمہارے ایک  
 ہی سوال میں کئی سوال ہیں۔ کس کس کا جواب دوں۔"  
 "سب کا تفصیل کے ساتھ۔"  
 "یہ بات۔"

اور جناب ڈٹ گئے اپنی بات پر۔  
 - ہادی - میں خود نہیں سمجھ پاتا۔ کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ شائد کے بغیر تو شاید  
 میں مری بھی نہیں سکوں گا۔ اگر میں اپنے جذبات کے اظہار کے لیے عشق کا لفظ  
 استعمال کروں۔ تو یہ لفظ نہایت ناممکن اور بڑا سا لگتا ہے۔  
 - اتنی دہرجا چکے ہو۔  
 - اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ تو یہ بات محسوس کی تھی۔ وہ مجھے اپنے آپ سے الگ  
 کوئی شے نہیں لگتی۔ اور تم یقین کر دو گے کہ میرے یہ احساسات پہلے دن ہی تھے۔  
 جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔  
 عثمان اتنی سنجیدگی سے باتیں کر رہے تھے۔ کہ ہادی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔  
 - ہاں تو اب مجھے شادی کے سلسلے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ عثمان بولے۔  
 - میں حاضر ہوں۔ ہادی نے کہا۔  
 - یہ تو بتا ہی چکا ہوں۔ کہ گھر والے شادی میں شرکت نہیں کریں گے۔ اب اس  
 نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے۔ کہ کوئی غیر خاندان کی ایٹ کی اس گھر کی دہلیز پر قدم نہیں  
 سکتی۔  
 - ہوں۔

- یہی دو مسئلے ہیں۔ جن میں تمہاری ضرورت ہے۔  
 ہادی نے پوری پوری مدد کا یقین دلایا۔  
 - چند دوست نکاح میں شرکت کے لیے ہوں۔ عثمان بولے۔ لمبا چوڑا اجتماع  
 کرنے کی ضرورت نہیں۔  
 - ٹھیک ہے۔ ہو جائے گا۔ بلکہ نسیم رضا احمد اور فیروز کی بیویاں بھی آجائیں گی۔  
 - یہ تو ہو جائے گا۔ اصلی مسئلہ گھر کا ہے۔

- میرا گھر حاضر ہے۔  
 - شکریہ ہادی۔ گھر مجھے کم از کم ایک سال کے لیے چاہیئے۔ کہ لے لے رہی  
 مل جائے۔  
 - کوشش کروں گا۔  
 - زیادہ سے زیادہ ایک سال۔ اس دوران انشاء اللہ میں اپنا بند و بست کر  
 لوں گا۔ میرا ارادہ ہے۔ جگہ لے کر اپنی پسند سے گھر بناؤں۔ خیر وہ تو بعد کی  
 باتیں ہیں۔ فی الحال گھر مل جائے۔ چاہے دو بیڈروم ہی کا ہو۔  
 - ہوں۔  
 - شادی سے پہلے گھر مل جائے۔ تو اسے رہائش کے قابل بھی بنانا ہے۔ کچھ  
 سامان۔ فرنیچر۔ اور۔ ہادی کو اچانک بیٹھے اک بات یاد آگئی۔ عثمان کی بات  
 کاٹتے ہوئے بولا۔ یا ر خوب یاد آیا۔  
 - کیا۔  
 - گھر کا مسئلہ حل ہی سمجھو۔  
 - کیسے؟  
 - لیکن۔ تم شاید اسی شہر میں گھر لے لیا چاہو گے۔  
 - ضروری نہیں۔  
 - تو پھر بن گئی بات۔  
 - کیسے؟  
 - میرے ایک دوست میجر اشفاق ہیں۔  
 - ہوں۔  
 - وہ ڈیوٹیشن پر تین سال کے لیے لیا جا رہے ہیں۔

اور گھونٹ گھونٹ چائے پیتے ہوئے پردگرام بنانے لگے۔  
- شادی ہو کب رہی ہے۔ ہادی نے پوچھا۔

- جلد ہی۔

- پھر بھی کتنے دنوں کتنے ہفتوں کتنے مہینوں بعد۔

- مہینوں والی بات غلط ہے۔ ہاں دو تین ہفتے ضرور لگ جائیں گے۔ ویسے  
ابھی تاریخ وغیرہ کی بات نہیں ہوئی۔

- لڑکی والوں کو تیاری کے لیے تو کچھ دن ضرور چاہیے ہوں گے۔ تم تو خاندان  
کے کٹ لگا کر وہاں بچ جاؤ گے۔ لیکن ان کا تو کنبہ قلیل ہوگا۔

- ضرور ہوگا۔ ویسے بھی مجھے اس بات کا دکھ بھی بہت ہے۔ خوشیوں کے سینے  
میں جیسے خنجر سا چبھا ہوا ہے۔ کاش والدین کو کسی طرح راضی کر سکتا۔  
- ابھی کوشش جاری رکھو۔  
- بے فائدہ ہوگی۔

- پھر بھی۔

- نکاح سے پہلے ایک دفعہ پھر کوشش کروں گا۔ لیکن جانتا ہوں۔ جس دن  
نکاح کا نام لیا۔ اسی دن گھر سے جواب مل جائے گا۔  
- ابھی تو گھر ہی میں ہونا۔

- نہ ہونے کے برابر۔ کوئی کلام تک نہیں کرتا۔ ابا امی کے ساتھ ساتھ بہنوں  
نے بھی بایکاٹ کر رکھا ہے۔ تعلق تو ان کے رویے سے ہے۔ بہت دکھ ہوتا ہے  
بابہ گھر میں ایک لمحہ رکنے تو جی نہیں چاہتا۔ مجبوری کے تحت وہاں ہوں۔  
- انوس ہے۔

- ہاں تو پھر۔ گھر کی امید رکھوں۔ عثمان نے چند لمحے رہنے کے بعد پوچھا۔

- پھر۔  
- ان کا ذاتی منظر ہے۔ دو بیڈروم کا بالکل بنا بنا ہوا۔ اور نئے سامان  
آراستہ۔

- لیکن۔

- وہ گھر کرایے پر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن کسی ایسے آدمی کو جو ان کے گھر  
اور ان کی چیزوں کی پوری پوری حفاظت اور دیکھ بھال کر سکے۔ اگر نہیں  
اس جگہ سے چالیس پچاس میل دور اپنے پر اعتراض نہ ہو۔ تو وہ گھر تہا رہے لیے  
بے حد محزون ہے۔

- تم ہی اس سلسلہ میں ان سے بات کر سکتے ہو۔

- آج ہی فون کروں گا۔

- انہیں کب جانا ہے۔

- ہفتے دو ہفتے کے اندر اندر۔ چند دن ہوئے میں ان سے ملا تھا۔ گھر کا  
وجہ سے وہ خاصے پریشان تھے۔

- ہو سکتا ہے پریشانی دور ہو گئی ہو۔

- یہ تو فون کر کے ہی پتہ چل سکتا ہے۔

- پھر آج ہی کرو فون۔

- کل تمہیں مطلع کروں گا۔ اگر انہوں نے ابھی تک کسی کو نہ دیا ہوا تو پھر کوئی  
وجہ ہی نہیں۔ کہ گھر نہ ملے۔

- مل جائے تو میری بہت بڑی پریشانی دور ہو جائے گی۔

- ہاں۔

- دونوں نے چائے کی ایک ایک اور پیالی بنائی۔ نئے سگریٹ سلاٹے۔

کہاں تھے کیا کر رہے تھے سو گئے تھے یا جاگ رہے تھے۔ انہیں کچھ تیر نہ چلا۔  
عثمان کے سر سے آج بہت سے بوجھ اتر گئے تھے۔ جب وہ سونے کے لیے  
بیڈ پر لیٹے۔ تو اپنے آپ کو ہلکا ہلکا محسوس کیا۔  
لیکن

اس کے باوجود دل میں کسک ہوتی رہی۔ اپنوں سے کٹ کر جینے کا تجربہ  
خاصہ تکلیف دہ تھا۔

نکل ہی تباہوں گا۔ آج رات انہیں فون کر کے تیر کروں گا۔ نہ بھی ہوا۔ تو فکر نہ  
کر دو۔ کہیں نہ کہیں بندوبست ہو ہی جائے گا۔ میرا گھر تو حاضر ہے۔  
بہت بہت شکریہ۔ خدا کرے کہ وہ گھر مل جائے۔  
دو دنوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر بیرے کو بلا کر بل ادا کیا اور دونوں  
ریٹورانٹ سے نکل کر باہر آ گئے۔  
تیسیم سے بھی بل نہ لیا جائے۔ ہادی نے اپنی گاڑی کی طرف جاتے جاتے پتھا۔  
کس لیے؟  
یہی مکان وغیرہ کے لیے۔ پھر نکاح کے لیے کچھ دوستوں کو اکٹھا کرنا ہے۔  
چلو چلتے ہیں۔  
اُد۔

ہادی اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ اور عثمان اپنی گاڑی میں آ بیٹھے۔ دونوں آگے  
پیچھے روانہ ہو گئے۔ دس منٹ بعد وہ تیسیم کے گھر میں بیٹھے تھے۔ تیسیم کی بیوی  
سارہ بھی ان کی باتوں میں شریک تھی۔  
عثمان کو صلاح و مشورے کی ضرورت تھی۔ شائے کے لیے انہیں کیا کچھ لینا چاہئے  
تھا۔ یہ سب منتر تیسیم انہیں بتا رہی تھی۔  
رات کا کھانا بھی سب نے اکٹھے یہیں کھایا۔ ساڑھے دس کے قریب ہادی  
اور عثمان نے اجازت چاہی۔ سارہ نے بہت سی چیزیں شائے کے لیے انہیں لوٹ  
کر وادی تھیں۔

انگوٹھی سب سے پہلے خریدیے۔ سارہ نے عثمان کو خدا حافظ کہنے سے پہلے کہا۔  
نکل ہی خرید لوں گا۔ عثمان مسکرائے۔  
وہ رات گئے گھر واپس آئے۔ ان کا ذاتی ملازم انتظار میں تھا۔ باقی اہل خانہ

جی۔

چلو اطلاع دیں انہیں۔

آپ اندر آکر بیٹھے۔ اس نے جلدی سے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول

دیا۔

عثمان ڈرائنگ روم میں آگئے۔ اس نے جلدی سے دونوں پیچھے کھول دیئے۔ اور پیچھے کے نیچے کھڑے ہو کر ماما کا انتظار کرنے لگے۔

دومنٹ کے اندر اندر ہی ماما آگئیں۔

عثمان نے قدرے سر جھکا کر انہیں سلام کیا۔

اور

انہوں نے کمال شفقت سے اپنے دستور کے مطابق ان کی پیشانی چوم لی۔

بہت کے اس پر خلوص اظہار پر عثمان سرشار سے ہو گئے۔

یہاں گرمی ہے۔ ماما بولیں۔

آج واقعی بہت گرمی ہے۔

مناسب سمجھیں تو میرے کمرے میں آجائیں۔ وہاں کنڈیشنر لگا تھا۔

ماما۔

جی۔

دیکھیں۔

کیا۔

ایک بات کہوں۔

ضرور۔

آپ نے جب مجھے بتایا بنانے کا شرف بخشا ہے۔ تو لپیز بیٹوں کی طرح ہی

عثمان گھر سے نکلے تھے۔ تو ہوا بالکل بند تھی۔ پچھلے پہر کی دھوپ دھل رہی تھی۔ لیکن مرد دیوار تپ رہے تھے۔ ایئر کنڈیشنر کمروں میں تو گرمی کا احساس ہوتا تھا۔ لیکن جو نہی باہر نکلتے گرمی کی شدت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی۔ انہوں نے ہنڈے کپڑے پہن رکھے تھے۔ لیکن پھر بھی پسینہ بار بار پونچھنا پڑتا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے تو کچھ ٹنڈک محسوس کر کے طبیعت بجالا ہوتی۔

وہ شائے کے ہاں آئے۔ آج انہوں نے ماما سے شادی کے متعلق کھل کر بات بھی کر لی تھی۔ اور انگوٹھی خریدنے بھی جانا تھا۔

گاڑی برآمدے کے سامنے روک کر انہوں نے برآمدے میں مگی بیل بجائی۔

کون۔ اسلام نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ اور پھر عثمان کو دیکھ کر مؤدبانہ

بولا۔ آپ۔ آئیے۔ میں بیگم صاحبہ کو اطلاع دیتا ہوں۔

گھر پہنچیں نا؟

کیا حال چال ہے - ماما نے ان کے جانے کے بعد بیڈ کی چادر بیٹھے بیٹھے  
 یک کرتے ہوئے عثمان سے پوچھا -  
 "شکریہ - ٹھیک ہوں"  
 گھر والے -

"حسب دستور"  
 کچھ لپک نہیں آئی -  
 "ناممکن ہے -"

"اپنی سی کوشش تو کرتے رہو -"  
 کر رہا ہوں - لیکن امید نہیں -"  
 "سچی عثمان - اگر آپ کے والدین بھی اس شادی میں شریک ہوئے تو ہمارے  
 لیے خوشی اور فخر کا مقام ہوتا -"

"میں اچھی طرح سمجھتا ہوں ماما - لیکن آپ شاید ان لوگوں کی خود پسندی سے  
 آفت نہیں ہیں - اور اب تو انہوں نے اپنا کامسٹر بنالیا ہے - میں جتنی منت  
 حاجت کروں گا - وہ اتنے ہی سخت گیر ہوتے جائیں گے -"  
 "افسوس ہے -"

"بالکل - لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں - کہ ان کا غصہ کبھی نہ کبھی اتر بھی جائے  
 انہیں ان کا اکلوتا بیٹا نہ ہوتا - تو شاید وہ اپنے غصے کو عموں تک پھیلا دیتے -  
 جان اب یقین ہے - کہ زیادہ عرصہ کٹ کر نہیں رہیں گے - پھر میں نے بھی عزم  
 لے رکھا ہے - کہ انہیں کسی نہ کسی طرح - کبھی کبھی منا ہی لوں گا -"  
 "خدا تمہیں سلامت رکھے -"

عثمان نے عقیدت سے ماما کو دیکھا - پھر ڈیڑی کے متعلق پوچھا -

ٹریٹ کریں - یہ سٹگاتی باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں - اپنائیت کا احساس کھو گئی  
 ہیں -"  
 ماما کھلکھلا کر ہنس پڑیں -

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی - وہ نہتے ہوئے بولیں -  
 ابھی تو کہہ رہی تھیں - آپ مناسب سمجھیں تو - جی - آپ - یہ وہ -  
 عثمان بولے - تو ماما نے قہقہہ لگاتے ہوئے ان کی لپٹ پر ہاتھ پھیرا اور بے اختیار  
 پیار کر لیا -  
 عثمان خوش ہو گئے -"

ماما انہیں ساتھ لے کر اپنے بیڈ روم میں آ گئیں - شائندہ اور ظریفہ بھی وہیں  
 لیٹی تھیں - ایسی اور جی بھی پلنگ پر لیٹے تھے - شائندہ اور ظریفہ تو عثمان کے اندر آنے  
 سے پہلے ہی کمرے سے نکل گئیں - ایسی جی اٹھ بیٹھے -

"ہو -"  
 دونوں نے عثمان کو سلام کیا - اور پلنگ سے نیچے کود آئے - عثمان نے انکی  
 احوال پر سہی کی - وہ تنظیم سے جواب دیتے رہے - بیڈ کے قریب ہی ایک کرسی پر عثمان  
 بیٹھ گئے - ماما بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئیں -  
 "ایسی جی - ماما بولیں -"

"جی -"  
 "چلیے جا کر نہائیے - بہت ریسٹ لے لیا - اب سکول کا کام شروع ہو جائے  
 سمجھے -"

"جی ماما -"  
 دونوں ماں کے حکم پر باہر چلے گئے -



نیکریہ۔ عثمان نے کہا۔ ایک گھونٹ لیا۔ سکولیش ظریف نے شاید دو چار قطرے ڈالی تھی۔ پانی بھی ٹھنڈا نہیں تھا۔ بہت ہمدرد تھا۔  
 ظریف نہیں کر بولی۔ پھیکا تو نہیں۔  
 یہ تو آپ کو بھی پتہ ہوگا۔ عثمان نہیں کر بولے۔  
 ظریف بولی۔ میں نے کچھا تھوڑا ہی ہے۔  
 اب چھ لیں۔ عثمان نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ تو ظریف ہنسنے لگی۔  
 اگچھ لیں اس نے شرارت کی ہے۔

بہت شریہ ہے۔ اس سے بچ کر رہنا عثمان۔ ماما نے کہا۔  
 سمجھ لوں گا۔ ظریف سے عثمان نے مسکرا کر کہا۔  
 لائیے دوسرا بنا دوں۔ ظریف بولی۔  
 جی نہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ میں خود بناؤں گا۔  
 کیوں۔ اعتبار نہیں رہا۔  
 بالکل۔

ہائے نہیں بھاٹی جان۔ اب قسم سے ٹھیک ٹھیک بناؤں گی۔  
 میں خود بنانا جانتا ہوں۔  
 عثمان اٹھ کر میز کی طرف آئے اور اپنے لیے سکولیش بنالیا۔ ظریف ہنستی رہی۔  
 آپ کے لیے بھی بناؤں۔  
 میں خود بنا لوں گی۔

میرے ہاتھ کا پی کر دکھیں۔ کبھی نہ پایا ہوگا ایسا۔  
 چلیے بنائیں۔ ظریف جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ ماما اور وہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔  
 عثمان نے سکولیش بنایا۔ اتنی چینی ڈالی۔ کہ شربت شیر اسابن گیا۔

ان کے کسی عزیز کی چوری ہو گئی ہے۔ ماما نہیں۔ ان کے ہاں صبح گئے ہوئے ہیں۔ ابھی تک آئے نہیں۔  
 ہاں تو ماما۔ عثمان مسکرائے کچھ جھکے۔ پھر چپ ہو گئے۔  
 کیا۔  
 کچھ تاریخ واریخ۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ماما بولیں۔ طے کر لیتے ہیں۔ جو نہیں مناسب معلوم ہو۔ ویسے کچھ دن ہر ضرورت چاہئیں۔  
 کس لیے۔  
 تیاری وغیرہ کے لیے۔

چھوڑیں ماما۔ فضول رکھوں کو۔ کسی لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت نہیں۔  
 صرف اتنے دن درمیان میں رکھیں۔ کہ میں شانہ کے لیے کچھ ڈرلینس تیار کر دوں گا۔  
 ماما نے تہقیر لگایا۔  
 اپنے لیے وقت چاہیے۔ اور یہی وقت کی ضرورت نہیں۔ شریہ۔  
 جلد سے جلد۔

ہاں ہاں۔ ہو جائے گا۔ لیکن کچھ گھر بار کا کیا۔ اپنے گھر تو شاید۔  
 سب ہو جائے گا۔ یہ میری ذمہ داری ہے ماما اور میں اپنی ذمہ داری اچھی طرح سمجھتا ہوں۔

ماما کچھ کہنے کو تھیں۔ کہ ظریف ٹرے میں سکولیش لیے آگئی۔  
 عثمان کو اس نے بڑی بے تکلفی سے سلام کیا اور حال احوال پوچھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ کونے والی میز پر ٹرے رکھ کر اس نے سکولیش بنائی۔ اور گلاس ماما اور عثمان کو پیش کیے۔

- شائندہ کے لیے -

- ہوں -

- آپ اجازت دیں - تو شائندہ کو ساتھ لے جاؤں - ان کی پسند سے خریدنا چاہتا ہوں -

- ماما چند لمحے تو چپ رہیں - پھر مسکرا کر بولیں - تو تم اسے ہی لینے آئے ہو -

- جی -

- اچھا -

- عثمان خوش ہو گئے - جلدی ساٹھ کھڑے ہوئے -

- بیٹھو بیٹھی ابھی - اس سے پوچھ تو لوں - ساتھ جائے گی بھی کہ نہیں -

- کیوں نہ جائیں گے - عثمان بولے تو ماما مسکرانے لگیں -

- تم ٹھیکو - میں ابھی آتی ہوں -

- ماما - میں نے ان کے لباس بھی نبوانے ہیں - جب تک وہ ساتھ نہ ہونگی مجھے

یا پتہ چلے گا -

- اچھا بھئی -

- آپ جانتی ہیں - کہ اب سب کچھ مجھے ہی کرنا ہے - اس لیے شائندہ کی پسند ناپسند

کھینا ہوگی -

- ٹھیک ہے -

- ماما چلی گئیں اور عثمان کمرے میں پہننے لگے - دیوار پر ماما اور ڈیڈی جوانی

تصویر دیکھتے ہوئے انہیں یوں لگا جیسے ماما نہیں شائندہ ہی کھڑی ہو - ماما بیٹی

اس قدر شاہت تھی - وہ خاصے حیران ہوئے -

- ماما تھوڑی دیر بعد آگئیں - شائندہ کو ساتھ لے جانے کی انہوں نے عثمان کو

- لیجئے - جناب - عثمان نے گلاس اسے دے دیا -

- لیکن ایک گھونٹ ہی سے جیسے منہ میں شیر اگل گیا - میٹھا لے دے ہی پسند نہیں

تھا - براس منہ بناتے ہوئے غسل خانے کی طرف دوڑی -

- عثمان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا - ماما بھی ہنسنے لگی -

- ظریفہ منہ صاف کر کے واپس آگئی - دونوں میں کچھ دیر لطیف سی چیر بھرا ہوا

رہا -

- ظریفہ -

- جی ماما -

- اب باتوں میں وقت گزار دو گی - چائے نہیں پلاؤ گی -

- چائے نہیں ماما -

- کیوں - پی آئے -

- ابھی نہیں پی - لیکن آپ نہ بنائیں - کم از کم میرے لیے -

- کیوں -

- مجھے جانا ہے -

- کہاں -

- بازار -

- کہیں باہر بیٹے کے ارادے ہوں گے - ظریفہ بولی -

- جی ہاں - عثمان نے مسکرا کر کہا -

- ظریفہ چلی گئی - ماما کے لیے چائے تو بنوانا تھی -

- اس کے جانے کے بعد عثمان نے ماما سے کہا - میں نے آج آکھوشی خریدنا

ادھ - اچھا - ماما کچھ نہ سمجھیں -

اجازت دیدی۔

عثمان خوشی سے پھیل سے گئے۔۔۔ آپ کتنی اچھی ہیں!۔۔۔ وہ اظہارِ شکر کے طور پر بولے۔

اما انہیں ساتھ لے کر باہر آگئیں۔ کچھ ہی دیر میں ظریف کے ساتھ شائے بھی آگئی۔ اس نے آسمانی پھولدار وائل کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ آسمانی رنگ کا چھوٹا سا دوپٹہ گلے میں تھا۔ چہرے پر نکھار اورتازگی تھی۔ ماں اور بہن کے سامنے عثمان کے ساتھ جاتے ہوئے لاج بھی آ رہی تھی۔ ویسے بھی اب اُسے عثمان سے بھی شرم آنے لگی تھی۔ ماما سے تو اس نے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جائے گی۔ لیکن ظریف نے خوب جھاڑ پلائی تھی۔ اور ماما نے بھی یہی مناسب سمجھا تھا۔

عثمان نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ اور وہ لمبائی شرمائی ایک طرف لگ کر بیٹھ گئی۔ عثمان نے ماما کو سلام کیا۔ ظریف کو ہاتھ ہلایا اور گاڑی چلا دی۔ ان دونوں کے سامنے وہ بڑے شریف بنے رہے۔ شائے کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔

لیکن گاڑی گیٹ سے نکلتے ہی ان کی تماشہ توجہ شائے کی طرف تھی۔

”دعا نہ سلام۔ یہ کیا بات ہوئی“ عثمان نے دروازے کے ساتھ لگ کر مٹی سگریٹ شائے کو دیکھ کر بڑے رعب سے کہا۔

شائے نے آواز کی تندی محسوس کی۔ تو گھبرا کر عثمان کو دیکھا۔

”ہاں ہاں۔ اب پہلے والی بات نہیں ہے جناب۔“ عثمان اسی انداز میں بولے۔ آپ کو بتا دوں کہ مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔۔۔

”جی۔ شائے ہم گئی۔“

”آپ کو آتے ہی مجھے سلام کرنا چاہیے تھا۔ یہ نہیں کہ منہ بنا کر مٹی رہیں۔ جیسے روٹھی ہوئی ہیں۔“ عثمان لپے میں زور پیدا کرتے ہوئے۔ ان کے ماتھے پر شکنیں تھیں۔ اور آنکھوں سے غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

”روٹھے کی کیا بات ہے۔ شائے مشکل کہہ پائی۔“

”تو یہ کیا انداز ہے۔“

”اور کیا کروں۔“

جان جان - میری جان - عثمان نے لاڈ سے کہتے ہوئے بازو اس کی کمر میں ڈالا - اور سیٹ پر اپنے قریب گھسیٹ لیا -

ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا - اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اسے اپنے ساتھ لگائے وہ گاڑی چلا رہے تھے - انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان کی نیلیگوں وختوں میں ہلکے پھلکے پرندوں کی طرح اڑ رہے ہیں - وہ اپنا مخصوص اور پسندیدہ مصرعہ لگتا رہے تھے -

گاڑی شہر کی گلیاں آباد سڑکوں پر آئی - تو عثمان نے شانہ کی کمر سے ہاتھ نکال لیا اور شانہ کی منجلیں کھینچ کر بیٹھ گئی -

شانہ -

جی -

اب پہلے جیولر کے پاس جانا پسند کریں گی - یا پہلے چائے پی لیں -

مجھے کچھ نہیں پتہ - زیادہ دیر نہ ہو بس -

کیوں -

ماما نے کہا تھا -

اب ماما کا آپ پر کوئی حق نہیں سمجھیں -

ابھی ہے -

اچھا - تو پھر میں کل ہی نکاح کا بندوبست کرتا ہوں - اپنا حق تو پورا تسلیم کیا جائے گا -

شانہ شرمیلی سکراہٹ لیے انہیں دیکھنے لگی - یکے کے ساتھ ہونے جارہے تھے وہ - ان کی خوشیوں کا اندازہ کرنے میں شانہ کو دیر نہیں لگی - دونوں ریلیٹورانٹ کی طرف بڑھ گئے -

قریب بیٹھیں -

شرم آتی ہے -

کیوں - کیا پہلی دفعہ آئی ہیں میرے ساتھ -

پہلے اور بات تھی -

پہلے تو بری بات تھی - غیر قانونی طریق سے میرے ساتھ فرار ہوتی تھیں - آج تو ہم قانونی طریق سے ساتھ ساتھ آئے ہیں -

تو - تو میں کیا کروں - مجھے کیا کرنا چاہیئے -

شانہ نے سہم کر مچھی مچھی آنکھوں سے عثمان کو دیکھا - جن کا موڈ خاصہ بگڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا - عثمان نے گروں گھبرا کر اسے دیکھا - جس کی یہ ادا ان کے لیے بالکل ہی نئی تھی - دل لوٹ پوٹ ہی ہو گیا - اداکاری اب نہ کر سکے - کھلکھلا کر نہیں دیئے - تو شانہ کی جان میں جان آئی -

میں نہیں بولتی - آپ سے - وہ حوصلہ پاکر خنگی کے انداز میں بولی -

کیوں - عثمان نے پوچھا -

جان نکال دی میری -

ڈر گئی تھیں -

اور نہیں تو کیا -

اچھی بات ہے -

واہ جی -

ہاں ہاں - میاں کا رعب بیوی پر ہونا ہی چاہیئے - خوب ڈرایا دھمکایا کروں گا -

ہائے اللہ - عثمان کی نشیل آنکھوں کو دیکھ کر شانہ شرمائی گئی -

ایک کہیں میں بیٹھے ہوئے عثمان نے ہیرے کو چائے کا آرڈر دیا۔  
 خوبصورت کہیں کے صاف تھرے میز پر دونوں آئے سامنے بیٹھے تھے۔ لطف  
 لذت کی اپنی دنیا تھی۔ خاموشی میں بھی اور باتیں کرتے ہوئے بھی سرشاری کی کیفیت  
 تھی۔ عثمان نے سگریٹ سلگایا تھا۔ اور کبھی دھوئیں کی آڑ سے اور کبھی پھونک سے  
 دھواں اڑا کر وہ اپنے سامنے بیٹھے شائے کو تک رہے تھے۔  
 اپنی قسمت پر اپنی خوش نصیبی پر انہیں ناز محسوس ہو رہا تھا۔  
 "شائے۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں۔"  
 "آپ۔ یاہیں؟"

"میں!۔ یقین نہیں آتا۔ کہ میں نے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پایا ہے۔ مجھے تو  
 لگتا ہے۔ میں نے واقعی تمہیں قسمت کی گیارہوں سے چرایا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں شائے  
 شائے بڑے دلفریب انداز اور شانِ تغاثر سے مسکرا دی۔ اس نے سن رکھا  
 تھا کہ محبت میں لوگ دیوانے ہو جاتے ہیں۔ آج اس دیوانے کو وہ حقیقت کی دنیا  
 میں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ پر نازاں تھی۔

چائے کے بعد دونوں جیولر کے پاس گئے۔ یہ شہر کی سب سے بڑی جیولری  
 کی دکان تھی۔ ہیرے کا جتنا نفیس کام ان کے ہاں ہوتا تھا۔ اور کہیں نہ تھا۔ ان  
 کے ریٹ دوسرے جیولروں سے قدرے زیادہ تھے۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ سکہ بند  
 چیز مل جاتی تھی۔ لینے والے کو دھوکہ نہیں دیا جاتا تھا۔

سیل مین کھڑے تھے۔ دکان کی مقبولیت ان سیل مینوں کی تربیت بھی تھی۔ ہر  
 گاہک کا وہ بڑی عزت سے استقبال کرتے تھے۔ کوئی چیز خریدنے یا نہ خریدنے  
 وہ عزت افزائی کے لیے بچھے جاتے تھے۔

عثمان اور شائے دکان میں داخل ہوئے۔ تو ایک سیل مین ان کی طرف متوجہ

ہوا۔ کچھ اور لوگ بھی خریداری میں مصروف تھے۔  
 "جی فرمائیے۔ سیل مین نے مؤدب لہجے میں پوچھا۔  
 "جہانزیب ہیں۔؟۔ عثمان نے پوچھا۔  
 "جی۔ اندر۔ آؤ۔ میں ہیں۔"  
 عثمان نے حیب سے اپنا کارڈ نکالا سیل مین کو دیتے ہوئے بولے۔ "یہ ان  
 تک پہنچا دو۔"  
 سیل مین "بہتر" کہتے ہوئے اپنی سیٹ سے باہر نکلا اور کھل چلا گیا۔  
 عثمان اور شائے شوکیوں میں رکھے زیورات اور اصلی چاندی کے نقش  
 برتن دیکھنے لگے۔

سیل مین کی بجائے جہانزیب خود ہی باہر نکل آیا۔  
 "ہلو عثمان۔" کہتے ہوئے وہ بڑی گرمجوشی سے ان کی طرف بڑھا  
 "ہلو۔" عثمان نے بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔  
 "زہے نصیب آپ تشریف لائے۔" وہ انکساری سے بولا۔  
 "بس آہی گئے۔ سوچا مدت ہوئی کھال اتروائے۔ آج آپ سے اتر دہا ہی  
 لیں۔ عثمان مسکرائے۔

"ادہ نہیں۔ نہیں۔" وہ کھیانہ سی ہنسی ہنسا۔ "آپ کی اپنی دکان ہے۔  
 آئیے اندر چل کر بیٹھیں۔"

"آئیے شائے۔ عثمان نے کہا۔  
 "آپ؟۔ وہ شائے کی طرف دیکھ کر بولا۔  
 "میری منگیتر۔ عثمان نے کہا۔  
 "ادہ۔ دندہ فل۔ آئیے آئیے تشریف لائے۔ بہت خوشی ہوئی۔"

”بھی سبھی لینے کی ابھی گنجائش نہیں“ عثمان نے مذاق کیا۔

”ہائے اللہ میں نے کب کہا ہے۔“ وہ شرما گئی۔

”فی الحال ایک پسند کریں۔“

”میری پسند ممکن ہے آپ کی پسند نہ ہو۔“

شائندہ نے ایک ادائے دل فریب سے عثمان کو دیکھا اور بولی۔ ”آپ کی پسند غیر معمولی ہے۔“

”وہ تو ہے۔“ عثمان نے پیار بھری نگاہ شائندہ پر ڈالی۔

شائندہ قیمت کے پچھ سے بچنے کے لیے اصرار سے بولی۔ ”بس آپ خود ہی

پسند کر لیں۔ مجھے کچھ تیر نہیں۔“

عثمان نے وہی انگوٹھی اٹھائی۔ جس پر شائندہ کی نظر انتخاب اٹکی ہوئی تھی۔

”یہ کیسی ہے۔“ عثمان بولے۔

شائندہ دھیرے سے مسکرا کر بولی۔ ”یقین کریں مجھے بھی یہی پسند آئی تھی۔“

”پہلے کیوں نہیں بولیں۔“

”دیکھنا تھا۔ کہ ہماری پسند ایک جیسی ہے یا مختلف۔“

”اوہ۔“ عثمان کا جی چاہا کہ شائندہ کو بازوؤں میں بھر لیں۔ لیکن شوخ

اور بولتی ہوئی نگاہ پر ہی اتفک کیا۔

لازم سیون آپ لے آیا۔ جہانزیب نے دونوں کو پیش کیں۔ ”میری خود

لے لی۔“

سیون آپ پٹیتے ہوئے شائندہ اور عثمان انگوٹھی پسند کرتے رہے۔ کبھی کوئی

انگوٹھی اس انگوٹھی کے ساتھ رکھ کر دیکھتے۔ کبھی کوئی۔ لیکن وہی نظروں میں چچی

تھی۔ چنانچہ اسے ہی خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ ان دونوں کو اپنے آفس میں لے آیا۔

جیولر کا آفس تھا۔ ایئر کنڈیشنڈ اور خوبصورتی سے آراستہ تھا۔

”باہر تو بلا کی گرمی ہے۔“ عثمان شائندہ کے قریب بیٹھے ہوئے بولے۔

جہانزیب کچھ دیر رسمی سی تکلفاتی باتیں کرتا رہا۔ مراد علی خان ان کی بیگم اور

دیگر اہل خانہ کی احوال پرسی کی۔ پھر بیل بجائی۔

لازم آگیا۔

”آپ کو کس پسند کریں گے یا سیون آپ۔“

”سیون آپ۔“ عثمان نے اپنے لیے کہا۔ ”اور آپ۔“

”سیون آپ۔“ شائندہ بولی۔

عثمان کی جس طرح عزت افزائی ہو رہی تھی۔ شائندہ متاثر نظر آرہی تھی۔ ان کے

مرتجہ اور خاندانی حیثیت کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔

لازم آرڈر لے کر چلا گیا۔ تو عثمان نے جہانزیب سے انگوٹھیاں دکھانے کو

کہا۔

وہ اٹھ کر باہر گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں لے آیا۔

”پسند کریں۔“ اس نے بڑے احترام سے انگوٹھیوں کے ڈبے شائندہ کے سامنے

رکھ دیئے اور خود اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ شائندہ اور عثمان انگوٹھیاں دیکھنے لگے۔

بہت نفیس بہت خوبصورت اور بڑی دیدہ زیب انگوٹھیاں تھیں۔ دو تین انگوٹھیاں

تو شائندہ کو بے حد پسند آئیں۔ لیکن اس نے اپنی پسند کا اظہار نہیں کیا۔ کیا ان

کی قیمت کتنی ہو۔ اور عثمان کی قوت خرید کی حد کہاں تک ہو۔

”کوئی پسند ہے۔“ عثمان نے شائندہ سے پوچھا۔

”سبھی اچھی ہیں۔“ وہ بولی۔

اور عثمان گاڑی چلانے لگے۔ لیکن گاڑی گھر جانے کی بجائے اس سمت  
بارہی تھی جس سمت کالج سے آنے پر جایا کرتی تھی۔

جمیوندی کے کنارے  
گھر نہیں جا رہے۔

نہیں۔

تو پھر کدھر۔

ادھر۔ جدھر پہلے جاتے تھے۔ بڑی پرسکون جگہ ہے۔

شانہ چپ ہو گئی۔

عثمان نے سڑک سے نیچے اتار کر گاڑی روک دی۔ پہلے خود باہر آئے  
پھر شانہ کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ باہر سڑک کافی تھا۔ ہوا ابھی تک بند  
تھی۔ آسمان کے شمال مشرقی کنارے کچھ گدلائے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا آندھی  
آنے والی ہے۔ ماحول کا ساکن ہونا بھی بتا رہا تھا۔ کہ آندھی آنے والی ہے۔

شانہ نے آسمان کی طرف نگاہ ڈالی۔

کوئی ڈر نہیں۔ آندھی آرہی ہے شاید۔ اچھا ہے ذرا موسم خوش گوار ہو  
جائے گا۔

شانہ کو ساتھ لے کر عثمان ندی کے کنارے آگئے۔ ایک ٹوٹے ہوئے درخت  
کے تنے پر شانہ بیٹھ گئی۔ یہ تناں کنارے کے ہلکے ہلکے پانی میں پڑا تھا۔ اس نے  
باؤں سے چلنا شروع کیا۔ اور ندی کے صاف و شفاف دھیرے دھیرے بہتے  
لگتا تھے پانیوں کو اپنے خوبصورت پاؤں سے اچھالنے لگی۔ شلوار کے پانچے  
اس نے قدرے اونچے کر لیے تھے۔ اور اس کی خوبصورت جذبات انگیز نیڈیاں  
نظر آرہی تھیں۔

انگوٹھی کی قیمت سن کر شانہ کو تو پسینہ آگیا۔ لیکن عثمان نے اس سلسلے میں  
کوئی بات ہی نہ کی۔ صرف اتنا کہا۔ شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔

کبھی نہیں جی۔ پہلے کبھی ہوا ہے۔ آپ کا خاندان ہمارے سب سے اونچے  
گاہکوں میں سے تھے۔ جہانزیب بولا۔ پھر وہ عشرت بانو کی خریدی ہوئی  
ڈاکٹمنڈ کی چیزوں کی فہرست گنوانے لگا۔ شانہ حیرت سے ان کی باتیں سن رہی تھی  
انگوٹھی خرید لی گئی۔ مالک نے سرخ خلیں ڈبیہ میں انگوٹھی رکھ کر عثمان کو دیتے  
ہوئے کہا۔ کئی رنگ ہے۔ خدا مبارک کرے۔

شکریہ عثمان نے کہا۔

کچھ زیورات بھی لینے ہیں۔ عثمان نے جہانزیب سے کہا۔ دو چار دنوں  
تک ہم پھر آئیں گے۔

ضرور ضرور۔ آپ کی پسند کی ہر چیز ملے گی۔ آپ کی اپنی دکان ہے۔

کندن۔ نورتن۔ فیروز۔ ایرلڈ ہر قسم کا پتھر ہے ہمارے پاس۔ بہت نفیس چیزیں  
بنائی ہیں ان سے۔

عثمان دو چار دن میں پھر آنے کا وعدہ کر کے دکان سے باہر آگئے۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے بولے۔ آپ کے لباس بھی تیار کروانا ہیں۔ میرے  
خیال میں کل آجائیں گے۔

جی۔

ابھی دیکھنا چاہیں تو جمیل سنسر کے پاس پلتے ہیں۔

کل سہی۔

ٹھیک ہے۔ پہلے ہی دن بہت دیر لگا دی۔ تو ممکن ہے کل یا کچھ پانچویں  
لگا دیں۔ شانہ مسکرا دی۔

پھر عثمان نے جیب سے انگوٹھی کی ڈبیہ نکالی۔ ڈبیہ کھول انگوٹھی کو محبت عقیدت اور احترام سے دیکھا۔

”لاڈلہ ہاتھ۔“ عثمان نے شائے سے کہا

شائے نے ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔ فرط مسرت سے اس کا صرٹ ہاتھ ہی نہیں سارا وجود کھپکا رہا تھا۔ عثمان نے خالی ڈبیہ جیب میں ڈالی۔ انگوٹھی کو ہونٹوں سے لگایا اور بڑی سنجیدگی سے انگوٹھی شائے کی انگلی میں ڈال دی۔

”مبارک ہو شائے۔“ انہوں نے اس کا خوبصورت ہاتھ پکڑے پکڑے کہا۔

شائے نے دھیمے مسکراتے لگناتے لہجے میں کہا۔ ”شکریہ۔“

عثمان نے اس کا ہاتھ اٹھایا۔ اور ہونٹوں تک لے گئے۔ اپنے پیار کی پہلی ٹہرائیوں نے شائے کے ہاتھ پر ثبت کر دی۔ جب انہوں نے شائے کا ہاتھ نیچے کیا۔ تو شائے کے ہاتھ کی گرفت ان کے ہاتھ پر بڑی مضبوط تھی۔

عثمان خوشی سے جھوم اٹھے۔ اور پھر دونوں ہاتھ میں ہاتھ دے کر گڑبڑی تک آگئے۔ گاڑی چلاتے ہی انہوں نے ٹیپ بھی آن کر دیا۔ ان کا پسندیدہ مصرع پلنے لگا۔ عثمان بھی ساتھ ساتھ گنگنارہے تھے۔ ”میں نے قسمت کی لکیروں سے برایا ہے تجھے۔“

آندھی زور و شور سے آرہی تھی۔ اب اس کی پیش رو ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ کبھی کبھی تیز ہوا بھی آجاتا۔ اور درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے شاخیں شاخیں کا شور مچا جاتا۔

عثمان تو جیسے مہوٹ کھڑے تھے۔ پرادر پٹلیاں بھی اتنی حسین ہو سکتی ہیں۔ یہ نیا انکشاف تھا۔

اور

پھر

یہ جان کر کہ یہ سب کچھ ان کا اپنا ہے۔ بالکل اپنا۔ ان پر مخمورانہ سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ آگے بڑھے اور جھک کر پانی میں نہری مچھلیوں کی طرح تیرتے اچھلتے کودتے پر اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیے۔

”ہائے نہیں۔“ شائے نے جلدی سے اپنے پاؤں چھڑا لیے۔ یہ یقیناً عثمان کی شان کے خلاف تھا۔ کہ وہ اس کے پیر چھوئیں۔ نادان لڑکی ان جذبوں سے آگاہ ہی کب تھی۔ کہ انہوں نے پیر کیوں پکڑ لیے تھے۔

شائے اچھل کر تنے سے اتر ہی پاؤں میں چل پہن کر بولی۔ ”گلتا ہے آندھی تیزی سے آرہی ہے۔“ چلنے والی چلیں۔

عثمان نے بھی آسمان کے اس گوشے کی طرف دیکھا۔ جو گدلا گدلا سا تھا۔ دائمی آندھی آرہی ہے۔ گدلا ہٹ اور ٹیلا کہن تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

آندھی سے ڈرتی ہو۔ عثمان نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”سخت ڈر لگتا ہے مجھے آندھی اور طوفان سے۔ کیا عورتاں کا منظر ہوتا ہے۔ جیسے بدر دہیں ہر طرف چٹکھٹاتی پھرتی ہوں۔“

عثمان ہنس دیئے۔ ”ڈر لو کہ کہیں کی۔ میرے ہوتے ہوئے بھی ڈر لگے گا۔“ شائے نے اثبات یا نفی میں جواب نہیں دیا۔ ان کی بات پر مست شرابی کی طرح لہرا لگی۔ عثمان نے بازو کے سہارے اسے تمام لیا۔ شائے چند لمحوں بعد پیچھے ہٹ گئی۔ عثمان اسے مسکرا کر دیکھتے رہے۔



شانہ کا نصیب یوں کھل جائے گا۔ یادہ اتنے بڑے خاندان کی بہو بنے گی کسی کے دم دگمان میں بھی نہ تھا۔ چونکہ شادی عثمان والدین کی رضامندی کے بغیر کر رہے تھے۔ اس لیے سب کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا تھا۔ انہوں نے غیروں نے بھی نے قصے کو خوب ہی اچھالا۔ باتیں بنائیں۔ طرز کئے۔

لیکن  
شانہ

اس کے گھر والوں کو اب کسی کی پردہاہ نہیں تھی۔ اپنی دھن میں مست شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

عثمان نے بھی اپنے طور سارے بندوبست کر لیے تھے۔ ان کے دوست ہادی نے میجر اشفاق سے بنگلہ کرائے پر لے لیا تھا۔ چھت کے اوپر والے کمرے میں انہوں نے اپنا ضروری سامان بند کر کے بنگلے کی چابیاں ان کے والے کر دی تھیں۔ فرنیچر قالین پر دے اور ایسی ہی دوسری چیزیں استعمال کے لیے رہنے دی تھیں۔ میجر اشفاق خوش تھے۔ کہ اتہائی معقول کمرہ بھی مل جائے اور رہنے والے بھی دھنگ کے لوگ ملے۔

شادی سے چند دن پہلے عثمان شانہ کو گھر دکھانے لے گئے۔

چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ نئے ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ جب تک ہمارا اپنا گھر نہیں بنے گا۔ ہیں اس گھر میں رہنا پڑے گا۔ عثمان نے شانہ سے کہا۔ پسند ہے۔

بہت اچھا ہے۔ وہ بولی۔

چھوٹی سی محبت ہوگی ہماری۔ عثمان نے سرشار لہجے میں کہا۔

شادی کی تقریب عثمان تو سادگی سے سرانجام دینا چاہتے تھے۔ لیکن اما اور شانہ کے ڈیڑھی اپنی پہلی خوشی پوری آن بان سے منانا چاہتے تھے۔ اور ایسی صورت میں جب کہ خود عثمان نے شانہ کے لیے زیورات اور لباس بنوانے میں پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ وہ کیونکر سادگی پر اکتفا کر لیتے۔

تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔ ماما اور ڈیڑھی دن رات تیاریوں میں لگے تھے۔ ظریف اور شانہ بھی خوب مصروف تھیں۔ خوشیاں روم جھم برس رہی تھیں۔ جب بھی شانہ کا کوئی ڈریس تیار ہو کر آتا۔ یا عثمان زیور لے کر آئے اہل خاندان کے دل فرط مسرت سے جھوم جھوم اٹھتے۔

شانہ کی بہیلیاں بھی مصروفیت کے ان دنوں میں کچھ ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ رشک اور حسد کی ملی جلی کیفیت سے دچرا بھی تھیں۔ یہی حال دوسرے ملے ملائے والوں کا تھا۔ عزیزوں رشتہ داروں کا تھا۔ دکھا اور حسد سے سینے جلنے لگے تھے۔

ہاں ٹھیک ہے۔ جب کچھ نہیں ہو سکتا تو سوچنے سے فائدہ۔ کل بھی میں نے اپنی طرف سے کوشش کی تھی۔ لیکن امی یا ابا بات سننے کے بھی روادار ہیں۔ وہ یہی سمجھتے ہیں۔ کہ شادی کے بعد جب میں حالات سے نہٹ نہ سکوں۔ انوائں کے در پر آ پڑنے ہی میں عافیت سمجھوں گا۔ وہ مجھے شکست دینے کے لیے من مانی کرنے دے رہے ہیں۔

عثمان۔

لیکن شائے میں نے ساری پلاننگ کر لی ہے۔ ساری۔ میں تمہیں مراد محل والوں سے کہیں زیادہ اونچا کر دوں گا۔ انہیں سب کچھ کر کے دکھاؤں گا۔ میں نے سب کچھ سوچ رکھا ہے۔ سب کچھ۔ میں تمہارے لیے دنیا کی ہر آسائش بیکروں گا۔

عثمان۔ شائے سنجیدگی سے بولی اس کا ہاتھ عثمان کے ہاتھ میں تھا۔ ہاتھ کا پورا دباؤ اس نے عثمان کے مضبوط ہاتھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔

ایک چیز کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ مل گئے۔ تو سب کچھ مل گیا ہے۔

بعد کچھ نہیں چاہیے۔ یہ گھر ہمارے لیے کافی ہے۔ اچھا ہے۔

چہنچہن پر کوئی بار نہ ڈالیں عثمان۔ یہ سب کچھ بھی میرے لیے بہت

بارہ ہے۔ بہت ہی زیادہ۔

عثمان نے اس کا ہاتھ سختی سے پکڑتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ شائے۔ میرے

ہاں میں تمہارے لیے کیا کچھ ہے۔ بتا نہیں سکتا۔ جی چاہتا ہے۔ دنیا

ہماری آسائشیں تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں۔

مجھے صرف اور صرف آپ کی ضرورت ہے۔ شائے نے سران کے کندھے

کا لگا کر بڑے پیار سے کہا۔

ہاں۔ وہ سرور لہجے میں بولی۔

سال ڈیڑھ سال یہاں رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد انشاء اللہ ہم اپنے نئے گھر میں

کریں گے۔ شائے وہ گھر میرے خوالوں کی تعمیر ہو گا۔ اتنا خوبصورت بناؤں گا۔ اتنا

عالیشان ہو گا کہ تمہارے رہنے کے قابل ویسی ہی جگہ میرے تصور میں ہے۔ مراد

محل سے بھی خوبصورت ہو گا ہمارا گھر۔

شائے کی نشیلی آنکھوں سے مسکراہٹ پھوٹ رہی تھی۔

مجھے دکھ تو ہوتا ہے۔ کہ تمہیں شادی کے بعد مراد محل کی بجائے یہاں آنا پڑے

گا۔ کاش ابا حضور اپنی روایتی سختی سے کام نہ لیتے۔ تو آج میری خوشیوں کا رنگ

ہی ادا نہ ہوتا۔ شائے۔ کبھی میری اپنی امی زندہ ہوتیں نا۔ تو یہ موقع آنا ہی نہ تھا۔

شائے خاموش رہی۔ عثمان کچھ جذباتی سے ہو رہے۔ یقیناً ان کے دل میں بڑی

کسک تھی۔

.. تمہارے شان شایاں میں ایک چیز بھی نہیں بنو اسکا۔ میری شادی

والدین کرتے۔ تو۔ تو۔ شائے تم نے ہمارے ہاں کی شادیاں کبھی دیکھی تو

نہ ہونگی۔

شائے نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اتنی شاندار ہوتی ہیں۔ کرکیا بتاؤں۔ میں جب تمہارے بارے میں سوچتا

ہوں۔ تو اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا ہوں۔ تمہیں وہ رسپشن دل سکے گا۔ جو اس

خاندان کی بھونپنے کی صورت میں ملنا چاہیے تھا۔

عثمان۔ آپ اس بارے میں بالکل زبردست چاکریں۔

نوارہ بھی بے حد خوبصورت تھا۔ اس کی گوشت پر جو سلے کا کام تھا دید کے قابل تھا۔

شائے کو مانا نے اپنے رواج کے مطابق تین چار دن سے خوشبوؤں بھرے پانی سے روزانہ غسل کرنا شروع کیا تھا۔ خوشبو دار بن کر مساج کرنے کے لیے بھی خاص عورت بلاتی تھی۔ یہ ساری خوشبوئیں شائے کے حسین جسم میں رچ گئیں۔ دلہن بنانے سنوارنے کے لیے بیوٹی پارلر سے حیدر احمد کو بلایا گیا تھا۔ شائے کو تو قدرت نے حسن و جمال کا مرقع بنایا تھا۔ اس پر حیدر احمد کی گفنٹوں کی کاوش، شاہانہ ٹھاٹھ کا لباس اور نفیس زیورات۔ شائے دلہن بنی تو اس پر آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ اس شادی پر بڑی بڑی باتیں بنانے والے۔ طرز کے تیر چلانے والے اور محبت کی شادی کو بری نظر سے دیکھنے والے بھی شائے کے حسن کے مترن ہو گئے۔

انشاء اللہ۔ ماشاء اللہ ہر طرف سے ایسی ہی صدائیں آرہی تھیں۔

عثمان نے بھی کچھ شہزادوں کی سی سج و سج نکالی تھی۔ کنو اب کی شیر وانی اور چوڑی دار پا جامہ پہنے تھے۔ آنکھوں میں نشہ ڈول رہا تھا۔ شائے کو اپنا لینے کی خوشی سرشار کیے تھی۔ مرادوں کی تکمیل خوبصورت چہرے کو بڑا دلنشیں وقار بخشے ہوئے تھی۔ کھارسی کھار تھا۔ خدا جانے یہ شادی اگر والدین کے زیر مایہ ہوتی تو ان کی خوشیوں کا رنگ کیا ہوتا۔ حسن کتنا حسین ہو گیا تھا۔

عثمان اپنے چند دوستوں اور ان کی بیویوں کے ساتھ آئے۔ نکاح گھر پہنچا ہوا تھا۔ ایجاب و قبول کے مراحل جلد ہی طے ہو گئے۔ مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ چھوہارے بانٹے گئے اور شہزادیوں میں رنگین کاغذوں میں سجائی گئی مٹھائی خوبصورت جوان لڑکیاں اٹھائے اگئیں۔ ہر بہانہ کامنا انہوں نے میٹھا کر دیا۔

عثمان نشے سے جیسے جھوم گئے۔ گھر دیکھ کر دونوں واپس آ گئے۔ کھانا ہوٹل میں کھایا اور اس کے بعد کتنی ہی دیر گھومتے پھرتے رہے۔ عثمان نے شادی کے بعد مہینے بھر کا جوہر و گرام بنایا تھا۔ شائے کو بتایا۔

”پہلے چار دن کے لیے ہوٹل میں کمرہ بک کر دیا ہے۔“ عثمان نے شائے سے کہا۔ تو اس کی آنکھوں میں حیا کے سائے ڈول گئے۔

”اس کے بعد ہم سوات جائیں گے۔ کالام چار دن قیام ہوگا۔ وہاں سے واپس آکر کاغان۔ پھر مری اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے کابل۔“ عثمان نے شوق فراوان سے سرشار ہو کر کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ شائے کی جھکی جھکی نظروں کو پیار سے دیکھتے ہوئے عثمان نے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ ادائے دلفری سے مسکرائی۔

”تمہیں کچھ پتہ بھی ہے۔“ عثمان نے شوخی سے پوچھا۔ تو اس نے شرما کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

شادی کا دن بھی خوب تھا۔ ریشم تو ہوٹل میں تھا۔ لیکن اماں کی سہیلیاں عزیز دست سب گھر پر جمع تھیں۔ شائے کا سامان سب کو دکھا کر نئے جھکے میں بھجوا دیا گیا تھا۔ اور عثمان کے لائے ہوئے زیورات اور طربوسات سب کو دکھائے جا رہے تھے۔ جدید ترین لباس بھی تھے۔ اور پرانی وضع کے طربوسات بھی۔ لوگ انکھ بند نہاں تھے۔

عروسی جوڑا تو واقعی دید کے قابل تھا۔ عثمان نے اپنی پسند کا بنوایا تھا۔ شا لباس لگتا تھا۔ لمبا چوڑا تشیو کا دوپٹہ سنہری کام سے بھرا ہوا تھا۔ کنو اب کا

پر ڈال رکھا تھا۔ اس کے ذریعہ دو پٹے کے پلو پکڑے نو عمر لڑکیاں اس کے  
پچھے کھڑی تھیں۔ کمرہ بین تصویریں لینے میں مصروف تھے۔ ہادی نے  
کیڑ پکڑ رکھا تھا۔

”اجازت ہے جی۔“ منیر نے ماما اور ڈیڈی سے پوچھا۔  
”جی۔“ ماما نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”سپر دندا۔ ڈیڈی گلوگیر لہجے میں  
برے۔ طریقہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔  
”بسم اللہ۔“ منیر نے شائے کا ہاتھ پکڑ کر عثمان کے ہاتھ میں دے دیا۔  
”پلیے عثمان۔“

عثمان نے قدم اٹھایا۔ شائے کا ہاتھ انہوں نے دھیرے سے دیا۔ اور سہارا  
دے کر آگے بڑھے۔

اور پھر شائے دعاؤں کے سایے میں عثمان کے سنگ سنگ چلتی ہوٹل کے  
بال سے باہر آئی۔ اور پھولوں سے لدی گاڑی میں عثمان کے پہلو میں بیٹھ گئی۔  
ظریفہ ماما ڈیڈی ایچی جی سبھی گاڑی کے گرد کھڑے تھے۔

گاڑی ہادی نے چلائی۔ اور دوسرے دوست بھی دونوں کو ہوٹل میں لے گئے۔  
اپنی اپنی گاڑیوں میں آ بیٹھے۔ عثمان کی گاڑی پر پھولوں کی پتیاں برساتی گئیں۔  
ان کے رخصت ہوتے ہی مہمان بھی ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔  
ہوٹل کا کمرہ پہلے سے بک کر دیا گیا تھا۔ دوستوں نے اس کمرے کو پھولوں  
اور رنگ دار کاغذوں نہری تاروں سے خوب سجایا تھا۔ گوجلہ عروسی دیا تو  
نقا۔ جیسا اگر مراد مل میں شادی ہوتی تو ہوتا۔ پھر بھی دوستوں کے خلوص اور  
محبت کا رنگ نمایاں تھا۔

شائے کو بیڈ پر بٹھا کر رضا۔ نسیم اور اختر کی بیویاں اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

تیز ترین موسیقی کے ریکارڈ بچے اور اس پر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے رقص  
کر کے خوشی کا مظاہرہ کیا۔

کھانے کے لیے سب ہوٹل پہنچے۔ پرنکلت کو انا تھا۔ سب نے سیر ہو کر کرایا۔  
شائے کو بھی دلہن کی مسند پر بٹھایا گیا تھا۔ عثمان خوشی سے پھولے نہ سہا رہے تھے۔  
ان کے دوست انہیں ان کے انتخاب کی داد دے رہے تھے۔

یہاں بھی کچھ دیر میوزک کے ساتھ منچوں نے رقص کیا۔ منہی مذاق ہوا۔ نلک  
شکاف قہقہے پڑے۔ خوشی کا اظہار ہر طریق سے کیا گیا خوشی کے ان لمحوں کو سب لو لائیڈ  
پریکیرہ میں منتقل کرتا گیا۔

ساڑھے نو بجے کے قریب ہادی نے عثمان کی طرف سے اجازت چاہی۔  
ہوٹل میں ان کا کمرہ بک تھا۔ رخصتی کا مرحلہ والدین کے لیے کرب کا مرحلہ ہوتا ہے۔  
ایسا کرب جس میں خوشیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ماما کا دل دھک سے ہوا۔ لیکن یہ  
لمحہ بھی تو آنا ہی تھا۔

”آپچی امانت ہے۔“ ماما نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ڈیڈی نے بھی یہی بات  
کی۔

عثمان نے آگے بڑھ کر ماما کے سامنے سر جھکا دیا۔ ماما نے انہیں گلے سے  
لگا کر خوب خوب پیار کیا۔ پھر ڈیڈی عثمان سے بٹل گیر ہوئے۔ انکی پیشانی پر  
شفقت سے بوسہ دیتے ہوئے بولے۔ ”خدا تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔“  
”آمین۔“ ارد گرد کھڑے لوگوں نے کہا۔

سارے مہمان شائے اور عثمان کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ شائے کو  
نوجوان سہاگنوں نے مسند سے اٹھایا۔ اور عثمان کے پہلو میں کھڑا کر دیا۔ وہ بیوہ  
گہرائی ہوئی تھی۔ سہارے کے بغیر کھڑا ہونا ممکن نہ تھا۔ سارا بار اس نے منیر نسیم

قریب آگئے تھے۔

عثمان کا دل بھی بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ انہیں یقین ہی نہ آ رہا تھا۔ کہ شائد پچھمچ ان کی زندگی میں داخل ہو چکی ہے۔ ان کی اپنی ہو چکی ہے۔

وہ چند لمحے بیڑے کے پاس کھڑے رہے۔ انہیں کوئی بات ہی نہ سوجھ رہی تھی۔ زبان جیسے گنگ تھی۔

”میں بیٹھ سکتا ہوں شائد۔“ انہوں نے کافی سمٹ کر کہہ دیا۔ تو شائد کا سر اور جھک گیا اور وہ زیادہ ہی سمٹ گئی۔

عثمان مسکراتے ہوئے بیڑے کے کنارے پر بیٹھ گئے۔

”شائد۔“ انہوں نے اس کا جھکا ہوا سر اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اور جھک گئی۔

عثمان اس کے بالکل قریب ہو گئے۔ ”سراٹھاؤ شائد۔“ یوں تو تہاری گردن دکھنے لگے گی۔ میں کوئی اور تو نہیں۔ عثمان ہی ہوں۔ یعنی غلط بات۔

چہرہ اٹھاؤ۔ اوں ہوں۔“

عثمان جذبات سے مغلوب آواز میں شائد کو چہرہ اٹھانے کا کہتے رہے۔

لیکن وہ اسی انداز میں بیٹھی رہی۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔“ سنجی کرنا پڑے گی۔ ہوں۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا جھکا ہوا سر پکڑ کر اس کا چہرہ اڑھائی کیا۔ شائد نے سر جھکانا چاہا۔

لیکن اب اس کا چہرہ عثمان کے ہاتھوں میں تھا۔ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامے وہ شدید متحیر اور اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”آنکھیں کھولو شائد۔“ انہوں نے غمور لہجے میں سرگوشی کی۔ لیکن وہ آنکھیں کھولنے کی بجائے سر جھکانے کی جدوجہد کرتی رہی۔ مضبوط اور جذباتی ہاتھوں

اس کے کانوں میں جانے کیا کھسکھس کر رہیں۔ شائد تو شرما شرما کر جھنجھکی اٹھا اور ان تینوں کے قہقہے بلند ہوتے رہے۔

ہادی رضا نسیم اور اختران کی شوخی اور شرارت سے محفوظ ہو رہے تھے گھنٹہ بھر یہ لوگ اودھم مچاتے رہے۔

پھر ہادی نے گھڑی دیکھی۔ اور سب سے واپس چلنے کو کہا۔ ”بہت دقت ہو گیا۔“

عثمان کی جگہ فکر آپ کو کیوں ہے۔ منیر رضا چکی

”بھئی وہی تو مجھے تو کہہ رہے ہیں۔ ہادی نے شوخی سے کہا۔

”کہا تو نہیں تھا۔ لیکن اب کہنا پڑے گا۔“ درنہ تم لوگ تو اپنے آپ ملنے کے ہیر عثمان نے ہنس کر کہا۔

”چلو بھئی آج تم پر رحم فرماتے ہیں۔ اختر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ یہ بڑی قہمی اور نایاب رات ہے۔ اس کا کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔“

”اور تم کئی گھنٹے ضائع کر چکے ہو۔“ عثمان نے کہا۔

”واقعی۔“ منیر نسیم بولی۔ چلو نسیم۔ باقی کل۔

سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ عثمان نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ اور انہیں چھوڑنے

باہر تک آئے۔

چند لمحوں بعد وہ کمرے میں واپس آگئے۔ دروازہ بند کیا اور بیڈ کی طرف

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے آگئے۔ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا ٹیپ انہوں نے آن کر لیا۔

پکے پکے سروں میں۔ دھیمی دھیمی آواز میں ان کا پسندیدہ مہر چلنے لگا۔

شائد کا دوپٹہ بیڈ سے نیچے ٹپک رہا تھا۔ اور وہ گھٹنوں میں سر دیئے جھکی

بیٹھی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ عثمان نے کی گنگا ہٹ کے

سے چہرہ چھڑانا ممکن ہی کہاں تھا۔ اصرار کی گرمی بڑھ رہی تھی۔ جوش جذبہ اور  
 دلولہ تو مندر تھے۔ شائندہ نے پل بھر کو آنکھیں کھولیں۔ اور بند کر لیں۔ اس  
 کے بھرے بھرے ہونٹوں پر بڑی خوبصورت تھی۔  
 "شائندہ — میری زندگی — عثمان کے لبوں سے سہم سی آواز نکلی۔ ان کا سر  
 جھکا اور انہوں نے اپنے ہونٹ شائندہ کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔  
 جذبات کی ساری حدت، عشق کی ساری حرارت اور پیار کی ساری حلاوت  
 انہوں نے ان ہونٹوں میں جذب کر دی۔

اور

پھر انہوں نے

سہاگ رات کے نشاط افروز لمحوں کا ہزارواں حصہ بھی ضائع نہیں کیا۔  
 لمحے لمحے کارس نچوڑا۔ پل پل سے خوشی کشیدی۔ اپنی شوریدہ سرخوشیوں کو  
 پوری پوری طرح بکھنے دیا۔  
 ساری رات آنکھوں ہی میں گزر گئی۔

اور

جب دن کی پہلی کرن نے کمرے میں گھس آنے کی جسارت کی۔ تو دونوں  
 کو ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے بے خبر سوتے پایا۔

تین دن ملٹن ہوٹل میں قیام اور دعوت ولیمہ سے فارغ ہو کر عثمان اور شائندہ  
 سوات روانہ ہو گئے۔ دو دن سید و شریفین میں رکے اور پھر کالام چلے گئے۔  
 اونچے اونچے فلک بوس پہاڑوں سے گھری یہ جگہ قدرت کے حسن کا شاہکار  
 تھی۔ خاموش اور پرسکون فضا کو دریائے سوات کا تیز بہنیل پانی اپنے شور اور  
 غراہٹوں سے ہی توڑتا تھا۔ لیکن یہ شور اور غراہٹیں بھی اس قدر ترقی حسن کا ایک  
 حصہ تھیں۔

چھوٹے سے ریسٹ ہاؤس میں دونوں مقیم تھے۔ شائندہ کو یہ جگہ بہت ہی  
 پسند آئی تھی۔ اس لیے تین دن کی بجائے سات دن یہاں رکے کا پروگرام بنا  
 تھا۔

دونوں زیادہ وقت تو اپنے کمرے ہی میں گزارتے۔ انہیں تو جیسے ارد گرد  
 کا ہوش ہی نہیں تھا۔ محبت کے متوالے ایک دوسرے کو پا کر دنیا و مافیہا سے

شانہ نہیں پڑی -

- یوں نہ سوگی - تو ضرور ہی گریں گے -

- کیوں -

- بس -

- بس کیوں -

- ہنستے ہوئے تم اتنی پیاری لگتی ہو - کہ میرا سارا دھیان تمہاری طرف منتقل ہو جاتا ہے - راستہ دیکھنے کی بجائے تمہیں دیکھنے لگتا ہوں -

- مانی -

- ہوں -

- بیٹھیں یہاں -

- یہاں کہاں -

- اس پتھر پر -

- اتنی ڈھلان پر - یہ پتھر لڑھک گیا تو -

- نہیں لڑھکے گا -

- سر تسلیم خم ہے حضور - موت کے منہ میں جانے کا حکم بھی دیں گی تو بندے کو غار نہ ہوگا -

عثمان ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئے - شانہ ان کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی ان کی گردن میں بازو ڈالتے ہوئے بولی - مانی - ایک بات پوچھوں -

- پوچھو - عثمان نے اس کی - کر میں بانہیں ڈال کر اسے مضبوطی سے پکڑ لیا -

- کیا آپ واقعی مجھے اتنا پیار کرتے ہیں -

بھولے جا رہے تھے -

کبھی کبھی تو عثمان کو بے یقینی ہی ہوتی - وہ اپنے آپ سے سوال کرتے - کہ کیا واقعی انہوں نے اپنا گوہر مقصود پایا ہے - کیا حقیقتاً شانہ ان کی ہو چکی ہے -

ان کی اپنی - بالکل اپنی -

اس دن دھوپ نکھری ہوئی تھی - جس سے موسم نکھر آیا تھا - شانہ اور عثمان آج دریا کے کنارے تصویریں اتارنے جا رہے تھے - کیمرو عثمان نے کندھے پر لٹکا رکھا تھا - شینو نے جوشیلا سرخ فلیپر - پیلی جرسی اور سرخ سرے بیڈ لگا رکھا تھا - دونوں سنبھل سنبھل کر نیچے اتر رہے تھے - کہیں دریا پاؤں اوچا نیچا پڑ جاتا - تو دونوں لڑکھڑاتے جاتے - لیکن ایک دوسرے کے سہارے گرنے سے بچ جاتے -

- شینو - عثمان نے کہا - شانہ پیار میں اب شینو بن چکی تھی - اور عثمان بھی اب شانہ کے لیے مانی تھے -

- شینو -

- جی -

- اگر ہم نے ایک دوسرے کا سہارا نہ لیا ہوتا تو اس ڈھلان سے پھسل کر سید دریا برد ہو سکتے تھے -

- ہانے مانی - کتنی بری بری باتیں سوچتے ہیں آپ -

- بری یا اچھی -

- پھسلنا اور دریا برد ہونا اچھی بات ہے -

- میں نے ساتھ اگر کا لفظ استعمال کیا ہے - اور سہارے کی افادیت دیکھ کی ہے -

کتنا۔

جنا اظہار کرتے ہیں۔

اوں ہوں۔

عثمان نے سرنفی میں بلایا۔ تو شائے کے دل کی دھڑکن جیسے تھم گئی۔

کیا؟ وہ حیران ہو کر بولی۔

جو تم نے پوچھا ہے ناشینو۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ عثمان نے شوخی سے کہا۔

کیا واقعی آپ مجھے اتنا پایا رہیں کرتے جتنا ظاہر کرتے ہیں۔

ہاں۔ میں جھوٹ بولنے کا عادی نہیں۔ صاف گو آدمی ہوں۔ سچی بات کہتا ہوں۔

شائے کا چہرہ کچھ بے رنگ سا ہو گیا۔ اس کا منہ بن گیا۔ بڑی روٹھی روٹھی

نظروں سے عثمان کو دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو مجھے یہ امید نہ تھی۔ کہ تم ایسا حوصلہ شکن

جواب دو گے۔

اس نے آستکی سے عثمان کے گلے سے بائیں نکال لیں عثمان نے بھی اس کی

کرے بازو الگ کر لیے۔ اور اٹھتے ہوئے بولے۔ ان کی آنکھوں میں شوخی چل

رہی تھی۔ لیکن چہرہ بخیرہ بنا رکھا تھا۔

بس اتنا ہی پوچھنا تھا۔

وہ کچھ نہیں۔

شینو۔

وہ اب بھی چپ رہی۔

کیا ہو گیا ہے۔ عثمان نے روٹھی روٹھی شائے کو پایا بھری نظروں سے دیکھا۔

وہ اداس سی نظر آنے لگی تھی۔ عثمان کو بڑا لطف مل رہا تھا۔

کھڑی کیوں ہو۔ نیچے نہیں جانا۔ عثمان نے چھیڑا۔

”چلتے“ وہ بے حد اداس ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی رووے گی۔ جس

کا یہ انداز جس طرح عثمان کے دل پر وار کر رہا تھا۔ لطف و مسرت کے جذبول

سے وہ سرشار ہوئے جارہے تھے۔

لاؤ ہاتھ پکڑاؤ۔ عثمان نے شائے کو قدم اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

وہ چپ چاپ نیچے اترنے لگی۔

”سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔“ عثمان نے اس کے پیچھے پیچھے اترتے ہوئے پوچھا۔

وہ اب بھی کچھ نہیں بولی۔ سنجیدگی سے خفا ہو گئی۔

”روٹھ گئی ہو شینو۔“ عثمان نے اس کے برابر آتے ہوئے پوچھا۔

”روٹھنا کس بات پر۔“ وہ بے رخی سے بولی۔

”بھئی تمہارا موڈ کچھ بگڑ گیا ہے۔“

”آپ کا تو ٹھیک ہے نا۔“

”جب تک دونوں کا ٹھیک نہ ہو نیچے جانے کا فائدہ۔“

شائے رک گئی۔ چند لمبے چپ چاپ کھڑی رہی۔ عثمان نے جلدی سے کمرہ

نکالا۔ اور شائے کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کی تصویر لے لی۔

یہ تصویر یادگار ہو گئی۔ عثمان کمرہ بند کرتے ہوئے مسکرائے۔

کیوں۔

”جناب کا موڈ جو آف ہے۔“ دو فٹ لمبا چہرہ آئے گا تصویر میں۔

آپ سے کس نے کہا تھا تصویر لینے کو۔



”میرے دل نے“

”ضرورت کیا تھی“

”نوز اچھا تھا“

”مجھے بتائے بغیر کیوں لی تصویر“

”ادھر۔ محترمہ۔ بھولیے نہیں۔ میں آپ کا شوہر ہوں۔ اور ایسے

ایسے بیمار حق رکھتا ہوں جناب پر“

”جی۔ بڑے آئے۔ حق جتانے والے“ وہ اب تو باقاعدہ خفا ہو گئی تھی۔

”شینو۔“

”اور شینو“

”شینو۔ بہری ہو گئی ہو۔ سنتی نہیں۔ میں بلارہا ہوں“

”فرمائیے حضور۔“

”شانہ نے غصیل نگاہ ان پر ڈالتے ہوئے بڑے طنز سے کہا۔

”کوئی جڑی بوٹی تو نہیں کھالی میاں سے۔“ عثمان نے سنجیدہ جتنے ہوئے

اسے چیڑا۔ ”غصہ کس بات کا ہے“

آپ نے نیچے جانا ہے یا میں واپس جاؤں“ وہ عثمان کی بات انہی کرتے

ہوئے بولی۔

عثمان پھر ڈٹ کر ہتھ پر بیٹھ گئے۔

”پہلے یہ بتاؤ کہ نہیں ایک ایسی ہو گیا کیا ہے۔“

”آپ کو اس سے کیا۔“

”کیوں۔ ہم نے قطع تعلق تو نہیں کر لیا۔“

”میرے ہاں آپ کی باتوں کا کوئی جواب نہیں۔ میں واپس جا رہی ہوں۔“

”کہاں۔“

”کمرے میں۔“

وہ تیزی سے اوپر چڑھنے لگی۔ ناہوار جگہ پر قدم سنبھل سنبھل کر رکھنا پڑ

رہا تھا۔ کنکر پتھر اور مٹی کی جگہ سے کھسک جاتی اور لڑھکتی ہوئی دھلان سے

نیچے چلی جاتی۔

عثمان نے اس کی۔ اوپر چڑھتے ہوئے ایک اور تصویر لے لی۔

پھر وہ خود بھی اٹھے۔ اور شانہ کے پیچھے پیچھے اوپر چڑھنے لگے۔

انہوں نے دو ایک دفعہ شانہ کو بلایا بھی۔ لیکن اس نے کوئی جواب دیا۔

”شانہ ہمارا تصویریں لینے کا پرہیز کر رہا تھا۔“

”ضرورت نہیں مجھے۔“

”بتاؤ گی نہیں کہ نہیں ہوا کیا ہے۔“

”کچھ نہیں ہوا۔“

”رو کیوں رہی ہو“

شانہ نے گردن موڑ کر غصے سے عثمان کو دیکھا۔ جو بڑی دھڑائی سے

اسے چڑائے جا رہے تھے۔ شانہ اوپر پہنچ گئی۔ وہ سیدھی ریسٹ ہاؤس کی

لن تیز قدموں سے چل دی۔

عثمان بلندی پھلانگ کر اوپر آئے اور لمبے لمبے دگ بھرتے اس کے پیچھے پلکے۔

رات ہی مذاق میں معاملہ کچھ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ عثمان شانہ کی سادگی اور بھولے پن

پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ اور اس کے اس رویے سے لطف بھی لے رہے تھے۔

شانہ براؤن سے تک جا پہنچی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئے۔ شانہ نے دروازہ

لولا اور اندر چلی گئی۔

"تمہاری تصویر لیں" عثمان نے پوچھا۔  
 "ہاں اٹکل۔ سب بچے بیک وقت بولے۔  
 "جو آپ کے می ڈی ٹی ناراض ہوئے تو۔"  
 "نہیں ہوتے۔"

"جائیے پہلے اجازت لے کر آئیں۔"

بچے بھاگے اور رلیٹ ہاؤس کے پچھلے کمروں کی طرف گئے۔ توڑی ہی دیر  
 بعد بچے اچھلتے کودتے واپس آگئے۔ فونی اور شرہ اپنی اپنی اور کئی اپنے ڈیڈی  
 کو بھی ساتھ لے آئے۔

یول رلیٹ ہاؤس کے باقی کمینوں سے عثمان کا تعارف ہو گیا۔ بچوں کی  
 تصویریں لے کر وہ اپنے نئے دوستوں سے باتیں کرنے لگے۔

کئی کے ڈیڈی نے کرسیاں باہر منگوا لیں۔ دھوپ بڑی شاندار تھی۔ فونی اور  
 شرہ کے ڈیڈی بھی باہر آ گئے۔

ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ کلام کے حسن کی باتیں بھی ہوئیں اور اپنے  
 اپنے شہروں کی بھی۔ فراغت اور سکون کے لیے یہ لوگ دو تین دن کے لیے یہاں  
 آئے ہوئے تھے۔

"آپ اکیس ہی آئے ہوئے ہیں۔" شرہ کی می نے پوچھا۔ تو عثمان مسکرا کر  
 بولے۔ "ہماری شادی کو ایک مہینہ ہی ہوا ہے۔ شائے کی طبیعت کچھ اچھی نہیں  
 رہ کرے میں ہیں۔"

"اوہ بہت اچھی بات ہے۔ آپ بھی ان سے ضرور ملو ایسے گا۔ فونی کی  
 می نے کہا۔

"آپ کا قیام کب تک ہے۔"

پہلے تو عثمان نے بھی اس کے پیچھے ہی اندر جانے کا سوچا۔ لیکن شوخی اسکا  
 رسمی تھی۔ لطف کے اس انوکھے تجربے کو ذرا طویل دینا چاہتے تھے۔ برآمدے  
 میں کھڑے کھڑے شائے سے پوچھا۔ کیا ارادہ ہے بھئی۔ تسریں نہیں اتر دلائیں  
 "نہیں۔" وہ غصے سے بولی۔

"میں اکیلا چلا جاؤں۔ کچھ مناظر ہی کیمرہ بند کر لوں۔" عثمان بڑے تحمل کا اظہار  
 کر رہے تھے۔

"مجھے کیا پوچھتے ہیں۔ جائیے۔" وہ پہلے سے زیادہ تلخ لہجے میں بولی۔  
 عثمان مسکرا دیئے۔

اور

پھر

اندر جانے کی بجائے برآمدے سے باہر نکل آئے۔ رلیٹ ہاؤس کے پچھلی  
 طرف والے میدان میں چلے گئے۔

یہاں ایک ایرانی جوڑا چل قدمی کر رہا تھا۔ کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ اور پارے  
 مزدور کٹر لوہے کے گٹھے سروں پر اٹھائے نچلے چھو چھوٹی کالی کالی چھتوں والے  
 کچے مکانوں کی طرف جا رہے تھے۔

عثمان نے بچوں سے دوستی کرنے کا سوچا۔ وہ ان کے درمیان آن کھڑے  
 ہوئے۔

"آپ کا نام۔ آپ کا نام۔ آپ کا نام۔" انہوں نے باری باری سب  
 بچوں سے پوچھا۔ بچے کھیل چھوڑ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اپنا اپنا بتایا۔  
 فونی۔ شرہ۔ پو۔ کئی۔ جی سب بچے ان سے جلد ہی فری ہو گئے۔ اپنے اپنے  
 می ڈیڈی کے متعلق بھی بہت کچھ انہیں بتا دیا۔

اپنی طرف دیکھا لیا۔ اور ہنس دینے۔  
 شائے نے غصے سے ان کے ہاتھ جھٹک دیئے۔  
 - پانگل سی لڑکی - عثمان نے اس کا رخ اپنی طرف موڑ کر اس کے گلے میں بازو  
 ڈالتے ہوئے اپنا چہرہ اس کے چہرے سے لگا دیا۔  
 - پیٹے - وہ اب بھی غصے میں تھی۔ لیکن عثمان کو ہٹا لینے کی سکت اس کے نازک  
 وجود میں کہاں تھی۔  
 - بہت بے وقوف ہو شیخو - عثمان اسے پیار کرتے ہوئے۔ اور پھر کتنی ہی دیر  
 اسے مانتے رہے گدگداتے رہے۔  
 - اب تمہاری موٹی عقل میں میری بات ہی نہ آئے تو میرا کیا قصور۔۔۔ وہ  
 مسکراتے ہوئے بولے۔  
 - بات جو بڑی اچھی کی تھی نا - وہ کچھ کچھ من گئی۔  
 عثمان کھلکھلا کر ہنس دیئے پھر بولے۔ شائے میں اب بھی کہتا ہوں۔ کہ جتنا میں  
 اظہار کرتا ہوں۔ اتنا پیار نہیں کرتا۔

شائے نے اپنے اوپر جھکے ہوئے عثمان کو غصے سے پرے دھکیلنا چاہا۔ لیکن  
 عثمان نے اس پر پورا ڈباؤ ڈال کر ہنستے ہوئے کہا۔ کتنی بے وقوف لڑکی ہو تم۔  
 - ہوں - اس نے منہ پر سے شائے کی کوشش کی۔ تو عثمان نے اس کا چہرہ  
 ہاتھوں میں پکڑ کر کہا۔ شیخو - میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں تمہیں کتنا پیار کرتا ہوں۔  
 اس کے مانپنے کا کوئی آلہ اب تک ایجاد ہی نہیں ہوا۔ یہ اظہار تو اس پیار کا ہزارواں  
 حصہ بھی نہیں شینے۔ جو میں تمہیں کرتا ہوں۔ کیا سمجھیں۔؟  
 - کچھ نہیں۔ شائے اتراتے ہوئے مسکرائی۔

- اندک رہے کچھ ہی نہ سمجھا کرو۔ یونہی روٹھار ہا کرو۔ خدا قسم جواب نہیں

- پر سوں والپی ہے۔  
 - پھر تو ضرور ملاقات کر داریں گے آپھی۔ شائے بھی بہت خوش ہوں گی  
 آپ سے مل کر۔  
 عثمان نے نعت گھنٹہ ان لوگوں کے ساتھ گزارا۔ پھر ملنے کا وعدہ کر کے  
 دوسری طرف نکل گئے۔ بے مقصد گھومتے پھرتے رہے۔ محنت کش پہاڑیوں  
 سے بھی انہوں نے کچھ دیر باتیں کیں۔  
 کافی وقت یونہیں گزار کر وہ اپنے کمرے کی طرف آئے۔ دروازہ آٹھنگ  
 سے کھولا۔ اور چورسی نظر شائے پر ڈالی۔ وہ بیڈ میں اندھ سی پڑی تھی۔ منہ  
 تکیے میں دے رکھا تھا۔ اور کنبل سے سارا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔  
 عثمان دبے دبے قدموں سے بیڈ کے قریب آئے۔ جھک کر اسے دیکھا۔  
 - شیخو - انہوں نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ وہ کندھے ہلا کر  
 اسی طرح پڑی رہی۔  
 عثمان نے اس کا کندھا ہلایا۔ - شیخو -

وہ اب بھی چپ رہی۔  
 عثمان پٹی پر بیٹھ گئے۔ شیخو کی لپشت ان کی طرف تھی۔ انہوں نے اس پر  
 جھکے ہوئے اس کے چہرے سے تکیہ ہٹانا چاہا۔ لیکن اس نے چہرہ باہر نہیں نکالا  
 عثمان نے سختی سے تکیہ پکڑ کر پرے ہٹایا۔ تو شائے نے دونوں ہاتھوں میں  
 چہرہ چھپا لیا۔

عثمان کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ واقعی روتی رہی تھی۔ اس کا چہرہ ناک  
 اور آنکھیں سرخ اور بھیگی ہوئی تھیں۔ عثمان کو اس پر اتنا پیار آیا اتنا پیار  
 کہ جی چاہا اسے سینے میں چھپا لیں۔ اس پر پوری طرح جھکتے ہوئے اس کا چہرہ

تہارے اس انداز کا - عثمان بولے -  
 " بہت اچھی لگتی ہوں - وہ کھلکھلا کر نہیں پڑی -  
 " بہت بُری - عثمان اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے -  
 پھر کتنی ہی دیر دونوں پیار کا عملی اظہار کرتے رہے -

---

کالام نے والپی پر سید و شریفین میں دونوں کچھ گھنٹے ٹھہرے - یہاں کی علاقائی  
 چیزیں عثمان کو بہت پسند تھیں - چاندی کے زیور اور کوچی ڈریس انہوں نے  
 شائے کے لیے خریدے -

دو دن پشاور میں بھی قیام کیا - خریداری کی - لیکن گرمی کے پیش نظر زیادہ  
 دن یہاں رہ نہ سکے - ایک ہفتے کے لیے کابل بھی گئے - واپس آئے مری چند  
 گئے گنارے پھر ایبٹ آباد گئے - یوں پھرتے پھرتے کانان جا پہنچے -

یہاں بھی قدرت نے حق کے انمول خزانے لٹائے تھے - یہ جگہ کالام سے  
 ہی کہیں زیادہ خوبصورت تھی - سرسبز علاقہ گلاب کے پھولوں کے قدرتی گلے  
 اور در نیچے بہتا ہوا ٹھنڈے یخ بستہ پانی کا دریا - حنا گاہ تک حسن ہی حسن تھا -  
 خوبصورت پس منظر میں عثمان نے شائے کی بے شمار تصویریں لیں - شائے نے  
 ٹھان کے عکس سلولا ٹیڈ پتارے اور بہت سی تصویریں دونوں نے اکٹھی لیں  
 بڑے رومانوی پوز بنا بنا کر - بڑے حسین انداز اپنا اپنا کر - کمرے کی آئینہ

نہیں ابھی موڈ بن رہا ہے۔

میرا موڈ باہر جانے کا ہے۔

میرا گھر بیٹھنے کا۔ خط لکھے بہت دن ہو گئے۔

اگر لکھا جاسکتا ہے۔

اسی بات پر دونوں کی تکرار ہو گئی۔ عثمان کو شائے پر غصہ آگیا۔ کتنا دل چاہ رہا تھا ان کا اس وقت باہر گھر منے کو۔ ماما کے خط کو اس نے ترجیح دی تھی۔ مالا بخود اس کی خاطر ماں باپ رشتے دار سب کو چھوڑ چکے تھے۔ ملال قدرتی تھا۔ وہ اکیلے باہر چلے گئے۔

شائے نے بھی کوئی پروا نہ کی۔ وہ ماما کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ اپنی سردرد اور شاذ زندگی کی پوری تصویر اس نے الفاظ میں کھینچ دی۔

خط بند کر کے وہ عثمان کا انتظار کرنے لگی۔ وہ نہیں آئے۔ شام اندھیروں میں ڈوب رہی تھی۔ سردی کافی بڑھ گئی تھی۔ اور بادباراں کے طوفان کی آمد آ رہی تھی۔ وہ گھر آکر کمرے سے نکلی۔ برآمدے میں کھڑی ہو گئی۔

لیکن

وہ نہیں آئے۔ تو وہ چوکیدار کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسے عثمان کو بلانے کے

لیے بھیجا۔

عثمان سامنے والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کراچی سے آنے ہوئے کچھ نوجوان چس کھیل رہے تھے۔ ان سے علیک سلیک آج صبح ہی ہوئی تھی۔ وہ انہیں بھی کھیل میں شامل کرنے پر مصر مہم تھے۔ شطرنج کے بہترین کھلاڑی تھے عثمان۔ سب کھیل میں اتنے محو ہوئے کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ نوبے کے قریب چوکیدار انہیں ڈھونڈتا ہوا ادھر آیا۔ بیگ صاحبہ کی پریشانی کا بتلاتے ہوئے

جن کے اک اک انداز کو متعید کرتی رہی۔

دونوں بے انتہا خوش تھے۔

سارا دن دونوں یا تو دشوار گزار راستوں پر چڑھتے رہتے۔ یا کمرے میں بنا

ہو کر محبت کے نغمے لاتے رہتے۔

کبھی کبھی لڑائی بھی ہو جاتی۔ شائے کسی بات کا برا مان جاتی۔ تو منہ پھلایا

عثمان اسے منا لیتے۔ پیار کرتے اور اپنی بے مثال محبت کا یقین دلاتے۔

کبھی عثمان کو کسی بات پر غصہ آ جاتا۔ تو وہ چپ کار روزہ رکھ لیتے۔ یہ لمحات

شائے کے لیے انتہائی اذیت ناک ہوتے۔ لیکن وہ جلد ہی اپنی غلطی کا اعتراف

کر کے منا لیتی۔

خفگی۔ چند گھنٹوں پر ہی محیط ہوتے۔ اس سے زیادہ برداشت کی طاقت

عثمان میں ہوتی نہ شائے میں۔

اس شام بالکل معمولی سی بات تھی۔

شینے۔

جی۔

چلو باہر چلیں۔

نہیں۔

غروب آفتاب کا منظر دید کے قابل ہے۔

میں نہیں جاسکتی۔

کیوں۔

ماما کو خط لکھنا ہے۔

اگر لکھ لینا۔ پوسٹ تو صبح ہی ہوگا۔

سٹے ہوئے تھے۔ شانہ کو روٹا آ رہا تھا۔ بجلا اتنی بڑی کوئی بات ہو گئی تھی۔  
جو عثمان نے یوں آنکھیں پھیر لی تھیں۔ وہ چپکے چپکے رونے لگی۔

نیز عثمان کو بھی کہاں آ رہی تھی۔ شانہ روڑی تھی۔ انہیں علم تھا۔ لمحوں کے توقف  
کے بعد ہلکی ہلکی سنوں سنوں کی آواز عثمان کو آ رہی تھی۔

لیکن وہ پہل کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ قصور شانہ کا تھا۔ منانا اسے ہی چاہئے  
تھا۔ انہیں شانہ کے رونے سے بے حد الجھن ہو رہی تھی۔ سمجھ نہ پارہے تھے۔  
کردہ کیا شے ہے۔ خود روٹھے پھر بھی رونے لگتی ہے۔ اور جو عثمان روٹھیں پھر  
بھی آنسو بہانے لگتی ہے۔

شانہ نے آنسوؤں کا حربہ کارگر نہ دیکھا۔ تو جھلا کر کئی بار ادھر سے ادھر  
کر دھیں بولیں۔ اسے بھی اب عثمان پر غصہ آ رہا تھا۔ نہیں بولتے نہ بولیں۔ اس  
نے جھلا کر سوچا۔ اور سو جانے کی کوشش کی۔  
دونوں نے آج کی خفگی کو انا کا مسئلہ بنالیا۔

لیکن

قدرت مسکرا رہی تھی۔ دونوں کی انا کا بھرم اس نے رکھ لیا۔

بادل زور زور سے گر جا اور بجلی کہیں ٹرپ کر گری۔ ایک خوفناک گرج  
اور بلا دینے والا دھماکا ہوا۔ طوفان سے ڈرنے والی شانہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔  
وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ غضب تو یہ ہوا۔ کہ بتی بھی بند ہو گئی۔ شانہ لرزتے ہوئے  
زور زور سے رونے لگی۔ تو عثمان کے شفق ہاتھوں نے اسے تھام کر اپنے ساتھ  
لگالیا۔ اپنے بازوؤں میں بیٹھے ساتھ لگائے وہ اسے یوں تھکتے رہے جیسے ننھی  
می بچی ہو۔ وہ کتنی ہی دیر کا پتی رہی۔ ڈرتی رہی۔ لرزتی رہی۔ اور عثمان  
کی چٹائی میں منہ چھپا کر روتی رہی۔ عثمان اسے جو شیلے انداز میں پیار کرتے رہے۔

انہیں فوراً ان کے پاس جانے کی تاکید کی۔

عثمان اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں شانہ کی پریشانی سے کوفت  
تو ہوئی۔ لیکن اس سے ناراض جو تھے۔ یہ سزا دینا ہی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ ناراضگی ان کے چہرے سے میاں تھی۔ شانہ  
بے اختیار انداز ان کی طرف بڑھی۔ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شاکی  
انداز میں بولی۔ کوئی اس طرح بھی کرتا ہے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر آپ کہاں  
چلے گئے تھے۔

عثمان نے سرد مہری سے اسے دیکھا۔ کپڑے تبدیل کیے اور اگر کمزور  
پڑ گئے۔

کھانا نہیں کھائیں گے۔ شانہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

نہیں۔ انہوں نے غصیلے بلے میں کہا۔ تو شانہ سہم گئی۔ اتنے غصے میں تو  
اس نے آج انہیں ہلکی بار دیکھا تھا۔ اس نے دو تین بار بمنت کھانا کھانے کے  
بلے انہیں کہا۔ لیکن جواب نفی میں ملا۔

شانہ نے خود بھی کھانا نہیں کھایا۔ ٹرے ویسے کی ویسے پڑی رہی۔

بیڈ ایک ہی تھا۔ شانہ کپڑے تبدیل کر کے آئی۔ کتنی ہی دیر کھڑی رہی۔ پھر  
ایک ٹی پرائیسی سے بیٹھی۔ اور کنارے ہی کے اوپر لیٹ کر کبیل کیے لیا۔

یہ سرد ترین رات تھی۔ پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں سے پھل پھل آنے والی  
مہوائیں تند جھلک بن رہی تھیں۔ ٹین کی چھتوں سے ٹھوکر شاں شاں کرتے گزرنے لگی  
تھیں۔ بادل بھی گھرا آئے تھے۔ اور دور بہت دور بجلیاں لہرا لہرا کر گرنے کو مچل رہی  
تھیں۔ کبھی کبھی ان کی خوفناک کرٹک دل کو دھلا دیتی۔

دونوں روٹھے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف اپشتیں کیے کناروں کا بلن

- کیا بتاؤں۔  
 - اگر میں مر جاؤں تو۔  
 - پہلے آپ بتائیں۔ کہ اگر میں مر جاؤں تو آپ کیا کریں گے۔  
 - پہلے میں نے پوچھا ہے۔  
 - کیا ہوا۔  
 - نہیں پہلے تم بتاؤ۔  
 - عثمان شوخی سے مسکارتے تھے۔ انہوں نے بازو شانہ کی کمر میں جمائی کر کے  
 اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

- بتاؤ نا۔  
 - پہلے آپ بتائیں۔  
 - میں بتاؤں گا۔ لیکن پہلے تم بتاؤ۔  
 - خدا کرے جو ایسا موقع آئے۔  
 - خدا کرے یا نہ کرے یہ دوسری بات ہے۔ یونہی پوچھ رہا ہوں۔ مرتے  
 توڑا ہی جا رہا ہوں۔ وہ ہنس کر بولے۔  
 - ہوں۔

- شانہ نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ اور بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔  
 میں آپ کے ساتھ ہی مر جاؤں گی۔  
 عثمان کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ انہوں نے شانہ کے بالوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔  
 میری زندگی ہونا۔

شانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بالکل۔  
 دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتے رہے۔ شانہ

یہ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ان کی محبت کو مضبوط اور مستحکم بنارہی تھیں۔ دونوں  
 کو احساس ہو جاتا تھا کہ ایک دوسرے کے لیے وہ لازم و ملزوم ہیں۔ زندہ رہنا  
 تو ایک طرف وہ تو ایک دوسرے کے بغیر مر بھی نہ سکتے تھے۔

اس دن دونوں کھالیں ہی بنے تکی اور بے سروپاسی باتیں کر رہے تھے۔  
 دونوں کا مود بڑا خوش گوار تھا۔ ہنستے ہنستے بے حال ہو رہے تھے۔  
 بڑی نہری دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ گلاب کے پھولوں کے پتوں کے بیچوں  
 بیچ سرسبز ہی جگہ پر دونوں بیٹھے تھے۔ چمکتا ہوا دن تھا۔ ہوا بند تھی۔ اور فضا میں کچھ  
 حرارت سی آگئی تھی۔

- شانہ - عثمان نے شانہ کو پیار سے بلایا براؤن شارٹ سکرٹ مسٹرڈ بلاؤڈ  
 اور مسٹرڈ چمڑے کے لائنگ بوسٹ پہنے۔ وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ بالوں  
 کا اندونیشی شامل جوڑا بنانے سے اس کی گردن کی خوبصورتی نمایاں تھی۔  
 - مانی - شانہ نے جیسے عثمان کی نقل اتاری۔

دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔  
 - شینو ایک بات بتاؤ۔

- کہیئے۔

۔ میں اگر مر جاؤں۔ تو تم کیا کر دو گی۔  
 شانہ نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اللہ کرے۔ کیسی بری بری باتیں منہ  
 سے نکالتے ہیں آپ۔

عثمان نے اس کے ہاتھ کو دانتوں سے ہلکا سا کاٹ لیا۔  
 - ادنیٰ - شانہ نے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ اپنا ہاتھ ملتے ہوئے عثمان کو دیکھنے لگی۔  
 - بتاؤ نا۔

روک کر جلدی سے کہا۔

مائی۔۔۔ شائندہ نے ان کے سینے پر دونوں ہاتھ زور سے مارے۔

عثمان کھلکھلا کر منہس پڑے۔ شائندہ بھی ہنسنے لگی۔ وہ اٹھ بیٹھی اور شاکی انداز میں عثمان کو دیکھ کر بولی۔ مرد ہوتے ایسے ہی ہیں۔

عثمان بولے۔ دیکھیے جناب مذاق کی بات ہو رہی ہے۔ موڈ بگڑ نہ جائے۔ دیسے کوئی خاص ہرچ تو نہیں۔ تم تو مری چکی ہو گی۔ میں جو چاہے کرتا پھر دوں۔ ہوں۔ شائندہ نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر کہا۔ میرا نام بھی شائندہ ہے۔ آپ نے ایسی حرکت کی تو قبر سے بھی نکل آؤں گی۔

عثمان ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے۔ پھر منہ ہی کو روکتے ہوئے پوچھا۔ قبر سے نکل کر کیا کر لو گی؟

اس ڈائن کا گلا دبوچ دوں گی۔ اور آپ کو۔ آپ کو زندہ ہی قبر میں گھسیٹ رہے جاؤں گی۔ وہ منہس پڑی۔ عثمان کا ہنستے ہنستے برا حال تھا۔

توبہ۔ توبہ۔ کیسی خطرناک ہو تم۔ مر کر بھی چین نہ لینے دو گی۔ وہ رد مال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولے۔ زیادہ ہنسنے سے آنکھوں سے پانی نکلنے لگا۔

آپ بھی کیا یاد کریں گے کہ کس سے پالا پڑا ہے مائی۔۔۔ شائندہ نے منہس کر کہا۔ اپنی جان اپنی روح اپنی زندگی سے۔ کہتے ہوئے عثمان نے شائندہ کو بچڑھانا چاہا۔ ن وہ جلدی سے اٹھ بھاگی۔ عثمان بھی اس کے پیچھے لپکے۔ دونوں کے حسین اور پر مسرت چہرے کو نبھنے لگے۔

ان کی گود میں سر رکے گھاس پر ہی لیٹ گئی۔

اب آپ بتائیے۔ شائندہ ان کی ٹائی سے کیلتے ہوئے بولی۔

کیا۔ عثمان شوخ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

میں مر جاؤں تو آپ کیا کریں گے۔

بتاؤں۔

ہاں۔

نہیں بتاتا۔

کیوں جناب۔ اپنی دفعہ یہ بے ایمانی۔ پچ پچ بتائیے۔

ہوں۔ پچ پچ۔

بالکل۔

تم مر گئی نا۔

ہوں۔

تو چند دن تو میں خوب ماتم کروں گا۔

پھر؟

عثمان کی آنکھوں سے شوخی اور شرارت ٹپک رہی تھی۔ لیکن بنجیدہ بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ بولے۔

نہیں بتاتا۔

بتانا ہو گا۔

اچھا سنو۔

ہوں۔

چند دن ماتم کرنے کے بعد کوئی اور لڑکی تلاش کر لوں گا۔ انہوں نے منہس



تخائف پاکر سب بہت خوش ہوئے۔

عثمان اور شائندہ نے یہاں دو دن قیام کیا اور پھر اپنے نئے گھر میں چلے آئے۔ عثمان کے ذاتی ملازم نعمت خان اور فضل دین بھی مراد محل سے آگئے۔ اماں فضاں نے بھی مراد محل ان کی خاطر چھوڑ دیا۔

میسجر اشفاق کا یہ بنگلہ چھوٹا سا تو تھا۔ لیکن نیا تھا۔ اور قرینے سے آراستہ تھا۔ وہ از قلم فرنیچر پر دسے اور قالین وغیرہ اسی طرح چھوڑ گئے تھے۔ یوں اس نئے جوڑے کو گھر کی سجادے کا زیادہ تر دہن نہیں کرنا پڑا۔ شائندہ نے اپنے شوق ہی سے کچھ معمولی سا رد و بدل کیا۔ بیڈ روم کی ترتیب اپنی مرضی کے مطابق کی۔ اشفاق صاحب کا بیڈ اٹھوا کر دوسرے کمرے میں ڈلوایا اور اپنی شادی کا نیا بیڈ ماسٹر بیڈ روم میں بچھوایا۔ یہاں پر دسے بھی اس نے اپنے بیڈ کی مناسبت سے نئے لگوائے۔

چند ہی دنوں میں دونوں اپنے ارد گرد رہنے والوں سے متعارف ہو گئے۔ پچھلے بنگلے میں زیدی اور ان کی نئی بیاتھا میڈن زیدی سے ان کی خاصی دوستی ہو گئی۔ بڑا انہیں مکھ اور پر غلوں جوڑا تھا۔ دائیں طرف کے بنگلے میں ایک لکھتی بیوہ تہا رہتی تھی۔ اس کی دونوں بیٹیاں بیاہی ہوئی تھیں۔ کم گو عورت تھی۔ اس سے صرف علیک سلیک ہی ہوئی۔ بائیں ہاتھ بہت بڑا بھرا پرا کنبہ آباد تھا۔ بین کمال کی کئی انیکسیر والی کو بیٹھی بھی شاید ناکافی تھی۔ درجن بھر بچے چار پانچ عورتیں چھ سات مرد بزرگ جانے کتنے لوگ آباد تھے۔ شائندہ اور عثمان ان لوگوں سے بھی ملے۔ لیکن شائندہ نے محسوس کیا۔ کہ ان کی اور ان لوگوں کی ذہنی تفاوت تہہ تکلف ہونے کی نوبت نہ لائے گی۔ پھر بھی ہمسایہ داری نبھانا ہر چاہئے تھی۔ کبھی کبھی مل لینے میں ہر ج نہیں تھا۔ اچھے شریف اور با وضع قسم

ماہر عمل مناکرہ دونوں واپس آئے۔ تو ماڈیڈی طرف انہیں دیکھ کر خوشی سے چولے نہ سائے۔

شائندہ باجی آپ کتنی خوبصورت ہو گئی ہیں۔ ظریفہ توبے اختیار کر رہی تھی۔

کیوں پہلے بہت صورت تھی کیا۔ شائندہ نے اٹھلا کر کہا۔

ماشاء اللہ ماشاء اللہ صحت بہت اچھی ہو رہی ہے۔ ڈیڈی بولے۔

اللہ نظر بد سے بچائے۔ ماما نے پیار اور خیر سے دونوں کو دیکھ کر کہا۔

عثمان سکر رہے تھے۔ گھر والوں کی خوشیوں سے انہیں بھی خوشی ہو رہی تھی۔

شائندہ سب کے لیے تحائف لائی تھی۔ اس نے سوائے چھ ڈیڈی کو دیا۔

ماما کے لیے گرم میکی اور اسی کی ہمرنگ گرم ٹوپی لائی تھی۔ ظریفہ کے لیے کابل

سے آرٹیفشل جیولری خریدی تھی۔ چمڑے کا کوٹ بھی لائی تھی۔ ایسی جی کے

لیے شرٹس اور جریساں خریدی تھیں۔

ہوتے۔ وہ دیکھتی کہ اس کی دوستی کا دم بھرنے والی خزانہ کے چہرے بے رنگ ہو جاتے ہیں۔ اس بات سے اسے بے حد خوشی ہوتی اور وہ عثمان کی آنکھوں میں اپنی خوبصورت نظروں سے بھانکتے ہوئے شوخ ہو جاتی۔ عثمان بھی فرسے مسکرا دیتے۔

شانہ تو اس کہا گہمی اور رنگیلی دنیا میں بڑی معروف ہو گئی تھی۔ کلب ہوٹل۔ دعوتیں اور دوستوں کے ہاں جانا آنا ہی مقصد زندگی بن گیا تھا۔ لیکن عثمان کے سامنے اور بھی بہت کچھ تھا۔ یہ وقت تو جیسے وہ عارضی طور پر گزار رہے تھے۔ عملی زندگی کا آغاز اتنا سہل نہ تھا۔ ماں باپ سے تو نمونہ چلے تھے۔ ان سے کچھ پانے کی توقع تھی۔ نہ ہی ان کی انا اجازت دیتی تھی۔ جو کچھ کرنا تھا خود کرنا تھا۔ اور ان کے جبر و اہم تھے۔ ان کے لیے انہیں بہت کچھ کرنا تھا۔

فیکٹری جو وہ بنوا رہے تھے۔ شادی کے چکر میں تکمیل کے مراحل کو نہ پہنچ سکی تھی۔ مراد علی خان نے ان کی خاطر دہاں سرمایہ لگایا تھا۔ لیکن اب یہ کام انہوں نے خود ہی کرنا تھا۔ فیکٹری کو مکمل کر کے چلانے کے لیے ابھی لاکھوں کی ضرورت تھی۔

اس کے علاوہ وہ اپنا خوبصورت اور شاندار گھر بھی بنوانا چاہتے تھے۔ ایسا گھر جہاں شانہ کے ساتھ رہ کر وہ مراد علی والوں پر ثابت کر سکیں کہ ان کی مدد و تعاون کے بغیر بھی وہ شان سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ ان کی خواہش تھی۔ کہ زمین انہیں مراد علی کے ارد گرد ہی ملے۔ انہوں نے کئی ایکٹوں کو پہلے سے ہی کہہ رکھا تھا۔

ان سارے کاموں کے لیے لاکھوں کا سرمایہ درکار تھا۔

کے لوگ تھے۔ وادی اماں نے تو شانہ کو اتنا پیرا کر لیا تھا کہ شانہ اور عثمان دواں ہی مرعوب ہوئے تھے۔ شغفتوں کے سائے کیسے بلند نہ ہونگے۔

زیریں اور نینے کلب کے باقاعدہ ممبر تھے۔ عثمان اور شانہ نے بھی رکنیت لے لی۔ اور کلب آنا جانا باقاعدگی سے شروع ہو گیا۔ تبوللا اور بنگو کا تو شانہ کو جیسے جنون ہو گیا۔ فلم دیکھنے بھی ضرور جاتی۔ اور کارڈز کھیلنا بھی ضرور جاتی تھی۔ کلب میں بھی کئی لوگوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یوں تھوڑے ہی دنوں میں عثمان اور شانہ کا حلقہ اجاب خاصہ وسیع ہو گیا۔ سمر شیرازی خاصی دلچسپ خاتون تھی۔ اس نے دونوں کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ پھر شانہ نے بھی ان کو گھر بلایا۔ نامہ احمد۔ جاوید خان۔ آصف قریشی۔ نادرہ۔ صوبی۔ جمیل۔ عرفی۔ منصور۔ جلیل۔ وغیرہ سبھی ان کے اچھے دوستوں میں شمار ہونے لگے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں سے راہ نرم ہوئی۔

یوں نئے شہر کی اجنبیت دور ہو گئی۔ شانہ تو پورے سکون اور اطمینان سے اپنی نئی زندگی میں کھو گئی۔ حسن و جمال قدرت نے فیاضی سے دیا تھا۔ عثمان کی خاندانی حیثیت نے اس حسن و جمال کو بڑا خوبصورت پس منظر دیا۔ یوں شانہ اپنے حلقہ اجاب میں اک خاص شان اور اقدار کی حامل بن گئی۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ضرور ہوا کہ عزت و قدر ملی۔ لیکن یہ بھی ہوا کہ شانہ کے اندر فخر و غرور کا بت بڑھنے پھیلنے لگا۔ اسے اپنے حسن اپنی حیثیت کا شعوری احساس ہونے لگا۔ اور محفل پر چھا جانے کی۔ دوسروں پر سبقت لے جانے کی خواہش اس کے اندر ہر دم چلنے لگی۔ پہلے وہ مٹی سنورتی تھی۔ تو صرف عثمان کہہ لے۔ لیکن اب آرائش و زیبائش کا مقصد دوسروں کو مرعوب کرنا بھی ہوتا۔ جب کسی محفل میں۔ دوستوں کے جگٹھے میں اس کی تعریفوں کے پل باندھے جا رہے

شانہ کی کمر میں جمائل کر دیئے۔

”اٹھئے نا“

”کہاں جانا ہے“

”کلب۔ بگلو ہے آج“

”اوہ خدایا۔ مجھے تو ڈھیر سارا کام کرنا ہے ابھی“

شانہ فائل اک طرف کرتے ہوئے ان کے سامنے میز پر بیٹھ گئی۔ فائلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی یہ کیا جھجال ڈال رکھے ہیں آپ۔

”جان من۔ عملی زندگی شروع کر رہے۔ اس کے لیے تنگ دود کا آغاز ہے یہ۔“ عثمان کرسی کی پشت سے اپنی پشت لگاتے ہوئے انکڑائی لے کر بولے۔

”عملی زندگی تو شروع ہو چکی ہے۔ وہ مسکرائی

”تمہیں سب کچھ تو بتا دیا ہے۔ میرے پاس کیا ہے اور میں نے کیا کچھ کرنا ہے۔“

”جانی۔ اتنے تردد میں کیوں پڑ رہے ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ آپ ہر وقت سوچوں میں ڈوبے رہتے ہیں۔“

”سب کچھ تمہارے لیے تمہاری خاطر۔ تمہارے واسطے۔“ عثمان نے آگے کو ہر کر شانہ کو پار کرنا چاہا۔

وہ مسکراتے ہوئے پیچھے ہو گئی۔

”اوں ہوں۔“

”کوئی اوں ہوں نہیں۔“ عثمان نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہلکا جھٹکا

دیا۔ وہ ان کی گود میں آ رہی۔

عثمان کی مرحومہ امی کی کچھ اراضی عثمان کے نام منتقل ہو چکی تھی۔ ان کا پتہ سرمایہ بیرونی کمپنیوں میں بھی لگا ہوا تھا۔ باہر کے دونوں میں بھی کچھ سرمایہ تھا۔ یہ سب عثمان ہی کا تھا۔ زمین کا انتقال تو ان کے نام تھا۔ فوری طور پر بیچی جاسکتی تھی۔ ہاں شیراز کی فروخت اور ملکوں سے روپیہ لینے کے لیے لمبی چوڑی کارروائیاں کرنا تھیں۔ کچھ سرمایہ ان کا اپنا بھی تھا۔ جو چھوٹی سی بزنس میں لگا رکھا تھا۔ یہ سب کچھ سیٹ کر ملک میں لانا تھا۔ جو ایک صبر آزما اور تھکا دینے والا مرحلہ تھا۔

لیکن

یہ سب کچھ عثمان کو کرنا ہی تھا۔ ورنہ ان کی پلاننگ کسی کام کی نہ تھی۔

عثمان کو اب دن رات یہی فکر دامن گیر تھی۔

اس شام شانہ نے بڑا خوبصورت لباس پہنا۔ میک آپ سے اپنے خُسن کو دو آتشہ کیا۔ کلب جانے کے لیے تیار ہو کر وہ کمرے میں آئی۔ تو عثمان فائلیں کھوکے کام میں مصروف تھے۔

”مانی۔“

”ہوں۔“

”ابھی تیار نہیں ہوئے۔“

”کہاں جانا ہے۔“

شانہ نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے عثمان کی گردن میں بازو ڈال کر جھٹکتے ہوئے ان کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ عثمان پن میز پر رکھ کر شوق اور پیار سے شانہ کو دیکھنے لگے۔ اس نے عثمان کی پسندیدہ مہر فریم لگا رکھی تھی۔ عثمان جیسے نشے میں جھوم گئے۔ انہوں نے مکان سے چوراک جہائی لی۔ اور بازو

- اچھا بھلا ہے یہ گھر ضرورت کو کافی - تین سال تو یہاں رہ سکتے ہیں ۔  
 - میرا بس چلے ناشینو ۔  
 - ہوں ۔  
 - تو تین دنوں میں اپنا گھر بنا کر تمہیں لے جاؤں وہاں - خوبصورت شاندار  
 اور ہر آسائش سے پر گھر میں ۔  
 شانہ مسکرائی اور پھر سنس کر بولی - مراد محل والوں پر رعب ڈالنے کے لیے  
 رہے ہیں سب کچھ ۔  
 - ادوہ شافو - میں تمہیں کہاں لے جانا چاہتا ہوں - کس بلندی پر پہنچانا چاہتا  
 ہوں - تمہارا سیٹس - تمہارا دقتار ۔  
 - بس بس - وہ کھلکھلا کر سنس پڑی - بہت بہت شکریہ - پہلے جلدی  
 سے تیار ہو جائیے - اٹھیے - اٹھیے نا ۔  
 حسن کا امر تھا - عثمان انکار کیونکر کرتے - تھوڑی دیر بعد تیار ہو کر شانہ  
 لے کر کلب آ گئے ۔  
 جہاں دوستوں نے والوں اور اجنبیوں نے ان کا استقبال جوش اور دلوں  
 سے کیا - شانہ اور عثمان پورے ہال میں منفرد نظر آ رہے تھے ۔  
 دن گزار رہے تھے - عثمان کی مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں - اراضی کا ایک  
 راناہوں نے بیچ دیا تھا - دوسرے کا سودا ہو رہا تھا - پراپرٹی ڈیلروں - اینجنیئروں  
 دیکلوں کے پکڑوں میں پڑے تھے - جو پیسہ وصول ہو چکا تھا - فیکٹری کا کام  
 راز کر دیا تھا ۔  
 انہیں دنوں خان نجیب اللہ خان کی کوٹھی بکنے کی خبر ان تک پہنچی ۔  
 بچان کی من پسند تھی - ان کے بچپن کا خواب تھی - اسے تو ضرورت انہوں

- نہیں مانی نہیں - اس نے عثمان کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہتے  
 ہوئے کہا - سارا میک اپ خراب کر دو گے ۔  
 - مت کیا کر دو - ضرورت ہی نہیں اس تصنع کی ۔  
 - واہ جی ۔  
 - خدا قسم ضرورت نہیں تمہیں ۔  
 - بہت اچھا صاحب - بس اب جلدی سے اٹھیے - تیار ہو جائیے - شینہ  
 کافون آیا ہے - وہ جا بھی چکے ہوں گے ۔  
 - تم اگر نہ ہی جاؤ تو ۔  
 - اوں ہوں - بنگو ہے آج ۔  
 - تو پھر لیو کر دو - ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ ۔  
 - آپ نہیں جائیں گے ۔  
 - نہ جاؤں تو بہت سا کام کروں گا ۔  
 - اُف خلیا - کام کام - وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی - کریزی میں آپ بھی ۔  
 - پیسہ کہاں سے آئے گا محترمہ - عثمان نے اس کے سر پر ہاتھ پڑھا ڈالتے  
 ہوئے کہا ۔  
 - جتنا ہے اتنا ہی کافی ہے - سرگرداں ہونے کی کیا ضرورت ہے ۔  
 - تم نہیں سمجھ سکتیں - ضرورت کا احساس مجھے ہے ۔  
 - ضرورت کیا ہے - جتنی پھیلائیں گے پھیلتی چلی جائے گی ۔  
 - فیکٹری مکمل نہ ہو ۔  
 - آہستہ آہستہ ہو جائے گی ۔  
 - اور گھر بھی نہیں چاہیے ۔

پورے چھ ماہ بعد چالو ہو جانے گی۔ سارا کام تسلی بخش رفتار سے ہو رہا ہے۔  
کچھ لوں اپلائے کر دوں گا۔ فیکٹری کے لیے۔ ہاں کوٹھی مل جائے تو اس  
کے لیے سرمائے کا بند و بست کرنے کے لیے دوڑ دوپ کرنا پڑے گی۔  
اس لیے تو کہہ رہا ہوں۔ اتنے بار ذہن پر ایک دم نہ ڈالیں۔ فیکٹری مکمل  
ہو جانے دیں۔ پھر گھر بھی بنالیں گے۔

شافویہ جج جو مل رہی ہے نا۔ وہ تو میں نے ہر صورت خریدنی ہے۔ اس  
کے لیے خواہ کچھ بھی کرنا پڑے۔

خدا کرے آپ کی خواہش پوری ہو جائے۔  
اب بات کی ناکام کی۔ عثمان نے شائے کو پیار کر لیا۔  
قیمت کا اندازہ بتایا ہے ایجنٹ نے۔

پھر دی۔ تمہیں کیا ہے نا تم بالکل فکر نہ کرو۔ دعا کر بس یہ کام ہو جائے۔  
باقی سب کچھ میں کر لوں گا تم اپنے ذہن پر رتی بھر بار نہیں ڈالو۔ سمجھیں۔ کل نجیب اللہ  
خان سے مل کر سب کچھ تہہ چل جائے گا۔ ہمارے ان سے خاندانی مراسم بھی ہیں۔  
کچھ بات بنے ہی گی نا۔

کل آپ وہاں جائیں گے۔ شائے کو جیسے کچھ یاد آگیا۔

ہاں۔ کیوں؟

کل چھ بجے ڈاکٹر سے ٹائم لے رکھا ہے۔  
ادہ ہاں۔

چند دنوں سے شائے کی طبیعت کچھ گری گری رہنے لگی تھی۔ کمر اور پنڈلیوں  
پر درد ہوتا۔ کبھی چکر آ جاتا۔ کبھی جی تھلانے لگتا۔ اماں فضلاء تو جان گئی تھی۔  
اس نے شائے سے کہا بھی تھا۔ لیکن ڈاکٹر کو دکھانا ضروری تھا۔

نے خریدنا تھا۔ پراپرٹی ڈیلر نے انہیں فون پر مطلع کیا۔ تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔  
کیا بات ہے۔ شائے نے پوچھا۔

شینو۔ دعا کرو۔ یہ جگہ مجھے مل جائے۔ انہوں نے فرط مسرت سے  
اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

مراد محل سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پرانی کوٹھی ہے۔ بہت خوبصورت  
عمل و قوس ہے۔ اونچے نیچے ٹیلوں پر بنی ہوئی ہے۔ صدیوں پرانے درختوں میں  
گھری ہوئی۔ پچھلے طرف سے جیومندی گزرتی ہے۔ اُن پر جگمگاتی گئی نا۔ تو تم  
دیکھو گی۔ میں اسے کیا سے کیا بنا دوں گا۔ جنت ہو گی شینو جنت۔ میں  
میں میری۔

انہوں نے شائے کو پیار سے دیکھ کر کہا۔

لیکن آنا پیسہ؟  
سب بند و بست کر لوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔  
کیسے نہ کروں۔

میری زندگی۔ میری جان۔ انہوں نے شائے کو لپٹاتے ہوئے کہا۔  
تمہیں فکر کی ضرورت نہیں۔ فکر کرنے کو میں جو ہوں۔

اچھا جی۔ آپ فکر مند ہوں۔ اور میں بے فکر رہوں۔  
تم صرف دعا کرو۔ کہ یہ جگہ مجھے مل جائے۔ باقی سب کچھ ہو جائے گا۔  
زمین بیچ دوں گا۔ باہر سے سرمایہ لے آؤں گا۔ ٹیڈرز میں امی مرحومہ کے  
ان کو ڈسپوز آف کر دوں گا۔ سب سوچ رکھا ہے میں نے۔

فیکٹری کے لیے بھی پیسہ چاہیے۔ سب سوچ لیں پہلے پھر کوٹھی کا سودا کریں۔  
میری جان تمہیں کیا ہے نا اس تردد میں تم نہ پڑو۔ فیکٹری انشاء اللہ

شانہ نے ڈاکٹر سے ٹائم لیا تھا۔ کل دکھانے جانا تھا۔  
 - میں چھ بجے تک آجاؤں گا۔  
 - نہ آسکے تو۔  
 - تو تم خود چلی جانا۔  
 - ہوں۔  
 - مناسب سمجھو تو مسز زیدی کو ساتھ لے جانا۔  
 - اچھا۔

- میں کوشش کروں گا۔ کہ چھ بجے سے پہلے ہی آجاؤں۔ سچ حال۔ نہ آسکا تو  
 تم ضرور چلی جانا۔ اور اب تو تمہیں ایسے ایسے کام خود کرنے کی عادت ڈالنا پڑے  
 گی جان۔ تمہارا یہ خادم آنے والے دنوں میں اتنا مصروف ہوگا۔ اتنا مصروف  
 کہ شاید اپنی ہوش بھی نہ رہے۔  
 - سخت خارا آتی ہے مجھے۔ شانہ مسکرائی۔ ہزار دفعہ کہا ہے۔ کہ آپ  
 کے ساتھ جھونپڑی بھی ہونا۔ تو میں خوش رہ سکتی ہوں۔ مملوں کی مجھے خواہش  
 ہے نہ ضرورت۔ ضرورت ہے تو صرف آپ کی۔ مانی صرف آپ کی۔  
 - اور مجھے ضرورت ہے اک شانہ رمل کی۔ جس میں اس پری کو اس کے  
 شان شاں طریق سے رکھ سکوں۔ عثمان نے شانہ کی ٹھوڑی کو پیار سے چھوتے  
 ہوئے کہا۔

شانہ چپ ہو گئی۔ عثمان کے جنون خیز جذباتوں کی اسے خبر تھی۔ اس کے لیے  
 وہ کیا کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتی تھی۔  
 دوسری شام شانہ کو مسز ٹینڈر زیدی ہی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔  
 اس دن عثمان کو ساڑھے آٹھ کے قریب واپس آنے۔

شانہ لان ہی میں تھی۔

آج کو ہم صبح بارش ہو جانے کی وجہ سے بہت اچھا ہو گیا۔ اس وقت  
 بھی آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور بھگی  
 فضا بڑی خوش گوار لگ رہی تھی۔ چمن کی تیاں روشن تھیں۔ فصل دین میز  
 سے برتن اٹھا کر لے جا رہا تھا۔ آصف اور منصور جلیلی آئے ہوئے تھے۔  
 عثمان کا انتظار کر کے وہ دس منٹ ہی ہوئے واپس ہو گئے۔ اماں فضلاء گھاس  
 پر بیٹھی تھی۔

عثمان گاڑی سے نکلے شانہ کو دیکھا تو کیا ریاں پھلانگتے ہوئے ادھر پکے۔  
 آتے ہی شانہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر چلائے۔ شانہ۔ مبارک ہو۔  
 کام بن گیا۔  
 - پنج۔ شانہ نے خوش ہو کر کہا۔  
 - ہلای۔

- سودا طے ہو گیا۔

- سمجھو سب کچھ ہو گیا۔ تین ماہ کے اندر جربٹری ہو جائے گی۔ کتنی بڑی  
 خوشخبری ہے۔ ہے نا۔ انہوں نے خوشی میں شانہ کو چمکے دے ڈالا۔  
 - ہے ہے۔ صاحبزادے۔ اماں فضلاء جلدی سے بولی۔  
 - کیوں اماں۔

- جھنجھوڑ رہے ہیں آپ تو بچم صاحبہ کو۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔  
 وہ خوشی سے بولی۔

- ادھ ہاں۔ گئی تھیں ڈاکٹر کے پاس۔ انہوں نے جلدی سے پوچھا۔  
 شانہ نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔

”کیا کہا انہوں نے۔“ عثمان نے پوچھا۔  
 ”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ شرما کر بولی۔  
 ”یاد تمہیں کبھی کسی بات کا پتہ بھی ہوتا ہے۔“ وہ مسرور لہجے میں بولے۔  
 ”خوشخبری ہے صاحبزادے صاحب۔“ اماں فضلاں سنس کر بولی۔ ”مبارک ہو۔ خدا بٹیا دے گا۔“  
 ”ادہ۔“ سچ۔“ شیخو۔“ عثمان کی آنکھوں میں جیسے قندیلیں جل اٹھیں۔  
 چہرہ خوشی سے تہمتا نہ لگا۔ انہیں اتنی بڑی خوشخبری کا جیسے یقین ہی نہ آ رہا تھا۔

”سچ شافو۔“ انہوں نے پھر پوچھا۔

شانہ نے سرشات میں ہلاتے ہوئے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔  
 عثمان خوشی سے جیسے دیوانے ہو گئے۔ شافو کو بازوؤں میں لپیٹ کر  
 سینے سے لگاتے ہوئے بے اختیار ہو کر اسے پیار کر لیا۔  
 ”ہائے اللہ۔“ شانہ نے ان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے  
 اماں فضلاں کی طرف اشارہ کیا۔ ”کچھ تو خیال کریں۔“

”خیر ہے۔“ عثمان خوشی سے سرشار لہجے میں بولے۔ ”اپنی ہی اماں ہے۔“  
 اماں فضلاں مسکرائے لگی۔

اس رات عثمان کو پوری طرح نیند نہ آئی۔ پل پل بعد جاگ کھل جاتی۔ خدانے  
 اتنی بڑی خوشیاں انہیں ایک دن ہی دی تھیں۔ وہ سوئی ہوئی شانہ کو  
 اپنے سینے میں چھپا لینے کی خواہش شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ لیکن آج  
 انہوں نے شانہ کے آرام کے خیال سے اسے جگایا نہیں۔

”شانہ بھابی آپ تو ابھی تیار ہی نہیں ہوئیں۔“ ٹینے نے آتے ہی کہا۔  
 ”عثمان نہیں آئے ابھی۔ ان کا انتظار کر رہا ہوں۔“ شانہ بولی۔  
 ”آجائیں گے وہ بھی۔ آپ تو تیار ہو جائیں۔ مردوں کو تیار ہوتے کوئی دیر لگتی  
 ہے۔ اٹھیے آپ۔“

شانہ اٹھی۔ اور ٹینے اس کے ساتھ ہی اس کے بیڈ روم میں آگئی۔  
 آج منشر شیرازی کے ہاں زبردست قسم کا ڈنر تھا۔ شہر کے متول اور فیشن ایبل  
 لوگوں کا اجتماع کسی نمائش سے کم نہیں ہوتا۔ ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے  
 کی کوشش ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو نمایاں کرنے اور لوگوں کی نظروں میں اوجھڑا  
 کرنے کا احساس غالب رہتا ہے۔  
 شانہ نے وارڈ روم کھولی اور لباس کا انتخاب کرنے لگی۔ ٹینے نے خوبصورت  
 مارٹھی پہنی ہوئی تھی۔ میک اپ بھی سلیقے سے کیا ہوا تھا۔ تہمتی پرل کاسٹ

بھی ساڑھی کی مناسبت سے خوب تھا۔ وہ خاصی سمارٹ اور دلکش لگتی تھی۔

”ساڑھی پنیں گی یا کچھ اور“ ٹینے نے میز سے میگزین اٹھا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ٹینے نے سبگیر میں لٹکا ہوا خوبصورت ڈریس نکالا۔ اصلی ریشم کا پورا خوبصورت ڈریس جو موسم کی مناسبت سے انتہائی دلکش اور دیدہ زیب تھا۔ ٹینے نے رشک سے اس ڈریس کو دیکھا اور پھر منہ بنا تے ہوئے بولی یہ آپا پسند ہے یا عثمان بھائی کی“

”دونوں کی“ وہ ہنس کر بولی۔

”خوش قسمت ہیں بھابی۔“

”کیوں۔“

”زیدی تو ہمیشہ مجھ پر اپنی پسند ہی مسلط کرتے ہیں۔“

”مائی کا بھی یہی حال ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے تو خوشی ہوتی ہے۔“

”پچ پوچھو تو یہ ڈریس بھی مائی ہی کی پسند کا ہے۔“

”پسند بھی کام کی ہو تو بات ہے نہ۔“ ٹینے نے کچھ کتری کا احساس پاتے ہوئے کہا۔

”زیدی کو تو بس ساڑھی کے سوا کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔“

”آج تو زیدی صاحب ساتھ نہیں تھے۔ اپنی پسند کے کپڑے پہن لیتی۔“

”میرے پاس ساڑھیوں کے سوا اور کوئی لباس ہے ہی نہیں۔ شلو اور قمیضیں گھر پہ پہنے والی ہیں۔“ ٹینے شان سے مسکرا دی۔

”تم بیٹھو۔ میں تیار ہو جاؤں۔“ ٹینے نے کہا۔ ”وہ زیدی صاحب کب آ رہے ہیں۔“

”سنڈے کو۔“

”اچھا۔ بیٹھو تم۔“

”آپ تیار ہو جائیں۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوں۔“

”وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ اور ٹینے تیار ہونے لگی۔“

”ٹینے جوں جوں لوگوں سے مل رہی تھی۔ اپنی تعریفیں سن رہی تھی۔ اس میں خود نمائی کا احساس کچھ زیادہ ہی بیدار ہوتا جا رہا تھا۔ آج تیار ہوتے ہوئے

بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ تیار ہو کر قد آدم آٹینے پر آپ کو ہر رخ سے دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ آج کی مغل پر وہ چھا جائے گی اور یقیناً اس کے مقابلہ کی کوئی

عورت پوری مغل میں نہ ہوگی۔ کھلا گھیر دار ڈریس اس کی کمر پر اگر اتنا تنگ

ہو گیا تھا۔ کہ پتے کی سی کمر کی خوبصورتی نمایاں ہو گئی۔ اس کے پیار دلانے ڈھلانی

کنڈھوں پر لباس کی صرف مہین ڈوریاں تھیں۔ جو بڑی خوبصورتی سے بندھی تھیں

اس کے سینے کی تشرپوشی لباس کی خوبصورت فرز کر رہی تھیں۔ پشت آدمی

سے زیادہ تنگی تھی، جو صرف جذبات انگیز نہیں، بیانی خیر بھی تھی۔ اس نے

کہنیوں پر مہین گلوڑ پہنے تھے۔ ایک بازو پر خوبصورت سا بازو بند تھا۔ ایک

آپ اور بالوں کا شائل اچھوتا تھا۔

”وہ تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ تو ٹینے اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔“

”کیوں۔“ ٹینے شان سے مسکرائی۔

”آپ تو واقعی قیامت ہیں۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ وہ ہنس کر بولی۔“

”لوگ کہتے ہیں؟“ ٹینے نے حیرانگی سے پوچھا۔

”جانے دیں بھابی۔ جیسے آپ جانتی ہی نہیں۔“

”بچی کچھ نہیں جانتی۔“



ہیں لوگ آپ۔ ایک خدا نے صورت ہی ایسی دی کہ نظروں میں اتر جائے اس پر ایسے ایسے لباس اور پیر آپ کی خوش گفتاری۔ بھلے بھلے دل ہا بیٹھے ہیں۔ وہ شوخی سے بولی۔

ان بھلے بھلوں کے نام میں بھی تو سنوں۔ شائے نے ہنس کر کہا۔  
کوئی ایک دو تھوڑے ہیں۔ وہ بھی ہنس کر بولی۔  
دس بیس ہیں۔

زیادہ ہی۔

بس اب بناؤ نہیں۔

پتہ کتنی ہوں بھابی۔

ٹینے ہنس کر شائے کو دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ایک بات بتاؤں بھابی۔  
ہوں۔

کچھ عورتیں آپ سے بہت جلتے لگی ہیں۔  
مثلاً۔

آپ کی دوست ہی ہیں۔

کون۔

منصور جلیلی۔ منیر جاوید خان۔ منیر عرفی۔ نادرہ اور۔ اور۔

بس بس ٹینے۔ یہ سب میری بہترین دوست ہیں۔

خدا قسم بہت باتیں بناتی ہیں۔ وہ تو آپ سے خائف ہیں۔ سب کا یہی خیال ہے کہ دوستی ترک کر دیں۔

کیوں۔

انہیں ڈر ہے۔ کہ کہیں ان کے میاں صاحبان آپ پوری پوری جان

فریفتہ نہ ہو جائیں۔

ہائے اللہ۔ کیسی باتیں کرتی ہو ٹینے۔

دونوں ہنسنے لگیں۔ ٹینے۔

دونوں ہنسنے لگیں۔ ٹینے نے اپنے کانوں میں ہونٹیاں شائے کو بتائیں۔ تو وہ حیران رہ گئی۔

منصور اور منیر منصور میں تو کئی دفعہ زبردست قسم کی لڑائیاں بھی ہو چکی ہیں۔  
وہ بولی۔ یہی حال منیر جاوید کا بھی ہے۔

حد ہو گئی۔ شائے نے کہا۔ لیکن عورت تھی نا۔ دل ہی دل میں ان باتوں سے لطف لینے لگی۔ بظاہر اس نے ٹینے کے سامنے ان باتوں کی صحت سے انکار کیا۔ لیکن اپنے حزن کے حدود اربعے سے واقف تھی۔ یہ باتیں غلط نہیں ہو سکتی تھیں۔  
زور سے اس کی گردن تن سی گئی۔ یہ بات ہے تو ان عورتوں کی تنگ دلی کی دلیل ہے۔

بالکل اعتماد نہیں انہیں اپنے خاندانوں پر۔ ورنہ ایسی باتیں سوچیں ہی کیونکر۔  
آپ کبھی منیر چوہدری سے نہیں سب باتیں۔

تو گویا یہ سب کچھ اوپن سیکرٹ ہے۔ شائے ہنسی

بالکل بالکل۔

ہائے اللہ کتنی بڑی بات ہے۔

بہت جلتی ہیں آپ سے۔

اور دوستی کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔

ٹوٹ جائے گا کسی دن۔ آپ نے شاید محسوس نہیں کیا۔ کہ اب آپ کے

ہاں منصور جلیلی اور جاوید غفر بیویوں کے کبھی نہیں آئے۔

ہاں۔ پہلے آجایا کرتے تھے۔  
 مل گیا نابوت۔  
 یقین نہیں آتا۔ کہ لوگ اتنی لپست ذہنیت بھی رکھتے ہیں۔ بظاہر کتنی اچھی

دوست ہیں میری۔  
 ٹینے چپ ہو گئی۔ اور پھر شاید اسے احساس ہوا۔ کہ یہ سب باتیں شانے کو  
 نہیں بتانا چاہئے تھیں۔ کچھ پریشان ہو کر بولی۔ شانے بھابی۔ شاید مجھے یہ سب  
 باتیں آپ کو نہیں بتانا چاہئے تھیں۔ ان لوگوں کو تپہ چل گیا تو میری جان کو انہیں گی  
 فکر نہ کریں۔ ان کو تپہ نہیں چلے گا۔ شانے شانے استغناء سے مسکرائی۔  
 کچھ دیر دونوں لوگوں کی ذہنیت کی باتیں کرتی رہیں۔

مانی ابھی تک نہیں آئے۔ شانے نے کہا۔ جانے انہیں یاد بھی ہے کہ نہیں  
 کہاں گئے ہیں۔ ٹینے نے پوچھا۔  
 چکروں سی میں ہیں اب جکل۔ کئی دنوں سے یہی حال ہے صبح جاتے ہیں اور  
 رات گئے واپس آتے ہیں۔  
 کیوں۔

فیکٹری کے چکر۔ کچھ کوٹھی خریدنے کی دوڑ دھوپ۔ ان دنوں زرعی زمین  
 بیچ رہے ہیں۔ کچھ یوں دفتروں اور گاؤں کے دورے ہی ہو رہے ہیں۔

شانے ٹینے کو عثمان کی پلاننگ۔ نگ۔ دو دو اور دو دو دھوپ کے متعلق بتانے  
 لگی۔

بزار کر دیا ہے مانی نے۔ یقین مانیں دس بارہ دن سے میں نے مانی کی  
 شکل دن کی روشنی میں نہیں دیکھی۔ شانے نے کہا تو ٹینے شوخی سے ہنس پڑی۔  
 اور بولی۔ چلے رات کے اندھیرے میں تو وہ پاس ہوتے ہیں نا۔ زبیری کو  
 لے مائے کر کے ٹینے چلی گئی۔ شانے بے تابی سے ٹپٹے ہوئے عثمان کا  
 لہنے لگی۔ جوں جوں دیر ہو رہی تھی۔ اس کے اعصاب پر جھنجھلاہٹ  
 رہی تھی۔ ہر دو منٹ بعد وہ گھڑی پر نگاہ ڈال رہی تھی۔ ساڑھے آٹھ  
 بج گاضی کی آواز آئی۔ اس نے گھڑی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔  
 ان آگئے تھے۔ گاڑی کا برا حال تھا۔ کیچڑ اور دھول مٹی میں لت پت تھے۔

- یوٹ اٹھاؤ اور چلے آؤ۔ میرے کپڑے بھی نکالو۔ ہاؤں گا۔  
شوار قمیض۔ نکالنا۔

- اچھا صاحب۔۔۔ وہ چلا گیا۔ تو شانہ میز پر بیٹھے ہوئے بولی۔ ہائیں۔  
کپڑے میں نے نکالے ہوئے ہیں۔ شوار قمیض پہن کر جاؤں گے۔ دعوت میں؟  
- شانہ میں نہیں جاسکتا۔ بہت ٹھک گیا ہوں۔ وہ اکتا تے ہوئے لمبے میں  
بولے۔ تم چل جاؤ۔

شانہ نے عثمان کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا۔ مکان کے آثار ان کے  
چہرے پر بڑے واضح تھے۔ بال بکھرے ہوئے۔ کپڑے مٹی سے لگے ہوئے۔  
تھے۔ انہوں نے پھر سروے کی پشت پر لگا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے سارا  
وجود ڈھیلا چھوڑ دیا۔

نعمت خان نے چپل لاکر رکھ دیئے۔ کپڑے غسل خانے میں رکھنے کی بھی  
اطلاع دی تو عثمان بے دلی سے اٹھے۔ شانہ یعنی اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔ خدا قسم ہٹنے  
کو بھی جی نہیں چاہ رہا۔ تم چل جاؤ۔ میری طرف سے معذرت کر دینا۔  
عثمان چلے گئے۔ شانہ شش در پنج کے عالم میں کئی لمحے کھڑی رہی۔ ڈنر کی  
کشش کینچ رہی تھی۔ آج تو اس کے ذہن میں منظر منصور اور منیر جادید کو خوب  
بلانے شانے کا منصوبہ تھا۔

لیکن

عثمان کا خیال بھی تھا۔ دنوں سے وہ مارے مارے پھر رہے تھے۔ مکان سے  
چورندہ حال اور اکتا تے ہوئے لگ رہے تھے۔ ایسی صورت میں انہیں چھوڑ  
الیکے چھوڑ کر خود دعوت میں شرکت کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔  
- فضل دین۔ عثمان ہنا کر شاید باورچی خانے کی طرف گئے تھے۔ فضل دین

وہ اس وقت یقیناً گاؤں سے آ رہے تھے۔  
نعمت خان نے برعین کیس ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور وہ سخت نڈھالا  
اور تھکے تھکے قدموں سے چلتے اندر آ گئے۔

شانہ کو ان پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ دیکھتے ہی تلخ لمبے میں بولی۔ آگئے  
جناب۔ یاد نہیں تھا۔ کہ منیر شیرازی کے ہاں آج ڈنر ہے۔ چلے جلدی  
سے تیار ہو جائیں۔ آدھ گھنٹہ پہلے ہی لیٹ ہیں۔

عثمان سخت تھکے ہوئے تھے۔ ذہنی اور جسمانی طور پر مکان محسوس کر رہے تھے۔  
شانہ کی باتوں سے انہیں آج پہلی بار کچھ دکھ ہوا۔ بڑی مجروح اور دکھی نظروں  
سے اسے دیکھا۔ اور پھر صوف پر بیٹھے ہوئے ٹانگیں میز پر پھیلا دیں۔  
"چلنا نہیں۔" شانہ ان کے سامنے آگئی۔

انہوں نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے گردن صوفے کی پشت پر ڈال دی۔  
- کیوں مانی۔۔۔ وہ قدرے نرمی سے بولی۔ منیر شیرازی کے ہاں ڈنر  
ہے آج بھول گئے تھے۔

- اپنے آپ کی بھی ہوش نہیں۔ دعوت کیا یاد رہتی۔  
"بڑی زیادتی کر رہے ہیں آپ اپنے ساتھ۔ میں نہ کہتی تھی۔ دونوں کام  
اکٹھے کر کے جیال نہ ڈالیں۔ آپ مانتے کب ہیں۔ اتنے دنوں سے سرگرداں  
ہو رہے ہیں۔ حال کیا بنا رکھا ہے۔ گاؤں سے آ رہے ہیں نا۔"

- ہاں۔ سودا ہو گیا ہے۔  
- شکر ہے۔ اب تو کچھ سکون ملے گا۔

نفی میں سر ہلاتے ہوئے عثمان پاؤں صلیٹ کر نیچے رکھے جھک کر بوٹوں  
کے تسمے کھولے اور نعمت خان کو آواز دی۔

اندھے ڈبل روٹی دودھ اور دوپہر کے بچے ہوئے سالن سے دونوں نے رات کا کھایا۔ عثمان اسے اپنی جدوجہد کی پروا نہیں کرتے رہے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

کھانا کھاتے ہی فضل دین کو چائے بیڈروم میں لانے کا کہہ کر عثمان میز سے اٹھ گئے۔

شانہ کچھ دیر ادھر ادھر گھومتی پھرتی رہی۔ فضل دین نے چائے بنا لیا تو وہ چائے خود لے کر بیڈروم میں آگئی۔

عثمان بیڈ پر اڑے ترچھے پیٹے بے خبر سو رہے۔ شاید بستر پر پڑتے ہی نیند نے آلیا تھا۔

شانہ کو ان پر پھر غصہ آگیا۔ یوں سو ہی جانا تھا۔ تو پھر وہ کیوں رک گئی ان کے لیے۔ چلی ہی جاتی دعوت پر۔ اس نے غصے سے ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچا۔ چائے میز پر رکھ کر وہ کتنی ہی دیر تملاتی رہی۔

پھر وہ عثمان پر جھک گئی۔

”مائی چائے لے لو۔“ اس نے ان کے چہرے کے قریب منہ لے جاتے ہوئے کہا۔

وہ اُن ادا کر کے رہ گئے۔

شانہ نے پھر جگانا چاہا۔

لیکن وہ نیند میں ڈوب چکے تھے۔ شانہ ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ مکان۔

کوفت اور بیزاری کی ملی جلی کیفیت تھی ان کے چہرے پر۔ رنگ بھی

لٹا خراب ہو رہا تھا ان دنوں۔ پیشانی پر ہلکی سونہیں پڑ گئی تھیں۔ شانہ

ان کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ بے اختیار نہ جھکی۔ اپنے ہونٹ ان کی پیشانی پر رکھ دیے۔

کو پکارا تھا۔

”بھئی کچھ ہے کھانے کو۔ میں نے تو صبح کا ناشتہ ہی کیا ہوا ہے۔ فرصت ہی نہ مل سکی کھانا کھانے کی۔ دوپہر کا ہی کچھ ہے تو دے دو۔ ارے بھئی دودھ اور ڈبل روٹی ہی لاؤ سخت بھوک لگ رہی ہے۔“

فضل دین نے جائے کیا کہا۔

تو وہ بولے۔ ”نہیں نہیں لے آؤ جو کچھ ہے۔ کھانا تو نہیں بنایا سو گا ہمارا۔“

لیکن میں نہیں جا رہا دعوت پر۔ اندھے فرانی کر دو۔ دودھ ڈبل روٹی کچھ دے بھی دو اب۔ چائے بھی پوئیں گا۔“

شانہ نے یہ باتیں سنیں تو آہستہ آہستہ گیلے کی طرف آگئی۔ مندرشیرازی سے دعوت میں شریک نہ ہو سکتے پر اس نے فون پر مہذرت کر لی۔

مندرشیرازی نے ہنس کر کہا۔ ”منہ عثمان آپ نے مجھے ادھر میرے بہت سے مہانوں کو بلایا ہے۔“

شانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس بات نے اسے پھر ایک بار شش و پنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ لیکن اس نے جلدی سے فون رکھ دیا اور کھانے کے کمرے میں آگئی۔

جہاں عثمان فضل دین کے کھانا لانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

عثمان نے شانہ کو خاموش دیکھ کر کہا۔ ”گئی نہیں تم۔ چلی جاؤ کیا ہرج ہے۔“

شانہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اور سست لہجے میں بولی۔ ”آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔“

عثمان کے دل میں شانہ کا احترام محبت اور پیاری سی جیسے بڑھ گیا۔

”شکریہ۔“ انہوں نے جذبات سے منسوب آواز میں کہا۔

سب کو یہ جگہ بہت ہی پسند آئی۔ شائد بھی خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اسے  
 تو یہ جگہ خوابوں کی دنیا کی طرح لگ رہی تھی۔  
 - خدا مبارک کرے - ماما نے گھوم پھر کر کوٹھی دیکھتے ہوئے کہا۔  
 - مرمت طلب ہے۔ ویسے جگہ بے حد شاندار ہے۔ ڈیڈی بولے۔  
 - مجھے تو سوئیگ پول سب سے زیادہ اچھا لگا۔ ظریف بولی۔ - مذی  
 کاٹ کر پانی اس میں ڈالا گیا ہے۔  
 - اب تو سوئیگ بھی سیکھنا پڑے گی۔ شائد اتر کر بولی۔  
 - کہیں ابھی سے پرکٹیں شروع نہیں کر دینا۔ عثمان نے شوخ سی سرگوشی کی۔  
 جو ماما نے بھی سن لی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ اس کا کچھ پتہ بھی نہیں۔ احتیاط  
 کرنے کی اسے بالکل عادت نہیں۔  
 - ڈرائیونگ سیکھنے کا جنون ہو رہا ہے ان دنوں۔ عثمان بولے۔ حالانکہ  
 ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق انہیں مکمل ریسٹ لینا چاہیئے۔  
 - کچھ نہیں ہوتا۔ شائد نے کندھے اچکائے۔  
 - اللہ نہ کرے۔ ماما جلدی سے بولیں اور پھر پیار سے کہنے لگیں۔ شائد  
 بیٹی۔ لاہر دواہی کی وجہ سے ہی پچھلے ماہ بیمار پڑ گئی تھیں نا۔ خدا نے اپنا فضل  
 کیا۔  
 - چھوڑیں ماما۔ آئیے ادھر والے کمرے دیکھئے۔  
 سب سنبھال کر طرف جانے لگے۔ ایسی جی تو اد بچائی سے گود گئے۔  
 ظریف نے بھی چھلانگ لگانے کی مشق کی۔  
 عثمان شائد کا ہاتھ تھامے اسے سہارا دے کر نیچے لائے۔ بیڑھیاں ٹوٹ  
 پھوٹ چکی تھیں۔ اور جگہ جگہ پھسلن سی ہو رہی تھی۔ رات سردیوں کی پہلی بارش

تین ماہ کے اندر ہی کوٹھی غریب لی گئی۔  
 رجسٹری ہو گئی۔

عثمان شائد کو کوٹھی دکھانے لے گئے۔ ماما ڈیڈی ظریف اور بچے بھی ساتھ  
 گئے۔ کوٹھی کافی پرانی تھی۔ اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے خاصی خستہ حالت  
 میں تھی۔ نجیب اللہ خان کبھی کبھار یہاں آتے تھے۔ نوکروں کے جم و کرم پر  
 ہی تھی عمارت۔ ویسے آرتا بتاتے تھے کہ جگہ واقعی کسی زمانے میں بہت شاندار  
 ہوگی۔ کوٹھی اونچے نیچے ٹیلوں پر بنی ہوئی تھی۔ اس طرح اس عمارت کے کئی حصے  
 گتے تھے۔ لان کہیں اور بچائی نہ پڑتے۔ کہیں ترائی میں اور کہیں ڈھلانوں کی اوٹ  
 میں۔ چمنوں کی شکل بھی مسخ ہو چکی تھی۔ خود رو جھاڑیاں جگہ جگہ اگی ہوئی تھیں۔  
 بلیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ  
 نایاب قسم کے پودے تھے۔ اور درختوں کا تو شمار ہی نہ تھا۔ حدیوں پرانے  
 گنے اور کچے اور سایہ دار درختوں سے کوٹھی گھری ہوئی تھی۔

ہوئی تھی۔ موسم خوب ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

ایک ہی لائن میں تقریباً چار کمرے تھے۔ شاید یہ مہان خانہ تھا۔ کمروں کے سامنے چوڑا محرابی دروازہ والا برآمدہ تھا۔ چھت منقش تھی۔ اور ستونوں پر بھی بل بوتے بنے ہوئے تھے۔

بہت خوبصورت۔

بہت اچھی۔

بہت عمدہ۔

سب کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔

اما ڈیڈی تو شانہ کی قیمت پر پھولے نہ سارٹے تھے۔ اتنا یاد آیا نصیب تھا اس کا۔ کوٹھی کے بعد عثمان سب کو فیکٹری لے گئے۔

یہاں کام زور و شور سے جاری تھا۔ عثمان کے فیچر اسلم ربانی وہاں موجود تھے۔ انجینئر آرکیٹک ٹیکے دار بھی دیکھتے ہی اکٹھے ہو گئے۔ سب کا تدارن ہوا۔ بگم عثمان ان کے لیے سب سے زیادہ قابل احترام تھیں۔

آپ انہیں فیکٹری دکھائیے۔ عثمان نے اسلم ربانی سے کہا۔ میں تھوڑا سا کام کروں۔

آئیے۔ اسلم ربانی نے مؤدبانہ کہا۔ عثمان انجینئر اور آرکیٹک کے ساتھ دفتر کی طرف چل دیئے۔

سب اس کے ساتھ چلے گئے۔ اسلم ربانی سب کو ایک ایک شعبہ ایک ایک بلاک دکھا کر تفصیل سے سمجھا رہا۔

کب تک مکمل ہوگی۔ ڈیڈی نے پوچھا۔

ابھی تو کافی کام باقی ہے جی۔ وہ بولا۔

میشنری تو اچھی ہے نا۔

جی تو چکی ہے۔ لیکن۔ لیکن اس کے لیے ایک بار پھر عثمان صاحب کو جاپان جانا پڑے گا۔

کیوں۔ شانہ چونک کر بولی۔

اس کی فنگ کے لیے انٹرکشن جوہیں۔ وہ پوری طرح سمجھ نہیں آ رہیں۔

اڈو صاحب بھی ساتھ جائیں گے۔ اس نے انجینئر کا نام لیا۔

پھر عثمان کو جانے کی کیا ضرورت ہے۔ شانہ بولی۔

بیٹے۔ ڈیڈی نے شانہ سے کہا۔ کچھ ضرورت ہوگی ہی نا۔

شانہ چپ ہو گئی۔

ساری فیکٹری سب نے گھوم پھر کر دیکھی۔ ڈیڈی ساتھ ساتھ اسلم ربانی سے تبادلہ خیال بھی کرتے رہے۔ انہیں خوشی ہو رہی تھی۔ کئی فیکٹری چالو ہو گئی تو بہت ہی منفعت بخش ہوگی۔

دو تین گھنٹے کے بعد سب ماما کے گھر ہی آ گئے۔

ظریف اچھی سی چلنے لگاؤ۔ شانہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ کافی ٹھک گئی تھی۔ ظریف چلی گئی۔ ڈیڈی عثمان اور ماما بھی بیٹھ گئے۔

شانہ بیٹی۔ کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤ۔ تھک گئی ہو تم۔ ماما نے کہا۔

ہاں۔ تھوڑی دیر ریٹ لے لو۔ پھر جانا بھی ہے۔ عثمان بولے۔

آج یہیں رہ جاؤ۔ ماما نے کہا۔

بڑے کام ہیں ماما۔ عثمان بولے۔

ان کے کام ختم ہو گئے۔ شانہ نے جل کر کہا۔ دن بدن

چلتے ہی چلے جائیں گے۔

کے متعلق پوچھنے لگے۔

پانچ بجے کے قریب عثمان نے جانے کی اجازت چاہی۔ شائندہ کا جی چاہ رہا تھا۔ کرات یہیں رہ جائیں۔ لیکن رات عثمان اپنے انجینئر اور آرکیٹک کو گھر آنے کا کہہ آئے تھے۔ اس لیے رک نہ سکے۔

”اب تو رند ہی ادھر آنا ہوگا۔ شائندہ چاہے گی تو میرے ساتھ آجایا کرے گی۔“ عثمان نے سب سے کہا۔ ”آپ لوگ بھی کچھ دنوں کے لیے آئیں نا ہمارے ہاں۔“

”ہاں ماما۔“ ظریفہ اور ایپی جی کو چھٹی ہے جمعہ کو جمعرات آجائیے گا۔“

”دیکھیں گے۔“

”نہیں جی۔ ضرور آئیں۔ ظریفہ۔ سن لو۔ تم لوگ نہ آئے تو پھر ہم بھی نہیں آیا کریں گے۔“

”ضرور آئیں گے شائندہ باجی۔“ ظریفہ نے اس کے گلے میں ڈال دیں۔

”تجھے تو پورا مہفتہ میں رکھوں گی اپنے پاس۔“

”اور میرے کالج کا کیا بنے گا۔“

”دیکھا جائے گا۔“

سب ہنس پڑے۔

عثمان اور شائندہ سب سے مل کر سناڑھے پانچ بجے کے قریب وہاں سے نکلے۔ پسند آئی کوٹھی۔ عثمان نے گاڑی چلاتے ہوئے شائندہ سے پوچھا۔

”بہت اچھی ہے۔ شائندہ نے خوش ہو کر کہا۔“ سچو الیشن تو لاجواب ہے۔“

”ابھی کیا ہے۔ جب بنے گی پھر دیکھنا۔“ سچو الیشن کا بھی تب ہی تپ چلے گا۔

میچ طور سے۔“

عثمان اس کی بات کی تکلیفی درگزر کرتے ہوئے مسکرائے۔ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ڈیڑھی بولے۔ ”کام نہیں کریں گے۔ تو اتنے بڑے پروجیکٹ کو مکمل کیے کریں گے۔“

”اس کو تو خدا واسطے کا بیرو گیا ہے۔“ عثمان نہیں کر بولے۔“

”بیرکونہ بکرو نہ ہو۔ شائندہ چمک کر بولی۔“ ”دن کی ہوش ہے جناب کو نہ رات کی۔ بس انہیں پھر رول میں پڑے ہیں۔“

”تو اور کیا کروں۔“

”اب کو کتنی خریدی ہے۔ تو اس سلسلے میں سرگرداں ہو جائیں گے۔“

”نظام ہے۔ ان کنڈرروں میں تو نہیں رہ سکتے۔ اس کی تعمیر تو نئے سرے سے ہوگی۔“

”تھوڑی بہت مرمت کروالیں ابھی۔“

عثمان نہیں دیئے۔ ماما تو چائے کے لوازمات کے لیے اٹھ گئیں۔ ڈیڑھ بجے اخبار اٹھالیا۔ میاں بیوی کی باتوں میں غل ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ ویسے وہ شائندہ کی زیادتی سے الجھ بھی رہے تھے۔ اس کا لہجہ بڑا تلخ تھا۔ اور اسے عثمان سے اس لیے میں کم از کم ان کے سامنے باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔

چائے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ ماما کے عزیزوں میں سے زریں خان ظریفہ کے رشتے کے متنی تھے۔ لیکن ان کے گھر کے حالات اس قسم کے تھے۔ کہ وہ اپنی خواہش کی تکمیل کرنے سے قاصر تھے۔ کچھلے ہتھ دہ آئے تھے۔ اور ساری باتیں ماما کے گوش گزار کر کے انتظار کرنے کا کہہ گئے تھے۔

ماما اس رشتے کے متعلق عثمان اور شائندہ کو بتانے لگیں۔ عثمان زریں خان

”میرے خیال میں تو ابھی تھوڑی بہت مرمت کروالیں۔“

”اول ہوں۔“

”کیا پوری کی پوری بنوائیں گے۔“

”ہاں۔ تقریباً تقریباً۔ کچھ جسے تو گرا دینے پڑیں گے۔ کچھ نئے تعمیر ہوں گے کچھ رد و بدل سے ٹھیک کرنا ہوں گے۔ ظفر اور داؤد کو آج رات میں نے اسی لیے گھر پر بلایا ہے۔ سارا نقشہ بدلا جائے گا۔ وہ اپنے ذہن میں آئی ہوئی تجویز شائے کو بتانے لگے۔“

شائے بنبر اسی نظر آنے لگی۔ وہ چپ ہوئے تو بولی۔ آپ کو شاید چہن لینے کی عادت ہی نہیں۔“

عثمان کھلکھلا کر سنہں دیئے۔ شائے کی کمر میں بازو ڈال کر قریب گھسیٹ لیا۔ سرگوشی کے انداز میں اس پر جھکتے ہوئے بولے۔ ”پہلے تمہاری وجہ سے نہ تھی۔ اب تمہارے آنے والے بے بی کی وجہ سے۔“

”ہائے اللہ۔ شائے مسکرا دی۔“

”میری دلی خواہش ہے کہ ہمارا بے بی نئے گھر میں آئے۔“

شائے نے اک نکاحہ غلا انداز ان پر ڈالی۔

”سچ شائے پہلے تو یہی لگن تھی کہ نہیں جلد سے جلد اپنے نئے گھر میں لے آؤں۔“

اب یہ خواہش اور بھی شدید ہو گئی ہے۔ اپنے بچے کے لیے میں بہت خوبصورت کمرہ بنواؤں گا۔ خدا کرے اس کی آمد سے پہلے میرے سارے منصوبے تکمیل کو پہنچ جائیں ہوں۔“

شائے چپکے چپکے مسکراتی رہی۔

عثمان آلے والے بچے کی باتیں کرنے لگے۔ بہت خوش تھے وہ۔ کتنی چاہت

اور محبت سے ذکر کر رہے تھے آنے والے بے بی کا۔ شائے خوش ہوتی رہی۔

رات داؤد اور ظفر نے کھانا عثمان اور شائے کے ساتھ ہی کھایا۔

شائے تو تھوڑی دیر ان کے ساتھ بیٹھ کر اٹھ گئی۔ عثمان کا پی دیوٹیک ان سے صلاح و مشورے کرتے رہے۔ کوٹھی کا نقشہ وہ لے آئے تھے۔ جہاں جہاں تبدیلیاں کرنا تھیں وہ ظفر کو سمجھاتے رہے۔ جو جسے نئے تعمیر کر دانا چاہتے تھے۔ وہ بھی بتائے۔ خوب غور کھانی کرتے رہے۔

گیارہ بجے کے قریب وہ دونوں اجازت لے کر اٹھے۔ تو عثمان نے ظفر سے کہا۔ آپ کل سے اپنی ساری توجہ اسی طرف مبذول کر دیں۔ میں بہت جلد عمارت شروع کر دانا چاہتا ہوں۔“

”ضرور ضرور۔“

”میں بھی آپ کی مدد کروں گا۔ دو ایک دن میں آرٹ لائن بنا کر دوں گا آپ کو۔“

”شکریہ۔ میں آپ کا مدعا سمجھ گیا ہوں۔ بے فکر رہیں ہر کام آپ کی منشا کے مطابق ہو گا۔“

”داؤد آپ بھی ذرا تیز ہو جائیں۔ عثمان نے داؤد سے کہا۔ تو وہ سر ہلاتے ہوئے مسکراتے لگا۔“

دونوں کو گاڑی میں بیٹھنے تک عثمان جلدی جلدی کام کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ دونوں نے انہیں اپنی بہترین کوششوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا تعین دلایا۔

عثمان لگناتے ہوئے اندر آئے۔ آج وہ ٹھنڈے تھے۔ شائے سے آج جی بھر کے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ اپنے منصوبے بتانا چاہتے تھے۔ آئندہ پروگرام بتانا چاہتے تھے۔



مجھے پوری طرح احساس ہے۔ لیکن اکیلے بور ہونے کی کیا ضرورت ہے۔  
کتنے بننے والے ہیں۔ دوست ہیں۔ بہائے ہیں۔ کبھی تم چلی جایا کرو۔ کبھی  
انہیں بلالیا کرو۔ وقت گزر جایا کرے۔ اور ایسا تم کبھی رہی ہو۔  
آپ نے گھر بیٹھنے کی قسم کھا رکھی ہے؟

مردوں کا کام گھر بیٹھنا نہیں ہوتا۔ کوٹھی تو خیر۔ کیا ٹیکسٹری بھی میں گھر  
بیٹھ کے چلاؤں گا۔ گزربیر کے لیے کام تو کرنا پڑتا ہے نامحترمہ۔ اب میں  
واہزادہ عثمان تو ہوں نہیں۔ جو کام کاج کے بغیر ہی عیش و عشرت کی زندگی گزار  
سکوں۔ عام سا آدمی ہوں۔ جس کی ایک عدد بیوی ہے۔ اور چند ماہ میں بیٹا  
جی بھی تشریف لانے والے ہیں۔

”بیٹا جی۔۔۔ شائے ہنس پڑی۔“ بیٹی کا تو نام ہی نہیں لیتے۔  
”پہلا بیٹا ہو گا۔ دوسری بیٹی قیر لہیڈا۔ چوتھی۔“

اور شائے جھنجھلاٹھ اور غصے کے باوجود ہنس پڑتی۔ عثمان بھی ہنس دیتے۔  
نفس میں آئی ہوئی شائے بیویوں غصہ بھول بھول جاتی۔

دن گزر رہے تھے۔ کام کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ عثمان دونوں جگہ نگرانی  
خود کر رہے تھے۔ گھر تو وہ شاید رات گزارنے کو آتے تھے۔ شائے کی جلی کٹی  
میں سننا پڑتی تھیں۔ انہیں اس کے جذبات کا احساس بھی تھا۔ لیکن مجبور تھے  
موشی سے سن لیتے۔ کبھی پیار سے سمجھا لیتے۔ لیکن کام کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔  
مردیات بڑیادہ ہو رہی تھیں۔ شائے کا مزاج بھی تند و تیز ہوتا جا رہا تھا۔

اس دن شائے نے بدتمیزی کی حد تک زیادتی کی۔ کوئی اور ہوتا تو عثمان  
لااتنہ باتیں سن سکتے تھے۔ غصہ تو کیا۔ لیکن دبا گئے۔ ہاں شائے سے خفا ضرور  
گئے۔

لیکن جب وہ بیدار دم میں آئے تو شائے سو رہی تھی۔  
عثمان نے لباس تبدیل کیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ بالوں میں برش کیا اور کچھ دیر  
میں بیٹھ کر اخبار دیکھتے رہے۔ ان دنوں انہیں گرد و پیش سے کٹ جانے کا  
احساس بھی تو تھا۔  
دوسری صبح وہ ناشتہ کرتے ہی کام پر چلے گئے۔ شائے جیڑبہ ہو کر رہ گئی۔  
کچھ دیر بعد بھی ان دنوں طبیعت اچھی رہتی تھی۔ رہ رہ کر الجھاؤ کی زد میں عثمان ہی  
آتے تھے۔

ناشتے کے بعد جانا اور رات آٹھ ساڑھے آٹھ والپس آنا اب عثمان کا معمول  
ہی بن گیا تھا۔ شائے سارا دن بور ہو جاتی رہتی۔ عثمان پر غصہ آتا رہتا۔ کبھی تو ان پر  
برس کر غصہ نکال لیتی۔ کبھی غصہ چلی جاتی اور عثمان پر ترس کھانے لگتی۔  
عثمان نے اس کی باتوں کا کبھی برا نہیں مانا تھا۔ محبوب کی ہر ادا انہیں پیاری  
تھی۔ بعض اوقات تو غصے میں وہ انہیں اتنی پیاری لگتی۔ کہ بے اختیار ہر کر اسے  
پٹا لیتے اتنے پیار کرتے کہ وہ غصہ بھول جاتی۔ ہنسنا پڑتا اور قہقہے لگاتے لگاتے  
اس کا دم پھولنے لگتا۔

”کچھ ماہ اور کلیف کے ہیں میری جان۔ کاشنا پڑیں گے۔ پھر۔ پھر سب  
کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ کہتے۔ سارے حجاب چکا دوں گا۔ سارے قرضے  
بے باک کر دوں گا۔ سمجھیں۔ اتنا پیار دوں گا کہ تنگ آجاؤ گی۔  
مجھے نہیں اچھی لگتی آپ کی باتیں۔  
کیوں۔“

آپ مجھے بھولتے جا رہے ہیں۔ کبھی سوچا ہے۔ کہ سارا دن اکیلے میں کونکر  
گزارتی ہوں۔“

شانہ بھی روٹھ گئی۔

دو تین دن گزر گئے۔ شانہ نے انہیں بلایا نہ عثمان نے منانے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے ذہن پر بار پلے ہی بہت تھا اس بات نے خاصہ تاثر کیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ نیکٹری میں انجنیئر سے لے کر مزدور تک پر برس رہے تھے۔ اور کوشی میں فیبر سے لے کر نوکروں تک ان کے غصے کا نشانہ بن رہے تھے۔ انہیں دنوں ماما آگئیں۔

گھر کی فضا اور موڈ کی خرابی انہوں نے فوراً بھانپ لی۔ عثمان سے تو کچھ نہیں کہا۔ شانہ کو خوب ڈانٹا۔ پھر پیار سے سمجھایا۔ اوپر نیچے سے آگاہ کیا۔ شانہ رو نہ گئی۔ تو ماما نے نرمی سے سمجھایا۔ آخر یہ سب کچھ وہ کس لیے کر رہے ہیں۔ شانہ بھاری سے کام لو۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے دل سے ہی اتر جاؤ۔ انہیں تو محبت اور ہمدردی کی تم سے زیادہ ضرورت ہے۔ کبھی سوچا ہے تم نے۔ تمہاری خاطر وہ ماں باپ گھر بار خاندان اور اپنے عزیز اقارب کو چھوڑ چکے ہیں۔ احساس ہوا ہے کبھی کنخون کے رشتوں کی ضرورت انہیں بھی محسوس ہوتی ہوگی۔ اپنے گھر باساں باپ کے لیے ان کا دل بھی تڑپتا ہوگا۔ لیکن میرے خیال میں انہوں نے تمہیں کبھی بتلایا بھی نہ ہوگا۔ تمہاری دلیوٹی اور ناز برداریوں ہی میں گئے رہتے ہیں۔ تم تو ان کا احسان عمر بھر نہیں اتار سکیں۔ اس طرح کے رویے سے سولے انہیں دکھ دینے کے تم اور کیا کر رہی ہو۔ کتنی محنت کرتے ہیں وہ۔ دن دیکھ رہے ہیں نہ رات۔ آرام لیتے ہیں دچپن۔ صحت تک کا خیال نہیں۔ اور یہ سب کچھ وہ صرف تمہارا دوتا بڑھانے کے لیے کر رہے ہیں۔ تمہیں اپنے خاندان والوں کی نظروں میں ادنیٰ کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ انہیں احساس دلانے کے لیے کر رہے ہیں۔ کہ تم سے شادی کر کے وہ پشیمان نہیں۔ بے طرح خوش طمس اور

پر سکون ہیں۔

ماما متا بھر ہی شفقت سے شانہ کو سمجھاتی رہیں۔ احساس دلاتی رہیں۔ ڈرایا بھی۔ اور کئی مثالیں بھی دیں۔

شانہ کانپ کانپ گئی۔ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ اور آئندہ عثمان کا ہر طرح کا خیال رکھنے کا مستحکم ارادہ بھی کر لیا۔

اس رات اس نے عثمان کو منانے میں پہل کی۔ عثمان بھی جانے کیسے طبیعت پر تین دن سے جبر کیے بیٹھے تھے۔ فوراً ہی من گئے۔ تین دن تو دونوں کو تین مہینوں سے بھی زیادہ طویل لگے تھے۔ اپنی پہلی اتنی لمبی ناراضگی کے تاثرات دونوں ایک دوسرے کو سناتے ہوئے ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے۔

ماما کی باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔

شاید

یہ اسی اثر کا نتیجہ تھا۔ جو عثمان جاپان گئے اور شانہ نے انہیں ہنسی خوشی جاننے کا اجازت دے دی تھی۔ اور عثمان نے اس خوشی میں شانہ کے لیے وہاں سے نئی گاڑی بھی بک کر دادی۔

ظریفہ اس وقت اس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ لوگوں کے اس تبصرے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ رات مندرشیرازی کے ہاں ڈرتھا۔ ظریفہ بھی گئی تھی۔ بے تکلف دوستوں کا اجتماع تھا۔ ظریفہ پہلی بار اس مغل میں شریک ہوئی تھی۔ یہ مندر بھی شانہ کی تھی۔

لیکن کچھ باتیں اسے ابھی بھی نہیں گئی۔ اور اس وقت وہ شانہ سے ہی باتیں کر رہی تھی۔

”ہاں کل گنوار لگ کر ہی ہو۔ شانہ سنتے ہوئے کرسی پر بچھے ہو گئی۔ اس میں گنوار رہنے کی کیا بات ہے شانہ باجی۔ بے تکلفی اچھی چیز ہے۔ لیکن اس گئی کوئی حد بھی ہونی چاہیے۔ رات وہ کون تھا۔ آصف شاید مجھے تو اس کی باتیں بہت بُری لگیں۔“

”حالانکہ وہ سب کو منسا رہا تھا۔“

”ایسی چیپ چیپ باتیں کر کے۔“

”پتہ نہیں تجھے کیوں چیپ لگیں باتیں۔ شاید تو نہیں جانتی تاکہ ہم سب بہت بہت ہی بے تکلف دوست ہیں۔“

”اپنی اپنی طبیعت ہی ہے نا۔ مجھے تو سخت غصہ آ رہا تھا۔ جب وہ آپ کے بیٹ پر اتنی بے باکی سے تبصرہ کر رہا تھا۔“

”پاگل ہے تو تو۔“

”اور وہ جو گھٹا سا آدمی تھا۔ کالا بھینسا۔“

شانہ اس کے تبصرے پر ہنستے ہوئے دوسری ہو کر بولی۔ کون۔ کون۔ جانے کیا نام تھا اس کا۔ جس کی بیوی نے گرین ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ادھ اچھا۔ فیصیح کے متعلق کہہ رہی ہو۔“

بہار چھوٹ رہی تھی۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ پھول ہی پھول تھے۔ نفا مسکور کن حد تک خوشبوؤں کی مہک سے سرچھ ہوئی تھی۔ آسمان کی زنگھٹ نکھری ہوئی تھی۔ اوپر زمین پر جہنم آیا ہوا تھا۔

ظریفہ ان دنوں شانہ کے ہاں آئی ہوئی تھی۔ عثمان چند دنوں کے لیے کراچی گئے ہوئے تھے۔ دونوں بہنیں لان میں بیٹھی تھیں۔ شانہ نے بڑا خوبصورت ڈریس پہنا ہوا تھا۔ ان دنوں اس کی حالت بھی خوب تھی۔ اگلے ماہ بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ خوب موٹی ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ ان دنوں بغیر کسی میک اپ کے بھی چمکتا تھا۔ جسم بے ڈھب ہو چکا تھا۔ لیکن عورت تخلیق کے اس عظیم عمل میں بعض اوقات اتنی حین ہو جاتی ہے۔ کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

شانہ کو بھی جو دیکھتا اعتراف حسن کرتے ہوئے ضرور کہتا۔ دیکھنا تمہارے بیٹا ہوگا۔“

"ہو گا کوئی نام - ویسے ایسی بری بری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔"

"تجھے۔"

"ہاں۔"

"ہائے گنوارن۔"

"ہونہ۔"

"سچی - کسی کے سامنے نہ کرنا ایسی باتیں - سچ مجھ ہی لوگ سمجھیں گے کہ گنوار ہو - نصیر تو بہت اچھا آدمی ہے۔"

"آپ اسے اچھا کہتی ہیں؟"

"بالکل۔"

"آپ کو اچھے بُرے کی پہچان ہی کب ہے۔"

"تو تو اماں دادی ہے نا۔"

"آپ سے زیادہ ہی سوچ بوجھ رکھتی ہوں - آپ کو تو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔"

"کیا فرق پڑتا ہے - اپنی نیت اپنے - ہم تو چند گھنٹوں کے لیے ملتے ہیں"

"منہں کھیل لیتے ہیں۔"

"عثمان بجائی برا نہیں مناتے۔"

"کس بات کا۔"

"ان لوگوں کی واسطیات بے تکلفی کا - گندی نظروں کا۔"

"ظریفہ - تو تو بات کا تنگٹ بناٹے جا رہی ہے - ہم نے تو کبھی کوئی بات"

"محسوس ہی نہیں کی۔"

"آنکھیں کھلی رکھا کریں۔"

"شروع ہو گئی نصیحتیں۔"

"بری بات ہے کیا۔"

"سہر بات کا روشن پہلو دیکھنے کی عادت ڈالو۔"

"تاریک کو نظر انداز بھی نہیں کرنا چاہیئے۔"

"تو کیا کروں۔"

"شانہ ظریفہ کی تنکرا سے جیسے تنگ آگئی - ظریفہ چپ ہو گئی - وہ اس سے عمر میں دو اڑھائی سال چھوٹی تھی - لیکن معاملہ فہم اور دراندیش ضرور تھی - ذہین بھی تھی اور ہوشیار بھی۔"

"ظریفہ - ہم سب ملنے جلنے والے شادی شدہ لوگ ہیں - وقت گزاری کا"

"اس سے بہترین ذریعہ شاید ہی کوئی ہو - ہم ہر ہفتے کسی نہ کسی گھر کٹھتے ہوتے ہیں"

"خوب گپ شب رہتی ہے - کھانا اکٹھے کھاتے ہیں - یہ ہمارا معمول بن چکا ہے - اب تک تو کوئی حادثہ نہیں ہوا۔"

"شانہ نے منہں کرتے حادثہ - پر زور دیتے ہوئے ظریفہ کو دیکھا۔"

"میں اس بات کو برا تصور رہی کہہ رہی ہوں۔"

"سو سو نقص تو نکال رہی ہے۔"

"وہ فقائے تو ہیں - میں نے غلط بات نہیں کی۔"

"تو شاید عادی نہیں نا۔"

"ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔"

"چند دن اور رہنا یہاں - بے تکلف ہو جاؤ گی۔"

"نہیں جناب۔"

"کیوں۔"

"میں کل واپس جا رہی ہوں۔"

- خدا کے لئے بند ہی کر دو۔ یہ بحث۔ کوئی اور بات کرو۔ میں تو اس قسم کی باتوں سے پہلے ہی تنگ آئی ہوئی ہوں۔۔۔  
 ظریف نے استفساری نظروں سے اسے دیکھا۔ تو وہ ہنس کر برابر والے بنگلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ دادی اماں سے مل ہونا۔

- ہاں۔۔۔

- یہ جب بھی آئیں گی نامیرے پاس۔ نصیمتوں کے پلندے کھول دیں گی۔  
 - مری بات تو نہیں۔

- اچھی بھی نہیں۔ میں بھلا کبھی ہوں۔۔۔

- پھر بھی۔ وہ عمر گزار چکی ہیں۔ ان کے پلے زندگی کا پختہ تجربے ہیں۔  
 - پھر تو بھی جان کی شاگردی کرے۔  
 - شائے ہنس پڑی۔ ظریف بھی مسکرانے لگی۔

شائے بڑی دلچسپی سے دادی اماں کے پند و نصائح اسے سنانے لگی۔ ہنس  
 ہنس کر بڑے مسخرے اس نے قصے سنائے۔

- ایک دن کی بات بتاؤں تمہیں۔ ہمارے ہاں آگئیں۔ میرے پاس ڈرائنگ  
 روم میں منصور جلیلی اور نصیر آئے ہوئے تھے۔ بس اس کے جاتے ہی  
 وعظ شروع کر دیا جناب۔۔۔

- کیا کہا۔ ظریف نے پوچھا۔

- کہنے لگیں۔ بیٹی مردوں سے یوں اکیلے نہ ملا کرو۔ شیطان زندہ ہے۔  
 انسان بڑا کمزور ہے کچھ نہیں پتہ چلتا۔ یہ ہو جاتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔

ظریف ہنس پڑی

- پھر خدا جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ حدیثیں سنانے لگیں۔ مثالیں دینے لگیں۔

- عثمان کے آنے تک نہیں رہو گی۔

- وہ جانے کب آئیں۔۔۔

- پرسوں منروحید کے ہاں نہیں جاؤ گی۔

- ظریف نے ناک چڑھایا۔

- ہائے اللہ ظریف۔ اتنا مزہ آتا ہے نا ان کے ہاں۔ جا کر دیکھنا۔

- حیدر تو بڑے ہی دلچسپ آدمی ہیں۔ پرسوں تو ان کے ہاں بہت بڑا فنکشن ہے۔

- وہاں بھی وہی کچھ ہو گا۔

- کیا۔

- وہاں باتیں۔ بے باک نظریں۔ گندے لطیفے۔ چپ مذاق۔۔۔

- ہائے ظریف۔ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ اتنی اچھی گید رنگ ہوتی ہے۔ تو نے

تو نقشہ یوں کھینچا جیسے لوہروں لنگھوں کا اجتماع ہوتا ہے۔۔۔

- سب کو تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں۔ بہت ڈینٹ لوگ بھی تھے رات کی پارٹی

میں۔ میں نے تو دو آدمیوں کے متعلق کہا ہے۔

- دونوں کو تو نے غلط سمجھا ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں۔۔۔

- ہوں گے۔ اس نے کندھے اچکائے۔ میں تو پھر یہی کہوں گی کہ اپنی اپنی

طبیعت۔ مجھے اچھی نہیں لگیں ان کی باتیں۔ آپ تو شاید مادی ہو چکی ہیں۔

شائے نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنس کر کہا۔ بی ملانی۔ یہ چیزیں بھی

نہ ہوں تو تو تباہ زندگی کتنی پور ہو جائے۔ عثمان تو کاموں میں اس قدر الجھے ہوئے

ہیں۔ کہ گھر بیٹھے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ میں لوگوں سے بھی نہ ملوں جلوں تو کھر

بیٹھ کر کیا کروں۔

- میں نے یہ تو نہیں کہا کہ آپ لوگوں سے ملیں جلیں نہیں۔۔۔

ہو رہی تھیں۔ قدم بھی رکھتی تو جیسے عثمان آنکھیں کھلا رہے تھے۔ جو وہ کہتی کرتے اس کا دل تو آزرہ کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ کتنی تکلیف اٹھا رہی تھی وہ۔ عثمان کو پورا پورا احساس تھا۔ کہاں تو وہ شائے کو چھڑا کرتے تھے۔ کہ ہمارے پورے چہرے بچنے ہوں گے۔ لیکن اس کی حالت دیکھ دیکھ کر تو انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔

مشکل کی شام شائے کو تکلیف شروع ہو گئی۔ عثمان اسے ہوسپل لے گئے۔ ماما کو بھی بلا لیا۔ اور اماں فضلاء بھی ساتھ گئی۔ تکلیف شائے کو تھی اور جان پر جیسے عثمان کی آہنی تھی۔ وہ لیبر روم میں گئی۔ تو عثمان براہِ رے میں ٹہل رہے تھے۔ بے تابی بے چینی اور اذیت کے مرحلوں سے گزر رہے تھے۔ چپ چاپ تڑپ رہے تھے۔ شائے کی صحت اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ کتنی خیرات کر چکے تھے۔ صدقے اتار چکے تھے۔ ساری رات اذیت کے لمحوں سے بیٹھے گذر گئی۔

ماما اور وہ دونوں ہسپتال کے براہِ رے میں ٹہلتے رہے۔ کبھی لان میں بیٹھ جاتے۔ دونوں نے ایک پل کو آنکھ بند نہیں کی۔ شائے تخلیق کا دکھ سہہ رہی تھی۔ اور وہ اس کے دکھ سے دکھ رہے تھے۔ رات گزر گئی۔

اور جب مشرقی افق سے روشنی کی پہلی نورانی لکیر پھوٹی۔ نرم لیبر روم سے باہر نکلی۔

مبارک ہو۔ بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اس نے ماما اور عثمان سے کہا۔ ماما نے فرط مسرت سے مغلوب ہو کر عثمان کو لپٹا لیا۔ عثمان نے اللہ کا شکر

آپ نے کیا کہا۔  
پہلے تو میں چپ چاپ سنتی رہی۔  
پھر۔

پھر میں سننے لگی۔ اور کہا دادی اماں شیطان ہمارا کچھ نہیں کاٹ سکتا۔ تاہم لوگوں کا بگاڑتا ہے۔ آج کل لوگ پڑھے لکھے عقل مند ہیں۔ شیطان کو مار بھگاتے ہیں۔

دیے کوئی غلط بات نہیں کی انہوں نے۔ حد اور احتیاط اچھی بات ہے۔ اسی لیے کہتی ہوں شاگردی کر لے دادی اماں کی۔  
دونوں سننے لگیں۔

عثمان والپس آگئے۔ تو ظریفہ گھر چلی گئی۔ مسز وحید کے ہاں بہت بڑا فنکشن ہوا تھا۔ اس نے بھی شرکت کی تھی۔ خامی دلچسپ تقریب تھی۔ اچھے اچھے لوگ مدعو تھے۔ لیکن یہاں بھی کچھ لوگوں کی بے ہاکی اور نظروں کی غلاظت سے اسے گھن آئی۔ اسے تو شائے پر حیرت ہوتی تھی۔ کہ اسے یہ سب کچھ محسوس کیوں نہیں ہوتا۔

کیا وہ واقعی اتنی سادہ ہے

یا  
وہ ایسی باتوں کی اب عادی ہو چکی ہے۔  
دن گزرتے چلے گئے۔

ڈیپورمی سے چند دن پہلے عثمان نے اپنی ساری مصروفیات سچ دیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے جاتے اور کام کی رفتار دیکھ کر والپس آجاتے حساب کتاب کا کام گھر ہی کرتے۔ شائے ان دنوں بہت خوش تھی۔ ناز برداریاں

اور پوری محبت کی پہلی مہر اس کے ماتھے پر ثبت کر دی۔ ان کی خوشیاں بے پایاں تھیں۔

شہریار کی پیدائش کی خبر طبرہ ہی پھیل گئی۔ ڈیڑی نظریہ اور بچے تو بہت ہی بھاگے آئے۔ دوست احباب اور شائنے کے کئی معززین بھی دیکھنے آئے۔ پانچویں دن وہ ہسپتال سے گھر آگئی۔ مبارکباد کہنے والوں کا یہاں بھی اتنا بندھا تھا۔ خوب خوشی منائی گئی۔ ماما نے ڈھیروں مٹھائی بانٹی۔

عثمان نے بھی مٹھائی تقسیم کرائی۔ تیم خانے میں تین دن کھانا بھجوا یا۔ اور مسجد کی تعمیر کے لیے بھی عطیہ دیا۔ سدرۂ خیرات بھی بانٹی۔ گودہ اتنا کچھ تو نہ کر سکے جتنا کچھ اگر شیریں مراد محل میں پیدا ہوتا تو کیا جاتا۔ پھر بھی انہوں نے کافی کچھ کیا ہاں اس خوشی کے موقع پر انہیں اپنے ماں باپ اور خاندان کی کمی کا احساس پوری شدت سے ہوا۔

چند دن خوب گہما گہمی رہی۔ مومن میلہ تھا جیسے۔ ننھے کی آبر سے جیسے خوشیوں کے سوتے ابل پڑے تھے۔ مسرتوں کی پھوار پڑنے لگی تھی۔ عثمان کا پاؤں زمین پر نہ پڑتا تھا۔ اڑتے پھرتے تھے۔ شائنے تو اب انہیں اور بھی عزیز ہو گئی تھی۔ دل میں قدر و احترام نے نئی انگڑائی لی تھی۔ اس نے تکلیف اور دکھ جھیل کر عثمان کو زندگی کا اتنا حسین تحفہ دیا تھا۔ بچے کے عقیقے کے دن انہوں نے نئی گاڑی کی چابی شائنے کو دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "شیوناب ہم مکمل ہو گئے ہیں۔"

شائنے نے چابی کو حیرانگی سے دیکھا۔ یہ۔۔

"تم نے جتنا خوبصورت اور عظیم تحفہ دکھ اور درد کی بھٹی سے گذر کر مجھے دیا ہے۔ عثمان نے شائنے کو سینے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے

ادا کرتے ہوئے نرس سے پوچھا۔ "سسر شائنے تو ٹھیک ہیں نا۔"

نرس مسکراتے ہوئے بولی۔ "تھوڑی دیر صبر کریں۔ آپ انہیں خود دیکھ لیجیے گا۔ بالکل ٹھیک ہیں اب۔"

نرس اندر چلی گئی۔ ماما بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئیں۔

کچھ ہی دیر بعد جب شائنے کو لیبر روم سے کمرے میں منتقل کرنے کے لیے ٹرالی پر برآمدے میں لایا گیا۔ تو عثمان لپک کر ٹرالی کے پاس آئے۔ شائنے غنودگی کے عالم میں تھی۔ چہرے بے انتہاء دھورہا تھا۔ ہونٹ تک پلید پڑ گئے تھے۔ عثمان نے جبکہ کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ان کا دل بے چین ہونے لگا۔ نرسیں ٹرالی بے گئیں۔

شائنے کو بیدار ٹھیک ٹھاک کر کے لٹا دیا گیا۔ جہاں وہ پڑتے ہی نیند میں ڈوب گئی۔

عثمان کو نرس نے اندر آنے کی اجازت دی۔

وہ اندر آئے۔ شائنے کو دیکھا۔ اس کے اوپر جھکتے ہوئے محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگے۔

"ادھر دیکھو عثمان۔ ماما نے کہا۔"

وہ سیدھے ہوتے ہوئے ماما کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں چمکے نیلے تیلے سے کبل میں لپٹا ہوا گلابی خوبصورت اور بے انتہا پیارا نوپوند کا محبت بچہ تھا۔

ماما نے بچے کا ہاتھ چومتے ہوئے اسے عثمان کی طرف بڑھا دیا۔

فردوس مرت سے عثمان کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ جھکتے ہوئے انہوں نے بچے کو پکڑا۔ حیرت و مسرت سے اسے چند لمحے دیکھتے رہے۔ پھر جھکے اور شفقت

کہا۔ "اس کا بدلہ تو چکا یا نہیں جاسکتا۔ میں تو سوچتا ہوں۔ اب تک جو کچھ تمہارے لیے کیا ہے یا کر رہا ہوں۔ اس سچنے کے مقابلے میں اتنا حقیر ہے کہ ذرا مت سے سر جھبک جاتا ہے۔ پھر بھی۔۔ میں بھی تو تمہارا ہی ہوں۔ اپنا آپ تمہاری نذر ہے۔ یہ گاڑی تو صرف ایک ٹوکن ہے۔" شائد۔۔ نے ان کی پوڑی چھاتی سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ کتنا سکون۔ کتنی خوشیاں۔ کتنی چاہتیں پار ہی تھی وہ۔

عثمان کی دلی خواہش تھی۔ کہ بچے کی ولادت نئی کوٹھی میں ہوتی۔ لیکن بہت دیر دھوپ کے باوجود کوٹھی کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ابھی بھی کئی مہینوں کا کام باقی تھا۔ تعمیر کے علاوہ سجادٹ اور آرائش کے۔ لیے بھی وقت چاہئے تھا۔

شیری کی آمد نے انہیں اور بھی مصروف کر دیا۔ تنگ دود میں اضافہ ہوا۔ اور دیر دھوپ زیادہ کرنے لگے۔ فیکٹری تو انہی دنوں چالو ہو گئی تھی۔ لیکن مکان کے لیے وقت اور سرمائے کی ضرورت تھی۔

شائد شیری کی وجہ سے اب بہت مصروف ہو گئی تھی۔ آیا بل گئی تھی لیکن اس کے ہوتے ہوئے بھی وہ شیری کے بہت سے کام خوشی اور لگن سے خود ہی کرتی۔

شیری چالیس دن کا ہوا۔ تو مانا انہیں چند دنوں کے لیے اپنے ہاں لے



کرنا تھا۔

جانے سے پہلے انہوں نے شائے اور بچے کو بے طرح پیار کیا۔ پھر شائے سے بولے۔ اب تو ہمیں تنہائی بُور نہیں کرے گی نا۔ میری جگہ شیریں تھا کہ ماتھ ہوگا۔ شائے مسکرا دی۔

چاہو تو مانا کے ہاں چلی جانا۔ عثمان نے اس کی آنکھوں میں تیرتی آداسی دیکھ کر کہا۔ شائے نے نفی میں سر ہلادیا۔

بہتر۔ ویسے یہاں بھی تم لوہ نہیں ہوگی۔ شیریں کے علاوہ ہمارے لئے بیٹے بننے والے ہیں۔ اور پھر باتا عذرا سے کلب بھی تو جاتی ہو۔ ہوں۔ شائے نے کہا۔

عثمان چلے گئے۔ شائے کی فرمائشیں انہوں نے نوٹ کر لی تھیں۔ اس کے بعد کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ تو خود اس کے لیے ایسی ایسی نایاب چیزیں لکھی کر رہے تھے جن کے بارے میں شاید اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ مزے بات تو یہ تھی کہ یہ سب کچھ وہ شائے کے علم میں لائے بغیر کر رہے تھے۔ مگر میں وہ سب چیزیں سیٹ کر کے شائے کو لائڈ سر پرانڈو دینا چاہتے تھے۔ اسے سارے جہاں کی خوشیاں دینے کی دیواہ مگن جوتھی۔

ان کے جانے کے بعد شائے کئی دن بولائی بولائی سی رہی۔ شیریں دل لانے کو تھا۔ لیکن عثمان کی کمی شدت سے محسوس ہوتی۔ وہ تو خیر دوستوں کے مصروف ہی رکھا۔ کسی دن کوئی آجاتا۔ کسی دن کوئی۔ اور وہ خود بھی ان کے ہاں آتی جاتی رہتی۔ ٹینے کے ہاں آنا جانا تو روز کا معمول تھا۔ کبھی

کئیں۔ عثمان صرف ایک دن کے لیے جا سکے۔ دوسرے ہی دن انہیں پھر کراچی جانا پڑا۔

مہنت بھرنا کے ہاں رہ کر شائے گھر والیں آگئی۔ شیریں اب خوب موٹا ہو رہا تھا۔ بے حد خوبصورت بچہ تھا۔ ماں باپ تو ماں باپ اسے تو غیر بھی پیار کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

کتنا پیارا ہے۔ شائے کا سینہ فخر سے تن جانا۔

بالکل مجھ پر ہے۔ عثمان تفاخر سے کہتے۔

اوں ہوں۔ بالکل مجھ پر ہے۔ شائے شان سے کہتی۔

آنکھیں میری ہیں۔ کالی خوبصورت اور چمکدار۔ عثمان د فور مسرت سے کہتے۔

ہونٹ میری طرح ہیں۔ سرخ سرخ بھرے بھرے۔ شائے اترائی۔

دونوں جب بھی اسے لے کر بیٹھے دیوانوں کی سی باتیں کر کے خوش ہوتے۔

شیریں دو مہینے کا بھی نہ ہوا تھا۔ کہ عثمان کو باہر جانا پڑا۔ رد پے پیسے کے میں جانا ضروری تھا۔ ان کے وکیل نے بذریعہ تار بلا بھیجا تھا۔

شائے بھی اب ذہنی طور پر ان کی مجبوریوں اور دوڑ دھوپ کی مگن کو قبول کر چکی تھی۔ گھر تیزی سے تکمیل کے مراحل میں داخل ہو رہا تھا۔ انٹر میڈیوٹ اور ان کے لیے مندرجہ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ دیگر سامان بھی دوسرے ممالک سے آرہا تھا۔ ان سب چیزوں کے لیے پیسے کی ضرورت تھی۔

اور اس کا بندہ لبست عثمان نے یوں کیا تھا کہ بیرونی کمپنیوں کے کچھ حصص فروخت کر دیئے تھے۔ اپنی جرمنی والی بزنس بند کر دی تھی۔ یوں سارا پیسہ

وہ فارغ ہو کر آ بیٹھتی اور کبھی شائندہ چلی جاتی۔

کبھی کبھی موڈ بنتا تو شائندہ برابر والوں کے ہاں بھی چلی جاتی۔ دادی اماں کی نصیحتیں گراں گزرتیں تو کئی کئی دن ان کے گھر کا رُخ نہ کرتی۔ پھر بھی غصہ لوگ تھے۔ ان کی بہنیں خوش خلقی سے پیش آتیں۔ ان کی لڑکیاں عزت اور لگاؤ کا اظہار کرتیں۔

تنبولا اور تنگور کھیلنے کی شائندہ بڑی شوقین تھی۔ ہر ہفتے کلب جایا کرتی تھی۔ ویسے بھی کافی جاننے والے مل جاتے تھے۔ سٹاکس کرنے والے نظر آ جاتے تھے۔ بننے بولنے والے مل بیٹھتے تھے۔ وقت اچھا گزر جاتا تھا عثمان پانچ مفتوں کے بعد واپس آئے۔ آتے ہی کراچی چلے گئے وہاں سے لوٹے تو پھر جرمی جانا پڑا۔ یوں لگتا تھا۔ وہ صرف شائندہ اور شیریں کو دیکھتا دو چار دنوں کے لیے آگئے ہیں۔

اس دن تنبولا تھا۔ شائندہ کلب جانے کے لیے تیار ہوئی۔ اس نے خوب سارٹ لباس پہن رکھا تھا۔ بال بھی بڑے دلفریب طریق سے سنوارے تھے۔ بدن خوشبوؤں سے بسایا تھا۔ ڈھیلے ڈریس پہن کر وہ بور ہو گئی تھی۔ اب اس کا جسم ہلکی سی حالت پر اچکا تھا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی دلکش ہو گیا تھا۔ اس دلکشی میں وہ خود بھی اضافہ کرتی عثمان بھی یہاں نہیں تھے۔ اس لیے بیکار وقت وہ اپنے آپ پر صرف کرنے لگی تھی۔ گھنٹوں چہرے کی آرٹ پر لگاتی۔ بھنویں پلک ہور ہی تھیں۔ ماتھے کے اوپر جھبک آنے والے بال اکھیرے جارہے ہیں۔ ہونٹوں کے زائے بن رہے ہیں۔ آنکھوں کی بناؤ دلکش انداز میں کی جارہی ہے۔ بدن کو مساج کر دیا جا رہا ہے۔ پنڈلیوں کی خوبصورتی اجاگر کی جارہی ہے۔ کمر کے خم دیکھے جارہے ہیں۔ کولہوں کے

اجاروں پر نظر ہے۔ سینے کی اٹھان اور گردن کی خوبصورتی کے زائے ہر کچھ جارہے ہیں۔

حسن خدا داد بے مثال تھا۔ اس پر اتنی دیکھ بھال محنت اور آلائش۔ ہر شراب دو آتش بن گئی۔

تیار ہو کر اس نے اپنا سراپا قد آدم آئینے میں دیکھا۔ تو اس کے ہونٹ مسکا اٹھے۔

”کاش آج مانی یہاں ہوتے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ فخر و غرور کی الہر اس کے اندر دوڑ گئی۔

شیریں کے متعلق آیا کوہ ایات دے کر اس نے بچے کو پیار کیا اور باہر آگئی۔ گاڑی نکالی اور کلب جانے کو تھی۔ کمر برابر والی دادی اماں آگئیں۔ اخلا تا شائندہ نے گاڑی سے نکل کر دادی اماں کو سلام کیا۔

”کہیں جارہی ہو۔“ دادی اماں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے سراپا دیکھا۔

”ہاں۔“

”کہاں۔“

”کلب۔“

”اس وقت؟“

دادی ماں ساڑھے سات ہی ہونے والے ہیں۔ دس منٹ کم ہیں۔ یہ کوئی کام تھا۔

”نہیں۔“ یونی دیکھنے آگئی تھی تمہیں۔ عثمان تو ابھی نہیں آئے نا۔“

”جی نہیں۔“ پرسوں آ رہے ہیں۔“

عثمان نہیں ہوتے تھے۔ تو کسی دوست سے شدید کرتی تھی۔ منصور جلیلی یا آصف کے ساتھ بیٹھنے میں اسے بڑا مزہ ملتا تھا۔ ان کی بیگمات بظاہر اس کے ساتھ بیٹھنے پر خوشی کا اظہار کرتیں۔ لیکن اندر ہی اندر جل رہی ہوتیں۔ شوہر کی ایک ایک حرکت پر ان کی نظریں ہوتیں۔

آج شائے منصور جلیلی جہاں بیٹھا تھا۔ اس طرف بڑھی تھی۔ کہ تہینہ یوسف نے اسے ہلو کہہ کر اپنی طرف مخاطب کر لیا۔ یوسف بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دونوں نے احوال پرسی کی۔ تپاک سے ملے۔ عثمان کا پوچھا۔ شیر کی خیریت دریافت کی۔

۔ بیٹھیں ہمارے ساتھ۔ تہینہ نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ شائے غالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے تیسری کرسی پر بیٹھے نوجوان کو دیکھ کر بولی۔ آپ کی تعریف؟ نوجوان جواب تک بلا پلک چپکے اسے متکتے جا رہا تھا۔ قدرے اٹھتے ہوئے بڑی شائستگی سے بولا۔ رفیقی۔

۔ شائے عثمان۔ اس نے بھی اپنا تعارف کر دیا۔

تہینہ اور یوسف بھی بیٹھ گئے۔

۔ آپ بہت بڑے آرٹسٹ ہیں۔ تہینہ نے رفیقی کے متعلق شائے کو بتایا۔

۔ واقعی۔ شائے نے تمہیں بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

۔ پورٹریٹ بنانے ان کا جواب نہیں۔ یوسف بولا۔

۔ سچ۔ شائے نے بچوں کی طرح خوشی کا اظہار کیا۔

رفیقی کے لبوں پر لودیتی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اٹھائیس تیس برس کا جوان آدمی تھا۔ دبلا پتلا لمبے قد کا۔ آنکھوں میں ذہانت کی روشنی تھی۔ بال بڑے

ہونے لگے تھے۔ چہرے پر کھوٹے رہنے کی کیفیت تھی۔ لباس کے معاملے میں

۔ اکیلے جاؤ گی۔

شائے کو ایک توجہ دی جانے کی تھی۔ دادی اماں کا استفسار برا لگا۔ لیکن نہیں کر بولی۔ آپ چلیں گی ساتھ۔

۔ تو بہ تو بہ۔ انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ شائے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔ دادی اماں بڑا مزہ آئے گا۔ آئیے آج آپ کو بھی ساتھ لے چلوں۔ ہوں۔ کھیل۔ ہے آج وہاں۔ ہو سکتا ہے آپ کچھ پیسے بھی جیت جائیں۔

دادی اماں سمجھ گئیں کہ وہ ان کا مذاق اڑا رہی ہے۔ پھر بھی برا نہیں مانا۔ حسب عادت چلتے چلتے دو چار نصیحتیں کیں۔ عثمان کے بغیر کہیں نہ جایا کر دو۔

۔ بہت اچھا۔ خدا حافظ۔ شائے کو ان کی باتیں بری لگیں۔ موڈ بگڑ گیا۔ گاڑی میں بیٹھی اور ان کے لوٹنے سے پہلے ہی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ سارا راستہ وہ دادی اماں کی باتوں پر تلملاتی رہی۔ یہ بڑھیا جانے کے لیے وارد ہو جاتی ہے۔ کیا سمجھ کر نصیحتیں کرتی ہے ہونہ۔ آئندہ اس نے

کچھ کہا تو میں بھی چپ نہ رہوں گی۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

کلب کے وسیع ہال میں لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ آرہے تھے۔ چند میز خالی

تھیں۔ شائے اندر داخل ہوئی۔ تو کئی جاننے والی آنکھیں کئی اجنبی نظریں

اس کی طرف اٹھ گئیں۔ ہلو۔ ہٹ۔ ہٹ۔ ہر طرف سے آوازیں آئیں۔

شائے نے کسی کو ملے ہاتھ ملایا۔ کسی کو مسکراہٹ پاس کی۔ کسی کو سلام کیا۔

کسی سے ہاتھ ملایا۔

عثمان ساتھ ہوتے تھے۔ تو وہ ان کے ساتھ اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھتی تھی۔

مار کر اٹھا ئے۔ اور تہو لا کھیلنے کے لیے تیار ہو بیٹھے۔

”آپ نہیں کھیلیں گے۔“ یوسف نے رفیق سے کہا

”نہیں۔ وہ کاغذ کی لپٹ پر لکیریں کھینچتے ہوئے سامنے بیٹھی شانہ کو دیکھ رہا تھا۔

جانے سے پہلے شانہ کو تہینہ اور یوسف کی زبانی رفیق کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ چوٹ کھایا دل تھا۔ زمانے کے حادث سے دو چار رہنے کی وجہ سے کسی وقت بے انتہا اکھڑ بھی ہو جاتا تھا۔

اپنے اور پترس کھانے والوں سے سخت بدگمت تھا۔ کوئی مرکز نہیں تھا۔ اس لیے بھٹکتا پھرتا تھا۔ بہت عظیم فنکار تھا۔ لیکن اس عظمت سے اس نے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کبھی نہ کی تھی۔ پورٹریٹ بنوانے کے لیے اسے ہزاروں کی آفر ہوتی تھی۔ لیکن بنانا اسی کی تھا۔ جو اس کی جمالیاتی حس کی پرکھ پر پورا اترتا تھا۔ لوگ اس کے پیچھے پھرتے تھے۔ لیکن وہ لوگوں کے پیچھے پھرنے کا قائل نہیں تھا۔

شانہ اپنی گاڑی میں بیٹھی۔ تو وہ یوسف سے رکنے کا کہہ کر اس کی طرف آیا۔ کھڑکی میں قدرے جھکتے ہوئے بولا۔ ”محترمہ آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

”کس بات کا؟“ شانہ نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ لوگ اس کے پیچھے پھرتے تھے۔ وہ لوگوں کے پیچھے پھرنے کا تو قائل نہ تھا۔

”میں آپ کی پورٹریٹ بناؤں گا۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔

”میرے شوہر کا جائیں تو پھر پوچھ کر بتاؤں گی۔“ وہ ہچکا چڑھانے کو بولی۔

اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کی پورٹریٹ

خاصہ لا پر واہ نگہا تھا۔ آواز میں ملائمت تھی۔ انداز شائستہ تھے۔

”ان سے ہماری ملاقات تہران میں ہوئی تھی۔“ تہینہ نے کہا۔ ”میری پورٹریٹ انہوں نے وہاں ہی بنائی تھی۔ کسی دن آنا دکھاؤں گی۔ اب لائے ہیں یہ۔“

”آپ باہر سے آئے ہیں۔“ شانہ نے پوچھا۔ ”رہتے کہاں ہیں۔“

”ہوٹل میں مقیم ہوں۔“ ہمدرد سے آ رہا ہوں۔“

”مستقل قیام کہاں ہے۔“

”کہیں بھی نہیں۔“

وہ مسکرایا۔ دھیرے سے بولا۔ ”میرا وجود میری رُوح کے تابع ہے۔ میں

اس کی مانگ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں۔“

سب اس کی بات پر مسکرا دیئے۔ یوسف بولا۔ ”روح کی مانگ انہیں ملک ملک لیے پھرتی ہے۔“

”ساری دنیا گھوم چکے ہیں۔“ تہینہ نے کہا۔ ”یہاں بھی قیام مستقلاً تھوڑا ہی ہوگا۔“

اتنے دن ضرور ہوگا کہ میں ان کی پورٹریٹ بناؤں۔“ اس نے شانہ کی طرف کھوٹے کھوٹے انداز میں دیکھ کر کہا۔

شانہ مسکرا دی۔

”کیا آپ اجازت دیں گی کہ میں آپ کی پورٹریٹ بناؤں۔“ وہ التباہری نظروں سے بولا۔

شانہ پھر مسکرا دی۔ اس فنکار کی نظروں میں جانے کیا جادو تھا۔ وہ کچھ

بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔

کھیل شروع ہو گیا تھا۔ شانہ تہینہ اور یوسف نے اپنے اپنے ٹکٹ نکالے

خود بنادوں گا۔ آپ اک مصور کا جتیا جاگتا تصور ہیں۔  
 - ادھ شکریہ - شائے تعریف کے اس انداز سے متاثر ہو کر بولی۔  
 شائے گھرا گئی۔ اجنبی فنکار کے لفظ کانوں میں جیسے چپک گئے تھے۔ اس  
 نے ارادہ کر لیا۔ کہ وہ اپنی پور ٹریٹ اس سے خود بخوانے گی۔ رفیقی کے  
 حالات سن کر اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات اُبھنے لگے۔  
 لیکن دوسری صبح اس نے پکا پکا ارادہ کر لیا۔ کہ اس اجنبی فنکار سے پھر  
 کبھی نہ ملے گی۔ وہ اس کا کیا لگتا تھا۔ جو اس سے ہمدردی محسوس کر رہی تھی۔

نوید کے ہاں محفل موسیقی تھی۔ یہ لوگ گانے بجانے کے بڑے ریا تھے۔  
 سال میں ایک آدھ بار بڑے اونچے پیمانے پر جشن موسیقی منایا کرتے تھے۔  
 دیسے ہر ماہ ان کے ہاں گانے بجانے کی محفل بجا کرتی تھی۔ نوید سار بہت  
 اچھی بجاتا تھا۔ منہ نوید کے گلے میں سر مچلتے تھے۔ خوب رنگ جتا تھا۔ کئی  
 دوسرے جو بڑے بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ بعض تو باقاعدہ موسیقی کی تربیت  
 لے رہے تھے۔ کچھ شغلا گاتے تھے۔ خاصی پر لطف محفل ہوتی تھی۔  
 بلاوہ شائے کو بھی آیا تھا۔ عثمان آئے ہوئے تھے۔ کچھ موسیقی سے فطری  
 لگاؤ تھا۔ کچھ شائے کی خاطر داری مقصود تھی۔ وہ بھی تیار ہو گئے۔  
 شائے نے آج محفل کی مناسبت سے کالی فرنج شیعوں کی ساڑھی پہنی۔  
 زیور اور میک اپ بھی اسی انداز سے کیا۔ عثمان بڑے شوق سے اس کو دیکھتے  
 ہوئے مسکرا کر کہا۔ ہر روپ دھار لیتی ہو جان۔ تپہ ہی نہیں چلتا۔ تمہارا  
 اصلی روپ کونسا ہے۔

کیسٹ نکال کر ٹیپ میں ڈال دیا۔

”حضرات متوجہ ہوں۔ وہ شوخی سے بولے۔

”ارشاد ارشاد۔ سب نے بیک زبان کہا۔

”سینے اور سر دھینے۔ عثمان بولے۔

”سنائیے سنائیے۔ سب متوجہ تھے۔

عثمان نے ٹیپ آن کر دیا۔ ان کا پسندیدہ مصرع چلنے لگا۔ میں نے قہمت کی کیرروں سے چرایا ہے تجھے۔

شائندہ پیار سے عثمان کو سرزنش کرتے ہوئے ٹیپ بند کرنے کو کہتی۔ لیکن انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

پہلے تو کوئی کچھ نہیں سمجھا۔ ایک مصرع بار بار چل رہا تھا۔

”یکسا۔ کیسٹ خراب ہے کیا؟“ سب کی طرح نوید نے یہی سمجھا۔

عثمان ہنس پڑے۔ کیوں جی خراب کیونکر ہوا۔ ٹوٹا ہوا ریکارڈ تو

نہیں جو بار بار بج رہا ہے۔ ہماری پسند ہماری اختراع۔ سینے اور سر دھینے۔“

شور مچ گیا۔ کسی نے واہ واہ کہا۔ کسی نے منہ بنایا۔ جیسے کوئین مکمل لی

ہو۔ کوئی داد دے رہا تھا۔ کسی نے بیہودہ واہیات جیسے الفاظ سے

بیدار کی۔ خوب ہلاکلا ہوئی۔ عثمان نے اپنی گلو خلاصی یوں کر الی۔ محفل کو مخطوط

ہی کرنا تھا نا۔ عثمان نے سب کو یہ بھی بتایا۔ کہ شادی سے پہلے انہوں نے

شائندہ کے لیے یہ مصرع ٹیپ کیا تھا۔ حال دل سنانے کے لیے۔ شائندہ شرمائی۔

سب نے خوب خوب اسے چھیڑا۔

مجھ چار بجے تک محفل جمی رہی۔ تہوے کافی اور چائے کے کئی دور چلے

تھے۔ موسیقی واقعی روح کی غذا ہے۔ یہ اک حقیقت تھی جسے سب نے

شائندہ ہنس پڑی۔

”سچ کہہ رہا ہوں۔ کل تم نے کو نوہینا تو جا پانی عورت بن گئیں۔ آج یہ لباس پہنا تو۔“

”بس بس۔ چلیے اب دیر ہو رہی ہے۔“

دونوں نوید کے ہاں آگئے۔ ان کے وسیع ڈرائنگ ہال میں آج صوفوں

میزوں کر سیوں کی جگہ فرشی نشست کا بندوبست تھا۔ قالین بچھے تھے۔

چاندنیاں ڈالی گئی تھیں۔ گاڑ بیچھے لگے تھے۔ جگہ جگہ پھولوں کے ہار تھے۔

پتیاں تھیں۔ کلیاں تھیں۔ خوشبو سے سارا ہال معطر تھا۔

بہت خوبصورت محفل تھی۔ خوب رنگ جمنا تھا۔ سنجیدگی سے۔ دم بخود

ہو کر بے سدھ ہو کر گانا سنا گیا۔ شور مچا کلا کر کے آواز سے کس کس کو بھی موسیقی

سے مذاق کیا گیا۔ بے تکلف دوستوں کی محفل بڑی شاندار تھی۔

باری باری کئی لوگوں نے گانا سنا یا۔ اور اس باری باری میں عثمان اور

شائندہ کی بھی باری آئی۔ شائندہ نے تو مشکلوں سے جان چھڑالی۔ لیکن عثمان کے

گرد و سب جمع ہو گئے۔

”میں جانتا تھا ایسا ہو گا۔“ عثمان مکرائے۔ اس لیے بندوبست کر لیا

تھا۔

”کیا۔ کیسا بندوبست۔“ سب بولے۔

”ابھی بتا رہا ہوں۔ وہ بولے۔

سب ان کی طرف متوجہ تھے۔

عثمان ٹیپ ساتھ لائے تھے۔ کچھ اچھی غزلیں انہوں نے ٹیپ کی تھیں۔

انہوں نے ٹیپ شدہ غزلوں والا کیسٹ ٹیپ سے نکالا۔ اور جیب سے دوا

جان لیا تھا۔

رات بھر جاگنے کے بعد عثمان اور شانہ گھر آئے ہی سو گئے۔ شانہ تو دن چڑھے تک سوئی رہی۔ عثمان دو گھنٹے کی نیند نکال کر اٹھ بیٹھے۔ کام پر جانا تھا۔ فیکٹری کا حساب کتاب بھی دیکھنا تھا۔ چار دن تھے۔ سب کام نپا کر انہیں پھر جرمی جانا تھا۔ دن گزرتے چلے گئے۔

اس شام شہیلہ نے روزی سے کپڑوں کا پتہ کرنے بازار گئی۔ تین بلاؤز سل چکے تھے۔ ساڑھیوں کو فال بھی لگ چکی تھی۔ لیکن باقی کپڑے ابھی تیار نہ تھے۔ درزی کو ڈانٹ ڈپٹ کر باہر آئی۔ تو سامنے ہی کیسٹ کی دکان دیکھ کر شیر ہی کی دوائی اور گرانپ واٹر یاد آ گیا۔ وہ مٹک عبور کر کے دوسری سمت آگئی۔ بٹوے سے نسخہ نکالا اور دکان میں آتے ہی کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ "ہلو۔ منر۔ اک آواز نے اسے متوجہ کیا۔ اس نے دیکھا کچھ ہی فاصلے پر اگلے کاؤنٹر پر رفیق کھڑا تھا۔ وہ جلدی سے اس کی طرف آ گیا۔ "ہلو منر۔" اسے شاید شانہ کا نام بھول چکا تھا۔ سر کھاتے وہ خفت سے بولا۔

"منر شانہ" شانہ نے مسکرا کر کہا۔

"معاف کیجئے گا آپ کا نام بھول گیا تھا۔" وہ کھویا کھویا نظر آرہا تھا۔ اپنے آپ سے بھی جیسے بگڑا نہ ہو۔ ایسے آدمی کو بھلا کسی کا نام یاد بھی کیسے رہ سکتا تھا۔

"نام بھول گئے تھے۔ تو مجھے کیسے پچانا۔" شانہ نے اس کی خود فراموشی کی سی کیفیت پر مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کی شخصیت میرے حافظے میں محفوظ تھی۔" وہ سادگی سے بولا۔ "شانہ" شکر یہ کہتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف مڑی۔ اور چیزیں مانگیں۔ شانہ نے مطلوبہ چیزیں سیل میں سے لے کر ہل ادا کیا۔ رفیق کے ہاتھ میں کوئی دوائی تھی۔ اس نے بھی پیسے سیل میں کود دیئے۔

"آپ بیمار ہیں شاید" شانہ نے اس کی دوائی دیکھتے ہوئے کہا۔

"ادہ نہیں۔" وہ لاپرواہی سے بولا۔ "ان دوائیوں کا عادی ہوں۔" کیوں۔" شانہ نے تجسس سے پوچھا۔

"بس۔ کبھی ٹینس ہوتا ہوں۔ کبھی نیند نہیں آتی۔ یہ ویلیم اور یہ سلینگ ملز ہیں۔" اس نے کہا۔

شانہ دکان سے باہر نکل وہ بھی ساتھ ساتھ آیا۔

"محترمہ آپ کے شوہر آگئے۔" وہ شانگی سے بولا۔

شانہ مسکرائی۔ "یہ بات آپ کو یاد تھی۔"

"ہاں۔" وہ اس کے ساتھ چلتے بولا۔

"وہ آئے تھے۔ پھر چلے گئے۔ ان دنوں جرمی میں ہیں۔" وہ گاڑی کی طرف آگئی۔

"آپ نے ان سے اجازت لی تھی پورٹریٹ بنوانے کی۔" اس نے چند فٹ کے فاصلے پر رک کر پوچھا۔

شانہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "یاد ہی نہ رہا۔"

"پھر نہیں بنوائیں گی۔" اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"آپ میری پورٹریٹ بنانے پر مصر کیوں ہیں۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

آپ میری جمالیاتی جس سے محو رہی ہیں۔ وہ جیسے غنودگی میں تھا۔  
اچھا دیکھو تھی۔ فی الحال تو اجازت دیں۔ میرے بچے کی طبیعت ٹھیک  
نہیں۔

میں اپنی بنائی ہوئی پورٹریٹ آپ کو دکھانا چاہتا تھا۔  
کہاں ہیں۔

کمرے میں۔

کبھی آؤں گی دیکھنے۔

کبیں تو میں لے کر آ جاؤں۔

ضرور آئیے۔

شانہ نے اسے گھر کا پتہ دیا۔ اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

شانہ کا خیال تھا کہ وہ دوسرے دن ہی آ بیچے گا۔ لیکن وہ کئی دن نہیں آیا۔

پھر کئی دنوں بعد وہ ماما کے ہاں سے واپس آئی تو رفیقہ ڈرائنگ روم  
میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بڑی شائستگی سے سلام کیا۔ شانہ

نے احوال پرسی کی۔ اور مسکراتے ہوئے کہا۔ شاید آپ میرا پتہ بھول گئے تھے۔

نہیں۔ وہ بولا۔ میں مہر دہ تھا۔ معذرت خواہ ہوں۔ اور ہاں میں

سگریٹ پی سکتا ہوں۔

سر لاتے ہوئے شانہ نے فضل دین کو چائے لانے کا کہا۔ خود رفیقہ سے

باتیں کرنے لگی۔ اپنی کوٹھی بھی دیکھ کر آئی تھی۔ اب تو تکمیل کے آخری مراحل میں

تھی۔ ڈیکوریشن بھی ساتھ ساتھ ہو رہی تھی۔ وہ عثمان کی کاوشوں سے بڑی

متاثر ہوئی تھی۔ رفیقہ سے بھی یہی باتیں کرتی رہی۔

رفیقہ دو پورٹریٹس اسے دکھانے کے لیے لایا تھا۔ ساتھ فوٹو گرافس بھی  
تھیں۔ شانہ کو اس کے فن کی داد بے ساختہ انداز میں دینا پڑی۔ واقعی  
وہ بڑا فنکار تھا۔ فوٹو گرافس سلولائیڈ پر تراہوا عکس تھیں۔ لیکن ان ہی کی  
پورٹریٹس زندہ لگتی تھیں۔ بالکل ایسے جیسے کوئی سامنے بیٹھا ہو۔ چہرے  
کے تاثرات اور آنکھوں کی بولتی روشنیاں پورٹریٹس کا کمال تھیں۔

شکریہ۔ وہ تعریف سے خوش ہو کر بولا۔ کبھی تشریف لائیں۔ میں اور

چیزیں بھی آپ کو دکھاؤں گا۔

ضرور ضرور۔ وہ بولی۔ اب تو میں بھی اپنی پورٹریٹ ضرور بنواؤں گی۔

وہ دھیرے سے مسکرایا اور پھر شانہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ بلا اجازت

بنانے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کی پورٹریٹ بنانا شروع کر رکھی

ہے۔

جی؟ وہ حیران ہو کر بولی۔

معذرت کر چکا ہوں۔ اس نے سگریٹ کے کئی کش لے کر سگریٹ ایش ٹے

میں ڈال دیا۔

لیکن آپ پورٹریٹ بنا کیسے رہے ہیں۔ کیا تصویر دیکھ کر ہی بنا لیتے ہیں۔

اور میری تصویر بھی تو آپ کے پاس نہیں۔ کہیں سے لی ہے۔؟

اس نے آہستہ آہستہ سر کو جنبش دی پھر سادگی سے بولا۔ پورٹریٹ تصویر

دیکھ کر نہیں بنائی جاتی۔

دی تو میں حیران ہو رہی ہوں۔ آپ کیسے بنا رہے ہیں۔ جبکہ میں آپ کے

سامنے نہیں ہوتی۔

وہ ہنسا۔ پھر بولا۔ کچھ چیزیں میرے ذہن میں اس طرح محفوظ ہو جاتی



وہ شام اترنے کے بعد واپس گیا۔ جاتے جاتے اس نے شانہ سے کہا۔  
 ہم بہترین دوست ہیں۔  
 شکریہ۔ وہ مسکرائی۔  
 پھر کئی دن نظر نہیں آیا۔

شانہ اس کی منتظر تو نہیں تھی۔ پھر بھی اپنی پورٹریٹ دیکھنے کا خیال کئی بار  
 آیا تھا۔ وہ اپنے ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر اسے بتا گیا تھا۔ ٹیلیفون نمبر  
 بھی دیا تھا۔ لیکن شانہ وہاں جانا تو کیا فون بھی نہ کر سکی۔ ان دنوں وہ اپنے  
 نئے گھر کی بجاوٹ بناوٹ میں عثمان کی غیر حاضری میں مسر جنید کو مدد دے رہی تھی۔  
 کئی دنوں بعد وہ بازار میں مل گیا۔ اس نے شاید کچھ کینوس رنگ اور برش  
 خریدے تھے۔ چیزیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔  
 شانہ نے ملتے ہی پچاسواں اپنی پورٹریٹ کے متعلق کیا۔ وہ کچھ سوچتے  
 ہوئے بولا۔ "ابھی نامکمل ہے۔"  
 "بنار بھی رہے ہیں یا وہ بھی بھول گئی ہے۔"  
 وہ مسکرایا۔

"میرا خیال ہے اگلے ماہ ہم اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔ جب  
 تک بن جائے گی؟"  
 "کوشش کر دوں گا۔ ویسے آپ کو بتا دوں جب میں مجبوراً کام کرنے  
 کی کوشش کروں گا۔ تو میرے اندر کا فنکار بڑی ڈھکائی سے اڑ جاتا ہے۔ نتیجہ  
 یہ ہوتا ہے۔ کہ جو چیز بننا ہوتی ہے وہ نہیں بن پاتی۔"  
 وہ ہنس پڑی۔ "رفیقی صاحب میری پورٹریٹ بنانے کے لیے اندر  
 کے فنکار کی منت سماجت کرتے رہیں۔ مجھے اگلے ماہ یہ تحفہ عثمان کو

ہیں۔ کہ ان کا عکس اتارنا مشکل نہیں ہوتا۔ خیر کوشش ہی ہے۔ ہو سکتا ہے  
 ناکام ہی ہو جائے۔"

شانہ اس کی فنکارانہ جس کی بے طرح معذرت ہو رہی تھی۔ "میں پورٹریٹ  
 ضرور بناؤں گی۔ اپنے عثمان کے لیے نئے گھر کا تحفہ یقیناً اس سے بہتر اور کوئی  
 نہ ہو گا۔"

"بالکل۔" وہ بولا۔ "نیا سگریٹ سلگا کر اس نے کہا۔" جو پورٹریٹ بنا  
 رہا ہوں وہی آپ کو پیش کر دوں گا۔ تھوڑی سی زحمت کسی وقت دوں گا  
 آپ کو۔"

شانہ نے استغہامی نظروں سے اسے دیکھا۔  
 تو وہ سر جھکائے ہوئے بولا۔ "محترمہ آنکھیں بنانے کے لیے مجھے آپکے  
 تعاون کی ضرورت ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔  
 "معاف کیجئے گا۔ میں آپ کی آنکھوں کو اب تک پورے غور سے نہیں  
 دیکھ سکا۔ اس لیے۔ خیر جب بناؤں گا آپ کو زحمت دوں گا۔ کچھ دیر  
 کے لیے مائل بن کر بیٹھنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" شانہ بولی۔ "اگر واقعی آپ میری پورٹریٹ حافطے کی مدد  
 سے بنارہے ہیں۔ تو یہ بہت بڑا کام ہے۔ آپ عظیم فنکار ہیں۔"  
 دونوں نے چائے پی۔ اور باتیں کرتے رہے۔ شانہ نے محسوس کیا۔ کہ  
 رفیقی بے ضرر قسم کا سادہ سا انسان ہے۔ بعض اوقات تو کھوئے رہنے کی  
 کیفیت اس پر اس طرح طاری ہو جاتی ہے کہ اسے گرد و پیش کا احساس ہی  
 نہیں رہتا۔

باہر چلا گیا۔ کئی اساتذہ نے اس کے علم میں اضافہ کیا۔ اس کے اندر کے قدرتی جذبے اور صلاحیتیں نکھرنے لگیں۔ وہ ملک ملک گھوم چکا تھا۔ لگبری لگبری پھرتا رہتا تھا۔ سکون نا آشنا تھا۔ محبت کی تلاش میں پھر دل سے نکلتا اور سر پھوٹتا رہا۔ مہینہ اس کی زندگی میں بہار بن کے آئی بھی تھی۔ لیکن ہمیشہ کے لیے خزاں بنا کر چھوڑ گئی تھی۔ اس کے فن کارانگ مہینہ کا سبب و فانی کے بعد ہی نکھرا تھا۔

شائندہ بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے مہینہ کے متعلق کئی سوال کر ڈالے۔ اُن دیکھی اُردو نے بے دلائل کی سے لے خدا واسطے کا بیر ہو رہا تھا۔

آپ نے شادی کیوں نہیں کی۔ اتنے تنہا میں آپ۔ وہ ہمدردی کی دویں کہہ گئی۔

رفیقہ نے سگریٹ کا طویل کش لیا۔ دھواں نکلتے ہوئے بولا۔ "شادی کرنے سے الزام مرجاتا ہے۔" شائندہ مذاق سمجھی نہیں کر بولی۔ "وہ کیونکر۔" وہ بھی ہنسا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔ "پورٹریٹ بنوانے کے لیے بھی اجازت لینا پڑتی ہے۔ میرے نزدیک تابع ہونا موت ہے زندگی نہیں۔"

"اوہ۔" شائندہ تغافل سے گردن ادبھی کرتے ہوئے بولی۔ طنز کا شکریہ دے لیے آپ کا تجربہ میرے تجربے کے بالکل برعکس ہے۔ شادی زندگی ہے۔ تابع ہونے اور تابع کرنے کا برابر عمل ہے۔ دیے اطلاقاً عارض ہے۔ کہ مجھے مافی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں نہ ہی انہوں نے اس قسم کی کوئی پابندی مجھ پر کبھی لگائی ہے۔ ایسی بات ہوتی۔ تو آج میں آپ کے ساتھ بیٹھ چا۔ نے نہ پی رہی ہوتی۔"

دینا ہے۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ چند لمبے سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ شائندہ نے دیکھا اس کی سگریٹ پچھڑی انگلیاں سگریٹ کے دھوئیں سے براؤن رنگ کی ہو چکی تھیں۔ اس کے ہونٹ بھی بیزارنوشی سے کالے پڑ چکے تھے۔ آپ اتنے زیادہ سگریٹ کیوں پیتے ہیں۔ شائندہ نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر کچھ نیرارسی ہمدردی تھی۔ کیا آپ وقت دے سکتی ہیں۔ اس نے جیسے شائندہ کی بات سنی ہی نہیں۔

شائندہ اس کی بات سے کچھ سمجھ نہ پائی۔ میری خواہش ہے کہ آپ چائے میرے ساتھ بیٹیں۔ زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ وہ سامنے ریٹورانٹ سے آئیے۔ شائندہ نے گھڑی دیکھی۔ اور پھر اس کی استاد کا گردنہ کر سکی۔ دونوں ریٹورانٹ کے صاف شھرے ہال کے ایک کونے والی میز پر آ بیٹھے۔ رفیقہ نے بیرے کو بلا کر چائے کا آرڈر دیا۔ شائندہ سے پوچھ کر اس کی پسینہ کی چیز چائے کے ساتھ منگوائی۔ چائے کے دوران باتیں کرتے رہے۔

رفیقہ نے آج اپنی سنجی زندگی کی بہت سی باتیں بھی اسے بتائیں۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ وہ کہاں پیدا ہوا۔ کن کے ہاں پیدا ہوا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ اسے بتایا دیا تھا کہ اک خیر صاحب نے اس کی دیکھ بھال کا ذمہ اپنے سر لیا تھا۔ مصوری کا پیدائشی شوق تھا۔ اس کے لیے اس نے تربیت بھی لی۔ تعلیم مکمل نہ کر سکا۔ تھوڑا دیر میں پڑھائی چھوڑ دی۔ پھر ملک سے

رفیقی اس کی باتیں سن کر مسکرایا۔ سر جھپکاتے ہوئے آدھا جلتا سگریٹ  
 ایش ٹرے میں مسل دیا۔ کتنی ہی دیر وہ اس سگریٹ کو مسلتا رہا۔  
 شائے چائے کے بعد کچھ دیر بیٹھنے اور باتیں کرنے کے بعد جانے  
 کے لیے اٹھی۔ رفیقی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ دونوں مخلص دوستوں کی  
 طرح نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی اپنی راہوں پر چل دیئے۔

تہمینہ یوسف نے کلب میں چائے دی تھی۔ ان کا فلیٹ چھوٹا سا تھا۔  
 یہاں زیادہ تھے۔ اس لیے بند و بست کلب کے خوبصورت لان میں کیا  
 تھا۔ چائے انہوں نے اپنی دوسالہ سچی شگفتہ کی سالگرہ کے موقع پر دی تھی۔  
 اس لیے اس تقریب میں بڑوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی شریک تھے۔  
 شائے بھی شیر می کو لائی تھی۔ چار ساڑھے چار ماہ کا بچہ تقریب میں حصہ تو  
 کیا لیتا۔ تہمینہ نے ہی تاکید کی تھی لانے کی۔ اس نے شیر می کو آج انتہائی خوبصورت  
 کپڑے پہنائے تھے۔ بڑا خوبصورت پیارا اور محنت مند بچہ تھا۔ ان دنوں خوب  
 سنہتا تھا۔ ذرا گدگدایا اور ہنستے ہنستے جے حال ہو گیا۔ اور بھی پیار سے پیار سے  
 بچے تھے۔ پھوٹے پھوٹے لڑکوں والی بچیاں سمارٹ نیکہ دل اور شرٹوں والے  
 لڑکے۔ نوید کی چھ ماہ کی سچی بڑی پیاری تھی۔ بچے خوش تھے۔ ادھر ادھر  
 دوڑتے پھر رہے تھے۔

چمن ان انسانی چہروں سے اتنا پرہیز کر رہا کہ اس کے اپنے چہروں کی

وہ آہستگی سے سر ہلاتے ہوئے۔ "اسے دو ایک دن اپنے ساتھ رکھوں گا۔ آپ بھیج دیا کریں گی۔"

"کیوں نہیں؟" شائے نے کہا۔

دوسرے دن ہی رفیق نے فون کیا۔ "آج شیریں کو چار بجے کے قریب بھیج دیں۔ میرا موڈ بن رہا ہے تصویر بنائوں گا۔"

"بہت اچھا۔" شائے نے کہا۔

اور اسی شام وہ بچے کو لے کر رفیق کے کمرے میں آگئی۔ آیا اس کے ساتھ تھی۔

کمرہ اس نے اچھا خاصہ کباڑ خانہ بنا رکھا تھا۔ بہت سی تصویریں تھیں۔ کچھ فریموں میں لگی تھیں۔ کچھ کاغذوں پر ہی بکھری تھیں۔ رنگ برنگ بہت کچھ تھا۔ شیشے کی چوڑی کھڑکی کے سامنے اینرل پر کپڑا پڑا تھا۔ نیچے سے فریم نظر آ رہا تھا۔ کوئی قد آدم تصویر بن رہی تھی۔

ایک طرف بیڈ تھا۔ دو بڑی بڑی کرسیاں تھیں اور ایک کونے میں میز رکھی تھی۔ جے ادھ جے سگرٹوں کے کمرے الیش ٹرے کے اندر اور باہر پڑے تھے۔ سائڈ ٹیبل پر بھی سگرٹ کی راکھ پڑی تھی۔ دہانٹ ہاؤس کی بوتل اور شیشے کا گلاس جگ بھی میز پر رکھا تھا۔

اس نے بڑی شائستگی سے شائے کا استقبال کیا۔ بچے کو اس نے ہاتھوں میں لے کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ پھر شائے سے بولا۔ "تشریف رکھیے۔" شائے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

وہ ہنسنا۔ "مخمرہ کمرہ آپ کے شان شایاں نہیں۔ بحر حال بیٹھے۔"

نوبھرتی ماند پڑ گئی تھی۔

شیریں کو بھی پایا کر رہے تھے۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھوں میں جارہا تھا۔ اس کی آیا ساتھ ساتھ تھی۔ شائے بھی بچوں کو خوب پایا کر رہی تھی۔ عثمان ان دنوں انگلینڈ میں تھے۔ ہفتے میں ایک بار فون کر کے وہ خیریت دریافت کر لیتے اور کام کی رفتار کی تسلی کر لیتے۔ بس کوئی مہینہ بھر کا ہی کام تھا۔ عثمان پیسے کے لیے ابھی تک سرگرداں تھے۔ ہفتے دو ہفتے تک کچھ کام بننے کی امید تھی۔ منسراجوید اور نوید سے شائے یہ باتیں کر رہی تھی۔ "نیا گھر خدا مبارک کرے۔" منسراجوید نے کہا۔

"شاندار پارٹی لیں گے۔" نوید بولا۔

"انشاء اللہ۔" شائے مسکرائی۔ "گھر کا افتتاح پارٹی ہی سے ہو رہا ہے۔" نصیر یوسف اور منسراجوید بھی ادھر ہی آگئیں۔ سب باتیں کرنے لگے۔ رفیق شاید آنے والوں میں سب سے آخری آدمی تھا۔ حسب معمول اپنے آپ سے لاپرواہ۔ سگرٹ پھونکتا وہین آنکھوں کی خیزی سے متاثر کرتا کھویا کھویا چلا آیا۔ لوگوں سے تعارف ہوا۔ جانے والوں سے ملا۔ شائے کو نظم جبک کر دی۔ شیریں کو بازوؤں میں دبوچ کر پیار کیا۔ ننھا فرشتہ۔ اس نے پیار سے کہا۔

چائے کے ہنگامے۔ کیے بعد اس نے شائے سے کہا میں شیریں کی بھی تصویر بنائوں گا۔

"یہ بھی جمالیاتی جس سے سکر گیا۔" شائے ہنسی

"ہر خوبصورت اور پاکیزہ چیز اپنا اثر رکھتی ہے۔" وہ بولا۔

"اس کی تصویر بھی حافظے کی مدد سے بنائیں گے۔" شائے نے پوچھا۔

دہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

بچے کو بازوؤں میں لئے دہ بیڑ کے کنارے پر اٹھیا۔ آیا کرسی کے قریب  
تالین پر بیٹھ گئی۔ دودھ کی بوتل اور پنک اس کے قریب ہی رکھ لیے۔  
کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شائستہ نے اس فریم کو دیکھنے کی  
خواہش ظاہر کی۔ جو یقیناً اس کی پورٹریٹ کا تھا۔ رفیقہ نے مسکاکر کہا۔ ”ابھی  
نہیں۔“ پھر رفیقہ نے شائستہ کے لیے چائے منگوائی۔ بیڑہ چائے کی ٹرے لے کر آگیا۔  
”آپ چائے نہائیں۔“ اس نے شائستہ سے کہا۔ اور خود بچے کے لیے جگہ بنانے  
لگا۔ اس نے دونوں ٹیکے اس طرح رکھ دیے کہ شیری آرام سے ان کے سہارے بیڑ  
پر پڑ گیا۔ وہ اپنے انگوٹھے کو چوسنے لگا۔ رفیقہ اپنا سامان اکٹھا کر کے فریم اینزل  
پر فٹ کرنے لگا۔

پھر شائستہ چائے پیتی رہی اور وہ تیزی سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس  
طرح مشغول کہ شاید اسے شائستہ اور آیا کی موجودگی کا ہوش بھی نہ رہا۔  
کافی دیر کے بعد شائستہ نے اجازت چاہی۔ وہ سخت بوڑھی تھی۔  
”بچے کو کل پھر بیچ دوں گی۔“ اس نے کھیتے کھیتے سو جانے والے شیری کی طرف  
دیکھا۔

رفیقہ کام میں مگن تھا۔ شائستہ کی بات کا ہوں ہاں میں جواب دے کر ہر کام  
کرنے لگا۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ تو شائستہ نے اس کے سامنے آکر اسے گرد پیش کا  
احساس دلایا۔ ”بھئی اب یہیں اجازت دو۔“

”کیوں۔“

”بہت دیر ہو گئی۔“

”باتی کل سہی۔“

”آپ جاسکتی ہیں۔“

آیا نے بچے کو اٹھایا۔ شائستہ نے ایک نظر اس خاکے پر ڈالی جو دہ بنا رہا  
تھا۔ ”کل شیری کو بیچ دوں گی۔“ وہ شوق سے ادھوری نامکمل لیکن خوبصورت  
تصویر کا سلیپ دیکھتے ہوئے بولی۔  
”شکریہ۔“ اس نے تیزی سے کام کرتے ہوئے کہا۔

”خدا حافظ۔“ شائستہ نے کمرے سے باہر آتے ہوئے کہا۔ اس نے مرنے  
کے ابتدائی اشارے سے جواب دیا۔ اور کام میں مشغول رہا۔ وہ شائستہ کو نیچے  
گاڑی تک چھوڑنے بھی نہیں آیا۔

دوسرے دن شائستہ نے شیری کو آیا کے ساتھ بیچ دیا۔ تیسرے دن بھی۔  
پھر رفیقہ نے آیا سے کہہ دیا۔ کہ بچے کو لانے کی ضرورت نہیں۔

کئی دن گزر گئے۔ رفیقہ خود آیا نہ تصویر بن جانے کی اطلاع ہی دی۔ اس  
دن شائستہ ہوٹل کے سامنے سے گزری تو تصویر کے متعلق پوچھنے کے لیے گاڑی  
لے آئی۔ پارکنگ کی جگہ گاڑی روکی اور چالی ہاتھ میں لیے فلور نمبر پانچ پر  
آگئی۔

رفیقہ کمرے ہی میں تھا۔ وہ کوئی غنیمت سمجھتا۔ ”بے بیٹا تھا۔“

ناک کر کے شائستہ نے اپنی آمد کی اطلاع دی۔

”ہوں لم ان۔“ رفیقہ نے کتاب سے نظر اٹھائے بغیر کہا۔

”ہو۔“ شائستہ اندر آتے ہی خوش دلی سے بولی۔ تو اسے دیکر وہ حیران سا

ہوا۔ پھر کتاب میز پر رکھتے ہوئے فوراً کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ اتنے دنوں سے غائب ہیں۔“ شائستہ نے کہا۔ شیری کی تصویر کا کچھ بتایا

میری تصویر کا کیا بنا۔ اس نے پوچھا۔

ابھی ادھوری ہے۔

کب تک بنے گی۔

آپ کچھ وقت دے دیں۔ تو شاید آپ کے لئے گھر میں شفٹ ہونے تک بن جائے۔

ضرور دوں گی آپ بتادیں۔ میں آجاؤں گی۔

شکریہ۔

وہ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

میں اپنی ادھوری تصویر دیکھ سکتی ہوں۔ وہ اشتیاق سے بولی۔

نہیں۔ اس نے کافی سختی سے کہا۔

وہ ہنس پڑی۔ چند لمحوں بعد بولی۔ ایک پورٹریٹ آپ کو ادھر بھی بنانا پڑے گی۔

کس کی۔

عثمان کی۔

وہ چپ رہا۔

شیری کی بن گئی۔ میری بھی بن جائے گی۔ عثمان کی بھی بنادیں تو

ہماری فیملی کی تصویر مکمل ہو جائے۔ بنادیں گے نا۔

عثمان صاحب سے مل کر ہی کچھ کہہ سکوں گا۔

وہ ملکا سا ہتھک لگا۔ نے ہونے بولی۔ بہت خوبصورت ہیں میرے پسند۔

یقیناً آپ کی جمالیاتی جس سے سحر میں گئے۔

اس نے سگریٹ الٹش ٹرے میں مسل دیا۔ اس کی بات کا جواب دینے

ہی نہیں۔

بن گئی ہے۔ وہ خوشی سے چمکتے ہوئے بولا۔

واقعی۔ شانہ تصویر دیکھنے کے لیے۔ بے تاب نظر آئی۔

دکھائیے۔ وہ بولی۔

تشریف رکھیے۔ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بیٹھی نہیں۔ تصویر دیکھنے کی شائق تھی۔ کہاں ہے دکھائیں نا۔

جون اچھا۔ اس نے کہا۔ اور پھر دیوار کی طرف الٹا کر رکھا ہوا کوئی دو

فٹ لمبا ایک فٹ چوڑا فریم اٹھایا۔ اسے دکھانے سے پہلے بولا۔ آپ کی تخلیق۔

بے شک بہت خوبصورت ہے۔ لیکن اپنی طرف سے میں نے بہت محنت کی ہے۔

اس نے تصویر سیدھی کر دی۔ شانہ تصویر پر ہنسی گئی۔ خوشی سے اس کا

چہرہ دمک اٹھا۔ اس نے جلدی سے تصویر اس کے ہاتھوں سے لے لی۔ تصویر

آئی ریٹل تھی۔ کہ لگتا تھا۔ شیریں ابھی تک فریم سے باہر آجائے گا۔

مان گئے صاحب مان گئے۔ وہ تصویر کو شوق سے دیکھتے ہوئے مسکرائے۔

شکریہ۔ وہ خوشی سے پھولانہ سمایا۔

شانہ تصویر کو دہریں رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک ایک زاویے سے تصویر

کو دیکھا۔ نایاب تھی واقعی۔ رفیقہ اس کی خوشی سے خوش ہو رہا تھا۔ شانہ دار

بھی تو بے اختیاری کے عالم میں دے رہی تھی۔

میں لے جا سکتی ہوں اسے۔ وہ سرشار بے میں بولی۔ اس کی قیمت کا اس

نے دانستہ نہیں پوچھا۔ فن کی بے حرمی تھی گویا۔ پھر بھی براہ چکانے کے لیے

اس نے سوچ لیا تھا۔ عثمان اسے دیکھ کر تو خدا جانے کیا کچھ دینے پر آمادہ ہو

ہو جائیں گے۔ رفیقہ نے تصویر بخوشی لے جانے کی اجازت دیدی۔

خریدی ہے۔ آپ دیکھیں گے نا۔ تو اپنی ساری چیزیں بھول جائیں گے۔  
 بوجھے تو بھلا کیا ہو سکتی ہے یہ چیز۔  
 "آں۔ بتا دوں۔" عثمان کی آواز میں شوخی تھی۔  
 "کبھی بھی نہیں جان سکتے۔" وہ زعم میں آکر بولی۔  
 "جان گیا ہوں۔"  
 "بتائیے۔"  
 "بتا دوں۔"

"ہاں ہاں۔ بتائیے۔ بوجھ جائیں تو مالوں۔"  
 "دنیا کا عظیم ترین اور حسین ترین تختہ تو مجھے شیر کی صورت میں دے  
 ہی چکی ہو۔"  
 "خدا یا۔ پوچھ کیا رہی ہوں۔ وہ بتائیں۔"  
 "اب۔ اب شیر کی کسی بہن بھائی کی نوید تو نہیں۔؟" عثمان  
 شوخی سے سنس دیئے۔

شائے کو ان کی بات پر سنسی آگئی۔  
 "یہی چیز میری ساری چیزوں کو بیچنا سکتی ہے شالو۔" وہ ہنسے۔  
 "بڑے آئے۔" شائے نے سنس کر کہا۔ اور پھر ان کے بار بار پوچھنے پر اسے  
 شیر کی پورٹریٹ کا بتانا ہی پڑا۔ اتنی تعریفیں کیں۔ کہ ان کا دل اڑ کر آنے کو  
 چلنے لگا۔

عثمان بے حد خوش ہوئے۔ "واقعی اس تحفے کے سامنے میری ساری خرید  
 و فروخت بیچ ہوگی۔ خیر حلد ہی آ رہا ہوں دیکھوں گا۔"  
 "ارں ہوں۔ جب نئے گھر میں جائیں گے تو دکھاؤنگی۔"

کی بجائے بولا۔ "کچھ نہیں کی۔ چائے یا ٹھنڈا۔"  
 وہ شکر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 رفیقہ نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔  
 "لائیے میں گاڑی تک لے جاؤں۔" اس نے تصویر شائے سے لے لی۔  
 شائے اور وہ ساتھ ساتھ چلتے نیچے آئے۔ شائے نے بہت بہت شکریہ  
 ادا کیا۔  
 "میں نے اپنی باقی تصویریں تو آپ کو دکھائی ہی نہیں۔۔ اسے جیسے بھولی  
 بات یاد آگئی۔  
 "پھر کسی دن آئی تو ضرور دیکھوں گی۔" شائے نے کہا۔

"شکریہ۔" وہ بولا۔  
 شائے خدا حافظ کہتے ہوئے گاڑی میں بیٹھی تصویر برابر والی سیٹ پر  
 رکھی۔ ہاتھ لایا اور گاڑی نکال کر لے گئی۔  
 شیر کی تصویر جس نے بھی دیکھی فن کی داد دے اٹھا۔ یہ تصویر تو شیر  
 کے عکس سے بھی زیادہ جاندار تھی۔ رفیقہ کے فن کا یہی کمال تھا۔  
 اس نے تصویر ماڈرٹیڈی نظریہ اور ایسی جی کو بھی دکھائی۔ وہ تو تصویر دیکھ  
 کر خوشی سے پاگل ہو جاتی تھی۔ سب نے تصویر کو بے حد سراہا۔  
 اور اس رات جب شان کا پیرس سے فون آیا۔ تو انہوں نے باتوں ہی باتوں  
 میں اسے بتایا۔ میں نے تمہارے لیے بڑی ہی نایاب چیزیں خریدی ہیں۔  
 لیکن دکھاؤں گا نہیں۔ اپنے گھر جا کر ہی تم ان چیزوں کو دیکھو گی۔ خوش  
 ہو جاؤ گی ایک دم۔"  
 شائے خوشی سے چپکتے ہوئے بولی۔ "میں نے بھی آپ کے لیے ایک چیز

” اچھا بھئی اچھا۔۔“  
 ” ایک اور تحفہ بھی ہوگا۔ گواس سے کچھ کم۔۔“  
 ” وہ تمہاری پورٹریٹ ہوگی۔ یہی نا۔“  
 ” کیسے جانا آپ نے۔“  
 ” الہام ہوا ہے۔“

” ہاں مانی۔ میری پورٹریٹ بھی بن رہی ہے۔ خدا کرے مکمل ہو جائے۔“  
 آپ آجائیں تو آپ کی بھی نواؤں گی۔ ہم نئی کوٹھی میں اپنی فیملی کی پورٹریٹس رکھیں گے۔“

” ضرور۔ ضرور۔“

عثمان کچھ دیر کام کے متعلق پوچھتے رہے۔ کوٹھی کی آرائش کا بھی پوچھا  
 شائے انہیں سب کچھ بتاتی رہی۔

” میرے بھی سارے کام ہو گئے ہیں۔ اس ہفتے فارغ ہو جانے کی قوی  
 امید ہے۔ وہ بولے۔ پھر انہوں نے اس سامان کا پوچھا۔ جو کچھ ہفتے پہلے  
 بیجا تھا۔ یہ سامان ابھی تک نہیں بلا تھا۔ شائے نے انہیں بتا دیا۔

” رفیقی صاحب آئے ہیں سیکم صاحبہ۔ نعمت خان نے شائے کو اطلاع دی۔“

” ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔“ اس نے کہا۔ وہ اپنی وارڈرو ب ٹھیک کر  
 رہی تھی۔ سارے کپڑے بیڈ پر ڈھیر کر رکھے تھے۔ اماں فضلاء قالین پر  
 بیٹھی تھی۔ وہ کپڑے استری کر کے شائے کو دے رہی تھی۔ شائے بڑے  
 اتناہم سے استری شدہ کپڑوں کو ہینگروں میں لٹکا کر وارڈرو ب میں رکھ رہی  
 تھی۔ صبح سے وہ اس کام میں مشغول تھی۔ سادہ سے کپڑے پہن رکھے تھے۔  
 بالوں کو بل دے کر جوڑا بنایا ہوا تھا۔

” اماں۔ تم یہ کپڑے استری کر کے رکھ دو۔ ہینگروں میں ہیں خود ڈالو  
 گی۔ شائے نے دوپٹے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ” مہمان آگئے ہیں۔“  
 ” اچھا جی۔“ اماں فضلاء بلاؤ پر استری چلاتے ہوئے بولی۔



میرا تپہ زدے دیجئے گا۔  
- کیوں -

- میں لوگوں کو غٹنے سے گھبراتا ہوں -

- یہ اچھی عادت نہیں رفیقی صاحب - اسی لیے تنہائیاں آپ کے اندر خور رو  
بیلوں کی طرح اگتی رہتی ہیں - لوگوں سے کھل کر ملا کریں - اس طرح کہ جس سے ملیں  
آپ کو یہی احساس ہو کہ آپ ان کے بہترین دوستوں میں سے ہیں - قریبی عزیز  
ہیں - آپ کی ساری تنہائیاں ختم ہو جائیں گی -

- مشورے کا شکریہ - وہ سنس دیا - شائے بڑے بزرگانہ انداز میں اسے  
تصیق کرنے لگی - تنہائی کو مٹانے کے لیے شادی کا مشورہ بھی دیا - رفیقی سر  
جھکا کر سرگٹ چوڑکتے مسکرائے - اس کی باتیں سننا رہا -

- آپ کہیں تو آپ کے لیے اچھی سی لڑکی تلاش کر دوں - شائے نے اجازت  
طلب نظروں سے اسے دیکھا - تو وہ سجدگی سے سرفنی میں ہلاتے ہوئے دھیرے  
سے بولا - ہر انسان کے کچھ آئیڈیلز ہوتے ہیں -

- یہ آئیڈیل کے چکر فضول اور بے معنی ہوتے ہیں - مفروضہ چیزیں حقیقت  
کی زندگی میں نہیں ملتیں - شائے نے کہا -

- مل تو جاتی ہیں حاصل نہیں - وہ ایک گہری سانس لے کر بولا - اور ان  
کا حاصل نہ ہونا ہی زندگی کا حاصل بن جاتا ہے -  
شائے مسکرائے -

کافی ختم کر کے رفیقی نے پیالی والپس رکھ دی - دوسری پیالی شائے نے آفر  
کی - لیکن اس نے شائستگی سے انکار کر دیا -

- میرا مرد ان دنوں آپ کی پورٹریٹ مکمل کرنے کا بن رہا ہے - وہ نیا سگریٹ ۵

شائے نے چپل پہنے اور بالوں کو ہاتھوں سے سوار - تے ہوئے ڈرائنگ روم  
میں آگئی -

رفیقی اٹھ کر کھڑا ہو گیا - اس نے سر جھکا - تے ہوئے سلام کیا - شائے  
نے خندہ پیشانی سے جواب دیا -

- بیٹھے - شائے بیٹھے ہوئے بولی - کیا حال چال ہے -  
- گذر رہی ہے بس - وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا - شائے کا سا دھ

اور نیا تھا - رفیقی تجسس نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا - حسن ہر حال میں حسین ہوتا  
ہے - وہ ہر لاکھنا چاہتا تھا - لیکن پاس ادب تھا کہ نہ سکا -

- بہت دنوں بعد آنے - مصروف تھے شاید - وہ بولی -  
- تنہا آدمی مصروفیت کا سہارا بھی نہ لے تو مر جائے - وہ پے در پے کش لیتے

ہوئے بولا -

شائے کا دل اس کے لیے دکھ گیا - اس کی طرف دیکھا - اس کے چہرے پر بڑی  
پر شرموگی تھی - اور تنہائی کی چھاپ واضح تھی - بڑا ہی ترس آیا اسے - اس پر رحم کھاتے

ہوئے بولی - رفیقی صاحب - سنا ہے آپ مہرودی جتا - نے والوں سے چڑھ جاتے  
ہیں - لیکن یقین مانیں مجھے آپ سے دل مہرودی ہے -

- شکریہ - رفیقی مسکرایا -  
دونوں باتیں کرتے رہے - فضل دین کا نبی بنا کر لے آیا - اس نے شائے اور

رفیقی کو کافی پیش کی -  
- شیریں کی تصویر جس نے دیکھی بے ساختہ داد دے اٹھا - شائے کافی کی

پیالی لیتے ہوئے بولی - بہت سے لوگ آپ سے ملنا چاہ رہے تھے -  
رفیقی نے کافی کا گھونٹ لے کر پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا - بھدا کسی کو

سب تیار تھے۔ رفیقی آج ضرورت سے زیادہ ہنسی کھویا ہوا تھا۔ کام کی گنج میں  
لگن تھا۔

شانہ ایک کمری پر بیٹھ گئی۔ رسی سی باتیں ہوئیں۔ پھر رفیقی نے اسے سٹول  
بیٹھنے کو کہا۔

شانہ سٹول پر جا بیٹھی۔

بال کھول دیں۔ رفیقی نے کسی فوٹو گرافر کی طرح اسے مختلف زاویوں سے  
پکھتے ہوئے کہا۔ شانہ نے جوڑے کی پنیں اتار دیں۔ کندھوں پر اس کے  
لال پھل گئے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

رفیقی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر چہرے کا زاویہ درست کیا۔  
ہر دیکھتی رہیں۔ اس نے شیشے کی کھڑکی کے مینڈل کی طرف اشارہ کیا۔  
شانہ ادھر دیکھنے لگی۔

چہرہ ذرا اونچا کیا۔ اس نے اس کی ٹھوری کو پچھڑک کر چہرہ اونچا کیا۔ شانہ کچھ  
ہلکی۔ لیکن وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ وہ اس کے چہرے کو صحیح سمت رکھنے کے  
بے کبھی ادھر کبھی ادھر کر رہا تھا۔ بالوں کو بھی چہرے سے ہٹانے اور ٹھیک جگہ  
لنے کے لیے اس نے بار بار چھوڑا۔

بس اب اسی طرح بیٹھ رہے گا۔ وہ جیسے نشے میں جھوم رہا تھا۔

شانہ بیٹھ گئی۔ اور وہ رنگوں کی دنیا میں کھو گیا۔ لمحوں بعد وہ شانہ کی طرف  
اٹھا کر دیکھ لیتا۔ اور پھر اس کے ہاتھ تیزی سے کام کرنے لگتے۔ وہ اس طرح  
تھا کہ اس کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ جل جل کر رکھ ہوتا رہا۔ اسے کش لینے  
دش نہ تھی۔

شانہ زیادہ دیر نہ بیٹھ سکی۔ اس کی گردن تھک گئی تھی۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑکی

سلگاتے ہوئے بلا۔

شکریہ۔

آپ کچھ وقت دے سکیں گی۔

ضرور۔

آج آسکیں گی۔

کس وقت۔

آپ وقت بتادیں۔ میں انتظار کروں گا۔

پانچ بجے آجاؤں۔

ٹھیک ہے۔ شکریہ۔

وہ کچھ اور بیٹھا۔ شیریں کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ آیا بچے کو بس آئی۔

وہ کچھ دیر شیریں کے ساتھ کھیلتا رہا۔

پھر اجازت ملے کر اٹھا۔ بھول نہ جانے گا۔

شانہ ہنس کر بولی۔ بھولنا آپ کی عادت ہے۔ کہیں آپ ہی نہ بھول جائیے

گا۔ میں آؤں اور آپ کہیں اور تشریف لے جا چکے ہوں۔

نہیں۔ نہیں۔ وہ خفت سے مسکرایا۔ پھر غرا حافظہ کہتے ہوئے چلا گیا۔

شام شانہ نے آسمانی فرخ شینوں کی پھولدار ساڑھی پہنی۔ ہلکا سا میک اپ

کیا۔ اور رفیقی کے ہونٹوں پر چل دی۔

وہ کمرے ہی میں تھا۔ کمرے حسب معمول الٹ پلٹ تھا۔ کہیں کتابیں تھیں

کہیں رنگ اور برش کچھ تیار داری تھیں۔ کچھ ادھورے خاکے تھے۔

کھڑکی کے قریب اینرل پڑا تھا۔ جو کٹھے پر کاغذ نہ تھا۔ جس پر کپڑا پڑا

ہوا تھا۔ اس کے سامنے ہی چندنٹ کے نائیلے پر سٹول تھا۔ رنگ برش

ہوئی۔ بس رفیقہ صاحب میری گردن اکڑ گئی۔

”اوہ خدایا۔۔۔ رفیقہ غصے سے جھلایا۔

لیکن شائے نہن پڑی۔۔۔ باقی کل سہی۔ مجھ سے نہیں بیٹھا جا رہا۔ گردن تھک گئی ہے۔

رفیقہ شائے کا منہ متعارف کیا۔ اور وہ اگر کسی میں بیٹھ گئی۔ گردن اس نے کسی کی پشت پر مسلمانہ انداز میں ڈال دی۔

رفیقہ زنجوں کی پلیٹ اور برش رکھ کر بیڈ کے کنارے پر آ بیٹھا۔ اس کا موڈ بگڑ گیا تھا۔ وہ شائے کو یوں تک رہا تھا۔ جیسے اس کی گردن دو بچنے کو چھپٹ پڑے گا۔ شائے کو نہن آئے رہی تھی۔

دوسرے دن آنے کا کہہ کر وہ چلی آئی۔

لیکن دوسرے دن وہ وقت پر نہیں گئی۔

اس دن موسم کچھ طوفانی سا ہو رہا تھا۔ جھک چل رہے تھے۔ اور مطلع ابڑا لوہا تھا۔ آسمان کے کنارے کالے اور سرمئی بادلوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اور در ان بادلوں کے سینوں میں جیلیاں چمک رہی تھیں۔ شائے کو ایسے موسم سے بڑا خوف آتا تھا۔

سو پانچ بجے کے قریب رفیقہ کا فون آیا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی آواز میں سخت غصہ اور الجھاؤ تھا۔

شائے نے مخدرت چاسی۔۔۔ کل سہی۔ آج موسم خراب ہے۔

اور اس کی ساری معذرتوں کو درگزر کرتے ہوئے وہ چیخا۔۔۔ میں آج کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو آنا ہے۔ اگر نہ آئیں۔ تو میں یہ تصویر پچاڑ دوں گا۔ ناٹال کر دوں گا۔ میں تصویر بنانے کی ٹیکن میں مر رہا ہوں۔ پیشتر اس کے ختم ہو جاؤ

آپ آجائیں۔ میرا شہکار ضائع نہ کریں۔

اس کا انداز جارحانہ تھا۔ اس کے موڈ سے وہ واقف تھی۔ اس کے اندر کے کھلا تے فنکار کی گونج اس کی آوازیں تھی۔ وہ تیار ہونے لگی۔

کل والی سارھی مہنی۔ بال کندھوں پر لہراتے چھوڑ دیئے۔ ہلکا سا میک اپ کیا۔ اور باہر نکل آئی۔ موسم بے شک اچھا نہیں تھا۔ وہ ڈر بھی رہی تھی۔ لیکن ابھی بادل اڑتے پھر رہے تھے۔ اور جن کے سینے میں جکیوں کے خنجر اتر رہے تھے۔ وہ دور آسمان کے کناروں پر پڑے تھے۔

اس نے ایک نظر آسمان پر ڈالی۔ اور گاڑی نکال کر سڑک پر لے آئی۔

متوڑی دیر بعد وہ رفیقہ کے کمرے میں تھی۔

کوئی اور ہوتا تو میں گھر سے قدم بھی باہر بھی نہ نکالتی۔ آپ نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں آگئی۔ اس نے آتے ہی رفیقہ سے کہا۔

رفیقہ بیڈ میں۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ حسب معمول اس کا استقبال کیا۔ شائے نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں لال

انگلہ تھیں۔ ہمیشہ الجھے رہنے سے بال بالکل بے ترتیب تھے۔ شائے کا دل ڈھل گیا۔ کہیں اس نے بے تحاشائی تو نہیں رکھی۔ اس نے سوچا۔ میری طبیعت بہت خراب ہے آج۔ آپ نہ آئیں۔ تو شاید زیادہ ہی بگڑ جاتی۔ میں بہت جلد یہ تصویر

کلک کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ وہ رک رک کر کہہ رہا تھا۔ وہ لہرا رہا تھا۔ اس کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔

شائے اس کے کہنے پر نٹول پر جا بیٹھی۔ اور چہرے کا زاویہ کل کی طرح بناتے ہوئے کھڑکی کے ہینڈل کی طرف دیکھنے لگی۔ باہر جھکڑوں کی تندہی بڑھ رہی تھی اور بادلوں کا ٹکڑاؤ ہونے لگا تھا۔

رفیقہ نے سر کے ہلکے سے جھٹکے سے ماتھے پر جھک آنے والے بالوں کو بھیجے لایا۔ ایزل کی طرف گیا۔ زنگوں کی ٹیٹ اور برش اٹھایا۔ شائے کی طرف دیکھا۔  
تھکے اشارے سے اسے چہرہ دائیں طرف گھمانے کو کہا۔  
"ذرا ادھر۔ اس نے دوسری طرف اشارہ کیا۔  
شائے نے چہرہ ادھر کیا۔ لیکن زادیہ شاید ٹھیک نہیں تھا۔ رفیقہ لیٹ  
دربار شد کہ کراس کی طرف آیا۔ اور ہاتھ سے اس کا چہرہ درست زادیہ پر  
لانے لگا تھا۔  
ک  
شائے نے بے اختیار اس کی کلائی کو چھوا۔ "رفیقہ آپ کو بخار ہے۔"  
"ہاں۔" وہ لا پرواہی سے بولا۔ پھر انگلیوں سے شائے کی ٹھوری پکڑ کر  
چہرے کا زادیہ درست کیا۔ شائے جیسے جلتے انگاروں سے چھو گئی۔  
"ہائے اللہ۔ آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔" وہ گھبرا کر اسے مہر دوا نکال  
سے دیکھنے لگی۔  
"ادھر۔" وہ برس پڑا۔ "بخار ہے تو کیا ہوا۔ آپ ٹھیک رخ بیٹھی رہیں  
نہیں۔ شائے سٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آپ کی طبیعت بہت خراب معلوم  
ہو رہی ہے۔ ٹھیک سے کھرا بھی نہیں ہوا جا رہا۔"  
"منہ فرمان۔" وہ غصے سے گھورتے ہوئے بولا۔ "میرا موڈ تصویر بنانے کا ہے  
پاکل تو نہیں ہو گئے آپ۔" شائے کو اس پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ "پلیٹ  
لیٹ جائیے بہتر میں۔ آپ تو جل رہے ہیں جیسے۔"  
وہ چند لمحے چپ کھڑا رہا۔ اس کا دماغ پکڑا رہا تھا۔ بدن حل رہا تھا۔  
لیکن آج تصویر بنانے کے لیے بے چینی تھپ بن رہی تھی۔ اس نے شائے

سے پھر بیٹھنے کی درخواست۔ پلیز۔ بیٹھ جائیے۔۔  
نہیں۔ شائے نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے اسے بیڈ پر لیٹے کا حکم  
دیا۔ موسم بھی خراب ہو رہا ہے۔ لا پرواہی سے طبیعت، اور بگڑ جائے گی۔  
آپ اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔  
رفیقہ نے ایک گہری سانس لی۔  
شائے نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے یوں پکڑا کہ جیسے وہ  
چھوٹا سا بچہ ہو۔ "شباباش پلیٹ۔ پلیٹ بہتر میں۔"  
رفیقہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ شائے کی مہر دوی سے اس کا دل گچھل  
گیا۔  
بیار ہونا اس کے لیے کوئی بڑی اور تشویش کی بات نہیں تھی۔ کبھی کبھی بیار  
پڑ جاتا کرتا تھا۔ کوئی پانی کا گھونٹ دینے والا بھی پاس نہ ہوتا تھا۔ اس لیے اس  
نے اب بیاری کو اہمیت دینا ہی چھوڑ دی تھی۔ اپنے آپ کو چھوٹی موٹی کالیف  
کا عادی بنالیا تھا۔ جبر صبر سے سب کچھ جھیل لیا کرتا تھا۔  
"لیٹ جائیے نا۔" شائے اس کے قریب آ گئی۔ پھر بولی۔ "تھراپیٹر ہو گا۔"  
نہیں۔ وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولا۔  
شائے نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر موسم بے حد خراب تھا۔ آندھی نے  
طوفانی صورت اختیار کر لی تھی۔ کالے کالے بادل بھی آسمان میں ادھر ادھر  
اڑتے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی گرج بھی سنائی دیتی۔ جھکڑوں کی ندی نے بادلوں  
کو کھانک کر برسنے کی صورت پیدا کر دی تھی۔ کوئی دم میں موسلا دھار بارش  
ہونے کا امکان تھا۔ شاں شاں کی آوازیں ہولناک ہونی جا رہی تھیں۔  
موسم خراب نہ ہوتا۔ تو شائے خود اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی۔ لیکن ایسے

رفیقہ کچھ نہیں بولا۔ وہ تو رکیک ہو جانے والے دل کو شکل بنجھال رہا تھا۔ سیال سی شے آنکھوں میں امانڈی آرہی تھی۔  
 شائد بیڈ کے قریب دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا رفیقہ کی بند آنکھوں کے کونے جھپک گئے تھے۔ پھر وہ آنسو لڑھک لاس کی کانوں کی لودن کو چھوتے تیجے میں جذب ہو گئے۔ شائد  
 - رفیقہ - شائد نے گلوگیر آواز میں اسے پکارا۔  
 وہ کچھ نہیں بولا۔

شائد نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اللہ۔ آپ یہاں اکیلے کیسے رہیں گے۔ چلے میں آپ کو اپنے ساتھ گھر لے جاتی ہوں۔ یہاں دیکھ جال کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔  
 رفیقہ نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی ازیت وہ مسکرا رہی تھی۔

- میں آپ کو یہاں اکیلے چھوڑ کر نہیں جاؤنگی رفیقہ - وہ بولی۔

- میں ان چیزوں کا عادی ہوں - وہ دکھ سے بولا۔

- نہیں - میں برداشت نہیں کر سکتی رفیقہ - اتنا تیز بخار اور اکیلے پڑے رہیں گے رات بھر - میں آپ کو گھر لے جاؤں گی - وہاں آپ کی دیکھ جال تو ہو سکے گی - ٹھیک ہو جائیں تو آجائے گا۔

رفیقہ نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کوئی اس کے لیے بھی بے چین تھا۔ اس کی تنہائی کے درد کو بھی محسوس کر لے والا تھا۔ اس کی تکلیف سے دل میں تڑپ محسوس کر رہا تھا۔ اسے سکون دینے کے لیے دامن پھیلارہا تھا۔ یہ ساری بچائیاں رفیقہ کی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ تھیں۔ اسے ان باتوں پر یقین

موسم سے تو وہ خوفزدہ رہتی تھی۔  
 - موسم بہت خراب ہے۔ دوائی - شائد نے کہا۔  
 - دوائی کی ضرورت نہیں - وہ بولا۔  
 - اسپرڈ وغیرہ ہے - چائے کے ساتھ دہی رہے لیں - شائد فکر مند نظر آرہی تھی۔  
 وہ ہنس پڑا۔ شائد کی طرف سرخ انگارہ سی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ بڑی فکر مند اور پریشان نظر آرہی تھی۔  
 - اتنی ہمدردی نہ جلائیے غمر مرہ - وہ بڑی بے چارگی سے بولا۔  
 - کیوں - شائد نے پوچھا۔

- مجھے اپنی کسی مہر سے کا زیادہ احساس ہو گا تنہائی کا ہر شے کی عادت نہ ہے گی۔ وہ مسکرایا۔

شائد کامل جیسے کٹ گیا۔ اس کی تنہائی کا دکھ اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ شائد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

- لیٹ جائیے - اس نے رفیقہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہہ منت کہا۔  
 اور پھر آہستگی سے اسے بیڈ میں لٹا دیا۔ چادر اٹھائی اور اس کے سینے تک ڈال دی۔ بیل کر کے اس نے بیرے کو بلایا۔ چائے منگوائی۔ اور تھرا میٹر بھی لادینے کو کہا۔ وہ بیرے کو فوری طور پر سب چیزیں لانے کی تاکید میں دودھ منڈی سے کر رہی تھی۔ رفیقہ کا دل رکیک سی شے بنا جا رہا تھا۔

بیرے کے جانے کے بعد وہ بیڈ کے قریب آئی۔ جھپک کر رفیقہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی انگلیاں جل اٹھیں۔

- انوہ - خدا یا - کتنا تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر کو یہیں نہ بلا لیں - اس نے کہا

ساتی نے اسے مئے دو آتشہ پلا دی ہو۔

شانہ نے پیالی سائید ٹیل پر رکھ دی۔ "اب آرام سے چادر اوڑھ کر لیٹ جائیے۔" اس نے ملائت سے کہا۔ "بارش رک جائے تو گھر چلیں گے۔" وہ پلنگ کی پٹی سے اٹھنے ہی کو تھی۔ کہ بجلی کہیں تڑپ کر اس طرح گری کہ جیسے کئی سو من وزنی بم گر اس پر۔ شانہ نے اک چپ ماری۔ اور بے اختیار رفیقہ کو پکڑ لیا۔

رفیقہ ساتی کی اس عنایت اور اس بے اختیار سپردگی سے ہوش و حواس سے جیسے بگا دسا ہو گیا۔ اُن ہونی کے ہو جانے کو برداشت کر لینا آسان تو نہیں ہوتا۔

شانہ نے ایک لمحے کو رفیقہ کو پکڑ لیا تھا۔ یہ اس کا فی شعوری فعل تھا۔ اس لمحے کو دھکیل کر خفت محسوس کرتے ہوئے وہ اٹھنے ہی کو تھی۔ کہ دوبارہ کسی ٹین کے خنک و خاشاک جلانے کو بجلیاں ایک دم کونڈیں اور دھماکے سے گریں۔ اس طرح کہ فضا میں کتنی دیر گر گڑا سٹ گونجتی رہی۔ شانہ اس لمحے کو پوری طرح دھکیل بھی نہ پائی تھی۔ کہ دوبارہ اس کو گرفت میں لے لیا۔ اس نے رفیقہ کے کندھوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور کبلی ایک بار پھر جھٹکا کر کڑکی تو شانہ کندھے کے ساتھ لگ گئی۔ بڑی ملائت سے رفیقہ نے اپنے بازوؤں کے حلقے میں اس کے ڈور اور خوت سے کانپتے وجود کو لے لیا۔

اور اس لمحے کے ہزاروں حصے میں اس کے اندر کا چھپا ہوا وحشی انسان جاگ اٹھا۔ یہ وحشی کچھ لوہی بھی نہ تھا۔ کہ ناکا میوں کی تیز دھار کی تلوار کی زد میں ہمیشہ آیا رہتا تھا۔

ہر انسان کے اندر ایک وحشی انسان چھپا ہوتا ہے۔ یہ وحشی انسان نہ ہوتا تو

ہی نہیں آ رہا تھا۔

بہرہ چائے اور تھرا میٹر لے گیا۔ شانہ نے سائید ٹیل سے اسپرنگ کالی پیالہ میں چائے بنائی۔ اسپرنگ کیکیاں کا تھہرے نکال کر تھیلی پر رکھیں۔

رفیقہ۔

وہ کچھ نہیں بولا۔

رفیقہ۔ شانہ نے اس کو ہلایا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں کی سرخی جل تھل تھی۔

باسر موسم جل تھل تھا۔ ایک ایک پانی پٹنے لگا تھا۔ ہوائیں اب بھی تند تھیں۔ بادلوں کی گرج چمک بہت بڑھ گئی تھی۔ شانہ چائے کی پیالی لیے رفیقہ پر جھلنے کو تھی۔ کہ بادل زور سے گر جا۔ شانہ کا ہاتھ کانپ گیا۔ اور پیالی اٹھنے لگتی

بشکل کچی۔

چائے۔ اسپر۔ وہ جلدی سے بولی۔

رفیقہ نے انکار میں سر ہلایا۔

پاکل نہیں ہو۔ کچھ تو افاقہ ہوگا۔ شانہ نے جلدی سے کہا۔

رفیقہ اٹھ بیٹھا۔ شانہ نے اسپر واس کے ہاتھ میں دیدی۔ اور پھر چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ رفیقہ کے ہاتھ میں پیالی ڈولنے لگی۔ شانہ نے جلدی سے پیالی پکڑ لی۔ اور پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر چائے کی پیالی سے گھونٹ گھونٹ چائے اسے پلانے لگی۔ وہ ناقابل یقین انداز میں کبھی شانہ کو اور کبھی پیالی کو ٹک رہا تھا۔

شانہ نے پوری پیالی اسے پلا دی۔ اور۔

رفیقہ نے سر کو جنبش دی۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے چائے نہیں بہرا

پھر  
وہ ہو گیا  
جو  
نہیں ہونا چاہئے تھا۔  
کبھی نہیں۔  
کبھی بھی نہیں۔  
کبھی بھی نہیں ہونا چاہئے تھا۔

تو دنیا میں کسی مذہب کی ضرورت نہ تھی۔ کسی ضابطہ اخلاق کی پابندی ضروری نہ تھی۔ کسی کرداری اصول کی ضرورت نہ تھی۔ یہ مذاہب، ان کی حد بندیاں، اخلاق کے ضابطے، کردار کے اصول صرف اسی وحشی کو پابند کرنے کے لیے ہی تو ہیں۔ لیکن یہ بھی بڑا سرکش ہے۔ ذرا بھی ڈھیل ملی۔ یا پابندی میں جھول دیکھا۔ تو جھٹ سے ہل بول دیا۔ اور جب اس طرح یہ ہل بولتا ہے تو اس کی ہلاکت آفرین اور خونخواری انسانیت کی ہر قدر کو پائمال کر دیتی ہے۔ روند ڈالتی ہے۔ ہلاک کر دیتی ہے۔

اور

جنس

اس کا بھی کوئی مذہب نہیں۔ نہ ہی یہ کسی اخلاقی ضابطے کی پابند ہے۔ یہ تو صرٹ اور حرف موقع کی پابند ہے۔ موقع مل جائے تو پھٹ پڑتی ہے۔ پھر جاتی ہے۔ بس۔ اندھی بہری اور گونگی ہو جاتی ہے۔  
باہر موسم نے کہرام مچا رکھا تھا۔ بکلیاں تڑپ رہی تھیں۔ بادل گرج رہے تھے اور بارش اندھا دھند برس رہی تھی۔

قیامت کا شور مچا تھا۔

جیسے نوے بن اور جنیں سب آپس میں گڈ بڑھ گئے ہوں۔  
رفیق کے بازوؤں کی گرفت آہنی ہو گئی تھی۔ اور اس کے ہونٹ۔

پیا سے

بٹلے

اور لذت سے محروم ہونٹ شانہ کے ہونٹوں میں پیوست ہو گئے تھے۔

پھر

لیکن

کہیں خداؤں کی بے مرتبی بھی کی جاتی ہے؟ انہیں ذلیل و خوار بھی کیا جاتا ہے؟

خواہشات کی سولی پر کبھی خداؤں کے وجود بھی لٹکائے جاتے ہیں؟  
شانہ روتے ہوئے چہیتے ہوئے اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ نوپنا کھسوٹ رہی تھی۔  
اور وہ تھر کے بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا اپنے فتن میں اٹھنے والوں کا جواب  
دے گا۔ اے اپنا جرم ناقابل معافی لگ رہا تھا۔ اتنے بڑے جرم کے لیے  
بوسوت کی سزا کوئی سزا ہی نہ تھی۔ وہ اپنے بہک جانے والے ذہن و وجود کو  
بانے کس طرح کی شدید ترین سزائیں دینے کے متعلق سوچ رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر کا وحشی انسان قہقہے لگاتے ہوئے اس  
امنہ چڑا رہا تھا۔ اور بار بار گھنڈار آواز میں کہہ رہا تھا۔ تمہارا خدا اتنا جھکے گا  
یا تھا۔ کہ تمہاری گرفت میں آگیا۔ خدا تو بندے کو دسترس میں رکھتا ہے۔ بندے  
دسترس میں نہیں آتا۔ محبت کے خدا کی بھی یہی خاصیت ہے۔ تم اتنے  
صور وار نہیں ہو۔ اتنے بڑے مجرم نہیں ہو۔

طوفان گرد و باران تباہی پھیلا کر اب تدر سے تم چکا تھا۔ بیکمیاں اشیانے  
بوک کر دم توڑ چکی تھیں۔ ہادلوں کے سینے خالی ہو چکے تھے۔ اب گر جھنکا  
وہ نہیں رہا تھا۔

پچھتاوے اور دکھ کی آگ بھی تندی سے جل رہی تھی۔ رفیق کا بخار میں جلتا  
بوداب اس آگ میں بھی جل رہا تھا۔ وحشی کی گود بخوار لٹاکر کے باوجود رفیق  
سناں جرم سے مراجار رہا تھا۔ وہ شانہ سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ معافی۔  
نذرت اور ندامت گدہ جانے والے سانچے کی تلاقی نہ کر سکتی تھی۔ شانہ

شانہ نے رفیق کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

اس کے منہ پر پوری قوت سے طمانچے مارے۔ اس کی چھاتی پر سرسبز در زور  
سے ٹپچا۔ اس کے بازوؤں میں ناخن گاڑ دیئے۔ اس کی کلائیوں کو کاٹ لیا۔  
اس پر مجبوزانہ کیفیت طاری تھی۔ وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔

لیکن

گذر جانے والے طوفانی لمحے اس کی گرفت میں نہیں آ سکتے تھے۔

رفیق بھی ہوش میں آچکا تھا۔ ندامت خفت اور ٹوٹ پھوٹ جانے کا  
احساس اتنا غالب تھا۔ کہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شانہ کی دیوانگی حتی بجانب سمجھ  
کر سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ یہ سب کیوں ہوا تھا؟ کیا ہوا تھا؟ اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا  
تھا۔ شانہ کو تو پہلی بار دیکھ کر ہی اس نے اسے محبت کا خدا مان لیا تھا۔ چپکے  
چپکے بغیر احساس دلانے اس خدا کی پرستش کر رہا تھا۔ یہ پرستش ہی اب اس کی  
زندگی تھی۔



روتے روتے بے حال ہو گئی۔ چیختے چیختے بے دم ہو گئی۔ کچھ لمبے تو وہ ہوش سے بھی بیگانہ رہی۔

لیکن

رفیقی تھرا یا سا بیٹھا رہا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ اس کے ہاتھوں نے شانہ کو سہارا دینے کے لیے حرکت تک نہ کی۔ بچی بچی نظروں سے محبت کے اس خدا کو دیکھ رہا تھا۔ جوشا یا اپنی غلطی سے یا اس کی لغزش سے انتہائی بندیلوں سے پستوں میں منہ کے بل گر چکا تھا۔

کئی دن شانہ کے حواس بجا نہیں ہوئے۔ بیٹھے بیٹھے چیختے لگتی۔ زور زور سے رونے لگتی۔ گرم پٹی رہتی۔ خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ اپنے آپ سے گرد پیش سے بیگانہ ہو جاتی۔ ساری ساری رات چن چن میں ننگے پاؤں ننگے سر گھومتی رہتی۔ گھر میں نوکر چاکر ہی تھے۔ پہلے تو کسی نے دھیان نہیں دیا۔ مالک اور نوکر دونوں میں حد فاصل بھی تو تھی۔ لیکن اماں فضلاں اس کی حالت سے متفکر ہو گئی۔ اس نے ڈاکٹر کو بلانے کا مشورہ دیا۔ تو شانہ نے اس کا منہ نوچ لیا۔

اماں فضلاں کے ذہن کی دھڑ جہاں تک ہو سکتی تھی ہوئی۔ شانہ کی حالت دیکھ کر اس نے فتوہ دے دیا کہ یکم پر ایسی سایہ ہے۔ دم درد و تعویذ دھاگے سے یہ بھلا رفع ہو سکتی ہے۔ لیکن اس بات پر بھی شانہ نے اسے ڈانٹ دیا۔ "ماما کو بلا بھیجیں۔" اماں فضلاں نے ڈانٹ ڈپٹ کھانے کے باوجود شانہ سے پوچھا۔ "تو شانہ نے اسے کھڑے کھڑے گھر سے نکل جانے کا حکم سنایا۔ اور خود بستر میں گر کر پھوٹ پھوٹ کر رہنے لگی۔ نوکر بے چارے پریشان تھے۔ نعمت خان اور اماں فضلاں نے برابر والوں کی وادی اماں کو بلانے کا سوچا۔ بزرگ عورت تھیں۔ نماز روزے کی پابند۔ ہر دقت

تسلیں کرتی رہتی تھیں۔ وہی کچھ پڑھ کر دم کریں تو شاید یکم صاحبہ کی حالت ٹھیک ہو جائے۔

بنا پوچھے وہ دادی اماں کو بلا لائے۔ شانہ اس وقت بیڈروم میں تھی۔ کھڑکی میں کھڑی در خلاؤں میں کچھ کوچ رہی تھی۔ لباس بے ترتیب تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ لب خشک اور بے رنگ تھے۔ نے اندر متواتر آنسو اتار رہے تھے۔ لیکن آنکھیں بالکل خشک تھیں۔

بچی۔ وادی اماں نے اسے محبت سے پکارا۔

شانہ نے ایک دم ہلٹ کر دیکھا۔ وادی اماں سفید جوتے میں سامنے کھڑی تھیں۔ چہرے پر شفقت تھی۔ آنکھوں میں ملائمت۔ تسلی حسب عادت ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھیں۔

"کیا بات ہے بیٹی۔" انہوں نے مکر مکر بے نور نور نظروں سے تیکے جانے والی شانہ کو دیکھا۔

"مردوں سے اکیلی نہ لاکر دبی۔ شیطان زندہ ہے۔ اسلام نے جو حد بندی کیا کی ہیں نہ۔ وہ بے مقصد نہیں۔ جوان بیٹی کے بستر پر گئے بھائی اور باپ کو بھیجنے کی اجازت اسلام نہیں دیتا۔ کہ شیطان موقع کا متلاشی ہوتا ہے۔ بھکا دیتا ہے۔ انسان بڑا کمزور ہے۔ اس کے پھندے میں پھنس جاتا ہے۔"

شانہ وادی اماں کو بچی بچی نظروں سے تیک رہی تھی۔ اور ان کے وقتاً فوقتاً کہے ہوئے جملے اس کے کانوں میں اتر رہے تھے۔ ان جملوں نے قیامت پادی۔ شانہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا وجود کانپنے لگا۔ وہ پیسے پیسے ہو گئی۔

"بیٹی۔ وادی اماں نے اس کے کندھے سے تھام لیا۔

بھی کروائے۔ دادی اماں سے پانی دم کر کے بھی پلایا۔

ڈاکٹر کی طرح ان کا بھی خیال تھا۔ کہ شائے عثمان کی جلدی کو اس حد تک محسوس کر رہی ہے۔ تنہا بیٹے کی چونکہ عادی نہ تھی۔ اس لیے اس کا اثر بہت زیادہ لیا ہے۔

عثمان کے اسی پینتے آنے کی توقع تھی۔ لیکن اس دن ان کا فون آگیا۔ پیسے تو وہ سارا اکٹھا کر چکے تھے۔ کچھ بھجوا بھی دیا تھا۔ لیکن باقی بھجوانے کے لیے خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ وہاں پہنے والوں کے ذریعے پیسہ منتقل کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے کافی وقت لگ گیا تھا۔ انہیں تین چار ہفتے مزید وہاں رکنا پڑا تھا۔ یہ فون بھی ماما نے ہی ریلو کیا۔

شائے کی خرابی طبع کا انہوں نے دائرہ ذکر نہیں کیا۔ جب عثمان آئیں سکتے تھے۔ تو انہیں پریشان کرنے کی ضرورت بھی کیا تھا۔ ویسے انہوں نے یہ کہہ دیا کہ شائے ان کی دوری کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی ہے۔ انہیں جتنی جلدی ممکن ہو واپس آجانا چاہیے۔

- دادی اماں — شائے نے اک زوردار چیخ ماری۔ ان سے اس کا لہرانا وجود منبھالانہ جاسکا۔ وہ لہرا کر گر گئی۔ چیخ کی آواز سن کر آیا اماں فضلاں اور نعمت خان دوڑے آئے۔

شائے بے ہوش ہو چکی تھی۔

فضل دین ڈاکٹر لینے دوڑا۔ اور آیا نے اماں فضلاں اور دادی اماں کی مدد سے اسے بیڈ پر ڈالا۔ دادی اماں قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر ہونٹے لگیں۔ ڈاکٹر کے آنے تک اسے ہوش آچکا تھا۔ اور وہ دادی اماں کی گود میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ جن باتوں کا وہ بڑی فراخ دلی سے مذاق اڑایا کرتی تھی۔ آج ان کی ہر گہر بکائی کی معترف تھی۔ کچھ سادہ جان لیوہ تھا۔ ڈاکٹر نے دیکھا۔ کچھ سوال کیے۔ پھر ذہنی سکون کے لیے چند دوائیاں لکھ کر دیں۔ اسے معر ف ہونے کا مشورہ دیا۔ اس کے خیال کے مطابق یہ سب تنہائی کا زہر تھا۔ دادی اماں نے بتا دیا تھا۔ کہ تین ماہ سے اس کے شوہر باہر ہیں۔ ڈاکٹر کی تحقیق انہی غلط طرہ تھی۔

فضل دین نے شائے کی خرابی طبع کا ماما کو بھی بتا دیا۔ اس دن ماما کا فون آیا۔ شائے دوائیوں کے اثر سے بے سدھ تھی۔ فون پر فضل دین ہی نے بات کی۔

ماما یہ خبر سنتے ہی آگئیں۔

اور  
ان کا آنا شائے کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بن گیا۔ وہ اپنے دھم مان کو بتا بھی نہ سکتی تھی۔ اور انہیں چھپانے کی بھی بہت نہ پاتی تھی۔ کشمکش نے اسے بے حال کر دیا۔ ماما تو ڈاکٹروں کے پیچھے پھرتی رہیں۔ تنویر گند

ماما نے سب کی طرف سے انہیں مطمئن کر دیا۔

شائندہ ماما کے آجانے سے اپنے آپ کو حواس میں رکھنے کی شعوری کوشش کر رہی تھی۔ ان کے سامنے نارمل ہی رہتی۔ راز کے افشا ہونے کے خوف نے اسے اب محتاط بنا دیا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ عثمان کے لیٹ ہو جانے سے شائندہ کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اب وہ زیادہ تنہا موش ہی رہتی۔ کلبجے میں پھانس اٹکی ہوئی تھی۔ ازیت اپنی جگہ تھی۔ درد بھی موجود تھا۔ کک بھی ہوئی تھی۔ لیکن سب کچھ بڑی خاموشی سے جھیل رہی تھی۔

ماما چند دن رہ کر چلی گئیں اسے اپنے ساتھ لے جانے کی انہوں نے بے حد کوشش کی۔ لیکن شائندہ نہ گئی۔ اپنی طبیعت ٹھیک ہونے کا اس نے ماما کو ہر طرح سے یقین دلایا

ماما کے جانے سے اس واقعی ذہن سے بہت بڑا بار اترتا محسوس کیا۔ ہر اک پر لہجہ جو افشا۔ بے راز کا دھڑکار رہا تھا۔ اس سے تو نجات ملی تھی۔ اب بچھاوے اور ماتم کے لیے پوری آزادی تو تھی۔ اب تو وہ تھی اور اس کی پریشانیوں۔ کبھی تو پریشانیوں سے واسن چڑھ کر شہاش بٹاش بننے کی کوشش کرتی اور کبھی ان میں اس طرح ڈوب جاتی کہ اپنے آپ کا بھی ہوش نہ رہتا۔ کشمکش کے اس نئے دور میں اس کا ذہن اب پوری طرح کام کرنے لگا۔ نا۔ خود ہو چکا تھا۔ اس کی ہلاکت آفرینی کا احساس تھا۔ لیکن

اب یہ بھی سوچنے لگی تھی۔ کہ اس ہو چکنے کی وارثت کا کیا کیا جائے۔ دن رات وہ یہی سوچتی رہتی۔ اپنے آپ سے سوال کرتی۔ اپنے ضمیر کو

- انتہائی مجبوری ہے ماما۔ میں تو خود واپس آنے کے لیے بے چین ہوں۔ تین چار مہینوں میں بھی جان چھٹ جائے تو غنیمت ہے۔ - عثمان نے ماما کو جواب دیا۔ پھر انہوں نے شائندہ سے بات کرنا چاہی۔ - وہ تو مسٹر یوسف کے بچے کی سالگرہ پر گئی ہوئی ہے۔ - ماما نے دانستہ بہانہ بنا دیا۔ شائندہ اس وقت سو رہی تھی۔ اسے بے آرام نہیں کرنا چاہتی تھیں دوسرے یہ بھی ڈرتھا۔ کہ فون پر وہ کچھ الٹ پلٹ نہ مار دے۔ جس سے عثمان کو اس کی فرائی طبیعت اور ذہنی پیر مردگی کا اندازہ ہو جائے۔ جہاں دیدہ عورت تھیں۔ کالے کوسوں دور بیٹھے عثمان کی پریشانی کا احساس تھا۔ اس پر مزید پریشان نہ کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ - عثمان نے شیریں کی خیریت دریافت کی۔ پھر گھر کے متعلق کچھ ہدایات دیں۔ اپنا کام جلد از جلد کرنے کی کوشش کا بھی کہا۔

متعجب بنا کر پوچھتی -

اسے کیا کرنا چاہیئے ؟

کیا کرنا چاہیئے ؟

جو جرم سرزد ہو چکا تھا - اس میں اس کا قصور نہیں تھا -

لیکن

اس کی غلطی ضرور تھی - غلطی اسے لے ڈوبی تھی - اور قصور تو شاید رفیق کا بھی نہ تھا - اس کا فعل بھی تو اس کی غلطی کا نتیجہ تھا -

بہر حال دونوں ہی تھے - کہ جرم کا ارتکاب کر چکے تھے - لیکن قصور وار شاید دونوں ہی نہ تھے - قصور تو ان لوگوں کا تھا - جن کی غفلت نے جس کو چھوڑ جانے کا موقع دیا - قصور تو اس تنہائی کا تھا - جس میں شیطان اپنے عمل کے لیے شیر ہو گیا - قصور اس کو تا ہی کا تھا - جو ہر سببی حریفوں سے کی گئی تھی -

رفیق دوسرے دن ہی ہوٹل چھوڑ کر وسیع درمیں دنیا کے جانے کس گوشے میں گم ہونے کے لیے چلا گیا تھا - محبت - کہ خدا کی بے حرمتی کرنے کے احساس نے اسے دیوانہ کر دیا تھا - جا - نے کہاں کہاں بٹکنے کے لیے وہ جا چکا تھا -

اب

شانہ کو کیا کرنا چاہیئے تھا !

دونوں کی سوچ کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا - اس کے راز سے اپنے کے سوا کوئی واقف نہ تھا - رفیق کے چلے جانے سے اسے ڈھارس ملی تھی - اسے یقین تھا کہ اب وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا

اس لیے

اپنی غلطی

اپنی غفلت

اور اپنی کوتاہی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ماضی کے دھندلوں میں روپوش کر دینے کا اس نے فیصلہ کر لیا - وہ کسی کو نہیں بتائے گی - ! کسی کو نہیں بتائے گی -

کسی کو نہیں -

بتا کر اپنی زندگی تباہ کر لینا قتل مندی نہ تھی - گزر جانے والے لمحے آنے والے لمحوں سے بچھڑ جاتے ہیں - انہیں کسی طرح آنے والے لمحوں پر اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہیئے -

اس فیصلے سے وہ کسی حرکت کا مطمئن ہو گئی - کسک درد پھانس اپنی جگہ موجود تھی - لیکن اب وہ سب کے سامنے ظاہر داری کا نقاب اوڑھ کر اپنی اصلی صورت چھپا لینے کی کوشش میں مصروف تھی -

اس نسا اپنے آپ کو اب زیادہ مصروف رکھنا شروع کر دیا - ہر روز کوٹھی کی تعمیر اور تزئین کے سلسلے میں جانے لگی - کام میں اپنے آپ کو اتنا تھکا دیتی کہ ہاتھ پٹختے ہی بے سُدھ ہو جاتی - ذہنی سکون کے لیے دوائیاں بھی اب اناج کی سے استعمال کرنے لگی - لوگوں سے ملنا جلنا بھی شروع کر دیا تھا -

رشیر می کی دیکھ بھال بھی کرنے لگی تھی -

جسم سے جیسے کسی نے جان کیسے لی۔ زنجیت پہلی بڑی گئی۔ آنکھوں میں اندھیرے  
سائے لہرانے لگے۔ حلق میں جیسے کسی نے نوکیلے کانٹے بھر دیئے۔  
برش اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ لہرا گئی۔ جلدی سے اس نے  
کمری کی پشت کو کچڑ لیا۔ کئی لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھایا رہا۔  
پھر اس نے جلدی سے اپنے آپ کو نبھالا۔ سر کو دتین بار جھکا دیا۔ آنکھیں  
چمکائیں اور خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے لمبے لمبے سانس لیے۔ اس  
کے ہاتھوں اور پاؤں میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھوں کی مٹھیاں  
بند کر لیں۔ کھولیں۔

”ہلو۔“ عثمان دروازے میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔  
شانہ کی آنکھیں بھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ اس پر پھر وہی کیفیت  
ناری ہونے لگی۔ جو چند لمحے پہلے ان کی آواز سن کر ہوئی تھی۔ لیکن لہرا کر گرنے  
سے پہلے وہ تیزی سے دروازے کی طرف دوڑی۔  
”مانی۔۔۔“ اس نے ایک کمرنگ پیج ناری۔ دوسرے لمحے وہ عثمان سے  
بٹ بٹ چکی تھیں۔ عثمان نے اس کا کانٹا پسینے میں تر اور برن کی طرح ٹھنڈا  
جو وہ بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”میری جان۔ میری زندگی۔“ وہ شانہ کے گال سے گال رگڑتے ہوئے  
سے پیار سے بولے۔

”مانی۔“ شانہ نے اس کے سینے میں سما جانے کی کوشش کی۔

”مانی۔“ شانہ درو سے بھٹ جانے والی آواز میں پکاری۔

”مانی۔“ شانہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر جی پیج کر رہنے لگی۔

”شانو۔ شانہ۔“ شینو۔ عثمان نے گہرا کراہے پکارا۔ اس کا پھر ہینے

عثمان بنا اطلاع ہی آگئے۔ پر دو گرام کے مطابق انہیں تین دن بعد آنا تھا۔  
لیکن اچانک ہی سارے کام نیٹ گئے۔ تو وہ تین دن پہلے ہی آگئے۔ دانستہ  
اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی۔ شانہ کے پاس اچانک پہنچ کر وہ اس کی خوشیوں میں  
اچانک مٹن کی سرتوں کا بھرپور اضافہ کرنا چاہتے تھے شانہ کام پر جانے کے  
لیے تیار ہو رہی تھی۔ اس نے پھولدار سارے ہی پن رکھی تھی۔ اور بالوں میں برش  
کر رہی تھی۔

”صاحب آگئے صاحب آگئے۔“

”سلام صاحب جی کب آئے۔“ صاحب جی اچانک آگئے۔

فضل دین نعمت خان اور آیا کی ملی جلی آوازوں نے شانہ کو چونکا دیا۔

پھر عثمان کے سینے اور باتیں کرنے کی آواز آئی۔

عثمان واقعی آگئے تھے۔

شانہ سرتاپا کانپ گئی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے میں اس کا وجود نہا گیا۔

”مجھے نہیں چاہیے یہ دولت۔ یہ گھر بار۔ کچھ نہیں چاہیے تھا مان۔  
مجھے تمہاری ضرورت تھی۔ صرف تمہاری۔ تم کیوں پیسہ جمع کرنے کے لیے مجھے  
تہا چھوڑ گئے تھے۔ کیوں چھوڑ گئے تھے۔ کیوں چھوڑ گئے تھے۔ وہ  
بے اختیار ہو ہو کر رد رہی تھی۔ دیوانوں کی طرح چلنے رہی تھی۔ لرز رہی تھی۔  
کانپ رہی تھی۔ ڈول رہی تھی۔ لہر رہی تھی اور عثمان کا گریبان پچڑے جیسے جاری  
تھی۔

فکر چاکر کمرے کے باہر آن کھڑے ہوئے تھے۔ عثمان کو بتانا چاہتے تھے۔  
کریگ صاحب کو ایسے دور سے پہلے بھی پڑ چکے ہیں۔ لیکن اندرجانے کی جرأت کوئی  
بھی نہ کر رہا تھا۔ پریشان اور ہراساں کھڑے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔  
دستے روتے جیتے جیتے شائد بے دم ہو کر عثمان کے بازوؤں میں جھول  
نئی۔

عثمان بے طرح گھبرا گئے۔ شائد کو میڈ پر ڈال کر اس پر جھکتے ہوئے بار بار  
اے پکارنے لگے۔

اماں فضلاں مہبت کر کے اندر آ گئی۔ اس نے عثمان کو شائد کی اس  
یاری کا بتلایا۔

عثمان پریشان ہو گئے۔ اماں فضلاں ان دردوں کی تفصیل بتانے لگی۔  
”مجھے اطلاع کیوں نہ دی تھی۔ وہ گر ہے۔

اماں فضلاں ڈر گئی۔ جلدی سے بولی۔ ”بڑی سگم صاحبہ نے اطلاع نہ کرنے  
ی تھی۔ اور اب تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔ بہت دنوں بعد آج ہی دورہ  
ہے۔

عثمان کی پریشانی دید کے قابل تھی۔ ”کس ڈاکٹر کا علاج کیا۔

سے الگ کرنا چاہا۔

لیکن

وہ تو باگلوں کی طرح ان کے سینے میں سامنے کی کوشش کر رہی تھی۔  
بے اختیار ہو کر چٹی ہوئی تھی۔ اور درد کو برا حال کر رہی تھی۔

عثمان اس کی نشت تھکتے ہوئے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کر رہے  
تھے۔ محبت اور چاہت کا بے پایاں اظہار سمجھ کر خوش بھی تھے۔ مسکائے  
بھی جا رہے تھے۔ شائد کے سینے میں جو قیامتیں ٹوٹ رہی تھیں۔ اس کا  
انہیں علم نہ تھا۔

”شائد پاگل نہ ہو۔۔۔ اب تو میں آ گیا ہوں۔ اتنی اداس تھیں۔ تو بتا دیتیں۔  
میں پہلے ہی آ جاتا۔ کچھ نہ ہو۔ میری طرف دیکھو۔ جان۔ بس۔ بہت ہو  
گیا۔ ہوں۔ دیکھو نا میری طرف۔ عثمان بڑے پیار شوخی اور سرت سے شائد  
کا چہرہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

شائد نے سرخ سرخ آنسوؤں سے تر آنکھوں سے عثمان کو دیکھا۔ پھر فوراً  
ہی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر چیخی۔

”تم کہاں تھے۔ کیوں چلے گئے تھے۔ کیوں چھوڑ گئے تھے مجھے۔

شائد عالم وحشت میں الفاظ بار بار دہرا رہی تھی۔ عثمان کے چہرے سے  
مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ شائد کی ذہنی حالت انہیں شکوک لگی۔

”شائد۔ انہوں نے بازوؤں میں لیٹی شائد کو سینے میں چھپا لینے کی کوشش  
کرتے ہوئے پیار سے کہا۔ اس کے ہونٹوں گالوں اور آنکھوں پر بے تحاشا  
پیار کرتے ہوئے انہوں نے اس کی دھارس بندھانے کی کوشش کی۔

”میری جان۔ وہ پھر لوہے۔

”ڈاکٹر فرید کا۔“

”کیا کہا تھا انہوں نے۔“

”پتہ نہیں صاحبزادہ صاحب۔ بیگم صاحبہ نے تنہائی محسوس کی ہے۔ ڈاکٹر بھی کہتا تھا۔ کہ اکیلا رہنے سے اثر ہوا ہے۔ اماں فضلاء کی سمجھ میں جو کچھ آیا کہہ دیا تھا۔ عثمان شہد ز سے کھڑے رہے۔ پھر شانہ پر جھک گئے۔ وہ اب ہوش میں تھی۔ چپ چاپ آنکھیں کھولے عثمان کو تک رہی تھی۔ اس کے ذہن میں کبھی قیامت کا شور اٹھنے لگا اور کبھی قبرستانوں کے سنائے چھا جاتے۔“

عثمان پٹی پر بیٹھ کر اس پر جھک گئے۔

”شانو۔ حد ہو گئی۔ اتنی پیار رہی اور مجھے اطلاع تک نہ دی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم اتنی اداس ہو جاؤ گی۔ تنہائی کو اس طرح محسوس کر دو گی۔“ اماں فضلاء کرے سے ہاتھ نہ نکال گئی۔ عثمان نے شانہ کو پیار کرتے ہوئے بازو اس کی گردن میں ڈال دیئے۔ وہ اسے ہنسانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کو گہرا دیا۔ بے تماشا پیار کیا۔

شانہ نے آہستہ سے اپنی گردن سے ان کے بازو الگ کئے۔ انہیں پر ہانک اٹھ بیٹھی۔ جنوئی لمحے گزر چکے تھے۔ ڈر اور خوف کی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ پیدا کرتے ہوئے گزر رہی تھی۔ سببانی اور جذباتی کیفیت کی سنگینی کا اسے احساس ہو چکا تھا۔ بے اختیاری اختیار میں لانے کی ضرورت تھی۔ اگر عثمان کو پتہ چل جاتا تو۔

تو۔

وہ کانپ گئی۔

احتیاط۔ احتیاط۔ احتیاط۔

اس کے اندر صرف یہی لفظ تڑپ رہا تھا۔ گونج رہا تھا۔ پکار رہا تھا عثمان نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی طرف گسیٹ لیا۔ ”شانہ۔“ اس کا چہرہ ہاتھ سے اونچا کرتے ہوئے انہوں نے پکارا۔ تو وہ گیلی گیلی دھندلائی آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک لاتے ہوئے ان کے ساتھ لگ گئی۔

”تم نے تو ڈرا ہی دیا۔“ عثمان سکون کا سانس لیتے ہوئے بولے۔

وہ پھر مسکرا دی۔ ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو بھی ٹپک پڑے۔

لیکن وہ اب پوری طرح سنبھل چکی تھی۔ جذباتی سببان پر قابو پالیا تھا۔ آنسو پینے کی شعوری کوشش کر رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔

نہیں رہی تھی۔

”کمال ہے بچی۔“ عثمان نے اس کے گال پر ہلکی سی چپٹ، لگائی۔ ”تین مہینے الگ کیا رہنا پڑا زمین آسمان ایک کر دیئے۔“

شانہ کچھ نہیں بولی۔ سر جھکا ئے بیٹھی رہی۔ اپنے اندر ٹوٹ ٹوٹ پڑنے والی قیامتوں پر قابو پانے کی پوری کوشش کرتی رہی۔ عثمان اسے چھوڑتے رہے۔ شوخی سے۔ بزدلی اور کم ہمتی کے جیلے کئے۔ حسین سی سرگوشیاں کیں۔

”سارے باپ کٹ گئے ہیں جان۔ چند دن اور ہیں۔ پھر۔ پھر۔ ہم دونوں اس قدر ترس رہے ہیں گے۔ ہر وقت اٹھ رہے ہیں گے۔ کہ موت۔“

بھی آئی تو اسے سوچنا پڑے گا۔ ان دونوں کو کیسے جدا کر دوں۔۔۔ وہ اس کے بالوں کو لبوں سے چھوتے ہوئے بڑے سرشار لہجے میں بولے۔  
شانہ کی جان پر بن آئی۔

لیکن اس نے اس آزار دہ موضوع کو بدل دیا۔ شیریں کو ملے آپ۔۔۔ تم سے تول لوں پہلے۔۔۔ وہ شوخی سے بولے۔  
لے آؤں شیریں کو۔۔۔ وہ بیڑ سے اتر آئی۔

بزدل کہیں کی۔ جان نکال دی میری۔ کتنی باتیں سوچ کر آیا تھا۔ سب جلا دیں۔ عثمان بھی اس کے برابر کتے ہوئے بولے۔

میں شیریں کو لاتی ہوں۔ وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔  
عثمان بیڈ کی ٹی پر بیٹھ گئے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ شانہ کی طوفانی محبت کے احساس سے سرشار تھے۔

وہ بستر پر آٹے ہی لیٹ گئے۔ مرتلے دونوں ہاتھ رکھ کر وہ سہانی سوچوں میں گم ہو گئے۔ شانہ نے ان کی جلدائی کو جس طرح محسوس کیا تھا۔ یہ احساس ہی جانفز تھا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو دنیا کا پہلا اور آخری خوش نصیب انسان سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے اب تک شانہ کے لیے جو کچھ کیا تھا۔ وہ سب بیچ نظر آرہا تھا۔ شانہ ان کی نظر کی بندیوں کی انتہا سے بھی آگے بڑھ چکی تھی۔ اپنے دل میں اس کے لیے موجزن پایا اور ٹھانٹیں مارتے چاہتے کے سمندر بھی حقیر لگ رہے تھے۔ وہ اعتراف کر رہے تھے کہ محبت کے میدان میں شانہ ان سے باز رہی۔ لے گئی ہے۔

شانہ شیریں کو لے آئی۔ اب وہ اپنے آپ میں تھی۔ اس نے جھکتے ہوئے شیریں کو عثمان کے سینے پر بٹھا دیا۔

عثمان نے ایک ہاتھ سے شیریں کو پکڑا اور دوسرے سے شانہ کو ہلکے سے جھٹکے سے اپنے ہلو میں کھینچ لیا۔

تین ماہ میں شیریں کو کھڑو ٹٹا ہو گیا تھا۔ گال تھمارے تھے۔ اور باثبات پہ ہنس دیتا تھا۔ غول غاں کی بے معنی آوازیں بھی نکالنے لگا تھا۔ خوب شور مچاتا تھا۔ شک کر تو بیٹھ سکتا ہی نہیں تھا۔

عثمان نے بچے کو جی بھر کر پیار کیا گد گدایا۔ اچھالا۔ جوم جوم کر اس کے گال گہرے لال کر دیئے۔ شانہ کھوٹی کھوٹی ڈوبی ڈوبی باپ بیٹے کو دیکھتی رہی لیکن

جب بھی عثمان اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ فوراً ہونٹوں پر مسکراہٹ ملے آئی۔  
شعوری کوشش سے شانہ نے عثمان کو مطمئن کر دیا۔

دوسرے دن وہ کام پر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ تو شانہ سے پوچھا۔  
چلو گی۔۔۔

آپ جائیں۔۔۔ وہ بولی۔

میرے جانے سے دور وہ تو نہیں پڑ جائے گا۔۔۔ وہ ہنس کر بولے۔

شانہ نے خفت سے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

بھئی اب تو ڈر رہی گئے لگا ہے۔ چند گھنٹوں کے لیے بھی تمہیں اکیلا چھوڑنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ وہ مسکرائے۔ شانہ چپ رہی۔

مذاق نہیں۔ چلنا ہے تو چلو میرے ساتھ۔۔۔ وہ بخندگی سے بولے۔

شانہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

دیکھو بھئی تین ماہ کے بعد جا رہا ہوں۔ فیکٹری بھی جانا ہے۔ اور نشین بھی



شانہ ڈوب ڈوب جاتی۔ اس کے اٹھ تل ہوتی رہتی۔ ظاہر داری کا بھرم  
بھانسنے کی پوری کوشش کرتی۔

لیکن

کبھی کبھی جب عثمان پیار کا بے پایاں اظہار کرتے۔ تو وہ۔۔۔

بے اختیار ہو جاتی۔ ضمیر اور روح کا بوجھ ناقابل برداشت ہو جاتا۔ سانس تک  
لینا دشوار ہو جاتی۔ بے اختیار ہو جاتی۔ وہ پھٹ پڑنے کو ہوتی۔ سب کچھ گزرنے  
کے کنارے آ جاتی۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ عثمان کو دھوکے میں کھ کھ کر دنیا کا بدترین  
جرم کر رہی ہے۔ اس جرم سے بھی ہزاروں گنا بڑا جرم کرنے کی مزکب ہو رہی ہے۔  
جو وہ لمحوں کے گرفت سے ایسا ایک ہی پھسل جانے سے کر چکی ہے۔

اس کے من میں قیامت کا شور مٹتا۔ کہ عثمان کو سب کچھ بتا دو۔ محبت  
بڑی وسیع القلب ہوتی ہے۔ وہ معاف کر دیں گے۔ تم نے غلطی ضرور کی  
لیکن جرم میں تصور وار نہیں ہو۔ ان کے سامنے اعتراف کر لو۔ وہ محبت کے  
عظیم خدا ہیں۔ بخش دیں گے۔ درگزر کریں گے۔ معاف کر دیں گے۔  
لیکن

اعتراف کے خیال سے وہ کانپ جاتی۔ عثمان اک مرد تھے۔ اور مرد کے  
دل کی دستکوں کا اندازہ ہونے کے باوجود وہ محسوس کرتی تھی۔ کہ ان دستکوں  
میں کسی دوسرے کا سایہ تک گوارہ نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت تو ایک طرف عثمان  
تو شاید خیال بھی گوارہ نہ کر سکتے تھے۔

کنکاش کی چکی میں پستے شانہ ظاہر داری کا بھرم بھنار ہی تھی۔

بھول گا۔۔۔ دیر ہو جائے شاید۔۔۔ انہوں نے شانہ کی ٹھوڑی انگلی سے اونچی  
رہتے ہوئے اس کی اداس آنکھوں میں جھانکا۔

کوئی بات نہیں۔۔۔ شانہ نے سکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

تو اجازت ہے۔ چلا جاؤں اکیلا۔ عثمان نے شوخی سے اسے چھڑا۔

ہوں۔۔۔ وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرا دی عثمان مسکرا سہ ہی دیکھ سکے۔

ان کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔

انگلے دن واقعی بے انتہا مصروفیت کے دن تھے۔ عثمان صبح جلد تے اور  
رات گئے واپس آتے۔ پہلے عشرے تک نشیمن میں ٹھٹھ ہوتا تھا۔ سارا کام  
پہٹ چکا تھا۔ کاریگری کو فارغ کیا جا رہا تھا۔ ٹھیکہ دار کے واجبات چکھنے جا  
رہے تھے۔ بل کیڑ ہو رہے تھے۔ مسز خلیہ کا حساب کتاب کیا جا رہا تھا۔ شانہ  
کے نئے نئے ڈریس بن کر آرہے تھے۔ ان کے بل دیے جا رہے تھے۔

نشیمن پر اک تعویذ کا بندوبست بھی کرنا تھا۔ اس سلسلے میں بھی تیاری ہو  
رہی تھی۔ مفتہ بھر پہلے کارڈ پیپ کر آگئے تھے۔

عثمان بڑے طعن تھے۔ مسرور تھے شاداں تھے۔

لیکن شانہ تذبذب و سوسے اور کشمکش سے دوچار تھی۔ اس کی روح پر ضمیر  
پر دل و دماغ پر ناقابل برداشت بوجھ تھا۔ عثمان سے اس نے راز خوش اسلوبی  
سے چھالیا تھا۔ اور عثمان بھی اتنے مصروف تھے۔ کہ شانہ کی آنکھوں میں گھل گھل آنے  
والا اداسیوں کو بخندگی سے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ کبھی محسوس کیا۔۔۔ زہنیں کہہ دیا۔  
یاد تم بھی کیا شے ہو۔ لگتا ہے تنہائی کے زہر کا تریاق پوری طرح نہیں ہوا۔ بس  
چند دن اور۔۔۔ پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ سارے حساب بے باقی کر دوں گا۔ سارے  
قرضے چکا دوں گا۔

انہوں نے مؤذبانہ سلام کیا۔ عثمان نے مسکرا کر جواب دیا اور فردا فردا ہر ایک کی احوال پرسی کی۔

- ابا حضور گھر پہنچے۔ انہوں نے پوچھا

- جی صاحبزادہ صاحب - ملازم بولا۔

- آپ ان سے ملیں گے۔ دوسرے نوکر نے حیرانگی سے پوچھا۔

- کیا خیال ہے۔ مل لیا جائے۔ عثمان مسکرا کر بولے۔

- جی ضرور۔ ضرور۔ ملازم شرمندہ سا ہو گیا۔

- امی بھی ہونگی گھر پہ۔ عثمان نے پوچھا۔

- جی سب گھر پہنچیں۔ چھوٹی بیبیاں بھی اور بڑی بیگم صاحبہ بھی۔

- اور سب خیریت ہے نا؟ عثمان نے پوچھا۔

- جی بالکل۔ بالکل۔ دیے نواب صاحب کی طبیعت پچھلے دنوں کافی خراب رہی ہے۔ ملازم نے کہا۔

عثمان کو دکھ ہوا۔ باپ کی محبت دل میں پوری قوت سے جوش مارنے لگی۔

اور مراد محل آتے وقت جو جھجک اور غیریت کا احساس تھا۔ وہ بالکل دور ہو گیا۔

وہ راہداری سے ہوتے ہوئے دائیں ہاتھ کے کمرے کی طرف آگئے۔ اندر

جانے ہی کو تھے۔ کہ برابر والے دروازے سے سائہ نکلی۔

عثمان کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ کافی عرصے کے بعد اس نے عثمان کو

دیکھا تھا۔ شرواع شرع میں کاغذات کے سلسلے میں وہ کبھی کبھی آجاتے تھے

لیکن اب کافی مدت کے بعد آئے تھے۔

- سائہ - عثمان نے بے ساختہ پکارا اور شفقت سے اپنے بازو پھیلا دیئے۔

- عثمان بھائی - سائہ کمان سے نکلے تیر کی طرح ان کی طرف بڑھی اور ان کے

عثمان ایک مدت بعد مراد محل میں داخل ہوئے۔ توان کی ذہنی حالت عجیب سی تھی۔ دکھ کچھ تھکا وہ اور خوشی آپس میں گڈر ہو رہے تھے۔ آج وہ اپنے والدین کو منانے آئے تھے۔ گھر کی خوشی کی تقریب میں انہیں مدعو کرنا تھا۔ ایک متوسط طبقے کی لڑکی سے شادی کرنے کے سلسلے میں اہل خانہ نے جن قباحتوں اور مشکلوں کی نشاندہی کی تھی۔ وہ ان سے سرخرو ہو چکے تھے۔ وہ والدین کو دکھا دینا چاہتے تھے۔ کہ محبت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اور اس کے بل بوتے پر پہاڑ ڈھانے جاسکتے ہیں۔ ناممکن کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ وہ آزمائش کے سبب مرے ملے کر چکے تھے۔ محبت کی عظمت کا قائل کرنے کے لیے وہ والدین کو رضامند کر کے تقریب میں شرکت کے لیے کہنے آئے تھے۔ گھڑی پور چمیں روک کر وہ باہر نکلے۔ تو گھر کے دو تین ملازم انہیں دیکھتے ہی لپک کر آئے۔ خوش اور حیرانگی کے بلے جلتے تاثرات ان کے چہروں پر تھے۔

گئے ہیں بازو ڈال کر ڈبڑبائی آنکھوں سے ان کو دیکھا۔ آپ آج کیسے آگئے۔  
 عثمان نے اس کی پیشانی پر شفقت سے بوسہ دیا۔ اور شاکی انداز میں بولے  
 "تم لوگوں نے تو میری کتنی محسوس نہ کی تھی۔ میں فوراً ہی آگیا ہوں۔"  
 سائرہ ان سے الگ ہوتے ہوئے بولی "ہم کیا کر سکتے تھے بھائی جان۔  
 ہمارا دل تو آپ سے۔ مرنے کے لیے ہمیشہ بے چین رہتا تھا۔ جب سے آپ آگئے۔  
 گھر میں رونق ہی نہیں رہی۔"  
 "فاخرہ کہاں ہے۔"

اندر۔ آجائیے۔  
 سائرہ جس دروازے سے نکلی تھی۔ دوڑتے ہوئے اس میں جا گھسی۔  
 فاخرہ۔ فاخرہ دیکھو تو کون کیا ہے۔  
 کون۔ فاخرہ کرسی میں بیٹھی ٹنگ کر رہی تھی۔ بغیر گردن موڑے  
 بولی۔

"دیکھو تو۔ سائرہ نے اس کی گردن گھما دی۔  
 عثمان بھائی۔ وہ بھی حیرانگی سے بولی۔ اس کی تیزی سے ٹنگ کرتے  
 ہوئے ہاتھ رک گئے۔

ملوگی نہیں۔ عثمان نے مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔  
 فاخرہ کرسی سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی عثمان کے قریب آئی۔ بھائی سے  
 بغل گیر ہوتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔  
 سائرہ نے عثمان کو کرسی پیش کی۔ بیٹھے۔

عثمان بیٹھ گئے۔ سائرہ اور فاخرہ بھی ان کے قریب کرسیاں گھسیٹ کر  
 بیٹھ گئیں۔ اور پھر تینوں بہن بھائیوں کے گلے شکوے شروع ہو گئے۔

اتنے کھڑ بن گئے تھے آپ۔۔ فاخرہ بولی۔  
 اور تم۔ عثمان نے کہا۔ شروع شروع میں جب بھی یہ آتا تھا۔  
 کترا کے نکل جاتی تھیں۔ بات تک نہ گوارہ نہ کرتی تھیں۔ پھر میں کیسے آیا  
 جایا کرتا۔

اب کیسے آئے ہیں۔ سائرہ نے پوچھا۔  
 اب۔ اب۔ عثمان مسکرائے۔

ہاں اب۔۔ فاخرہ بولی۔  
 تم لوگوں کی یاد نے بے چین کر دیا تھا۔ عثمان بولے۔  
 میں نہیں مانتی۔ سائرہ بولی۔

کوئی اور کام ہو گا۔ فاخرہ نے کہا۔  
 عثمان نے نفی میں سر ہلایا۔ تم لوگوں کو منانے آیا ہوں۔

ہیں؟ سائرہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔  
 ابا حضور اور امی حضور کو۔ عثمان سمجیدگی سے بولے۔

نامن۔ فاخرہ بولی۔

کیوں۔ عثمان نے پوچھا۔

ابا حضور آپ سے سخت ناراض ہیں۔ فاخرہ نے جواب دیا۔  
 اور امی۔۔ وہ مسکرا کر بولے۔

امی۔؟ امی شاید آپ کو معاف کر دیں۔ فاخرہ نے کہا۔ عثمان  
 حیرانگی سے اس کا منہ تنہے لگے۔ لیکن ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سائرہ بولی۔  
 فوقیر کی مٹائی ہو گئی ہے نا۔ اس لیے امی کو آپ سے مخالفت بھی ختم ہی  
 سمجھیے۔

”بھائی کو بھی لے آتے۔“ فاخرہ نے کہا۔

”کیسی ہیں وہ۔“ سائرہ بولی۔

”بچے کا کیا نام ہے۔ اس کی شکل کس پر ہے بہت پیارا ہو گا۔“ فاخرہ نے پوچھا۔

عثمان نے جیب سے بڑا نکالا۔ اسے کھولا۔ اور اس میں لگی شائہ اور بچے کی تصویر دونوں بنوں کو دکھائی۔ سائرہ نے تو پیار سے تصویر کو چوم لیا۔ ”اللہ کتنی پیاری ہیں بھائی اور یہ دیکھو کیا گول ٹٹول سا ہے۔“ نام کیا رکھا ہے۔ بھائی جان۔“

”شہر پار۔“ پیار سے سب شیریں کہتے ہیں۔“ عثمان نے کہا فاخرہ اور سائرہ شیریں کے متعلق پوچھنے لگیں۔

”دیے ابا حضور کو۔“ سے دیکھئے کا بڑا شوق ہے۔“ سائرہ بولی۔ ”نارنگی کے باوجود اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”کے۔“

”شیریں کو۔“

”اچھا۔“

”ہاں۔“ جس دن انہیں تہ پلا تھا ناکہ آپ کا بیٹا ہوا ہے۔ بڑے خوش ہوئے تھے۔“

”واقعی۔!“

”ہاں۔“ مٹھائی بانٹی تھی۔ اور مسجد کی تعمیر کے لیے روپیہ بھی دیا تھا۔“

”قیم خانے میں تین دن کھانا بھجوا دیا تھا۔“

”سچ۔“

عثمان سکڑانے لگے۔ پھر سائرہ سے پوچھا۔ کب ہوئی تنگی؟

”تین ماہ ہو گئے۔ اب تو اس کی شادی کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔ غالباً دسمبر میں شادی ہو جائے گی۔ بہت اچھی جگر رشتہ ہوا ہے اس کا۔“

”اچھی بات ہے۔“ عثمان نے مطمئن انداز میں کہا۔

”اور بھائی جان تہ ہے آپ کو۔“ سائرہ فاخرہ کو خوشی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا!“

”ان کی تنگی بھی ہو گئی۔“

”واقعی۔“

”ہاں۔“

”کہاں۔“

”خالہ ارجمند بانو میں نا۔“ ان کے دیور کے ساتھ۔ نوابزادہ محمد اللہ خان صاحب کے ساتھ۔ سائرہ نے خوشی سے کہا۔ فاخرہ شرمائی۔ عثمان نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ اسد بہت اچھا لڑکا ہے۔“

عثمان خوش بھی ہوئے۔ اور دکھ بھی ہوا۔ کتنے قریبی رشتوں سے وہ کٹ گئے تھے۔ بہن کی عمر بھر کی رفاقت کے زندہ من باز رہے گئے تھے۔ اور انہیں خبر ہی نہ ہوئی تھی۔

وہ کچھ دیر بنوں کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کئی نئی خبریں سنیں۔ بہت سے انکشاف بھی سائرہ نے کئے۔ جو عثمان کی خوشی کا باعث بنے۔ ندامت اور دکھ بھی محسوس ہوئے۔

- خدائے مہربان -

عثمان خوش ہو گئے - والدین کو رضا مند کر لینے کی امید جاندہ ہو گئی -

- ابا حضور کہاں ہوں گے اس وقت - عثمان اٹھتے ہوئے بولے -

- اپنی نشست گاہ میں ہیں - - فاخرہ بولی - - تھوڑی دیر ہوئی میں ادھر

سے آئی ہوں -

- اور اسی - - عثمان نے پوچھا -

- وہ بھی شاید وہیں ہیں - وہاں نہ ہوئیں تو کچھ چل طرف ہونگی - - سارہ

بولی -

- دعا کرو - دونوں میری خطائیں دیں - عثمان نے مسکرا کر کہا -

- اکیلے جائیں گے ان کے پاس - سارہ نے خوف محسوس کرتے ہوئے پوچھا -

- تم جیتی ہو ساتھ -

- نہ بابا -

- اچھا ہوتا آپ بجا ہی کو ساتھ لے آتے -

- آج اندازہ کر لوں - تو پھر اسے بھی لے آؤں گا -

- کس بات کا اندازہ -

- مراد محل کے دروہام کا -

- کیا مطلب ؟ -

- یہی کہ یہاں کے دروہام شائے کے لیے اب بھی تنگ ہیں یا ان میں کشادہ

ہونے کی چک پیدا ہو گئی ہے -

سارہ اور فاخرہ عثمان کی بات پر خست سے مسکرا دیں -

عثمان کہے سے نکلے اور برآمد سے لہا ریاں عبور کرتے نشست کی طرف آ گئے -

کئی ملازم ملے - جمہار نیوں نے سلام کیا - عشرت بانو کی خاص ملازمہ نے احوال

پرسی کی -

نشست گاہ کے دروازے پر عثمان چند لمحے رُکے - پھر اپنی ساری بہت

جمع کی - اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی -

- آجائے - نوابزادہ مراد علی خان کی رعب دار آواز آئی -

عثمان آہنگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے -

مراد علی خان سامنے ہی صورنے پر بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے - دروازے

کی آہٹ پر نظر میں اٹھا کے دیکھا - انتہائی غیر متوقع طور پر عثمان کو کھڑے دیکھ کر

ان کے ہاتھوں سے اخبار چوٹ گیا - سگڑ ہونٹوں میں کانپ گیا - لیکن یہ سب کچھ

لحاتی تھا -

عثمان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی - انہوں نے سر جھکا کر بڑے ادب سے

سلام کیا -

- آئیے - ان کے لہجے میں نکتی تھی - - کیسے آنا ہوا -

عثمان آگے بڑھے اور باپ کے قدموں کے قریب دوڑا تو ہو کر جھکتے ہوئے

ان کے پاؤں چھو لیے - معمر باپ کامل ڈول گیا - لیکن روایت پسندی کا جو خول

ان پر چڑھا تھا - وہ کافی سخت تھا - اپنے پیر کو ٹرتے ہوئے انہوں نے دوسری

طرف کر لیے -

- ابا حضور - عثمان نے ادب سے پکارا -

- کیسے آئے ہو - مراد علی خان کی آواز گونجی -

عثمان سر جھکانے بیٹھے رہے -

- کیا - یہ اعتراف شکست ہے - مراد علی خان نے بڑی رعایت سے کہا -

جی نہیں۔۔۔ عثمان نے متمک آواز میں جواب دیا۔

تو پھر۔۔۔ کوئی مالی مجبوری؟

نہیں۔

پھر کیوں کہنے ہو۔۔۔

آپ کی شفقتوں کے سایے کی ضرورت ہے۔۔۔

ہونہ۔۔۔ مراد اٹھ کر بیٹھنے لگے۔ عثمان بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

مراد علی خان عثمان کی توقع کے مطابق سرد نہری کا اظہار کرنے لگے۔ رعونت سے بات کی۔ طنزیہ نظروں سے دیکھا۔ غصے میں بھی آئے۔ بھنا گئے۔ کرے سے نکل جانے کا حکم بھی دیا۔

لیکن

عثمان سر جھکائے سب کچھ خاموشی سے سنتے رہے۔ باپ کو منانے کا عزم کر رکھا تھا۔ اسی لیے بعض ایسی تلخ باتیں بھی خاموشی سے نکل لیں۔ جو کسی اور وقت وہ برداشت بھی نہ کر پاتے۔ مراد علی خان کی تلخ کلامی جاری تھی۔ کہ عشرت بانو اندر آگئیں۔ عثمان کو دیکھ کر وہ پہلے حیران ہوئیں۔ پھر ان کی جبین بھی سکون اُلوہ ہو گئی۔ عثمان کے سلام کا انہوں نے جواب دینا بھی گوارہ نہ کیا۔ مراد علی خان۔ نے خوب ڈانٹ ڈپٹ کی۔ برا بھلا کہا۔ عشرت بانو بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتی رہیں۔

عثمان سب کچھ سنتے چلے گئے۔ جب وہ بول بول کر دل کا بغبار نکال چکے اور عشرت بانو بھی چپ ہو گئیں۔ تو عثمان نے سر اٹھایا۔ مسکرائے اور بڑی تعلیم سے بولے۔ مجھے روپے پیسے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی میں اپنے فیصلے پر نادام ہوں۔ مجھے اب ضرورت ہے تو صرف آپ کے پیار اور شفقت کی۔

اور وہ حاصل کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔۔۔

مراد علی خان نے تندرنگانہ پر ڈالی۔ سولہ سترہ ماہ بعد پیار اور شفقت کی ضرورت محسوس ہوئی ہے؟۔۔۔

ابا حضور۔ وہ بولے۔ میں اپنے شن کی تکمیل میں مصروف تھا۔ اس دوران اگر آپ کے پاس آتا۔ تو شاید آپ لوگ یہی سمجھتے کہ میں آپ سے کچھ حاصل کرنے آیا ہوں۔ اب خدا کے فضل سے میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا ہوں۔۔۔

ٹھیک ہے۔۔۔ عشرت بانو بولیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے ہو۔ بیوی ہے بال بچے دار بھی ہو گئے ہو۔ گھر بار بس گیا ہے۔ ہماری کیا ضرورت ہے نہیں۔ ضرورت ہے۔ اسی لیے تو حاضر ہوا ہوں۔۔۔ وہ بولے۔

نہیں۔ مراد علی خان گرجے۔

ابا حضور۔۔۔

ابا حضور۔۔۔

ہم نے جو فیصلہ کیا تھا۔ اس پر سختی سے کار بند ہیں۔ تم نے جو فیصلہ کیا تھا۔ اس پر قائم رہو۔ یوں ہمارے تمہارے فیصلے ٹکراتے ہیں۔۔۔

مراد علی خان کی بات پر عثمان کا دل بھر آیا۔ لیکن متمک آواز میں بولے گئے۔

شانہ کی تعریفیں کیں۔ اس کے بارے میں بہت کچھ انہیں بتایا۔ وہ لڑکی نہیں فرشتہ تھی۔ عثمان نے یہ بات ثابت کرنے کی پوری کوشش کی۔ پھر التیما آمیز لہجے میں کہا۔

ابا حضور۔ میں نے شادی کی تھی۔ میرا انتخاب لا جواب ہے۔ سولہ سترہ

مہینے کی رفاقت نے مجھے احساسِ دلین و دلایا ہے۔ کہ میں نے غلط فیصلہ نہیں کیا

تھا۔ میری بیوی لاکھوں میں ایک ہے۔ صورتِ سیرت ہر لحاظ سے بیکتا ہے۔ میں

اس کے ساتھ بڑی سرد اور مکمل زندگی گزار رہا ہوں۔ آپ گزری باتوں کو

- ایک ترکیب بتاؤں۔ سو فی صدی کامیاب ہوگی۔ وہ سوچتے ہوئے بولی۔  
- بتاؤ۔ عثمان نے کہا۔

- آپ شیر کی کو ساتھ لے آئیں۔ ابا حضور یقیناً صلح پر رضامند ہو جائیں گے۔  
یہ حیر بھی استعمال کر دیجییں۔

- میں تو شانہ کو بھی لانے کو تیار ہوں۔

- اوں ہوں شانہ بھابی کوئی الحال مت لائیے گا۔ کہیں خواہ مخواہ ان کی بیعتی نہ ہو جائے۔ آپ کل شیر کی کو ساتھ ضرور لائیں۔ اس کی وجہ سے آپ کو ضرور معافی مل جائے گی۔

- یہی سہی۔ عثمان نے مسکرا کر کہا۔۔۔ صلح تو بھر حال ہوئی ہے۔ آپ لوگ میرے ہاں ٹنکشن میں آنے کی پوری پوری تیاری کر لیں۔

- ہائے اللہ ہمارا بس چلے تو ابھی آپ کے ساتھ چل دیں۔ سچی بھابی کو دیکھنے کی کتنی شدید خواہش ہے۔ اور شیر کی۔ خیر کل آپ اسے تو لاسی رہے ہیں نا۔

عثمان نے ساڑھ اور فاخرہ کے کمرے میں ان کے ساتھ چائے پی۔ ساڑھ بھی فاخرہ کی ترکیب سے مطمئن تھی۔

دوسرے دن عثمان شیر کی کو ساتھ لائے۔ ساڑھ فاخرہ کی تو جیسے عید ہو گئی۔ اتنا پیار آیا انہیں پر کہ بے اختیار ہو ہو گئیں۔ ساڑھ اسے امی کے پاس لے گئے۔ اسے آہستگی سے ان کی گود میں ڈال دیا۔

یہ حیر بر واقعی کامیاب رہا۔

مراد علی خان محصوم فرشتے کو شانہ کی ہمت نہ کر سکے۔ چند لمبے اسے تکتے رہے۔ جب عادت شیر کی مسکرا دیا اور ہلک ہلک کہ انہیں بلانے لگا۔ عشرت بانو ساڑھ اور فاخرہ دم بخود کھڑی تھیں۔

مد گذر کر دیں۔

وہ منت سماجت کرتے ہوئے بولے۔

- شانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہے۔ انہوں نے مراد علی خان کو خاموش دیکھ کر آہستگی سے کہا۔

- نا ممکن۔ مراد علی خان نے بڑی رعوت سے کہا اور کمرے سے نکل گئے۔  
عثمان کے دل پر جیسے کسی نے گھونسا مارا۔ بہت دل برداشتہ ہوئے۔

لیکن

اپنی کوشش ترک نہ کی۔ عشرت بانو کا دامن تمام لیا۔ اور پھر کچھ اس انداز سے ان کی منت سماجت کی۔ کہ ان کا دل گچھل گچھل گیا۔ وہ کتنی دیر عثمان کی باتیں چپ چاپ بیٹھیں رہیں۔ شانہ عثمان کے لیے کیا تھی؟ انہیں بخوبی اندازہ ہو گیا۔

عثمان دوسرے دن پھر مراد مل گئے۔

تیسرے اور چوتھے دن بھی گئے۔

وہ جان گئے تھے کہ مراد علی خان محض انا کے بت کی خاطر صلح پر رضامند نہیں ہو رہے۔ عثمان نے بھی اس بت کے توڑنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ عشرت بانو اب نرم پڑ چکی تھیں۔ ساڑھ اور فاخرہ سے عثمان کو معاملے کی نوعیت کی رپورٹ بھی مل رہی تھی۔ صلح و صفائی ہو جانا ممکن نظر آرہا تھا۔

- بھائی جان۔ عثمان پانچویں دن بھی باپ سے ڈانٹ کھا کہ باہر نکلے تو فاخرہ نے انہیں روک کر کہا۔

- ہوں۔ وہ سوچوں میں گم تھے۔ فاخرہ نے عثمان سے ابا حضور کے رویے کا پوچھا تو معلوم ہوا۔ کہ اس میں کوئی لپک نہیں آئی۔

اس کی خاطر ہمیں معاف کر دیں ابا حضور۔ عثمان باپ کے قدموں میں دو زانو ہوتے ہوئے بجا جت سے بولے۔

تو مراد علی خان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے بچے کو ہاتھوں میں اٹھایا اور اس کا ماتھا چومتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔ وہ بڑے والہانہ انداز میں بچے کو پیار کرنے لگے۔

ابا حضور۔ فرط مسرت سے عثمان کے منہ سے نکلا اور انہوں نے اپنا سر باپ کے زانو پر رکھ دیا۔ مراد علی خان نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گلو گراواز میں صرف یہی کہا۔ میرے بچے۔

بچہ کرکٹ کھیلنے کا منظر بڑا ہی دلگداز تھا۔ عشرت بانو ساڑھ اور فافروہ کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں تھیں۔ عثمان کا دل بھی بھر بھر آ رہا تھا۔

آج نشین کے آباد ہونے کی خوشی میں قریب تھی۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ عثمان تیار ہو چکے تھے۔ انہوں نے نویں بلورنگ انو لیمورٹ سوٹ پہنا تھا۔ ان کا چہرہ خوشی سے تیار ہا تھا۔ آنکھوں میں دیکھے جل رہے تھے۔ قدم زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ خوشیوں کا بحر ذخار سینے کی وسعتوں میں بانہیں رہا تھا۔

شانہ بھی تیار ہو رہی تھی۔ اس نے موتیوں اور ستاروں سے بھرا انتہائی نفیس درجہ یڈلر کا لانگ ڈریس پہنا تھا۔ اس کے جسم کی ساری خوبورتیاں اور لکٹیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ لباس کمر تک اس کے جسم سے چپاں تھا۔ جس سے مارے لشیب و فراز قاتلانہ حد تک حسین نظر آ رہے تھے۔ اس کے ہڈول اور اٹھائی کندھے تنگ تھے۔ جو سیپ کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کے چوڑے رکھنے گریبان سے گردن اور چھاتی کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ پشت بھی کافی حد تک ریبان کی گہرائی سے دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے انہیں سٹائل جوڑا بنایا تھا۔



مرحلے سے بھی اسی کے سہارے گزر گئی تھی۔

لیکن آزمائش قدم قدم پر تھی۔ وہ مقابلہ کرتے کرتے ہارے جا رہی تھی۔ آج صبح ہی صبح اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ تو اس نے عثمان کو بیڈ پر نہیں پایا تھا۔ کافی دیر وہ اس انتظار میں رہی کہ شاید غسل خانے میں گئے ہیں۔

جب وہ غسل خانے سے باہر نہ آئے۔ تو وہ بیڈ سے نکل آئی۔ کمرے سے باہر گئی۔ اس نے دیکھا۔ عثمان باہر چمن میں تھے۔

صبح کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ لگتا جیسا اُجلا تھا۔ ہلکی ہلکی سردی تھی۔ کہیں کہیں درختوں میں پرندے پھر پھر مارے پھرتے تھے۔ عثمان قبلہ درمجد سے میں پڑے تھے۔

نماز کے بعد شاید یہ سجدہ شکر ادا تھا۔ کیونکہ وہ کافی دیر سرجھوڑے رہے تھے۔ شائے کانپ گئی۔ وہ واپس آکر بستر میں گر گئی۔ اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ اسے اپنے وجود سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ وہ یقیناً اس فرشتہ خصلت انسان کے قابلِ رحمت تھی۔ اسے جرم کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ وہ اب عثمان کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔

نہیں دے سکتی

نہیں دے سکتی۔

لیکن۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اندر احتیاط۔ احتیاط کی گونج گونجنے لگی۔

وہ اعتراف نہ کر سکی۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہی۔ لیکن ظاہر ابری کا بھرم نبھائے گئی۔ دل کے مقابلے میں دماغ کی استدلال وزنی تھیں۔ اسے اپنا راز چھپانے رکھنا تھا۔ راز افشا کر کے زندگی ویران کر لینے میں

بال اور پاٹھ جانے سے گردن کی نزاکت اور دلکشی بے حد جذبات انگیز لگ رہی تھی۔

میک اپ زیورات اور حسین لباس نے اس کو رنگین خوالوں کی آن چھوٹی اور آنکھیں ہنر ادبی کارڈپ دیا تھا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ بکھری بکھری لگ رہی تھی۔

لیکن

آج

وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر پھر رہی تھی۔ بار بار شعوری کوشش سے اپنے آپ کو منع لانا پڑ رہا تھا۔ لا پرواہی سے اس نے اتنے دنوں کی تنگ دود سے جو سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

عثمان والدین سے مصالحت ہو جانے سے بید خوش تھے۔ ان کی زندگی میں صرف یہی پچانس تھی جو نکل گئی تھی۔ وہ آرائے آرائے پھرتے تھے۔ شائے کو بازوؤں میں بھر کر انہوں نے مجنونانہ انداز میں پیار کر کے کہا تھا۔ شائے میرے والدین نے تمہیں قبول کر لیا ہے۔ انہوں نے تم سے ہارن لی ہے۔ تم عظیم ہو۔ تمہاری یہ فتح میری زندگی کی سب سے بڑی سب سے جاندار اور سب سے منفرد خوشی ہے۔ مجھے خدانے ہر چیز دے رہی ہے۔ میرا دامن ہر خوشی سے بھر دیا ہے۔ مجھ سا خوش قسمت کون ہو گا۔

شائے ساری جان سے کانپ کانپ گئی تھی۔ جرم کا احساس شدید نہ ہونے لگا تھا۔ عثمان کے خلوص کو دھوکہ دینا۔ انہیں اندھیرے میں رکھنا ناقابلِ معافی گناہ لگنے تھا۔

لیکن اس نے لا پرواہ بننے کا جو عزم کر رکھا تھا۔ اس دن اتنے بڑے

- ہو - عثمان نے شیری کے گال کو انگلی سے چھو کر پیار کیا - آسانی کپڑوں میں وہ بہت پیارا لگ رہا تھا -  
 شیری بکھنے لگا - عثمان کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا بنے لگا -  
 - اٹھالوں - عثمان نے اسے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا - اب پہانتے لگے ہیں جناب -

- انہوں نے شیری کو دو ایک بار سہرا میں اچھالا - پیار کیا اور پھر آیا کے حوالے کر دیا -

آیا شیری کو لے کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آ بیٹھی - گھر بند کر کے اس نے چابیاں چوکیدار کو دے دی تھیں -

- سارے کمرے اچھی طرح لاک کیے نا - شائے نے عثمان کے برابر بیٹھتے ہوئے آپا سے پوچھا -

- جی - جی - وہ شیری کو گود میں بٹھاتے ہوئے بولی -

- چلیں - عثمان نے پوچھا -

- جی - شائے نے کہا -

عثمان نے گاڑی شارٹ کرتے ہوئے مسکرا کر زور سے بسم اللہ پڑھی -  
 اور پھر - اللہ تیرا لاکھ لاکھ سکڑ ہے - کہتے ہوئے گاڑی گیٹ سے باہر نکلے گئے -

راستے میں انہوں نے اپنا پسندیدہ کیٹ لگا کر ٹیپ آن کر دیا - شائے کو نورنگا ہوں سے دیکھتے ہوئے وہ اس مہرے کے ساتھ ساتھ جھومنے لگے -  
 سارا راستہ وہ چپ نہیں ہونے - باتیں کیے گئے - مذاق - شوخی - شرارت - جیسے ان خود مہور رہا تھا -

معلکت نہ تھی -

تیار ہو کر وہ باہر آئی - تو عثمان گاڑی کے قریب اس کے انتظار میں کھڑے تھے - اسے دیکھا - تو لپک کر اس کی طرف آئے - اسے سرتاپا دیکھا تو وہ نگاہوں کی اداسی چھپانے کے لیے دوسری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دی -

عثمان آنکھوں سے سیاہ چشمہ ہٹاتے ہوئے اس کے عین سامنے آ گئے -  
 - کیوں ؟ - شائے نے اک گہری سانس روک کر پوچھا -

- میں نہیں چاہتا کہ میری نظروں اور تمہارے درمیان کوئی بھی چیز حائل ہو - انہوں نے ہاتھ میں پجڑے چٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا -

- جی چاہتا ہے نہیں اتنا پیار کروں اتنا پیار کروں کہ - بس -  
 شائے نے عثمان کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکی - ان کی خوشیوں کے پیمانے

چھلک رہے تھے - ایک بار پھر شائے نے بہت جمعے کی - سر کو ہلکا سا جھکا دیا اور لاہر داہ بن جانے کی کوشش کی -

- اب چلیے بھی - وہ بولی -

- بہت بے تاب ہونا - شائے واقعی آج ہماری خوشیوں کا کوئی حساب نہیں -

- باقی سب لوگ چلے گئے -

- ہاں صرف آیا اور شیری یہاں ہیں -

- کہاں ہیں -

- آیا اسے تیار کر رہی تھی - بس لاتی ہی ہو گی -

شائے مڑ کر دیکھنے لگی - شیری کو اٹھائے آیا اور ہر آہ رہی تھی -

شائے بھی حتی الامکان ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

اپنے گھر میں عثمان اور شیری کے ساتھ شائے نے قدم رکھا تو اس کی حالت دگرگوں تھی۔ نوکر چاکر اکٹھے ہو گئے۔ سب نے مبارک باد دی۔ دعا پڑھیں۔ اس گھر کی ابدی خوشی کے لیے دامن پسلا کر دعا کی۔ شائے کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اور عثمان اسے مسرت کے آنسو سمجھ سجدہ کی مسکراتے رہے۔ انہوں نے سارا گھر شائے کو دکھایا۔ ہاں خواب گاہ کی طرف نہیں لے گئے۔ شائے نے ادھر جانا چاہا۔ تو راستہ روک کر بولے۔ ابھی نہیں۔ رات جب سارے کاموں سے فارغ ہو جائیں گے۔ تب۔۔

وہ کتنے شوخ ہوئے جا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں شباب کی مستیاں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو آج منعقد ہونے والی تقریب کو منوں میں ختم کر کے رات کو گھسیٹ لاتے۔

اس رات کو

جس کا انہیں بہاگ رات سے بھی زیادہ انتظار تھا۔

نیا گھر۔ نئی نئی چیزیں۔ خوبصورت دکش اور دلفریب تھیں۔ ہر چیز جگہ گارہی تھی۔ در دیوار مسکرا رہے تھے۔ عثمان کی نگین محنت اور دلولہ ہر چیز میں چمک رہا تھا۔ ڈرائنگ اور ڈائنینگ ہال کی تزئین و ترتیب آج وہاں کے لیے بطور خاص کی گئی تھی۔ شائے کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ اور اس گھر میں وہ اکت سرور اور مطمئن زندگی گزارے گی۔ ضمیر کے کچھو کے پے چین کر رہے تھے۔ عثمان کی بہکتی خوشیوں سے وہ کانپ کانپ اٹھتی تھی۔ پھر ظاہر داری سے کام لے رہی تھی۔ خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ اٹھلاتی پھر رہی تھی۔ ذہن سے ہر خوف اور دوسرے جھٹک رہی تھی۔

مراد علی سے مہمان آئے۔ عثمان علی خان اور عشرت بانو پہلی گاڑی سے باہر نکلے تو جلدی سے نعمت خان نے پستول عثمان کے ہاتھ میں دے دیا۔ ان کی آمد کی خوشی میں عثمان نے کئی ہوائی فائر کیے۔

مراد علی خان کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر عثمان کو سینے سے لگالیا۔ منظر قابلِ دید تھا۔ باپ بیٹے کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ شائے کے تو آنسو ہی کل آئے۔

عثمان نے شائے کا تعارف کروایا۔ اب سائڈ فاخرہ بھی آگئیں۔ عثمان سب سے نلن گیر ہوئے۔

حسن کا مجسمہ دیکھ کر مراد علی خان اور عشرت بانو دنگ رہ گئے۔ شائے نے جھک کر دونوں کو بڑے سی من موندنے اور شائستہ انداز میں تنظیم دی۔ مراد علی خان نے اسے سینے سے لگا کر پیار کر لیا عشرت بانو اور سائڈ فاخرہ نے بھی اسے لپٹالیا۔

اتنی پیاری ہیں ہماری بھابی۔ سائڈ تو شائے نے لپٹ رہی تھی۔ اُن اللہ آپ اتنے دنوں کہاں تھیں۔

کاش عثمان انہیں بہت پہلے ہم سے ملا دیتے۔ مراد علی خان نے مسکرا کر کہا۔ لیکن ہٹ کے پچے ہیں۔

کچھ کر کے ہی دکھایا ہے نا۔ عشرت بانو بولیں۔ شاباش بیٹے تم مبارک کے واقعی متقی ہو۔

ہمارا دل خوش ہو گیا ہے۔ مراد علی خان بولے۔ تمہارا انتخاب لاجواب ہے۔ مسکریہ۔ عثمان نے سر خم کر کے ادب دینا سے کہا۔ آج میں بھی بہت خوش ہوں اب حضور۔

- آپجی تشریف آوری ہماری بلند بختی ہے - شائے نہ کہا۔

سب باتیں کرتے ہوئے ہال میں چلے گئے۔ ڈرائیور گاڑیاں نکال لے گیا۔ روشنیوں سے نہایا ہوا ماحول بڑا ہی دلغریب تھا۔ ساڑھے فاخرہ تو شائے ہی چپٹ گئی تھیں۔ اپنے ویدرہ زیب بھڑکیلے لباسوں میں وہ اس کے ساتھ ساتھ اٹھاتی پھر رہی تھیں۔

مہمان آنا شروع ہو گئے۔

عثمان اور شائے ہال کے صدر دروازے پر کھڑے تھے۔ مہمانوں کا استقبال خندہ پیشانی سے ہو رہا تھا۔ مہمان مبارکباد کہہ رہے تھے۔ ساتھ لائے ہوئے تحائف نوکر دوں کے حوالے کر رہے تھے۔ عثمان اور شائے رسمی تکلفاتی جملے ادا کرتے ہوئے تحائف کے لیے شکریہ بھی ادا کر رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد شائے کے ڈیڑھی ماما آ گئے۔ ظرفیہ اور امی جی بھی تھے۔ اس کی کچھ سہیلیاں بھی آئی تھیں۔ ماما نے عثمان کی پیشانی چوم لی۔ شائے کو گلے سے لگایا۔ ان کی خوشیوں کا آج ٹھکانہ نہیں تھا۔ مبارکباد الفاظ میں نہیں اظہار سے دے رہے تھے۔ ظرفیہ نے آج بڑا دیدرہ زیب ڈرلین پہنا ہوا تھا۔ بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ شائے سے گلے ملی۔ تو ہنس کر بولی۔ کیا ہوتا جو آج زریں خان کو بھی بلالیتیں۔

۔۔ اودہ۔۔ لیکن وہ یہاں ہے کہاں۔ شائے نے پیار سے کہا۔

۔۔ آجاتا۔۔ ظرفیہ شوخی سے بولی۔ کچھ ہمارا خیال ہوتا تو جب نا۔

۔۔ بہت بے تاب نہ ہو۔ مل جائے گا موقعہ تجھے بھی۔ شائے بولی اور پھر

آنے والے مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

۔۔ شانو۔۔ عثمان نے اندر جانے والے ماما اور ڈیڑھی کے پیچھے پیچھے جاتے

ہوئے اسے بکارا۔ آڈان کا تعارف تو اباحضور سے کرادیں۔

شائے ظرفیہ کو ساتھ لے کر اندر آ گئی۔ مہمانوں کی کافی تعداد تھی۔ لوگ ہنس بولی رہے تھے۔ ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ ہال کی تہہ بین کی تعریفیں کر رہے تھے۔ ذوق کی داد دے رہے تھے۔ عثمان نے تعارف کر دیا۔

ماما عشرت بانو سے بغل گیر ہوئیں۔ ڈیڑھی نے مراد علی خان سے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ ظرفیہ کے بے مثال حسن سے عشرت بانو متاثر ہوئیں۔

۔۔ ہم آپ سے بہت شرمندہ ہیں۔۔ رسمی احوال پرسی کے بعد مراد علی خان نے بڑی صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ عثمان نے حیرت اور سرت سے باپ کو یوں دیکھا جیسے اندازہ کر رہے ہوں کہ یہ الفاظ واقعی ان کے ہیں۔

۔۔ شائے بے حد پیاری کچی ہے۔ عشرت بانو نے مسکرا کر کہا۔ اب انوس ہو رہا ہے کہ ہم اس سے پیلے کیوں نہ مل پائے۔

۔۔ نوازش ہے آپ لوگوں کی۔ ماما نے انتہائی شائستگی سے جواب دیا۔ شائے کی خوش بختی ہے کہ آپ لوگوں نے اسے قبول کیا۔ وہ انشاء اللہ آپ کی تابعدار رہے گی۔

ڈیڑھی ماما ان کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ شائے ظرفیہ کو ساڑھے فاخرہ سے ملانے دوسری طرف چلی گئی۔ عثمان دوستوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

خوب گھاگھی تھی۔ ردنی۔ بلبل۔ شور وغل بڑا ہی سرور ہنگامہ تھا۔ ہر زبان پر تعریفی و توصیفی جملے تھے۔ شائے کے حسن و جمال رکھ رکھاؤ اور شائستگی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ عثمان کے انتخاب کی داد دی جا رہی تھی۔ کوٹھی کی بناوٹ سجادوٹ کو سراہا تھا۔ عثمان چھوٹے نہ مار رہے تھے۔

۔۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ ماما بیٹی کے گھر بار اور ٹھانڈے ہاتھ کو دیکھ کر دل ہی

”ضرورت تھی۔ میرے لیے دوہری خوشی۔ میرے والدین رضامند ہو گئے ہیں۔“  
 ”پھر تو گانے بجانے کی ڈبل شفٹ ہونا چاہیے تھی۔“  
 گانے بجانے کی نہیں بجدہ شکر کرنے کی۔  
 عثمان نے بڑی عقیدت سے کہا۔ دوست بے حد متاثر ہوئے۔

بر بھی گانے کی محفل بپا کرنے کا وعدہ لے ہی لیا۔  
 اس پر سرت تقریب کے حین لمحوں کو کیرے کی آنکھ میں مقید کرنے کا بھی  
 بند و بست تھا۔ فوٹو گراف تصویریں لیتا پھر رہا تھا۔ کھانے کے بعد میل گروپ  
 اتارے گئے۔ شائے کی تصویریں عثمان نے اپنے خاندان کے ہر فرد کے ساتھ  
 اترا دیں۔ مراد علی خان اور عشرت کے ساتھ تو انہوں نے شائے کو بار بار تصویر  
 اترا دینے پر مجبور کیا۔ ایسا کرتے ہوئے ان کا جو جذبہ اور نگیں کام کر رہی تھی۔ شائے  
 محسوس کر کے کانپ کانپ جاتی تھی۔ وہ اسے اپنے اہل خانہ کے قریب ترک کرنے  
 کی شعوری کوشش میں مشغول تھے۔ اس کوشش میں شائے کا وقار اور شان بھی ملحوظ  
 خاطر تھا۔

مہمان واپس ہونا شروع ہوئے تو انہیں زحمت کرنے کے لیے عثمان اور  
 شائے پہلو پہلو کھڑے تھے۔  
 ”بہت خوش قسمت ہو شائے۔“  
 ”خدا مبارک کرے۔“

”عثمان نے آپ کے لیے جو کچھ کیا ہے کوئی نہیں کر سکتا۔“  
 ”عثمان نے آپ کو آسمان کی بلندیوں سے بھی بلند کر دیا ہے۔“  
 ”گر ریٹ تو آپ تھیں ہی عثمان۔ نے دی گر ریٹ بنا دیا ہے۔“  
 ”عثمان نے اپنی بے انتہا محبت کا آج ثبوت بھی دے دیا ہے۔“

دل میں کہہ رہی تھیں۔ شائے اور عثمان آج ان بان ہی اور تھی۔ والدین کی  
 شمولیت سے شائے کو آج اس کا حقیقی مقام ملا تھا۔ ماما بار اللہ کا شکر  
 ادا کر رہی تھیں

ماما اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے عشرت بانو کے دل میں اتر گئیں۔ وہ ان  
 سے بہت ہی سرعوب ہوئی تھیں۔ دونوں سارا وقت تقریباً ساتھ ساتھ ہی  
 رہیں۔ مراد علی آنے کے لیے انہوں نے بطور خاص ماما سے کہا۔

”اب تو ضرور آیا جایا کریں گے۔ اس وقت کی مجھے شدت سے خواہش  
 تھی۔ یقین مانیں اب تک میری خوشیاں ادھوری تھیں۔“

”ہم واقعی بہت شرمندہ ہیں۔ خاندانی روایات کے بت توڑ کر عثمان نے  
 بہت بڑا کام کیا ہے۔“ عشرت بانو نے کہا۔

سائے فاخرہ اور ظریفیہ میں بھی دوستی ہو گئی۔ آئندہ شے رہنے کے  
 پروگرام تینوں نے بڑی چاہت سے بنائے۔ ظریفیہ آیا سے شیریں کو بھی لے  
 آئی۔ تینوں بچے کو مہانوں کو دکھاتی پھریں۔ مراد علی خان نے کتنی دیر اسے  
 گود میں اٹھائے رکھا۔ سب بے انتہا خوش تھے۔

کھانا وقت پر دے دیا گیا۔ وسیع ڈائیننگ ہال میں لمبی میزوں پر کھانا  
 قرینے سے لگایا گیا تھا۔ ہر تکلف اور لذیذ کھانا مہانوں نے سیر ہو کر کھایا۔  
 عثمان نے کچھ دوستوں سے شکایت کی۔ ”بھئی آج کی تقریب ادھوری  
 ہے۔“

”کیوں۔“

”گانا بجانے کا پروگرام بھی ہونا چاہیے تھا۔“  
 ”پھر کبھی سہی۔“

انہوں نے تہارے لیے بے انتہا محنت کی ہے۔ بڑی جدوجہد کی ہے۔  
خدا ہر لڑکی کو ایسا شوہر دے۔

رخصت ہونے والے بے تکلف و دست ادران کی بیگمات قریبی عزیز اور  
ملنے والے ایسے ایسے جملے کہ دردِ باغِ حور ہے تھے۔ یہ جملے جہاں عثمان کا سرِ فخر سے  
سر بلند کر رہے تھے۔ شائد کے من میں تیر بن کر اتر رہے تھے۔ عثمان کے ساتھ  
کھڑے کھڑے وہ محسوس کر رہی تھی۔ کہ وہ اس سے بلند بہت بلند ہیں۔ بلند  
ہوتے جا رہے ہیں۔ اور وہ کچھ کھاتے ہوئے پاتال کی گہرائیوں کی طرف جا  
رہی ہے۔ اپنی نظروں میں اتنی ذلیل ہوئی جا رہی تھی۔ کہ رخصت ہونے والوں  
کی باتوں پر اب مصنوعی مسکراہٹ بھی نہ لاسکتی تھی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔  
اس کے من میں ٹھیک ٹھکانی ہوتی جا رہی تھی۔

آج کے فلکشن میں اسے عثمان کی محنتوں و معنوں اور چاہتوں کا صحیح طور پر احساس  
ہوا تھا۔ اسے ان بلندیوں پر پہنچانے کے لیے انہوں نے کیا کچھ کیا تھا آج پوری طرح  
پتہ چلا تھا۔

اور یہ احساس ہونا۔ یہ پتہ چلنا قیامت بن رہا تھا۔

اس کی ساری ہستی ڈانواں ڈول رہی تھی۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔ کیا خداؤں سے  
فریب کرنا ممکن ہے۔

کیا فرشتوں کو دھوکہ دیا جاسکتا ہے۔

اس کی ہمت ٹوٹ رہی تھی۔ سنبھلنے کی کوشش میں گری جا رہی تھی۔ فیصلے

بننے اور بگڑنے لگے تھے۔ اسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

اس کے ضمیر پر تاثر توڑ چلے ہوئے تھے۔ کچھ کے لگ رہے تھے۔ یہ ضمیر

بے چین تھا۔ اس پر اتنا بار بڑھ گیا تھا۔ کہ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا

اس کی چیخ و پکار کے سامنے احتیاط احتیاط کی گونج شکست خوردہ نظر  
آنے لگی تھی۔

ہواؤں کے دوش پر لہراتے پھر رہے تھے۔ مستی چھائی تھی۔ مدتوں کی محنت ٹھکانہ لگئی تھی۔ طوفانوں کی لپیٹ میں آئی کشتی جیسے آج کنارے آن گئی تھی۔ سرشار تھے۔ بدست تھے۔ بہکے جا رہے تھے۔

پسند آئی۔ خوابگاہ۔ عثمان نے بڑے شوق سے پوچھا۔

شانہ نے آٹومیک مشین کی طرح سر لایا اس کے چہرے کے میک اپ نے اس پر دارو ہونے والی کیفیت کو چھپا لیا۔ عثمان خوشی خوشی اسے کمرے کی تزیین اور نایاب نایاب چیزوں کے متعلق بتانے لگے۔

”یہ داز میں جاپان سے لایا تھا۔ یہ مجسمہ کانسی کا ہے۔ یہ ڈیکوریشن پیس پیس سے خریدی تھا۔ یہ ناچتی ہوئی عورت انڈونیشی ہے۔“

وہ چیدہ چیدہ چیزوں کے متعلق شانہ کو بتا رہے تھے۔ شانہ شاید تعریفیں بھی کر رہی تھی۔ لیکن اس کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل تیزی سے ہو رہا تھا۔ کوئی چیز بھینکتی ہی جا رہی تھی۔ پھٹ پڑنا یقینی ہو رہا تھا۔ عثمان باتیں کر رہے تھے

اور

اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے ضمیر کا بوجھ پادری کے سامنے اعتراف کر کے ہلکا کرنے کے لیے وہ کلیسا کے اندر داخل ہو گئی ہے۔ اس نے لاکھ دفعہ اس اذیت وہ خیال کو ذہن سے جھٹکنا چاہا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ ڈوبتی گئی۔ ڈوبتی چلی گئی۔

شانہ۔ عثمان نے اسے گم سم دیکھ کر پکارا۔

جی۔

تھک گئی ہو۔

تشریف لائیے ملکہ عالیہ۔ عثمان نے کورنش بجالاتے ہوئے شوخی سے کہا۔ انہوں نے خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ شانہ اندر آ گئی۔

خوابگاہ خوابوں کی طرح حسین تھی۔ سرخ روشنیوں کا غبار پھیلا تھا۔ عثمان کی پسندیدہ خوشبو فضا میں رچی بسی تھی۔ بید پر پھولوں کی چادر پڑھی تھی۔ اور اس کے گرد اگر دجالیدار پردوں کے ساتھ پھولوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔

شانہ سرتاپا کانپ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ خوابگاہ میں نہیں کسی عبادت گاہ میں داخل ہوئی ہے۔ عبادت گاہ جہاں عابد و معبود کا رشتہ براہ راست ہوتا ہے۔ معبود کی نظریں عابد کے دل کے آ رہا ہوتی ہیں۔ جہاں کچھ نہیں چھپایا جھوٹ نہیں بولا جاسکتا۔ کوئی راز راز نہیں رکھا جاسکتا۔

اسے چپکا گیا۔ جلدی سے وہ مندر کے کنارے پر ٹک گئی اسے ایکایک کیا ہو گیا تھا۔ وہ خود بھی نہ سمجھ پائی۔ عثمان کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی۔ وہ جیسے

میں سیٹ کر بڑے والہانہ انداز میں پیار کر لیا۔ پھر اسے ہاتھوں پر اٹھایا اور  
بیڈ پر ڈالتے ہوئے اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس پر جھک گئے۔ اس کی گردن  
میں بازو ڈالتے ہوئے پیار سے بولے۔ ہماری اصلی سہاگ رات تو آج ہے۔  
وہ سہاگ رات تو کراٹے کے ہوٹل میں تھی۔ کراٹے کی رات تھی۔

وہ سنس پڑے۔

شانہ مسکرا بھی نہ سکی۔ اس کا سارا وجود بے جان ہو رہا تھا۔ رگوں میں سنسنی  
ہو رہی تھی۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا۔ کہ نیچے پاتال کی گہرائیوں میں اترتی  
چلی جا رہی ہے۔

عثمان نے شانہ کی گردن کو ہونٹوں سے چھوا۔ تھکاوٹ کا بہانہ نہیں چلے  
گا میری جان۔ آج تو جاگیں تمام رات جگا نہیں تمام رات والی بات ہوگی۔  
سمجھیں۔

شانہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اس کا جسم عثمان کے پاس تھا۔ ذہن دل  
دماغ سوچوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اندر ہی اندر پھیلنے والی چیز بھٹ جانے  
کے کنارے پر تھی۔

عثمان غمور و مسرور تھے۔ جذبات مچل رہے تھے۔ انہی حرکات بدست  
شرابی کی طرح ہلکی جا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹ اور ہاتھ چھڑچھاڑ میں مصروف تھے  
حسین سرگوشیاں مترنم ہوئی جا رہی تھیں۔ شانہ برف کا تودہ مٹی جا رہی تھی۔ مٹی  
کا بت تھی۔

عثمان کا جذباتی پن اس میں حرارت اور زندگی پیدا کر رہا۔ تو وہ کچھ حیران  
ہوئے۔

شانہ۔ انہوں نے چہرہ اونچا کرتے ہوئے پوچھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

ہاں۔

چلو پھر کپڑے تبدیل کر لو۔

وہ اٹھی۔

عثمان بازو کا سہارا دے کر اسے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔

ڈرائنگ روم میں تیز درودھیا روشنی تھی۔ ہر چیز جھپک رہی تھی۔ دیوار گیر  
آئینے تھے۔ دار درو میں تھیں۔ شانہ کے رنگارنگ ڈرائیو سیکڑوں میں تنگ  
تھے۔ میک اپ کی چیزیں ڈرائنگ ٹیبل پر قریب سے سجی تھیں۔

یہ رہا لباس شب خوابی۔ عثمان نے پیاز کے اندرونی چھلکے کا سا  
مہین اور سیپ کی رنگت کا انتہائی دلکش اور جذبات انگیز لباس شانہ کو  
دکھایا۔ شانہ کے ہونٹوں کو پیار سے چھوا اور مسکرا کر بولے۔ فوراً پہن  
کر آ جاؤ۔

وہ آنکھوں کے شوخ شوخ مسکراتے مسکراتے اشارے کرتے ہوئے  
اپنے ڈرائنگ روم کی طرف چلے گئے۔ شانہ کے دل میں ہوک اٹھی۔ وہ  
اس خوبصورت لباس کو کھپٹی کھپٹی نظروں سے دیکھتی رہی۔

اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ سینے میں جلن ہو رہی تھی۔ عثمان کی مہربانیوں کی  
فراوانیاں اسے مارے جا رہی تھیں۔

اتنے دنوں سے وہ عثمان کو دھوکہ دیتی آرہی تھی۔ لیکن آج اس کی ہمت جواب  
دے رہی تھی۔ خمیر جی رہا تھا۔ محبتوں کو فریب دینا دنیا کا شکل ترین کام تھا۔  
کافی دیر بعد وہ لباس تبدیل کر کے اندرا گئی۔ عثمان اس کے انتظار ہی میں  
کھڑے تھے۔

ادہ میری زندگی۔ میری جان۔ وہ لپک کر اس کی طرف بڑھے۔ بازو ڈل



کیا بات ہے۔۔۔ عثمان نے پوچھا۔۔۔ ٹھک گئی ہو۔۔۔ نیند آرہی ہے۔  
وہ کچھ نہیں بولی۔ عثمان سیدھے ہو کر بیٹھے ہوئے بولے۔ کیوں شائد۔  
طبیعت تو ٹھیک ہے۔ پانی لاؤں۔

وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کی حالت غیر سو رہی تھی۔ اپنے آپ میں دھکی۔ اس  
نے قریب بیٹھے عثمان کے کندھوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ عثمان نے  
دیکھا وہ تھر تھرا کر رہی تھی۔ وہ بے طرح گہرا گئے۔

کیا بات ہے شائد۔ کچھ کہو تو۔ کیا ہو رہا ہے۔ تمہاری طبیعت یقیناً  
ٹھیک نہیں۔ لیٹ جاؤ۔

وہ پوری آنکھیں کھولے عثمان کو تک رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر ٹھنڈ کے  
بادجوڑ پسینے کے قطرے تھے۔ عثمان نے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ ان کی پریشانی  
اور گہرا سبٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے اٹھنا چاہا تو شائد نے ان کا ہاتھ پکڑ  
لیا۔

مانی۔ اس نے کہا۔ درد سے اس کی آواز بھٹ گئی۔  
شائد۔ انہوں نے اسے اپنی طرف کھینچ کر لیا۔ وہ بے قابو ہو کر رو  
گئی۔ عثمان کچھ سمجھ نہ پائے۔ اسے سینے سے لگائے پھٹکتے ہوئے رونے کی وجہ  
پوچھنے لگے۔ رونے کی سر ممکن وجہ انہوں نے پوچھی۔ لیکن وہ روئے گی۔

شائد۔ کیا خوشی کے آنسو ہیں۔۔۔ انہوں نے گہرا کر کہا۔ شائد کے سینے  
میں ہچکیاں ٹوٹتے لگیں۔ تو وہ بے حد گہرا گئے۔ شائد کو اپنے سے الگ کرتے  
ہوئے انہوں نے اس کے آنسوؤں سے ترچہرے کو دیکھا۔

کیا ہوا؟ انہوں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ بتاتی کیوں نہیں۔  
پریشان کر رہی ہو۔

عثمان کا ردِ مانوی موڈ ختم ہو گیا تھا۔ وہ حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئے تھے  
سوچ سکتے تھے سمجھ سکتے تھے۔ خوشیوں بھری اس رات کا استقبال آنسوؤں  
سسکیوں اور ہچکیوں سے کیا جا رہا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ عثمان کا  
دھیان مراد فعلِ دالوں کی طرف گیا۔ شاید کسی نے چپکے سے زہر بھجے تیر حلا کر  
شائد کی انا کو مجروح کر دیا تھا۔ وہ بے تابی سے بولے۔ کسی نے کچھ کہہ دیا  
ہے۔ مجھے بتا دو۔ بے دھڑک کہہ دو۔ شائد۔ کچھ نہیں چھپانا۔ ساری  
باتیں بتا دو۔ تمہیں جس نے دکھ دیا ہے میں اس کا خون پی لوں گا۔ جھجکے نہیں  
نام لوچا ہے میرے ابایا امی ہی ہوں۔ اگر انہوں نے تہا رادل دکھایا ہے تو میں۔  
نہیں مانی۔ شائد نے ساری جان سے کافیتے ہوئے کہا۔ مجھے کسی نے  
کچھ نہیں کہا۔ میں تو خود ڈوبی ہوں۔

شائد۔ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ عثمان نے گہرا کر اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔  
بخدا جلدی بولو۔ مجھ میں برداشت نہیں رہی۔ آخر بات کیا ہے۔ بتاؤ نا۔  
بتا بھی دو۔

بتاتی ہوں۔ شائد نے بازو سے آنکھیں پونچھ کر جذباتی انداز میں کہا۔ میں  
نے سب کچھ نہ بتایا۔ تو میرا ردل بھٹ جائے گا۔ مانی۔ میں کئی دنوں سے  
آپ کو دھوکہ دے رہی ہوں۔ لیکن آج۔ آج۔

شائد۔ عثمان کی آواز گھٹ گئی۔ معاملے کی نوعیت سے وہ اب تک  
بے خبر تھے۔ لیکن سنگینی کا احساس کچھ کچھ ہو چلا تھا۔

میرا ضمیر مجھے چپ نہیں لینے دے رہا۔ شائد نے سینے میں ٹوٹی ہچکیوں  
کے درمیان سر جھکاتے ہوئے کہا۔

عثمان اسے خوفزدہ نظروں سے ٹک رہے تھے۔ شائد ان نظروں سے

بے نیاز یوں بیٹھی تھی جیسے کلیا کے اندر خمیر کا بوجھ اتارنے کے لیے مجرم پادری کے سامنے اعتراف کی منزل سے گذر رہا ہوتا ہے۔

عبادت گاہ کے اندر مہبود کے سامنے جھوٹ نہیں بولا جاسکتا۔

شائندہ نے سچائی سے اعتراف کر لیا۔ ساری بات عثمان کو بتا دی۔ اس کا سانس پھول گیا۔ اس کا وجود ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ پسینے میں نہا گئی۔ لیکن ساری سچائی اس نے پوری ایمانداری سے اگل دی۔

اور

اور

اس کے عین سامنے بیٹھے عثمان یوں لگا۔ جیسے نشین کی ساری چھتیں اکٹھی ہو کر ان کے سر پہ آن گری ہیں۔ دھماکہ دھول مٹی جھٹکے۔ انہیں صرٹ ہی محسوس ہوا۔ پھر بھی ان کا دم نہیں نکلا۔ ہوش کے عالم میں جانکنی کی اذیت سہنا آسان تو نہیں ہوتا۔ وہ پٹی پٹی نظروں سے شائندہ کو نکال رہے تھے۔ ان کے چہرے پر مڑی چھا گئی تھی۔

پھر ایک ایسی وہ چیخے۔ اپنا گریبان اتنا زور سے کھینچا کہ وہ چاک ہو گیا۔ نہیں شائندہ۔ نہیں نہیں۔ نہیں۔ وہ کانپ رہے تھے۔ خوفزدہ وحشت زدہ تھے۔ یوں جیسے کوئی انتہائی ہیجانک خواب حقیقت میں ڈھل کر سامنے آ گیا ہو۔

انہوں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور پھر پوری قوت سے چیخے۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ شائندہ۔ نہیں۔

شائندہ ڈر گئی۔ اس نے تو شاید اس ہولناکی کا اندازہ ہی نہیں کیا تھا۔ اپنی آگ میں جلتی رہی تھی۔ سوچا ہی نہ تھا۔ کہ اس آگ نے عثمان کا دامن پکڑا تو

ہلاکت کی کتنی کہ بنا کہ منزل سامنے آئے گی۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کے عثمان آنکھیں بند کیے سر اور ہادھر بچ رہے تھے۔ ان کا چوڑا چھلا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ شائندہ انہیں دیکھنے کی تاب نہ لاکر جلدی سے بیڈ سے نیچے اتر گئی۔ وہ خود بھی لرز رہی تھی۔ رنگ فق تھا۔ اور دل دماغ کے پر نیچے اڑ رہے تھے۔

عثمان تیزی سے اٹھے۔ بیڈ کے گرد گھوم کر اس کے سامنے اکھڑے ہوئے۔ اسے وحیانہ انداز میں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے چیخے۔ تم نے سب کچھ غلط کہا ہے نا۔ کہ مذاق کیا ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ سب غلط ہے۔ شینڈ تم میری امانت ہو۔ تمہارا سب کچھ میرا ہے۔ اس میں خیانت نہیں ہو سکتی۔ نہیں ہو سکتی۔ نہیں ہو سکتی۔ کدو کر سب کچھ غلط ہے۔

شائندہ مجرموں کی طرح کھڑی تھی۔

کیا یہ سب سچ ہے۔ عثمان گر جے۔

ہاں۔ یہ آنسوؤں سے اندھی آواز تھی۔ میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا۔

شائندہ۔ عثمان اتنے زور سے چیخے کہ خواب گاہ کے در و دیوار لرز اٹھے۔ شائندہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

شائندہ۔ عثمان غصے سے پاگل ہو گئے۔ ان کے ہاتھ اٹھے۔ اور شائندہ کی گردن کی طرف بڑھے۔

وہ صلیب پر چڑھے وجود کی طرح ساکن کھڑی رہی۔

عثمان نے اس کی گردن پکڑ لی۔

لیکن

پیشتر اس کے کہ غصے سے سسنا تے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو کر شائندہ

لعل بصارت پر یقین نہ رہا۔ شائے کو کھینچ کر سینے سے لگایا۔ بازوؤں میں بھر کر اس کے بالوں میں منہ چسپا کر بے بسی کی انتہا کو چھوتے ہوئے گلو گھر پہ آواز میں بولے۔ "شانو۔ کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ کہ یہ سب غلط ہے۔ جھوٹ ہے مذاق ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہو تو آسمان گر پڑے گا۔ قیامت آجائے گی۔"

شانو بے حال ہوئی چار ہی تھی۔

لیکن۔ لیکن۔۔۔ عثمان کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ انہوں نے شانو کو پرے دھکیل دیا۔ گریبان پھڑک کر چیخے۔ لیکن یہ سب کچھ تو سوہ چکا ہے۔ سوچکا۔ اوہ میرے خدا۔ میں۔ کیا کروں۔ کیا کروں۔

انہوں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے پچھلا ہونٹ سختی سے دانتوں تلے دبایا۔ پھر ساری رات یہی کچھ ہوتا رہا۔

انہوں نے شانو کو کئی دفعہ مارا۔

کتنی دفعہ پیار کیا۔

لیکن

یہ سب کچھ ان چرکوں کا ملا دانا نہیں بن سکا۔ جوان کے دل میں لگے تھے۔

ت لمحہ لمحہ قیامتیں ڈھاتے گذر رہی تھی۔ وہ رات جس کے ایک ایک لمحے سے خوشیاں کشیدنے کے تصور سے وہ سرشار رہتے تھے۔ اتنی بے درد سفاک درنگیں ہو گئی تھی۔ اسی بے درد رات کے قیامت ڈھاتے لمحوں میں عثمان نے سپتول اپنی کنپٹی پر رکھ کر داغ دینا چاہا تھا۔ لیکن شانو نے برق کی سی زری سے چھپا مار کر سپتول ان کے ہاتھ سے گر ادیا تھا۔ اور ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی تیر کی طرح پلک کر سپتول اٹھایا۔ اور کھلی کھڑکی سے باہر اچھال دیا تھا۔

کی شہرگ دبا دیتی۔ کہیں سے شیریں کے رونے کی آواز آگئی۔ وہ شاید دودھ کے لیے جاگا تھا۔ یا کستی تکلیف سے رو رہا تھا۔ آواز کانوں میں اترتی گئی۔ شیریں کی شبیہ آنکھوں میں لہرائی۔ مٹا سے محروم بچے کا دکھ ان کا جانا پہچانا تھا۔ ان کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ انہوں نے شانو کو زور سے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ خود بیڈ پر اونٹھے متجاگرے۔ ان کا سارا وجود طوفانوں کی زد میں آئی کشتی کی طرح بچھو لے کھا رہا تھا۔

شانو کا دل کٹ کٹ گیا۔ وہ چند لمحے بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر بیڈ کی طرف بڑھی۔ اور عثمان کی نشت سے پلٹ کر بے اختیار سو ہو کر روتے ہوئے بولی۔ "مانی۔ میں نے ارادہ کیا تھا۔ میں قصور وار نہیں ہوں مجھے معاف کر دیں۔ مجھے بخش دیں۔"

عثمان نے پلٹ کر اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ تم میری سو شانو میری ہو۔ تم نے کیا کر دیا۔ میری خوشیوں میں آگ کیوں لگا دی۔ کس ظلم کی یہ سزا دی ہے مجھے۔ تم کتنی ظالم ہو۔ کتنی بے درد ہو۔ کتنی سفاک ہو۔ جنونی انداز میں باتیں کرتے عثمان نے شانو کو پرے پٹخ دیا۔ وہ قالین پر گری عثمان کمرے میں دیوار ٹپکنے لگے۔ شانو نے ان کے قدم پھڑیلے۔ تو غصے سے پاگل ہوتے ہوئے انہوں نے دو تین ٹھوکریں ماریں۔ پھر شانو کو بالوں سے پکڑ کر ادھر کھینچا اور اس کے چہرے پر اپنی پھری ہوئی قوت سے طمانچے مار مار کر بے حال کر دیا۔ "ذلیل عورت۔ بدکار۔ کینی۔" پہلی بار ان کے منہ سے اتنے گرسے ہوئے الفاظ نکلے۔

شانو منہ چسپا کر روتی رہی۔

عثمان اسے قہر آلود نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر شاید اپنی سماعت

- ہٹ جاؤ۔ عثمان نے دھکا دے کر شانہ کو راہ سے ہٹا کر باہر جانے کی تھی۔

شانہ ان کے بازو سے لپٹ کر بولی تھی۔ میرے لیے نہیں شیریں کے لیے زندہ رہیے عثمان۔ میں آپ کو الیا نہیں کرنے دوں گی۔ شیریں کو آپ کی ضرورت ہے۔ اس نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ مارنا ہے تو مجھے مار ڈالیے۔

عثمان بے دم ہو کر لتبر پر گر گئے۔  
شانہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اور

یہی تھا

وہ خونی سانچہ

وہ خوفناک واردات

وہ بے رحم حادثہ

جس نے شانہ اور عثمان کی سنتی بستی پیار کی نگری کو دیران کر دیا۔  
دلوں میں دیکھ بھر دیئے اور روحوں میں سناتے پھیلا دیئے۔

دندوں زخمی تھے۔ مجروح تھے۔ اذیت درد اور تڑپ کی سانچہ تھی۔

صبح عثمان کی آنکھ کھلی۔ تو دن پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سنہری دھوپ پردوں کی درمیانی درزوں سے اندر منعکس تھی۔ کمرے میں چمکیلا اجالا بکھرا ہوا تھا۔

پھر تمام تک وہ باہری گھومتے پھرتے رہے۔ دیوانوں کی طرح۔ دیوانوں کی خاک چھاتے رہے۔ وہ کبھی سنبھل جاتے۔ کبھی بے قابو ہو جاتے۔ صدمہ اتنا جان لیوا تھا۔ کہ ان جیسے دل درماغ کا آدمی بھی حوصلہ ہار بیٹھا تھا۔

رات کافی گذر چکی تھی۔ وہ گھر آئے۔ ملازم نے کھانے کے لیے پوچھا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ حرف چانے کی چالی پی۔ اور خواب گاہ میں آگئے۔ شانہ لٹی ٹپی دیوان پر بیٹھی تھی۔ عجب بلند رنگی اور اداسی اس کے سر پایا پر چھائی تھی۔

عثمان نے حرف اک نگاہ اس پر ڈالی۔ یہ نگاہ کسی شعلے کی طرح جلا ڈالنے والی تھی۔

پھر وہ ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ لباس تبدیل کیا۔ نیلا ناٹ سوٹ پہنا گاؤن لیا۔ اور خواب گاہ کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔

شانہ رات گئے تک ان کی دلپی کی منتظر رہی۔ لیکن وہ واپس نہیں آئے۔ اس کا دل ڈوب ڈوب گیا۔

پھر وہ دیوان سے اٹھی۔ اور اسی دروازے سے باہر نکل گئی جس سے عثمان گئے تھے۔

لبا برآمدہ عبور کر کے دائیں طرف مڑی۔ تو مہمان خانے کے بیڈ روم کی تی روشن تھی۔ اس نے دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ سانے ہی بیڈ پر عثمان لیٹے تھے۔ انہوں نے تکیے میں منہ دے رکھا تھا۔ اور پاؤں پر رکھا پاؤں بغیراری سے ہلا رہے تھے۔

شانہ نے جان لیا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ وہ چند لمحوں میں کھڑی رہی۔ ہچکچاتی رہی۔ اندر جانے کی جرأت نہ ہو سکی۔

انہوں نے کروٹ بدلنا چاہی۔ تو جسم شل تھا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کی ڈبیہ اٹھائی۔ سگریٹ سلگانے کو لائیٹر جلایا۔ تو آگ کے شعلے نے انہیں رات کے آخر چمکاں واقعے کی یاد دلادی۔ انہوں نے سر کو جھٹک دیا۔ اسے اک خوفناک خواب سمجھنے کی کوشش کی۔

لیکن حقیقت کو جھٹلادینے کی جرأت نہ کر سکے۔ سگریٹ انہوں نے ایش ٹرے میں ڈال دیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ شانہ کمرے میں نہیں تھی۔ بیڈ پر وہ اکیلے لیٹے تھے۔ پھولوں کی چادر مسللی ہوئی تھی۔ مہربانے پھولوں کا رنگ بدل چکا تھا۔ خواب گاہ دروازہ بند تھا۔ دوسری طرف کے دروازے کا لاک بھی لگا ہوا تھا۔ شانہ یقیناً اندر ہی تھی۔ عثمان نے سکون کا سانس لینا چاہا۔ لیکن سانسوں میں آگ گھل گئی۔ نفرت و کراہت سے انہوں نے سر جھٹک دیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھنے لگے۔ ٹھنڈی آہیں ان کے سینے سے سرھوڑتی رہیں۔ شانہ دیوان کے دوسری طرف قالین پر سو رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ گھٹنوں میں دسے رکھے تھے۔ اور شاید نیند ہی میں سردی سے بچنے کے لیے پرہ کھینچ کر آدھے جسم کو ڈھک لیا تھا۔

عثمان نے اسے دیکھا۔ تو دل تڑپ گیا۔ بے قراری سے اس کی طرف بڑھے۔ اس کے معصوم اور اس چہرے کو غور سے دیکھتے رہے۔ پھر ان کے حواس متزلزل ہونے لگے۔ انہوں نے شانہ کا گلا دبا دینے کی تڑپ محسوس کی۔ وہ تو خیر مرنی بخورہ جلدی سے پرے ہٹ گئے۔ لہجہ میں کتنی ہی دیر انداز سے پڑے رہے۔ ایسے میں قرار نہ آیا۔ تو تیار ہو کر باہر نکلے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر گاڑی لی اور چلے گئے۔

اس نے دیکھا۔ عثمان نے بقیارہی سے کروٹ بدلی۔ تکیہ پر سے پھینک دیا  
 اوندھے ہو کر سراسر ہاتھ بٹھا۔  
 پھر وہ اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے اپنا گریبان جھٹکے سے کھول دیا۔ یوں محسوس  
 ہوتا تھا۔ سینے میں آگ لگی ہے۔ جو بڑک بڑک اٹھتی ہے۔  
 - آف - آف - انہوں نے آنکھیں میچتے ہوئے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کئی بار  
 کہا۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بے تابی سے کمرے میں ٹپٹنے لگے۔ ان کے منہ  
 سے آدھیت وہ آوازیں نکل رہی تھیں۔  
 - یا خدا - انہوں نے چیخ مار کر کہا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ  
 لیا۔

شائندہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ تڑپ گئی۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ کمرے میں آ  
 گئی۔ اور عثمان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔  
 عثمان نے ہاتھ کاٹس محسوس کرتے ہی چہرے سے ہاتھ ہٹا دیئے۔ گردن  
 کو جھٹکے سے موڑ کر پیچھے دیکھا۔

- تم - ؟ - وہ خوفناک انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔  
 شائندہ تو متحیر بنی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سارے آنسو بہ چکے تھے  
 اب ان میں دلگدگاہ ویرانی تھی۔

- کیوں آئی ہو یہاں - وہ گرجے۔  
 - چل کر خواب گاہ میں سو جائیے - شائندہ گھٹی گھٹی آوازیں صرف اسی قدر  
 کہہ سکی۔

- پہلی جاؤ - وہ چیخے - میں تمہاری شکل دیکھنا چاہتا نہیں - آئندہ  
 ادھر آنے کی جرات نہ کرنا۔

- شائندہ چند لمحے چپ رہی۔

- چلی جاؤ۔ ورنہ میں - وہ تند لہجے میں بولے۔

- مار ڈال لیے مجھے - شائندہ بے بسی سے پھٹ پڑی۔

- میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔

شائندہ اسی طرح کھڑی رہی۔ عثمان غصے سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ پھر

وہ غرائے - حرف اس معصوم بچے کا خیال آتا ہے۔ ورنہ میں - میں -

- میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں - شائندہ نے الجھے سانسوں کے درمیان

آہستگی سے کہا۔ - لیکن خدا کے لیے اپنے آپ کو سنبھالیے۔

وہ رو رہی۔

عثمان چپ چاپ اسے تکتے رہے۔

- میرا بہت خیال ہے تمہیں - انہوں نے زہرناک لہجے میں کہا۔ پھر

اک خوفناک تہقیر لگاتے ہوئے بولے۔

- وفاقا بیویوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔

شائندہ کٹ مری۔ سر اٹھانے کی جرات نہ ہوئی۔

عثمان اس کے قریب آئے۔ - بے وفا عورت - تم اسی دن مر کیوں

نہ گئی۔ یہ سانحہ تمہیں چھوڑ گیا۔ بے غیرت بے حیا۔ دفع ہو جاؤ میری نظروں

کے سامنے سے۔ میرا تم سے اب کوئی تعلق کوئی واسطہ نہیں۔ سمجھ لے کہ میں

تمہارے لیے مر گیا۔ کاش تم بھی میرے لیے مر گئی ہو تیں۔ کاش - کاش -

شائندہ آنسو بہاتی رہی۔ اور عثمان زہر بھرے طعنے اس کا جلاتے رہے

وہ دل برداشتہ ہو کر کمرے سے جانے لگی۔ تو انہوں نے پکارا۔ ٹھہرو۔

وہ رک گئی۔

عثمان اس کے سامنے آ گئے۔ دونوں ہاتھ چھاتی پر باندھ کر بڑے سنبھلے ہوئے انداز میں بولے۔ "شانہ۔ میں تمہیں قتل بھی کر سکتا ہوں۔ طلاق بھی دے سکتا ہوں۔ علیحدہ بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن میرے سوا اس ابھی بچا نہیں ہے۔ میں بہت جلد کوئی آخری فیصلہ کر لوں گا۔" نبھاہ کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔ ہم ایک دوسرے کے لیے مر چکے ہیں۔

وہ چند لمحے رسکے۔ شانہ کے جسم سے جان نکلنے لگی۔ کانوں میں شاہیں شاہیں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس سے کھڑانہ رہا جاسکا۔

اور وہ عثمان کی بات سننے بغیر ہی کمرے سے نکل گئی۔

عثمان دوسرے دن بھی صبح صبح تیار ہو کر نکل گئے۔ فیکٹری گئے نہ کسی ملنے بننے والے کا سامنا کیا۔ شہر سے میلوں دور نکل گئے۔ جہاں کوئی نہیں تھا کوئی بھی نہیں۔ صرف وہ تھے۔ ادران کی بوچھاں۔ جو کسی آخری فیصلے پر پہنچنے کی کوشش میں لوٹ کر پہلے ہی مقام پر آ جاتی تھیں۔

کل کی طرح آج بھی وہ رات گئے گھر لوٹے۔

وہ برآمدے میں آئے تو فضل دین نعمت خان اور آیا کو سر جوڑے باتیں کرتے کھڑے پایا۔ انہیں دیکھتے ہی انہوں نے مؤدبانہ سلام کیا۔ اور معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

کیا بات ہے۔ اس وقت یہاں کیوں کھڑے ہو۔ عثمان نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

نعمت خان اور فضل دین تو سہم گئے۔ ہاں آیا نے جرأت سے کام لے کر کہا۔ صاحبزادہ صاحب آپ کہاں چلے جاتے ہیں۔

کیوں۔ تم۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

بگم صاحبہ سارا دن روتی رہتی ہیں۔ کمرے سے باہر نکلتی ہیں۔ نہ کچھ کھاتی پتی ہیں۔ کیا ہمت کر کے کہ بولی۔

کل بھی کھانا نہیں کھایا۔ آج بھی نہیں۔ فضل دین بولا۔

صاحب جی آپ بگم صاحب سے غصہ ہوا ہے۔ نعمت خان بولا۔ وہ بہت خفا ہے۔ بیمار پڑ جائے۔ بھوکا رہتا ہے سارا دن۔

مشکل سے چائے کی پیالی میں نے پلائی۔ ذرا سابلکٹ کھلایا۔ آیا بولی۔

عثمان شذر سے کھڑے رہ گئے۔ وہ تو ملازموں کی باتیں شاید سن ہی نہ رہے تھے۔ انہیں تو اک جھکنا لگتا تھا۔ ناچاتی کی واردات ملازموں کی نظر میں آگئی تھی۔ یہ بات پھیل بھی سکتی تھی۔ لوگوں کو پتہ چل سکتا تھا۔ والدین کو خبر ہو سکتی تھی۔

وہ سرتاپا لرز گئے

انہیں یوں لگا جیسے لوگ انہیں گہرے کھڑے ہیں۔ ان پر ہتھیاں کس رہے ہیں۔ طنز اور تمخر اڑا رہے ہیں۔ ان کے ابا پوچھ رہے ہیں۔ اس لڑکی کے لیے ہیں چھوڑا تھا؟

امی کہہ رہی ہیں۔ کر لی پسند کی شادی۔ دیکھ لیا حشر۔

بہنیں پوچھ رہی ہیں۔ اس آوارہ کے لیے ہم سے منہ موڑا تھا۔ دن رات محنت کی تھی۔ اس کا مقام بلند کیا تھا؟

وہ گہرا گہرا کر ملازموں کو دیکھنے لگے۔ پھر ڈانٹ کر بولے۔ خبردار جو کسی نے کوئی بات کی۔

آیا چپ نہ رہ سکی۔ جرأت سے بولی۔ لڑائی جھگڑا ہو ہی جاتا ہے صاحب

جی۔ پر اب بگم صاحبہ کو منا ہی لیں۔ بہت بڑھال ہو رہی ہیں۔ کم از کم کھانا تو کھلا دیں۔  
- اچھا۔ عثمان نے جانے کیسے کہہ دیا۔ اور سیدھے خواب گاہ کی طرف چلے گئے۔

نوکرانہیں دیکھ دیکھ کر نہ مسکراتے رہے۔  
عثمان کمرے میں آتے ہی کرسی پر گر گئے۔ شائے بیڈ میں تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی۔

لیکن کوئی بات نہیں کی۔ عثمان بھی کچھ نہیں بولے۔  
کئی اذیت وہ لمحے گزر گئے۔

- شائے۔ عثمان نے دھیمی آواز میں پکارا۔

شائے نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

وہ چند لمحے رکے پھر تنگ آواز میں بولے۔ میں نہیں چاہتا۔ کہ ہمارے تعلقات کا کسی کو بھی علم ہو۔ جب تک اہم علی گڑھی کا کوئی فیصلہ نہ کر لیں۔ یہیں اس بے تعلقی کو سب سے چھپانا ہو گا۔

وہ جیسے حکم دے رہے تھے۔ کرسی سے اٹھتے ہوئے تیزی سے بولے۔  
اگر کسی کو اس واقعے کی بھنگ بھی پڑ گئی۔ تو میرے لیے خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہ ہو گا۔ میں اب مزید ذلت یا رسوائی برداشت نہیں کر سکتا گا۔

شائے نے تڑپتی نظروں سے انہیں دیکھا۔  
- نوکروں۔ رشتہ داروں اور دوستوں سب سے اس بات کو پوشیدہ رکھنا ہے۔ وہ فحشی سے بولے۔  
شائے چپ رہی۔

- آپ نے کل سے کھانا نہیں کھایا۔ سارا دن روتی رہی ہیں۔ یہ بات نوکروں کے علم میں آ چکی ہے۔ شائے میں آپ کو تھک کر رہا ہوں۔ ظاہر داری مشکل ہے۔ لیکن بہر صورت بھانہنا ہوگی۔ تاوقتیکہ کوئی آخری فیصلہ ہو جائے۔ وہ زوردار آواز میں بولے۔ - اٹھیے۔ چل کر کھانا کھالیں۔

شائے نے پس و پیش کیا۔ وہ تندی سے بولے۔ آپ چاہتی ہیں میں اپنی نظروں میں تو ذلیل ہوا ہوں۔ دوسروں کی نظروں میں بھی رسوا ہو جاؤں؟  
- نہیں۔ نہیں۔ شائے نے گہرا کر انہیں دیکھا۔  
- تو آئیے۔ عثمان بولے۔

شائے نے دوڑ پڑ لیا۔ اور لستر سے نکل آئی۔

دونوں نے ساتھ ساتھ میٹھ کر کھانا کھایا۔ دو دن سے عثمان نے بھی دو چار لقمے ہی تو ہمارے کیے تھے۔

نوکر مسکرا مسکرا کر کھانا پیش کرتے رہے۔ عثمان کو گونا گویا تسلی ہوئی۔

ادھر

سب کے سامنے نارمل نارمل رہنے لگے۔ اس شعوری کوشش نے ان کی جنونی کیفیت کو بہت حد تک کم کر دیا۔ ظاہر داری کا بھرم قائم رکھتے ہوئے وہ اپنے اپنے دکھ دلوں میں دبائے کے قابل ہو گئے۔ کوئی بھی تو نہ جان سکا۔ کہ وہ ازل وابد کے سرے بن چکے ہیں۔ ان کے درمیان اجنبیت کی دیواریں اٹھ آئی ہیں۔ اور وہ میاں بیوی ہوتے بھی ایک دوسرے سے بالکل لائق ہو چکے ہیں۔



پچھلے دنوں جب عثمان کے چاروں دوست مع اپنی بیگمات کے پورے سات  
دن یہاں ٹھہرے تھے۔ تو شانہ کا دل ہی جانتا تھا۔ کہ یہ دن کیسے گزرے  
تھے۔

مراد علی میں جانا اور ان لوگوں کی محبتوں اور شفقتوں کے سامنے بھی بھرم  
قائم رکھنا مشکل ترین کام تھا۔ جس دن مراد علی خان نے شانہ کو انگشتری دی  
تھی۔ وہ ٹوٹ بھوٹ گئی تھی۔ منشر ہو گئی تھی۔ لیکن ظاہر داری بھائی تھی۔  
ظرفیہ کی منگنی والے دن تو اس کے چہرے سے تصنع کے نقاب سرک  
سرک گئے تھے۔ بڑی ہمت اور کوشش سے اس نے بھٹکنے کی کوشش کی تھی۔  
لیکن اب وہ محسوس کرتی تھی۔ کہ ماما اس کے اصلی چہرے کی جھلک دیکھ چکی ہیں۔  
وہ اسے کہہ کر سید کر پوچھتی تھیں۔ ان کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ وہ سب کو  
دھوکہ دے رہی تھی۔ سب کے سامنے بن رہی تھی۔ لیکن اب اس کا حوصلہ  
ٹوٹ رہا تھا۔ وہ ہمت ہار رہی تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ۔ ظاہر داری کا  
بھرم وہ ماما کے سامنے قائم نہیں رکھ سکے گی۔ کسی بھی وقت ان کے سامنے  
وہ دھماکے سے پھٹ پڑے گی۔

کبھی کبھی تو اس کے ذہن میں باغیانہ خیالات امنڈنے لگتے۔ اسے اپنے  
ساتھ ساتھ عثمان سے بھی نفرت محسوس ہونے لگی۔ اس کا بغیر لادی نگاہ وہ  
معاف نہیں کر سکتے تھے۔ زمانے بھر کی محبتیں جتانے والے شفقت کا دامن  
اس قدر تنگ رکھتے تھے۔ کہ غلطی سے سرزد ہونے والی غلطی کو ڈھانپ  
رہے تھے۔ محبت وسیع القلب ہوتی ہے۔ لیکن اب تو اس کا ایمان اس حقیقت  
سے بھی اٹھ گیا تھا۔ وہ شدت سے چاہنے لگی کہ عثمان کے آخری فیصلے کی پرواہ  
کیے بغیر ان سے الگ ہو جائے۔ اس وقت اسے لوگوں کی پرواہ نہ ہوتی۔

زندگی اک آزار تھی  
فدا ب تھی

ظاہر داری آسان کام نہیں تھا۔ دل جلتا تھا لیکن لبوں پر مسکراہٹ سببانا  
پڑتی تھی۔ آنکھوں سے ہونٹ پکستا تھا۔ لیکن اسے پی جاتے ہی جیتی تھی۔ درد  
نہ پاتا تھا۔ لیکن کراہنے کی اجازت نہیں تھی۔ درمیان میں قیامت کے  
فیصلے آچکے تھے لیکن قربت کی انتہا میں ظاہر کرنا پڑتی تھیں۔ شخصیت کو دانستہ  
متضادوں میں منقسم کرنا کٹھن ترین فعل تھا۔ کئی دفعہ انتہائی نازک لمحے آچکے تھے۔  
جب ظاہر داری کے خوں میں دراڑ پڑ گئے تھے۔ اور بھرم کا بھرم رکھنے کے  
لیے آزمائش کی آزادہ گھڑیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔  
آزمائش کا آزار تو قدم قدم پر تھا۔ شانہ ہتے ہتے عاجز آچکی تھی۔ نوکروں  
چاکروں سے دن رات کا واسطہ تھا۔ دوستوں سے بھی ملاقات ہوتی تھی۔

اور نہ ہی اپنے مرتبے اور سوسائٹی میں مقام کا احساس ہوتا۔  
لیکن علیحدگی کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی بہت بھی توجہ پڑتی۔ لاتعلقی  
اور ناچاقی کے باوجود محبت کے بندھن موجود تھے۔ چاہتوں نے اور شدت  
اختیار کر لی تھی۔ عثمان کے بغیر تو وہ شاید مر بھی نہ سکتی تھی۔ اور پھر ننھے شیری  
کا وجود بھی تو حامل تھا۔ خودکشی کی ہر بار کوشش اسی منے سے وجود نے ناکام بنا  
دی تھی۔

عثمان کے متعلق اسے کچھ علم نہیں تھا۔ کہ وہ آخری فیصلہ کیا اور کب کر رہے  
ہیں۔ وہ منتظر ضرور تھی۔ اسی لیے کبھی کبھی احساس ہونے لگتا تھا۔ کہ ٹائم لم پر  
بیٹھی ہے۔ کسی لمحے یہ لم پھٹ جائے گا اور اس کی ہستی ریزہ ریزہ ہو کے  
بکھر جائے گی۔

عثمان اب اکثر رات دیر سے گھر آتے تھے۔ تنہائی میں ان سے پوچھ کہنے کا سوال  
ہی نہ تھا۔ سب کے سامنے ظاہر داری مانے تھی۔ کچھ پوچھا ہی نہ جاسکتا تھا۔

لیکن

آج

جب منتر تپوری کی زبانی اسے معلوم ہوا۔ کہ نشین بچی جا رہی ہے اور  
کے کین باہر جا رہے ہیں۔ تو وہ پریشان ہو گئی۔

شیری کا کیا ہو گا؟

اور وہ کہاں جائے گی؟

یہ جلتے ہوئے سوال اس کا دماغ داغ رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا  
تھا۔ وہ اپنا ذہنی توازن کھودے گی۔ سارا دن وہ پریشان رہی۔ ایک  
ایک لمحہ آ کر رہے تھا۔

لیکن اس نے عثمان سے اس بارہ میں کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر  
لیا۔ رات اتر آئی تھی۔ عثمان کی گاڑی آچکی تھی۔ وہ اپنے بیڈ روم میں تھے  
شانہ بستر سے مکلی شال کندھوں پر ڈالی۔ چل پھرتے اور عثمان کے کمرے کی طرف  
چل دی۔

آج اس نے بلا بھجک دروازہ کھولا۔ اور بے دھرمک اندر چلی گئی۔  
عثمان بیڈ پر لیٹے تھے۔ فائینوں اور کاغذوں کا پلندہ سائڈ ٹیبل پر پڑا  
تھا۔ وہ ابھی ابھی برلن میں رہنے والے ایک واقع کار کو خط لکھ کر فارغ  
ہوئے تھے۔ یہ پاکستانی واپس وطن آنا چاہتا تھا۔ جب عثمان جرمی گئے تھے۔  
تو اس نے کسی اچھے سے شہر میں خوبصورت سا گھر خریدنے کی خواہش کا اظہار  
ان سے کیا تھا۔ اب عثمان نے نشین کے لیے اسے لکھا تھا۔ وہ ڈالر میں اس  
کی قیمت بھی دے سکتا تھا۔ عثمان ملک چھوڑ دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔  
خط لکھ کر ان کی طبیعت بے طرح بے چین ہو گئی تھی۔ نشین کو آباد کرنے کے  
سلسلے میں اپنی انتھک کوششوں اور شب و روز کی محنت کا خیال آ رہا تھا۔ ڈھیر  
سارے انسوا طق میں اتر رہے تھے۔ آنکھیں جلتے لگی تھیں۔ انتہائی بے چین تھے۔  
مضطرب تھے بیکار تھے۔

سوچ رہے تھے کہ انہیں کس جرم کی سزا ملی ہے؟

کیا خطا ہوئی تھی ان سے؟

کیا بگاڑا تھا انہوں نے؟

ان کی خوشیوں میں کیوں آگ لگ گئی تھی؟

ان کا دل سیال سی شے بنتا جا رہا تھا۔ ڈانٹ ہارس سکاپچ اور تلخ ترین  
بھی تسکین دے سکے تھے۔

پھیل رہے تھے۔ آواز میں سختی تھی۔ وہ ہاتھوں کی مٹھیاں کھولنے اور بند کرنے لگے۔

- جو کچھ سوچتے ہیں کر ڈالے۔ شائے نے بے آواز سسکی سے کہا۔  
- میں تمہارا گلا کھونٹ کر تمہارے لاش کی بوٹی بڑی بکھر دینا چاہتا ہوں۔  
وہ بکھر پڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

شائے تحمل سے بیٹھی رہی۔ آہستگی سے بولی۔ یہ مجھ پر آپ کا سب سے بڑا اور آخری احسان ہو گا۔

- لیکن۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ دکھ سے کراہتی آواز میں بولے۔  
- شیریں کی وجہ سے۔ انہوں نے شائے کو چپ دیکھ کر تلمی سے کہا۔ - مض  
اس بچے کی وجہ سے۔

انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بڑی کر بناک آواز میں بولے۔ میں یہاں رہ کر تمہیں طلاق بھی نہیں دے سکتا۔ مجھے مجبور یوں نے قدم قدم پر جکڑ رکھا ہے۔  
لیکن۔ وہ رکے پھر سنگین آواز میں بولے۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کو یوں ہی برداشت کرتا چلا جاؤں گا۔ تنگ آپ بھی آپکی ہوں گی۔ میں نے قبائل فیصلہ بھی کر لیا ہے۔

- نشین بیچ رہے ہیں۔ شائے نے پوچھا۔

- ہاں۔

- کیوں؟

- اس کیوں کا جواب آپ کو اب تک نہیں ملا۔؟

وہ چپ رہی

- اگر آپ کو یہ جہنم کدہ بہت پسند ہے تو ارادہ ترک بھی کر سکتا ہوں۔ آپ

شائے اک پر اسرار سائے کی طرح ان کے بیڈ کے قریب آگئی۔

عثمان نے اسے دیکھا۔

عثمان نے تو نہیں کہا۔ لیکن وہ خود ہی بیڈ کے قریب پڑے سٹول پر بیٹھ گئی۔  
اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ کٹری رستی تو شاید گر جاتی جاتی۔

عثمان نے اک نظر اس پر ڈالی۔ کالی شال میں اس کا سپید چہرہ کسی نقش کی طرح لگ رہا تھا۔ لیکن بعض لوگوں کے چہروں پر موت بھی نکھار پیدا کر دیتی ہے۔ نعشیں بھی بے اتہا خوبصورت لگتی ہیں۔ شائے کا چہرہ بھی کسی ایسی ہی نعش کی طرح تھا۔ جس پر موت نے نکھار پیدا کر دیا تھا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ شائے اپنے خوبصورت ہاتھوں کو بیدردی سے مسلاتی رہی۔ اور عثمان سگریٹ کے کش پر کش لیتے رہے۔  
- آپ کیوں آئی ہیں۔ عثمان نے سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال کر تحمل سے

پوچھا۔

- آپ نے کیا سوچا ہے؟ - مرلی سی آواز میں اس نے کہا۔  
عثمان نے اک گہری سانس لی۔ سگلتے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل  
سل کر گل کرنے لگے۔ شائے دم رد کے ان کے جواب کی منتظر رہی۔  
- میں نے۔۔ وہ اٹھ کر بے تابی سے ہٹنے لگے۔

- جی۔ وہ اسی انداز میں بیٹھی رہی۔

- میں۔ میں جو سوچتا ہوں۔ افسوس ہے کہ وہ کر نہیں سکتا۔ وہ بڑی نفرت

سے بولے۔

شائے نے سر اٹھا کر اس مایوس اور سچان ہپا کر دینے والی نظروں سے  
عثمان کو دیکھا۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے

یہاں رہ سکتی ہیں۔

اور آپ۔

باہر جاب رہوں۔

شیری۔

میرے ساتھ جائے گا۔

اور میرے متعلق؟

آپ کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ تھا۔

شانہ نے گردن اٹھا کر حیران نظروں سے انہیں دیکھا۔ خیالات گڈمڈ ہو گئے۔ کیا انہوں نے اسے بخش دیا تھا۔ خطا معاف کر دی تھی؟ لیکن نہیں۔ ان کے چہرے کی سختی اور خند لمحے پہلے ہونے والی باتیں؟ شانہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو سکی۔

میرا ارادہ فوری طور پر ملک چھوڑ دینے کا ہے۔ آپ کو بھی ساتھ جانا ہوگا۔ شانہ کا دل تنم گیا۔ پھیلی پھیلی حیرت زدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ وہاں جا کر فوراً ہی میں آپ کو آزاد کر دوں گا۔ شیری کے پاس آنے جانے یا اسے اپنے پاس رکھنے کی میں آپ پر کوئی پابندی نہیں لگاؤں گا۔ لیکن میرا آپ سے یا آپ کا مجھ سے کوئی نااطہ کوئی رشتہ کوئی تعلق نہ رہے گا۔ وہ بیسے پیچھے اٹھے۔

شانہ نے ان کا فیصلہ یوں سنا جیسے قتل کے مجرم پھانسی کا فیصلہ سنتے ہیں۔ اس کا دماغ چکر اگیا۔ آنکھوں میں اندھیرا اچھا گیا۔ چہرہ ہونٹ یوں سپید ہو گئے جیسے کسی نے آنا فانا خون کی آخری بوند بھی سمجھوڑ لی ہو۔ اس سے تو سامنے لینا ہی دشوار ہو گیا۔ وہ بے شکل کچھے کچھے سانس لے رہی تھی۔

سانسین عثمان کی بھی الٹ پلٹ تھیں۔ سینے میں قیامتیں ٹوٹ رہی تھیں۔ دل کے خلاف بغاوت کرنا کوئی معمولی اقدام تو نہیں تھا۔ اپنے عشق کو یوں بے دریغ قتل کر دینا آسان تو نہیں تھا۔ وہ بے حال سے ہو کر ہانگ کی پٹی پر آ بیٹھے۔ سگریٹ سلگاتے وقت ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد شانہ نے سر اٹھا کر عثمان کو دیکھا۔ ویران خشک اور اجاڑ سی آنکھوں سے پھر اس کے لب پہلے۔ پیچ بولنا اور دھوکہ دینا شاید دنیا کے ہر ترین فعل ہیں۔

عثمان نے بے قراری سے پٹی پر بیٹھے بیٹھے پلو بولا۔ رک رک کر بولے۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ میں نے اپنے فیصلے سے آپ کو مطلع کر دیا ہے۔۔۔ میں یہاں آپ کو ملاقات نہیں دے سکتا۔۔۔ مجھ میں رسوائی ذلت اور لوگوں کے مسخر کا نشانہ بننے کی ہمت نہیں۔۔۔ میں والدین کی نظروں میں بھی ذلیل نہیں ہونا چاہتا۔ آپ نے اتنے دنوں بھرم رکھا ہے۔ اب اسی ہمارے یہ توقع بھی کر رہا ہوں۔ کہ ہم باہر جا کر علیحدگی کے فیصلے کو عملی جامہ پہنائیں۔۔۔ وہاں۔۔۔

مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور ہے۔۔۔ وہ بڑے دکھ سے بولی اس کے حلق میں پھنسے پڑے تھے۔ آنسو پھوٹ بننے کو چل رہے تھے۔ لیکن ایک رعایت۔ اس کی آواز گھٹ گئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔

کیجیے۔ عثمان حوصلے سے بولے۔ وہاں جا کر مجھ سے بے شک کوئی رابطہ کوئی تعلق کوئی نااطہ نہ رکھیے گا۔ لیکن الگ نہ کیجیے گا۔ اس نے جلدی سے کہہ دیا۔ اس کا سانس پھول گیا۔ ہونہ۔ عثمان کے منہ سے بڑے استعوار سے آواز نکلی۔ ویسے ان کا دل

کانپ گیا۔ وہ جبر سے ہنسنے۔

”کیوں؟“

شانہ نے ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھا۔

”محبت ہے مجھے آپ سے؟ اس لیے۔“ عثمان نے طنز کیا۔

”ہاں۔“ وہ طنز کی آگ سے جل گئی۔

”مجھے آپ سے نفرت ہے۔“ وہ غصے سے بولے۔

”آپ کہنے کو کہہ سکتے ہیں۔“ وہ عثمان کو آہٹا رہا جانے والی نظروں سے

دیکھ کر بولی۔ عثمان ڈول گئے۔ لیکن اپنے آپ کو اپنی نظروں سے بھی چھپاتے

ہوئے تیزی سے بولے۔ ”میں آپ سے نفرت کرتا ہوں۔“

”آپ بھوٹ کہتے ہیں۔“ وہ بھی تیزی سے بولی۔

عثمان ٹڑپ گئے۔ ان ساری تلمیحوں اور حالات کھٹھنیاؤں کے باوجود

شانہ اس تعین سے یہ بات کہہ رہی تھی۔؟

سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔ عثمان کا سینہ پھٹ جانے کو تھا۔ لیکن کمال ضبط

سے بولے۔ ”آپ چاہتی کیا ہیں۔“ شانہ سرعت سے سٹول سے اٹھی اور

تالین پر دوڑا تو ہوتے ہوئے عثمان کے پاؤں اپنے پنج بستہ ہاتھوں میں پکڑ

لیے۔

عثمان بڑبڑا گئے۔ شانہ کے ہاتھوں کے لمس نے جلا ڈالا۔ سارا وجود

پانی پانی ہو گیا بہت ہی نہ رہی۔ کہ اس کے ہاتھوں سے پاؤں چھڑا سکیں۔

عثمان بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ ان کا درد پھٹ جانے کو تھا۔ اذیت

نا قابل برداشت ہو رہی تھی۔ اپنے اور پریسلٹ کیا ہوا البادہ سرک رہا تھا۔

دکھ بچھل رہا تھا۔ لیکن بہت کم کے انہوں نے سختی سے کہا۔ ”میں آپ کو بردہ

نہیں کر سکتا۔ یہ اذیت میری بہت سے باہر ہے۔“

”مانی۔“ شانہ نے درو بھری التجا کی۔ ”شیری کی خاطر سہی۔ آپ

کو اپنا فیصلہ بدلنا ہو گا۔ اس میں لچک پیدا کرنا ہو گی۔ اگر آپ ایسا نہیں

کر سکتے۔ تو مجھ میں بھی اب برداشت کی بہت نہیں رہی۔ میں سچائی کا زہر

اپنے اندر اتار چکی ہوں۔ اب میرا گلا گھونٹ دیجئے۔ مجھے مار ڈالئے۔ ختم

کر دیجئے۔“

شانہ نے بڑے جراتی انداز میں کہتے ہوئے سراٹھایا آنسوؤں سے تر

چہرہ اڑچا کیا۔ اور پاؤں کو اپنی پوری طاقت سے پکڑتے ہوئے بولی۔ ”مار

ڈالئے مجھے۔ گھونٹ دیجئے میرا گلا۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ نہیں

رہ سکتی۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ گردن

عثمان کے ہاتھوں کی زد پر رکھ دی تھی۔

”شانہ۔“ عثمان کی آواز نے لڑکھڑائی۔ ”تم نے مجھے کس عذاب میں مبتلا

کر دیا ہے۔ کہ میں جی سکتا ہوں نہ مر سکتا ہوں۔“

عثمان نے بہتر سے ضبط کے بند باندھے۔ ہونٹ کاٹ لیے۔ آنکھیں میچ

لیں۔ لیکن سینے میں پھیلنے والی سیال شے پھر بھی بہہ نکلنے کو تھی۔

”شانہ۔“ یہ کس جرم کا بدلہ چکایا ہے تم نے۔ کس تصور کی سزا دی ہے۔

کس آزار میں مبتلا کر دیا ہے مجھے۔ تمہیں قبول بھی نہیں کر سکتا۔ چھوڑ بھی

نہیں سکتا۔ کس تصور کا سزاوار سمجھوں اپنے آپ کو۔ تمہارے پاس تو

احساس جرم ہے۔ میرے پاس تو وہ بھی نہیں۔ دل کو کس بات کی ڈھارس

دوں۔ کیا کہہ کر سمجھاؤں۔ کیا کروں۔ کیا کروں۔ شانہ۔ میں کیا کروں

سینے کی سیال شے بہ نکلی۔ درد پھٹ گیا۔ دکھ پھیل گیا۔  
دوسرے لمحے وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر  
رورہے تھے۔

فضا لرز گئی۔

درو بام کانپ گئے۔

اس نومند دل و جگر کے مالک نے حوصلہ ہار دیا تھا۔ جو بڑی سے بڑی  
افتاد پر بھی نہیں گھبرا یا تھا۔ جس نے ہر مصیبت کا ہمیشہ خندہ پیشانی سے استقبال  
کیا تھا۔

عثمان رورہے تھے۔

تڑپ تڑپ کر

سک سک کر

گھٹ گھٹ کر

اور ضبط کی کوشش میں بے ضبط ہو ہو کر۔

شانہ گنگ سی دنگ سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کا دکھ عثمان کے دکھ کا نہاراواں

حصہ بھی نہیں۔ واقعی اس کے پاس احساس جرم تو تھا۔ لیکن عثمان — !!!